کاروانِ افسانہ

اردو دنیا کے ۵۰ شاہکار افسانے

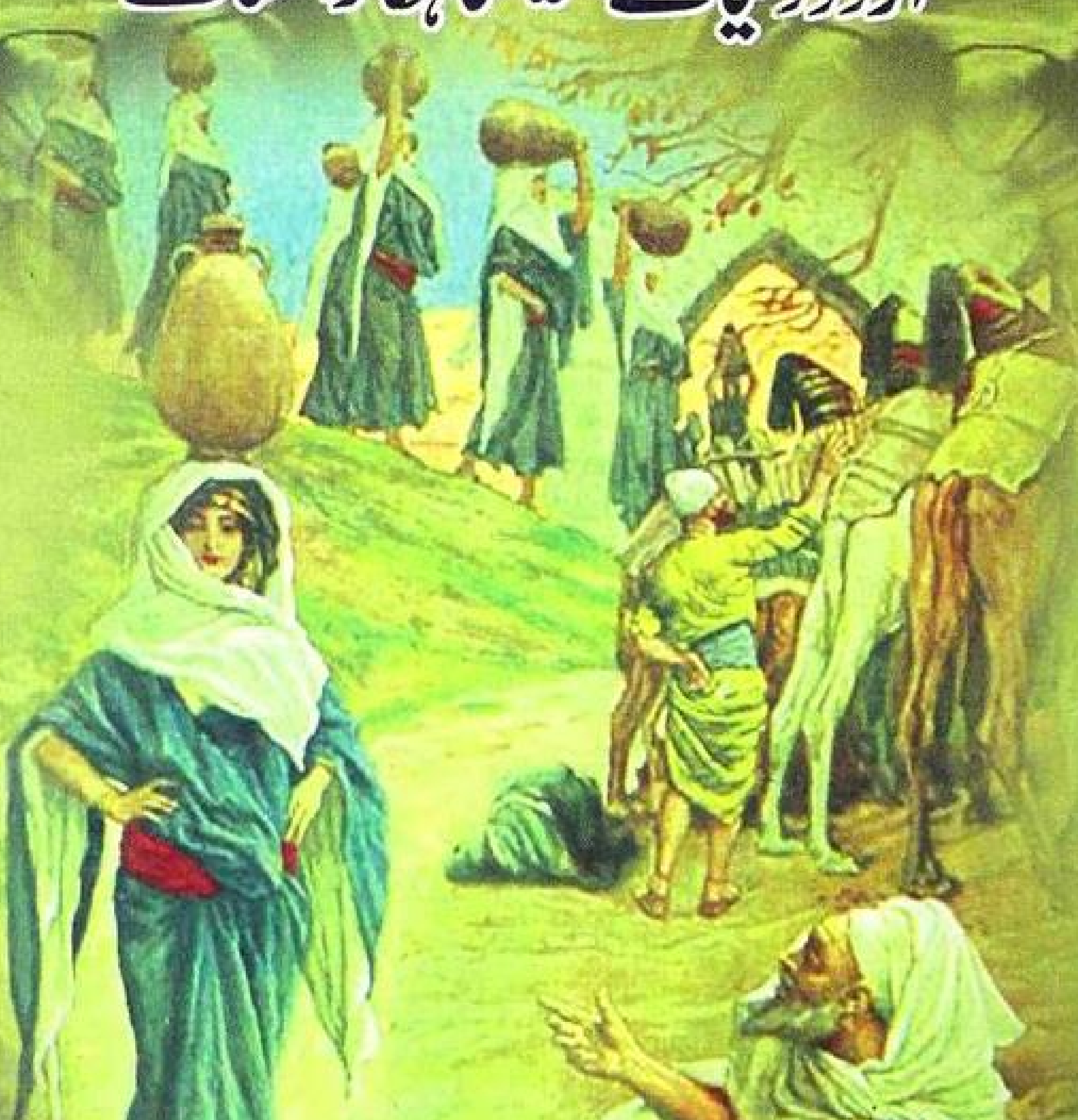

مرتبہ
فاروق ارگلی

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

کاروانِ افسانہ

اُردو دنیا کے 50 شاہکار افسانے

مرتبہ

فاروق ارگلی

(سکریٹری عالمی اُردو کانفرنس)

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

NEW DELHI-110002

© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب

کاروانِ افسانہ

مرتبہ: فاروق ارگلی

صفحات: ۸+۶۴۶ قیمت: -/۱۷۵ روپے

طبع اوّل: مارچ ۲۰۰۵ء

باہتمام
محمد ناصر خان

Name of the book

KARWAN-E-AFSANA

Selected Urdu Short Stories by Renowned Authors

Compiled by:

Farooq Argali

Ist Edition: **March, 2005**

Pages: 8+646 Price: **Rs. 175/-** Size: 23x36/16

ناشر

فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2
Phones: 23247075, 23289786, 23289159 Fax: 23279998 Res.: 23262486
E-mail: farid@ndf.vsnl.net.in Websites: faridexport.com, faridbook.com

Composed by: Crescent Computers, 55176893

Printed at: Farid Enterprises, Delhi-6

عرضِ مرتب

ترقی پسند، جدید، مابعد جدید، اور مابعد مابعد جدیدیت کی بحث و تطبیق سے قطع نظر جب ہم اردو افسانے کے ارتقاء اور اس کی لامحدود وسعتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو منشی پریم چند کے عہد سے لیکر اب تک اردو کے عظیم افسانہ نگاروں کی لازوال تخلیقات کا ایک بے پناہ اور بیش بہاء خزانہ سامنے آتا ہے جو یقیناً ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان کا افسانوی ادب اپنی معنویت، وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے بشمول انگریزی، فرنچ اور رشین، دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے کم وقیع نہیں ہے۔ اردو زبان کے افسانوی ادب کا یہ عظیم کارواں وقت کے تغیر پذیریوں اور رنگ بدلتی ہوئی قدروں میں دھڑکتی ہوئی انسانی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو اجاگر کرنے والی تخلیقی قوتوں کے ساتھ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔

اردو زبان میں منتخب افسانوی مجموعوں کی کمی نہیں۔ ان گنت خوبصورت افسانوی مجموعے اردو ادبیات میں شامل ہیں لیکن 'کاروانِ افسانہ' کے عنوان سے زیرِ نظر مجموعے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں منشی پریم چند اور ان کے بعد اب تک لکھے گئے ہزاروں شاہکار افسانوں میں سے پچاس ایسے افسانوں کو منتخب کیا گیا ہے جن میں زندگی کی بنیادی حقیقتوں، انسانی نفسیات، سیاست، معیشت، طبقاتی کشمکش، حرص و ہوس، شرافت و خباثت، کامیابی و ناکامی، دوستی و دشمنی، عورت و مرد کے جسمانی و روحانی رشتوں اور عشق و محبت کے لازوال جذبوں کی بھرپور تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ان بہترین پچاس افسانے اردو افسانہ کی ساٹھ ستر سالہ تاریخ کی، ترقی پسند تحریک سے لے کر اب تک کی مختلف تحریکوں اور فکری نہجوں کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ

مجموعہ اردو افسانہ کی ارتقائی وتدریجی تاریخ کو سمجھنے کا ایک موثر ذریعہ بن جاتا ہے۔

اردو کے دور ساز افسانہ نگاروں کے لکھے ہوئے سدا بہار افسانوں کا یہ گلدستہ دلچسپ کہانیوں کے شائقین کے لیے ایک خوبصورت تحفہ اور اردو ادبیات کے طلبہ کے لیے بیش بہاء علمی خزانہ بھی ہے۔

اس مجموعے کی ترتیب اردو دنیا کے نامور پبلشنگ ادارے میسرز فرید بکڈپو کے مینیجنگ ڈائریکٹر جناب الحاج ناصر خاں کی تحریک وز وردار فرمائش کی مرہونِ منت ہے۔

ناصر صاحب نے موجودہ دور میں اردو زبان کی ترقی وترویج کے جذبے سے سرشار ہوکر اردو ادب کے شہہ پاروں کو کم سے کم قیمت پر عام لوگوں تک پہنچانے کی بین الاقوامی تحریک کا آغاز کیا ہے۔ 'کاروانِ افسانہ' اسی سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے۔ اہم ترین اس حوالے سے کہ اب تک ہندوپاک میں افسانوی ادب کا اتنا ضخیم اور مکمل انتخاب شائع نہیں ہوا ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں اردو زبان کے عظیم افسانہ نگار، دانشور اور صحافی جناب نند کشور وکرم، مدیر عالمی اردو ادب، کی رہنمائی اور مشوروں سے بیحد مدد ملی ہے، جس کے لیے میں تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

فاروق ارگلی

۲۵ گنیش پارک، رشید مارکیٹ، دہلی۔

فہرست

	افسانہ	مصنف	صفحہ
-1	کفن	پریم چند	1
-2	آنندی	غلام عباس	10
-3	میلہ گھومنی	علی عباس حسینی	27
-4	زبانِ بے زبانی	اختر حسین رائے پوری	33
-5	ٹوبہ ٹیک سنگھ	سعادت حسن منٹو	49
-6	میری موت	خواجہ احمد عباس	57
-7	آخری کوشش	حیات اللہ انصاری	71
-8	مالکن	قاضی عبدالستار	100
-9	درزی	حجاب امتیاز علی	118
-10	چھرو ماںجھی	علی سردار جعفری	125
-11	مہالکشمی کا پل	کرشن چندر	150
-12	لاجونتی	راجندر سنگھ بیدی	167
-13	انگڑائی	ممتاز شیریں	181
-14	دو ہاتھ	عصمت چغتائی	199
-15	نظارہ درمیاں ہے	قرۃ العین حیدر	209
-16	بین	احمد ندیم قاسمی	226

-17 سفرِ منزلِ شب .... انتظار حسین 236
-18 اجگر .... اپندر ناتھ اشک 248
-19 پکھیرو .... رام لعل 271
-20 جھکی جھکی آنکھیں .... ممتاز مفتی 289
-21 بُو .... جوگندر پال 308
-22 کچھ تو کہیے .... رضیہ سجاد ظہیر 321
-23 ظلِ سبحانی .... جیلانی بانو 325
-24 محدّب شیشہ .... مسعود مفتی 334
-25 کٹھن ڈگریا .... بلونت سنگھ 352
-26 سخی .... کلام حیدری 365
-27 مرد .... واجدہ تبسم 372
-28 دھرتی کا بوجھ .... انور عظیم 383
-29 اچھی .... غیاث احمد گدی 400
-30 سدھارتھ .... دیوندر اِسّر 406
-31 اگنی دا .... جمیلہ ہاشمی 428
-32 سوکھے جھرنے .... انور خان 445
-33 طولِ شبِ فراق .... نند کشور وکرم 451
-34 دیدۂ یعقوب .... منشایاد 459
-35 کام دھینو .... سلام بن رزاق 472

-36	سہاگ	انور عنایت اللہ	490
37	راکھ	ساجد رشید	497
-38	طلسم آباد	انور قمر	505
-39	چوپال کا راجہ	امراؤ طارق	519
-40	قصاص	اشفاق احمد	525
-41	سوال	ہرچرن چاولہ	535
-42	گلیڈی ایٹر	کنور سین	542
-43	سگریٹ	افتخار نسیم	551
-44	ٹوٹا ہوا آدمی	بشریٰ رحمان	556
-45	دوسری بابری مسجد	آغا گل	572
-46	ہیولا	شوکت حیات	588
-47	احمد آباد 302 میل	مشرف عالم ذوقی	592
-48	پانیوں میں سراب	زاہدہ حنا	616
-49	آخری سبق	سلیم اختر	627
-50	نیم پلیٹ	طارق چھتاری	635

پریم چند

کفن

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے جاڑوں کی رات تھی فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔'' مادھو دردناک لہجے میں بولا۔ ''مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں؟''

''تو بڑا بیدرد ہے بے! سال بھر جسکے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی؟''

''تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔''

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لیے انھیں کوئی رکھتا نہیں تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونو اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہیں تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارا نہ ہوتا۔ کاش دونو سادھو ہوتے تو انھیں قناعت اور توکل کرنے کے لئے ضبط

نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی ۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی عجیب زندگی تھی ان لوگوں کی گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں ۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے دنیا کے مکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے ۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں ۔ مسکین اتنے کہ وصولی کے مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انھیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے ۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے' یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے ۔ گھیسو نے اسی زاہدانا انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا ۔ بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے ۔ جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے ۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا ۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی ۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی ۔ پسائی کر کے گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام کر لیتی ۔ اور ان دونو بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی ۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے ۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے ۔ وہی عورت آج صبح سے درد سے مر رہی تھی ۔ اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں ۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا ۔ '' جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی ۔ چڑیل کا پھساد ہو گا ۔ اور کہاں یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے کس کے گھر سے آئے ؟ '' مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا ۔ بولا ۔ '' مجھے وہاں ڈر لگتا ہے ۔ ''

'' ڈر کس بات کا ہے میں تو یہاں ہوں ہی ۔ ''

'' تو تم ہی جا کر دیکھو نا ۔ ''

'' میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں ۔ اور پھر مجھ سے لجائے گی نہیں ۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا ؛ آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں ، اسے تن کی سدھ بھی تو

نہ ہوگی مجھے دیکھ لے گی تو کُھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔''

''میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ سونٹھ، گُڑ، تیل کچھ تو نہیں گھر میں۔''

''سب کچھ آئے گا۔ بھگوان بچہ دے تو ___ جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے، گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔''

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی، اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے، کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا۔ اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و آداب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لئے جہاں اس کی جماعت کے لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیاں بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگرتوڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی۔ اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال کر جلدی جلدی کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انھیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیتے۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ جل جانے پر آلو کا بیرونی حصّہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصّہ زبان اور تالو حلق کو جلا دیتا۔ اور اس انگارے کو منھ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کے وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھا۔ اس لئے دونو جلدی جلدی نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی۔ جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی۔ اور آج بھی اس کی یاد

تازہ تھی۔ بولا" وہ بھوج نہیں بھولتا تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔ چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائی اور اصلی گھی کی چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ۔ ایک رسہ دار ترکاری۔ دہی، چٹنی، مٹھائی، اب کیا بتاؤں کے اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی جو چیز چاہوں مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا' ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوڑیاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے۔ پتل کو ہاتھ سے روکے ہوئے تھے مگر وہ ہیں کے دیئے جاتے ہیں۔ اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی سُدھ کہاں تھی، کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا کہ" اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

"اب کوئی کیا کھلائے گا وہ زمانہ دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو۔ کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ ہر کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔"

"بیس سے زیادہ کھائی تھیں۔"

" میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے جیسے دو بڑے اژدر گنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا۔ تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اس کے منہ پر

مکھیاں بھنک رہی تھیں پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھی سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا ۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس گیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ وزاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن اور لکڑی کی فکر تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا۔ جیسا چیل کے گھونسلے سے مانس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمینداروں کے پاس گئے وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے ۔کئی بار انھیں اپنے ہاتھوں سے پیٹ چکے تھے' چوری کی علت میں، وعدے پر کام پر نہ آنے کی علت میں، پوچھا۔ کیا ہے بے گھِسوا۔ روتا کیوں ہے ؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کے تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔''

گھیسوا نے زمین پر سر رکھ کر، آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا' سرکار بڑی مصیبت میں ہوں مادھو کی گھر والی رات گزر گئی؛ دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے ۔دوا دارو جو کچھ ہوا سب کچھ کیا ۔مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہ رہا۔ مالک تباہ ہو گئے، گھر اُجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں جو کچھ تھا وہ دوا دارو میں اُٹھ گیا۔ سرکار کی ہی دیا ہوگی تو اس کی مٹی اُٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں؟''

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں۔

''چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ سڑا، یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہی کا بدمعاش۔'' مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہیں تھا

دو روپے نکال کر پھینک دیے ۔ مگر تشفی کا ایک بھی کلمہ منہ سے نہ نکلا ۔ اس کی طرف تا کا تک نہیں؛ گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپیہ دیے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام سے ڈھنڈورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیے۔ کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسے نے غلّہ دیا اور کسی نے لکڑی، اور دو پہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے ادھر بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آ آ کر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو بہا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا ''لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہیں کیوں مادھو!'' مادھو بولا ۔

''ہاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کفن چاہیے۔''

'' تو کوئی ہلکا سا کفن لے لیں۔''

''ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی رات کو کفن کون دیکھتا ہے۔'' کیسا بُرا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اُسے مرنے پر نیا کفن چاہیے۔''

''کفن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔''

''اور کیا رکھا ہے۔ یہی پانچ روپیہ ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔''

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے ۔ بازار میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ یہاں تک شام ہو گئی دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے ۔ اور ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب کی لی۔ کچھ گزک' اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کُجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

گھیسو بولا کفن لگانے سے کیا ملتا۔ آ کھر جل ہی تو جاتا ہے۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔

"دُنیا کا دستور ہے۔ یہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں کیوں دے دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے کہ نہیں۔"

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے؟"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کہ کھن کہاں ہے؟"

گھیسو ہنسا۔ "کہہ دیں گے کہ روپیہ کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔"

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔

"بڑی اچھی تھی بچاری۔ مری بھی تو خوب کِھلا پلا کر۔"

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپیہ خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوڑیاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اُڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر، ضعف کے ان مراحل کو انہیں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پُن نہ ہو گا۔"

مادھو نے فرقِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ "جرور سے جرور ہو گا۔" بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔''

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پُر ملامت انداز سے دیکھا۔

''جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟''

''کہیں گے تمہارا سر۔''

''پوچھے گی تو جرور۔''

''تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کفن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دُنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔''

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا ''کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے۔''

گھیسو تیز ہو گیا۔ ''میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں۔''

''کون دے گا بتاتے کیوں نہیں۔''

''وُہی لوگ دیں گے جنھوں نے اب کی دیا۔ ہو ہاں وہ روپیہ ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے۔ اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے۔ اور کپھن تیسری بار ملے گا۔''

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا۔ اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی، مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی لہکتا تھا۔ کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منہ سے ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا۔ ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلّو میں اُلّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آئے تھے صرف خود فراموشی کا مزا لینے کے لئے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی۔۔ اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں یا زندہ در گور۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزا لے لے چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہوکر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتّل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔اور ''دینے'' کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔'' لے جا۔کھوب کہا اور اسیر باد دے۔جس کی کمائی ہے وہ تو مرگئی۔مگر تیرا سیر باد سے جرور پہنچ جائے گا۔روئیں روئیں سے اسیر باد دے بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔''

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔''بیکنٹھ میں جائے گی دادا__ بیکھنڈ کی رانی بنے گی۔''

گھیسو کھڑا ہوگیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔'' ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی کسی کو ستایا تو نہیں، کسی کو دبایا تو نہیں۔مرتے وقت ہماری زندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں۔اور اپنے باپ کو دھونے کے لئے گنگا میں جاتے ہیں۔اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔''

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا۔تلون نشے کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دور ہوا۔

مادھو بولا:۔

''مگر دادا بچاری نے زندگی بڑا دُکھ بھوگا۔مری بھی تو کتنا دُکھ جھیل کر۔''

وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا۔'' کیوں روتا ہے بیٹا۔ خُس ہو کہ وہ مایے جال سے مکت ہوگئی۔جنجال سے چھٹ گئی۔بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔''

اور دونوں وہیں کھڑے ہوکر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھکاوے ٹھگنی

سارا مے خانہ محو تماشہ تھا اور یہ دونوں میکش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے پھر دونوں ناچنے لگے۔اچھلے بھی۔کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہوکر وہیں گر پڑے۔

☆☆

غلام عباس

آنندی

بلدیہ کا یہ اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیوں کہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رُکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے، نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے۔

.......اور پھر حضرات! آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ ان کا قیام شہر کے ایک حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گذرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چاروناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے علاوہ ازیں شرفا کی پاک دامن بہو بیٹیاں اور بازار کے تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ اور نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگھار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دل ربائی کی نئی نئی اُمنگیں اور دلولے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُر مسرّت گھر' ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنّم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

........اور صاحبان! پھر آپ یہ تو بھی خیال فرمایئے کہ نونہالانِ قوم جو درس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا پھر ان ہی کے سر بندھے گا۔ انھیں بھی صبح و شام

اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں ہر وقت بارہ اُبھرن، سولہ سنگھار کئے ہر راہ پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر وسناں برساتی اور اسے دعوتِ حُسن پرستی دیتی ہیں۔ کیا انھیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے، ناتجربہ کار، جوانی کے نشے میں سرشار، سود وزیاں سے بے پروا نونہالان قوم اپنے جذبات وخیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حُسن زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر ان کے دل میں گناہ کی پُراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا ....؟''

اسی موقع پر ایک رُکن بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے اور اعداد و شمار سے شغف رکھتے تھے بول اٹھے :۔ ''صاحبان! واضح رہے امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبا کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔

ایک رُکن نے جو چشمہ لگائے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیر اعزازی تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''حضرات! ہمارے شہر سے روبروز غیرت، شرافت، مردانگی نکوکاری پرہیزگاری، اٹھتی جارہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی نامردی، بزدلی، بدمعاشی، چوری اور جال سازی کا دور دورا ہوتا جارہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل وغارت، خودکشی اور دیوالہ نکالنے والی وارداتیں بڑھتی جارہی ہے۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیوں کہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش وخرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کے بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقے سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی وکوشش میں جامۂ انسانیت سے باہر ہو جاتے ہیں اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جانِ عزیزی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں ے پڑے سڑتے رہتے ہیں۔''

ایک پینشن یافتہ معمّر رُکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دُنیا کا سرد گرم دیکھ

چکے تھے اور اب کش مکش حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل وعیال کو اپنے سایے میں پنپتا ہوا دیکھنے کی متمنی تھے ،تقریر کرنے اُٹھے ۔ان کی آواز لرزتی ہوئی اور لہجہ فریاد کا انداز لیے ہوئے تھا۔ بولے:

''صاحبان ! رات بھر ان لوگوں کی طبلے کی تھاپ' ان کی گلے بازیاں' ان کے عشاق کی دھینگا مشتی ، گالی گلوچ ، شوروغل ، ہاہاہا، ہو ہو ہوُسن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفا کے کان پک گئے ہیں ۔ضیق میں جان آ گئی ہے ۔رات کی نیند حرام ہیں تو دن کا چین مفقود ۔علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو بُرا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحب اولاد خود کرسکتا ہے......''

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے ۔ سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیوں کہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازارِ حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رُکنِ بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علم بردار تھے اور آثارِ قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے ' تقریر کرتے ہوئے کہا:

''حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں جب وہ اس بازار سے گزرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجیے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔''

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اُٹھے ۔گو قد ٹھگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے لہجہ میں حد درجہ متانت تھی ۔بولے۔'' حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب وتمدن کے لئے باعثِ صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے ۔اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے۔''

ایک صاحب بول اٹھے۔ ''یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔''

اس پر ایک طویل قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یک بارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحب صدر بولے۔ حضرات! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جا چکی ہے۔ اس لئے ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انھیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے' اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ جو محض ان کی دولت کے لئے ان سے شادی کرنے پر آمدہ ہوں گے' یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔''

اس پر ایک صاحب بولے۔ ''بلدیہ کو ان نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں' مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔''

صدر نے کہا۔ ''صاحبان یہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں سیکڑوں پر پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات بھی ہیں۔''

یہ مسئلہ کوئی مہینہ بھر تک بلدیہ کے زیر بحث رہا اور بالا۔ آخر تمام ارکان کے اتفاقِ رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہئے اور ان کو رہنے کے لئے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں۔ مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گراہک پیدا کیے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے مکانوں ہی میں رہنے کی اجازت دی گئی تاکہ اس عرصہ میں وہ نئے علاقے میں مکان بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی

سڑک جاتی تھی۔ اور اس کے آگے کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہوگی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے الو بولتے تھے۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر کسی کا فاصلہ یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے۔ یا یوں ہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روزِ روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزاد رہنے پر مجبور تھیں۔

اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سر پرستی کے بھروسہ پر بادلِ ناخواستہ اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی، یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی۔ یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ دیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی مالدار تھیں۔ اس شہر میں جوان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انھیں اچھے مل گئے تھے اور اس علاقے میں زمین کی قیمت برائے نام تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں ہٹ کر تھی منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے گئے چابک دست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گاڈر اور دوسرا عماراتی سامان لاریوں چھکڑوں، گدھوں، اور انسانوں پر لاد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انھیں

گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ تعمیر عمارت میں معماروں کو کام کے متعلق ہدایت دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے، مزدور اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے او راپنے ساتھ کام کرنے کے لئے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر ستانے کی غرض سے کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اسی کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ اور ثواب کا کام تھا اس کے لئے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہوگئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو راج مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی، اس بستی کی خبر سن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خوردسال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ، بیڑی، چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔

بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنوئیں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا۔ پیسے کے دو دو شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا گھر سے سری پائے پکا' دیگچی میں رکھ' خوانچہ میں لگا' تھوڑی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کر آ موجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میرِ عمارت' معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں کے ایک ملاّ کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنج سورہ رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ کر آموجود ہوا اور اس مسجد میں کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آجاتا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولہا بنا: کباب کلیجی دل اور گردے سیخوں پر چڑھا بستی والو کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھوس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسوت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا اِدھر اُدھر گشت کرتا دیکھنے میں آجاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار اور کارندے تو کرتے ہی تھے۔ کسی کسی دن دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آجاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آجاتیں۔ اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے شور مچاتی رہتیں اور انھیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش بیکار مباش کچھ کیا کر کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سُن گن لینے آجاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتی تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے گرداگرد چکّر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے' بے تکے قہقہے لگاتے' عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے، ہو کا عالم تھا ' اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔شروع شروع اس علاقے کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو یہاں آکر رہنے کے خیال سے جو دہشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہتی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تیار ہو چکے تو ایک دن بستی کے راج مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اٹھ رہا ہے اور سُرخ سُرخ آنکھوں والا لمبا' تڑ نگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چار ابرد کا صفایا کرائے اس مزار کے اردگرد پھر رہا ہے اور کنکر پتھر اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔دو پہر کو وہ فقیر ایک گھڑا لیکر کنویں پر آیا اور پانی بھر بھر کر مزار پہ لے جانے لگا ایک دفع جو آیا تو کنویں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں کہنے لگا۔''جانتے ہو یہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا۔ میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے____ ''اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کے پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامات بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیئے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کے سرہانے اور پائتی چراغ روشن کر دیے۔رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے 'اللہ ہُو' کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب ایک ہی وضع کے تھے سات ایک طرف اور سات دوسری طرف بیچ میں چوڑی سڑک تھی اور ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں۔مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔اس کے آگے بیٹھنے کے لئے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھیں جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگ مرمر کے مور قص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے

جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرا بیٹھنے کے لیے تھا اس میں سنگ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے دیواروں پر خوش نما پچی کاری گئی تھی۔فرش سبز چمک دار پتھر کا بنایا گیا تھا۔جب سنگِ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبودی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سبھی بیسواؤں نے مل کر بھاری نیاز دلوائی۔بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کر کے شامیانے نصب کردئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبوئیں بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جانا تھا اس قدر فقیر جمع ہو گئے کے عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوئے ہونگے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کرادیا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔گاؤ تکیے لگا دیے گئے تھے۔پان دان' پیک دان' پیچوان اور گلاب پاش رکھ دئے گئے۔اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں ان کیساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کیلئے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں۔بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے زربفت اور کم خواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے اِدھر اُدھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس' غازوں اور خوشبوؤں سے بسی ہوئی نازنینیں اٹھکیلیوں سے چلتیں' رات بھر رقص و سرور کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں سازوسامان کی فراہمی اور

مکانوں کی آرائش میں مصروف ہوگئیں جھاڑ ، فانوس ،ظروف بلوری ، قدِ آدم آئینے' نواڑی پلنگ' تصویریں اور قطعات سُنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے ۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصّہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے غزلیں یاد کرنے' دُھنیں بٹھانے' سبق پڑھنے' تختی لکھنے' سینے پیرونے' کاڑھنے' گراموں فون سننے' استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے' ضلع جگت' نوک جھوک سے جی بہلانے یا سونے میں گزارتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال کر ٹپ بھر رکھے ہوتے ۔اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا ۔ یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اُٹھتے جو جا بجا سنگِ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے اور مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتّیوں کی وضع کے کاٹ کر جوڑے گئے تھے ۔ ان کی قوس قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھِل مِل جھِل مِل نہایت بھلی معلوم ہوتیں یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کیے برآمدوں میں ٹہلتیں آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں' ہنستیں کھلکھلاتیں ۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر لگے گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں ۔ ان کے سازندیں ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیہ کترتی رہتیں ۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان کے ملنے والے نوکروں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لئے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے ۔اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی ۔ نغمہ و سرود' ساز کے سُر رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگھروؤں کی آواز قلقل مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا کہ رات کب بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے دو کانوں کے کرایہ دار پیدا

ہونے شروع ہو گئے ۔ جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکاندار آیا وہی بڑھیا تھی جس نے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دُکان کو پُر کرنے کے لئے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگرٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لایا اور انھیں منبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھروا دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دُکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کرلئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دوکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگریٹ تین تین چار چار پیکٹوں' بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں' دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں' پانوں کی ایک ڈھولی' پینے کے تمباکوں کی تین چار ٹکیوں اور موم بتّی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں کنجڑے آبسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں، چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی 'ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار' گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انھیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا۔ اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دُھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ جاتا تو اسے اپنے ہی گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے۔ سینے کی ایک

مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اسی کے دکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے لہریاں دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا شہر کو خیر باد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کو سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی ٹٹ پونجیا دکان دار، کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھتے ہوئے کرایوں سے گھبرا کر اس بستی میں پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کس قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اُٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرائے پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں ُشربت کی بوتلوں اور مربے چٹنی اچار کے مرتبانوں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طب اکبر قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جمع کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انھوں نے اپنے خاص الخاص مجرّبات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دئے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آ موجود ہوتے اور شربت بزوری' شربت بنفشہ، شربت انار، اور ایسے ہی فرحت بخش، روح افزا شربت و عرق' خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربّے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں

ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دوکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دوکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں ستار، طنبورے، دل ربا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکان دار آجاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے تھے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دوکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملا جی جب تک یہ بستی زیر تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جب کہ انھیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے ملا جی کو روپیہ پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھتے ہوئے کرائے اور اپنی بے مائیگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہیں ملی تو اس نے اسی بستی کا رُخ کیا اور بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلے پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دئے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے۔ جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ

کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت و مشقت کی کسر شوروغل، خر مستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے راہ چلتوں پر آوازیں کستے، گالی گلوچ کرتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تمبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولھا ہلاتا تھا، کبھی منھ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا۔ عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنھیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہہ لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہو گئے۔ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے۔ "آؤ کوئی نئی بستی کو" شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کی لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتیں، منہ سے ہارن بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا بُرا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم داموں میں سواریاں بٹھا طرارے بھرتے اور گھنگھرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق در جوق اس پُر اسرار بازار کی سیر کرنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انھیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے کو تیار نہ ہوتی تھیں، اب اس کی یہ دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمین خرید کر ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے

بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں پر زمینیں خرید خرید کر چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے ۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھی مورو ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لئے درخواست بھیجی گئی تھی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ کھول دیا گیا ۔ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے' کارڈ اور قلم دوات رکھ' بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفع بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر کی بوتلیں' چاقوؤں' اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی۔ اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تا کہ تماشائی اگر بائسکوپ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ یوں ہی ستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ آ کے بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصا سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ کٹورا بجاتے بھشتی اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کے تیل کی مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے کاندھے پر میلہ کچیلا تولیہ ڈالے' دل پسند' دل بہار مالش کی صدا لگاتے دردِ سر کے مریضوں کو اپنی

خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دو کانیں بھی بنوائیں۔ ایک مکان میں ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لئے کمرے بھی مل سکتے تھے۔ اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا' ایک فوٹو گرافر' ایک سائکل مرمت والا' ایک لانڈری والا' دو پنواڑی' ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دوا خانے کہ آرہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی میں ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹو گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پُرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل' روشنی کے باقاعدے انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے' سرخ جھنڈیاں' جریبیں اور راونچ نیچ دیکھنے والے آلے کر آپہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔

اس واقع کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا ہوا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ایک ریلوے اسٹیشن ہے اور ٹاؤن ہال بھی' کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لئے ایک لڑکیوں کے لئے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔

شہر سے دو روزانہ' تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل وجرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی' دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی' ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصّوں میں دو مسجدیں' پندرہ مندر اور دھرم شالہ' چھ یتیم خانے پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن جن میں ایک صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے' حسن آباد' کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں

اسے مناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی ۔یعنی بجائے' حسن آباد' کہلانے لگا مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حُسن اور حَسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سیکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے۔ ''آنندی''

یوں تو سارا شہر بھرا پرُا صاف ستُھرا اور خوش نما ہے۔مگر سب سے خوبصورت' سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہے ہیں۔ آنندی کے بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے۔ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کیا جائے۔کیونکہ ان کا وجود انسانیت' شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں۔ ''معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیر اثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دے دی گئی ۔ اس مرتبہ ان عورتوں کے رہنے کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

☆☆

علی عباس حسینی

میلہ گھومنی

کانوں کی سنی نہیں کہتا ،آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں، کسی بدیسی واقعہ کا بیان نہیں، اپنے ہی دیس کی داستان ہے گاؤں گھر کی بات ہے۔جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر جی چاہے رکھیے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سننا۔

دو بھائی تھے۔چنو منو نام کہلاتے تھے پٹھان مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھا اور ددیہال ، سیدواڑے میں۔ ماں پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آئی تھی۔ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لیے اور نتیجے میں ہاتھ آئے چنو منو۔ وہ تو یادگار چھوڑ کر جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے انہوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنو منو کی پرورش کے لئے کچھ روپے دیے۔ وہ دونوں پلے بڑھے، اچھے ہاتھ پاؤں نکالے، چنو ذرا سنجیدہ تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور ہم سن میر صاحبان کا مصاحب بنا۔منو لا ابالی تھا۔اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا اور نام کے لئے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سَر کرنے لگے۔شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کے کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔انہوں نے چنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر باندھ دیا لیکن منو چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی چمار ٹولی، جولاہے ٹولی، ہر سمت اور ہر

محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انہوں نے عاجز آ کر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا ، وہ جب گھونگھٹ لگائے لجاتی ، سہمتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آ کر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی۔ اور کہا اس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔''

اس نے آہستہ سے کہا۔

''تو میں کیا کر سکتی ہوں، آپ ہی چنو کی طرح اسے کسی ناند سے لگا دیجیے،،

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قوم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی، وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انہی دنوں درزی کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نا معلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیّدانی نے شکل صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹکی بھی ہے۔ سیّدانی ان درزی کی حرکات سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی، اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیّدانی بی کے رئیسانہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا۔

''اچھا گھر میں رہو اور کام کرو۔ دو چار دن میں تمہارے لئے کوئی بندوبست کروں گی۔

''ادھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نو وارد کی خبر دی۔ ایک صاحب نے جو ذرا ظریف بھی تھے، اس کی تاریخ یوں بیان کی۔

''روایانِ صادق کا قول ہے کہ اصل کی بنجارن ہے، وہ بنجارن سے ٹھکرائن سے پٹھانی سے کبڑن، کبڑن سے درزن، اور اب درزن سے سیّدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔''

ایک صاحب نے پوچھا ''اور اس کے بعد؟''

وہ دونوں شانے اٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے'' خدا ہی جانے شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔'' میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ جز بز ہوئے، اس سیرت کی عورت اور شرفاء کے گھر میں؟ وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلہ میں سامنے آئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی، اگر انکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں۔ تو اسے معصیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں بار دیتے ہیں تو گھر میں ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔ کہیں چنو منو کی نسل اور نہ بڑھے، ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے، پھر منو کی ماں کو بلوا کر انہوں نے نادر شاہی حکم دے دیا کہ ہم نے منو کی نسبت طے کر دی ہے، اس سے کہہ دو کل اس کا عقد ہو گا۔

بے چاری جولاہن کو چوں وچراں کی مجال نہ تھی۔ وہ بہت اچھا کہہ کے ہونے والی بہو پہ نظر ڈالنے چلی گئی، وہ بھی رشتہ سے بالکل بے خبر تھی، اس لئے کھل کے باتیں ہوئیں، جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی، لیکن جانتی تھی، میر صاحب کی خوشنودی اس میں ہے اختلاف کا یارا نہیں، رہنے کا ٹھکانہ انہی کا دیا ہے چنو کی نوکری انہی کی عطا کردہ ہے، اور منو کی جوت میں کھیت بھی انہی کے ہیں، پھر لالچ بھی تھا۔ اپنی خوشی سے شادی کریں گے تو سارا خرچ بھی خود ہی اٹھائیں گے غرض گھر آئی اور اس نے رات کو منو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا۔ جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے، منو کو نئی دھوتی نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا، دلہن کو شاہانہ جوڑا اور چند چاندی کے زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا پھر میر صاحب اور ان بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منو کی ماں کو دیئے اور دلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

دن بیتتے گئے ۔ دن بیتتے گئے ، مہینے ہوئے ، ایک سال ہونے کو آیا مگر منو اور اس دلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی جھٹکے سے اچھے ہو گئے ۔ کہ دفعتاً ایک دن بی جولاہن روتی بسورتی پہنچیں ، معلوم ہوا منو نے مارا ہے پوچھ گچھ سے پتا چلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہے اور جس طرح وہ نشہ بیوی پر اتارتا ہے ۔ اسی طرح غصہ ماں پر کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھری میں بے آب و دانہ بند رکھا ، اب چھوٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے ۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک سے شاید بری عادت نہ پڑنے پاتی ۔ جولاہن سوائے ماماتا کے اور کیا جواب دے سکتی تھی انہوں نے حکم دے دیا آج سے یہیں رہو گھر جانے کی ضرورت نہیں ۔

مگر میر صاحب کو منو کی فکر ہو گئی ۔ خون گندی نالی میں بہہ کر تہہ تو بدل جاتا ہے ورنہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے ، اس لئے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی ۔ تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا ادھڑ جائے گا ۔ ساتھ ہی پاس کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ اب اگر منو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا ۔ غرض منو کی پوری طور پر بندش کر دی گئی ۔ اور تاڑی بند ہو گئی ۔ نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا ۔

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی ۔ اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا ۔ بالکل زرد سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار ہوا ۔ جب میر صاحب کو خبر ملی ۔ کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں ۔ اور منو کی بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دئے تو انہوں نے بی جلاہن کو کچھ روپے دے کر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو نگرانی کی تاکید کی ۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گزری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھٹکتی ہے ۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی ۔ ساس بھلا کس سے کم تھیں ۔ انہوں نے کلہ بہ کلہ جواب دینا شروع کر دیا ایک دن تو نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی جوانی اور

بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہوگئی۔ منو پلنگ سے جھپٹ کر اٹھا۔ اور لڑکھڑاتا ہوا اماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر وہ لات ماری کہ وہ ہائے کر کروہی ڈھیر ہو گیا۔ دونوں لڑنا بھولکر اس کی تیمارداری میں مشغول رہیں۔ لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر قبر میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا، بین ہونے لگے اور ساس بہو میں اسی پر مقابلہ اٹھتا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے پانچ روز تو اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آکر سمجھانا پڑا لیکن آہستہ آہستہ سیلابِ غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتہ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتاً چنو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی، بی جولاہن کے چار چھوٹے پوتا پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منو کی بیوہ کو عدّت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔ ایسے ہی موقع سے چنو غم بھلانے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس آبیٹھا، خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا، دردِ دل بیان ہوئے تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کو دور کرنے کے ذرائع پر ذکر ہوا بالآخر ایک شبِ امتحان قرار پائی۔ جب اس کی صبح سرخروئی سے ہوئی تو چنو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنادے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے انہوں نے امتحان اور اس کے نتیجہ سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرمادیا۔ بڑی بی دیر تک ایک وکیل کی طرح بحثتی رہیں۔ پر مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں۔ چل رے گھر چل۔ مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا وہ اب تیری بیوی ہے میں خوش میرا خدا خوش، چنو نے ماں کا کہنا کیا، مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دیا۔ اور اپنے چاروں بچوں سمیت اس گھر میں منتقل ہو آیا۔ ایک مہینہ بیتا، دو بیتے، تین مہینے بیتے، مگر چوتھے مہینے چنو کی کمر میں چک آ گئی، اکڑنا، بررنا، تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ ذرا جھک کے چلنے لگا ہم سن میر صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے، ان

کو دکھایا انہوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دن اور چلا بد قسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس چنو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا۔ مگر افیون کی خشکی نے دبوچا اور بی چپیا بیگم مانگتی ہیں دودھ، مکھن، گھی، ملائی اور یہ چیزیں چار روپے کی کمائی میں کہاں نصیب وہ لاکھ پیسے نکال کے ہاتھ پھیلانے اور مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا بھاویں نہ سماتا اور افیون کی لت پڑ چکی تھی، وہ چھوٹتی نہیں اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور چنو خان کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی، اولے پڑنے والے تھے، کہ چنو اختلاج شروع ہو گیا ڈیوڑھی پر کسی کے سلسلہ میں حاضر تھا ڈلیا برتن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا کہ اسی کے سر پر بجلی گری وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ سنبھل کر اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑ رہا تھا۔ بے ساختہ ارے ماں ارے ماں چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ سجائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا۔ مگر پاؤں پہیے کی طرح لڑھک رہے تھے گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کے دوسرا کڑاکا ہوا وہ ٹھوکر کھاتا سنبھلتا پھسلتا لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بحری کے نیچے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بھد سے گر پڑا اور اسی طرح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔

بیوی ''ارے کیا ہو گیا لوگو''! کہتی ہوئی دوڑی۔ چنو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہاں۔

''اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟'' اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ چنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کمبھ کا میلہ گھومنے الٰہ آباد چلی گئی۔

☆☆

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

زبانِ بے زبانی

میں برگد کا ایک عمر رسیدہ درخت ہوں، غیر فانی اور ابدی!

نہ جانے کتنی مدت سے میں تن تنہا اور خاموش کھڑا ہوں ۔ برقرار اور بے قرار! بے زبان اور نغمہ زن۔ یاد نہیں کتنی مرتبہ کڑکتی سردیوں میں اپنی بے برگ شاخوں سے کوہاسہ کی چادر کو ہٹا کر میں نے فریاد کی ہے، نہ معلوم کتنی مرتبہ آتشیں گرمیوں میں اپنی پیاسی اور حسرت بھری لاتعداد آنکھیں میں نے آسمان کی طرف اٹھائی ہیں۔ نہ معلوم کتنی مرتبہ موسمِ گل میں عطر بیز نسیم بہار نے میرے بے حس جسم میں سنسنی ڈال دی ہیں۔ لیکن کچھ دنوں سے لاغر اندام ہو رہا ہوں۔ میرے چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ جسمانی تاثرات سے میں بے پروا ہو گیا ہوں۔ میری پتیاں گر گئی ہیں۔ سردیاں اور گرمیاں دونوں میرے لئے یکساں ہیں۔ لیکن بہار! اس کے تصور میں ہی ایک ایسا جادو ہے، اس کے تخیل میں ہی ایک ایسی کشش ہے کے میری ان بے حرکت رگوں میں نئ زندگی کی بجلی دوڑنے لگتی ہے اور ساتھ ساتھ ایک اندوہگیں پشیمانی خُون کی ایک ایک بوند میں گھر کر لیتی ہے۔ بہار! یہ لفظ کتنا سوگوار ہے اور کتنا جان سپار، جب حدِ نظر تک راتوں رات لاتعداد کنول کھل جاتے تھے

اور میں اپنے آپ کو پھولوں کے ایک ناپید اکنار سمندر میں کھڑا پاتا تھا تو یہ محسوس ہونے لگتا کہ جہان رنگ و بو میں سورج نئ شان کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اس نشان کے ساتھ کہ اس میں تپش نہیں صرف چاند کی حلاوت رہ گئی ہے۔ پیمانہ دل مسّرت اور احسان سے چھلکنے لگتا تھا لیکن اس احسان میں اطمینان نہ ہوتا تھا۔ وہ مسرت اس روحانی سوز کو دبا نہ سکتی تھی جو تمناؤں کے ساز پر ہمیشہ درد کے ترانے الاپا کرتا ہے۔ حُسن جمال کی اس جولانگاہ میں بڑھا پا اپنی دزدیدہ نگاہ ہیں ڈال کر

یکا یک مسکرا دیتا تھا اور میرے سکون واطمیناں کو ایک کھٹک اڑا لے جاتی تھی۔

تخلیل تمناؤں کے آغوشش میں پروان چڑھتا ہے۔ جب بڑھاپے کا خیال مجھے بھی بے چین کرتا تو میں ایک جہانِ نو کی بنا ڈالتا ___ ایسا جہان جس میں برگد کی شاخوں میں بھی پھول لگتے ہیں۔ رنگارنگ کے پھول، جن سے ٹہنیاں دلہن بن جائیں ایک شاخ میں یاسمیں دوسری میں گلاب تیسری میں صنوبر ___ پستی سے لے کر بلندی تک میں گلاب بداماں ہوتا! آہ وہ تصور کتنا روح پرور تھا۔؟ لیکن عہد کہن کی ان داستانوں میں کیا رکھا ہے۔ اب میں بوڑھا ہو رہا ہوں اور یہ امر بیل ___ لامحد اور لازوال ___ مچلتی اور لچکتی ہوئی یہ "امر بیل" اب مجھ پر محیط ہو چکی ہے۔ میں عظیم الشان اور پُر وقار ہوں لیکن میری عظمت اور شوکت نے ہی مجھے اس چنچل "انیلی بیل" کے آگے بے بس کر دیا ہے۔ ایک دن یہ ننھی اور حقیر بیل میرے قدموں سے لپٹی رہتی تھی لیکن آج اس نے میری جسم کو زنجیروں سے کس دیا ہے اور میری مغرور گردن کو خم کرنا چاہتی ہے۔

اس کی گرفت کتنی جانکاہ ہے ___ کتنی روح فرسا اور نا کام! تمنا کی طرح لا دوا اور فراق کی طرح یاس انگیز، جو میرے ناتوان جسم کو پیس کر اس کی تازگی اور شگفتگی سلب کر لینا چاہتی ہے اور میں ___ حرماں نصیب اور بدبخت "میں" ___ ماضی کی یاد میں اشکبار" اور مستقبل سے خوف زدہ میں" ___ اس بے حقیقت بیل کی خواہش کے آگے مائل بہ خود سپردگی نظر آتا ہوں۔

تاہم گاہے گاہے محسوس ہوتا ہے کہ اس بیل میں کوئی مقناطیسی کشش ہے۔ جس طرح کسی با کمال، مطرب کے رباب جھنکار رختہ اور مُردہ رگوں کا زندہ کر دیتی ہے، جس طرح موت کی ہچکیاں بھرتے ہوئے بھی سرما بہار کی رنگینیوں سے دوچار ہو کر دم بھر کے لئے جوان ہو جاتا ہے، جس طرح کسی رہزن عقل و ہوش کے شانوں پر سر رکھ کر زاہد خود فریب کی پسلیاں پھڑکنے لگتی ہیں ___ ہاں اسی طرح میرے تمام جسم میں، میری ٹہنیوں میں اور میری پتیوں میں، دل کی ایک ایک دھڑکن اور نبض کی ایک ایک چپک میں اس کا مس ایک دلنواز بے دلی اور ایک دھندلی سی تمنا پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت دفعتاً میں سوچنے لگتا ہوں کہ میری ٹہنیوں میں اتنی ہی لچک ہوتی جتنی

اس ''امر بیل'' میں ہے تو میں اس کی گرفت کو اور بھی مضبوط کر دیتا اور اس کے بوسہ کو پوری زندگی کی درازی عطا کرتا۔ لیکن الٰہی! تو نے مجھے ایسا کیوں بنایا کہ میں محبت حاصل کر سکتا ہوں واپس نہیں کر سکتا دامِ عشق میں گرفتار ہو سکتا ہوں گرفتار نہیں کر سکتا۔ پربت کے گیت سمجھ سکتا ہوں' گا نہیں سکتا۔ جب بادۂ عشق میں سرشار ہو کر جذباتِ دل کو عالم آشکار کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو یکا یک مجھے اپنی بے حسی کا احساس ہونے لگتا ہے اور ارمانوں کے ہجوم پر جیسے اوس پڑ جاتی ہے میری بے تابی کا صرف ایک ثبوت ہے۔

پتیوں کی خاموش جنبش ان کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ سوز نہانے کی سرگم ہے۔ اُف اتنا تندو توانا ہو کر بھی ایک شرمیلی بیل کے آگے میں کتنا مجبور ہوں۔

بہار، نسیم، گل و بلبل، آہ و زاری ____ رنگین خوابوں کا ایک میلہ! لیکن زندگی کی ایک پت جھڑ میں بہار کی ان محفلوں کو میں کیوں یاد کرتا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میری دنیا ان سے محروم ہو چکی۔ اب میں ایک دوسری دنیا میں رہتا ہوں غنچے نہیں چٹکتے، جہاں ارمانوں اور حسرتوں کے سوا کچھ نہیں وہ بھی ایسے کہ ان میں کیف اور سرور نہیں غم و غصہ کی جھلک رہ گئی ہے۔ اب بھی میرے اردگرد بہار میں زمین گل فروش بن جاتی ہے اور ذرہ ذرہ فرطِ انبساط میں متوالا ہو جاتا ہے۔ میرا دل بھی بھر آتا ہے لیکن اس میں محبت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ دریائے حسن کے بیچ و بیچ کھڑا ہو کر بھی میں ایک لگاؤ محسوس کرتا ہوں گویا ستاروں سے مصروف گفتگو ہوں۔ جس محفل سے میں اٹھ آیا اس میں شمول کی آرزو نہیں کرتا۔ میری تمام تر توجہات ایک دوسرے ہی جہان کی تعمیر کے لئے وقف ہوتی ہے جس کا تخلیل میرے ناسوروں کو پر چا تا رہتا ہے ____ یہ بیل فنا پر ہادی اور ابد و بقا کی ندیم ہیں۔ جب میں زمین کے دجامن میں لیٹ جاؤں گا تو شاید میرے جسم سے لپٹی رہے گی اور اس کی باقی ماندہ طاقت کو چوستی رہے گی۔ ایک وہ دن تھا جب اس کا بیج ابھرا تھا اور میں جوان تھا۔ میرے سڈول جسم میں مسرت کی امنگیں موجزن تھیں اور او رروح کا ایک ایک تار فطرت کے رباب کے ساتھ غزل خواں تھا۔ میری وسیع جڑوں کے وسط میں اس کے ننھے سے بیج سے سر نکلا۔ اس کی زرو کو

نپلوں نے سہارے کی التجا کی اور مایوس ونا کام مرجھانے لگیں۔ ہاں، اس وقت سے گلے لگا کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ ایسی جیسے بچے کو گود میں لے کر باپ کو ہوتی ہے۔ ایک عرصہ تک اس کی بانہیں دل میں یہی جزبہ پیدا کرتی رہیں۔ لیکن چشم بددور، رفتہ رفتہ وہ ایک سانچے میں ڈھلنے لگی اور اب اس چھونے کے بعد معصومیت اور شفقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس میں ایک ایسا عجیب بانکپن پیدا ہو گیا جو میری آزادی پھندے ڈالنے لگا۔ جب کچھ سوچنا چاہتا تو اسی کی یاد آتی گویہ اس یاد میں بھی حیا تھی، تمنا بھی، غرض کے ساتھ اس پر مر مٹنے کی آرزوں بھی، پیاس کے ساتھ سکون تھا اور لاگ کے ساتھ ایک لگاؤ۔ آج جس جذبہ کی گہرائیوں تک میں پہنچ چکا ہوں۔ ان دونوں اس کی سطح کو بھی نہ دیکھ سکا تھا اس انقلاب پر میں ہمیشہ تصویرِ حیرت بنا رہتا اور یہ حیرت بھی مسرت، نفرت، تمناو اطمینان سے لبریز تھی۔

میرے قدموں پر ایک چھوٹا سا پتھر پڑا ہوا تھا جس پر گاؤں کی عورتیں اکثر سیندور اور چندن ملا کرتیں۔ کبھی یہ بھی ہوتا کی ان کی نازک انگلیاں مجھ پر سندور کھینچ دیتیں۔ یہ بھی دیکھا کہ کوئی شیزہ بڑی سادگی سے میرے سنگین جسم کو اپنے بازؤں میں لپیٹ لیتی، نرم ہونٹوں سے میرے آہنی تنے کو بوسہ دیتی اور اس سنگ جبیں کو آنسوؤں سے نہلا کر چلی جاتی تھی۔ شاید اس سے اس کے قلب حزیں کو کچھ قرار ہوتا تھا۔

دنیا بھی ایک درخت ہے جیسے حسینانِ عالم اس بیل کی صورت دامِ بلا میں گرفتار کیے ہوئے ہیں لیکن مجھ پر اس کے نازو نیاز کا کوئی مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ ہاں جب کوئی بدبخت میرے دامن کو تھام کر آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آوازیں کہتی۔ ''دیوتا میری مراد کب آئے گی۔'' تو میں پسیج جاتا اور اپنے پتوں کو ہلا کر کچھ کہنا چاہتا لیکن خبر نہیں کہ وہ میرے اشاروں کو سمجھتی تھی یا نہیں۔ میں سوچتا رہ جاتا کہ کاش بے گل وثمر برگد نہ ہو کر میں پھولوں کا ایک پودا ہوتا تو کم از کم اپنی ہمدردی کا اظہار تو کر سکتا۔ جب حسن کی وہ مورت مجھے چھوتی تو مرجھائے ہوئے پھول پھر کھل جاتے۔ اور اس کے قدموں میں اشکبار برس کر گویا میرا پیغام پہنچا دیتے ____ لیکن دل ہی دل میں یہ منصوبہ

باندھتا رہ جاتا اور وہ چلی جاتی۔

تاہم، ان کی قرابت میرے جسم میں تھرتھری پیدا نہ کرسکتی تھی۔ میں از سرتاپا کانپنے نہ لگتا تھا۔ لیکن جب کبھی کوئی دوشیزہ میری نازک اندام بے زبان بیل کی کونپلوں کو توڑ کر مجھ پر بکھیر دیتی تو میرے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ لیکن جتنا غم و غصہ ہوتا اسے ظاہر نہ کرسکتا تھا۔ جنابِ باری سے دل ہی دل میں فریاد کرتا اس امید پر کے وہ روح کی آواز کو پہچانتا ہے۔ ''یارب اس عورت کو بھی اتنا ہی کرب والم نصیب ہو''۔ وہ بے چاری مجھے دیوتا مانکر پھولوں کی نذر چڑھاتی اور میں اسے بددعا دیتا۔ محبت کے نشے میں مدہوش ہوتا تھا۔ حتیٰ کے عقل وخرد سے بھی واسطہ نہ رہا تھا۔ کتنی عجیب و غریب تھی وہ محبت؟ کاشکہ میں جانتا ہوتا! کاشکہ میں جانتا ہوتا!

لیکن کیا میں سب کچھ سمجھنے کے باوجود میں اس دام میں گرفتار نہ ہوتا؟ گویا یہ بیل میرے جسم کے ایک ایک بند پر حاوی ہو چکی ہے تاہم اس کا میرے لئے کتنا ولولہ انگیز ہے۔ محبت آئینہ کی طرازی شفاف ہوتی ہے۔ ہر آدمی اس میں اپنا عکس رخ یکھتا ہے اور ایک بار یہ چور چور ہو جانے کے بعد یہ آئینہ کبھی ثابت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ متواتر کوشش کے بعد اس کے ٹکڑوں میں یکجائی ہو جائے لیکن وہ صفائی کہاں سے آئے گی؟ آئینہ میں ہمیشہ کے لئے بال پڑ جاتا ہے۔ عشق وار پروار سہتا ہے،

پیہم ناکامیوں کے بعد بھی اُف نہیں کرتا۔ لیکن وہ کمال درجہ خوددار اور غیور ہوتا ہے۔ صرف ایک جھڑکی اس کی شمع زندگی گل کرنے کے لئے کافی ہے۔ آج یہ بیل میری زندگی میں اتنا دخل حاصل کر چکی ہے لیکن اس کشش میں عشق کا جزو بھی نہیں۔ یہ بے کلی عشق کی پرتو نہیں بلکہ اس کی یادگار ہے اور بس۔

داستانِ محبت کی جب ورق گردانی کرتا ہوں تو دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے محبت سے جو امیدیں وابستہ تھی وہ سب تشنہ تکمیل رہیں اور اس کا سزوار میں ہرگز نہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ خدانے، مجھے اس ''امربیل'' سے اور مجھے دیوتا سمجھنے والی ان الھڑ نادانوں سے انصاف نہیں کیا

۔بے گناہ ہوتے ہوئے بھی ہم اپنے کسی حق سے، ایسا حق جو نا قابلِ بیان ہے، محروم کردئے گئے ہے۔ جب یہ خود فریبی چٹکیاں لینے لگتی ہے تو آرزو ہوتی ہے کہ کاش میں درخت نہ ہوتا انسان ہوتا، ایک دائرہ میں زندگی محدود نہ ہوتی، اپنی پرچھائی کو تاکتے تاکتے میں یوں بوڑھا نہ ہوجاتا۔ میری زندگی بھی رواں اور جوان ہوتی تاکہ محبت کا اظہار کرسکتا اور اس طرح بے زبان و بے قرار نہ ہوتا۔! لیکن کیا قلب انسانی میرے جذبات کا احساس نہیں کرسکتا؟ کیا انسان کی محبت اتنی مختلف ہے؟ کیا اس کی فریاد کوئی نے ہے؟ کیا اسکے نالوں میں کوئی نے ہے؟ کیا میرے جذبات کی ترجمانی کے لئے وہ گہری سانس کافی نہیں جو طوفان کی آمد کا پتہ دیتی ہے؟ کیا انسانوں کی دنیا بھی محبت کا پھول اندھیرے میں کھلتا اور مرجھاتا نہیں ہے؟ کیا ان میں بھی محبت کی انتہا یہ نہیں ہے کہ گفتگو کے لئے الفاظ کافی ہوں اور صرف سانسوں کا اُتار چڑھاؤ جہان معنی میں ارتعاش پیدا کرسکے؟ کیا ان میں بھی تمنا کے بعد پشیمانی اور فریاد کے بعد شرمساری پیدا نہیں ہوتی؟ ندی کی طرح انسان ہمیشہ گردش میں ہے اور ہم پہاڑ کی طرح اچل ہیں۔ لیکن ہم ان سے کہیں زیادہ عمر دراز اور مستقل ہیں۔ ہماری محبت کی مثال جگنو سے دی جاسکتی ہے جو تاعُمر اجلتا ہے اور بعد از مرگ بھی روشن رہتا ہے۔ ایک زمانہ گزرا ان دنوں مجھے اس ''امر بیل'' کی نازبرداری سے فرصت نہ تھی۔ اوّل اس کے بوسوں میں مجھے ایک لذت محسوس ہونے لگتی تھی اور اس نئے جذبہ کے اثرات معلوم کرنے میں میں اتنا محو تھا کہ گردو پیش سے قطعاً بے نیاز ہوگیا تھا۔ بھولے بھٹکے اپنے ماحول پر ایک آدھ نگاہ غلط انداز میں ڈال دیا کرتا تھا۔ میں جس واقعہ کا ذکر کررہا ہوں وہ روز پیش آتا تھا اور اس سے باخبر ہوتے ہوئے بھی میں بے خبر تھا۔ تاہم نادانستہ طور پر یہ حادثہ مجھ پر ایسا گہرا نقش چھوڑ گیا کہ اسے میں آج تک نہ بھول سکا۔

جو بت میری قدم بوسی کررہا تھا اس کی پوجا کے لئے صدہا عورتیں آتی تھیں۔ روز کوئی نہ کوئی پرانی پجارن غائب ہوجاتی اور اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی اور حسن کی دیوی آجاتی تھی۔ یہ نئی نویلی شرم کے بار سے دبی جاتی تھی۔ نرگسی آنکھیں زمین میں گڑی جاتی تھیں۔ اور رُخِ پُرنور تارِ

نقاب کے اندر بھی عرق ہو جاتا تھا____ مجھے بے جان سمجھ کر کبھی وہ میرے جسم کا سہارا لیتی اور کبھی اپنے ناخنوں سے میرے تنے کو کرید کرتی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکتا اور میں گہری سانس کھینچ کر خاموش ہو جاتا کہ مبادا وہ سہم نہ جائے۔ ایک لمحہ کے بعد نقاب ان کے رُخِ روشن کا پردہ دار بن جاتا پھولوں کے ہاران کے بیدار جذبات کو تھپکیاں دیتے اور چھاگل کے گھونگھروان پیروں کو چوم کر رقص کرنے لگتے تھے۔

ان مہوشوں میں سے ایک وطیرہ سب سے جدا تھا۔ نگاہیں سمیٹے سب چھپ کر وہ میرے پاس آتی اور سر جھکا کر فوراً چلی جاتی تھی____ اس خوف سے کے کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ زیبائش سے وہ اتنا ہی دور تھی جتنا کہ چاند۔ پسینہ کی اسکی جبیں پر کم کم ہوتا نہ پیروں میں چھاگل۔ اس کی سادگی سفید ساری سے یوں چھن چھن کر نکلتی تھی جیسے نبت البحر نے نہنگ آسا موجوں سے سر نکالا ہو یا دوشیزۂ صبح سفید بادلوں میں تیر رہی ہو۔ اس کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہیں تر تھا کبھی وہ صبح میں آتی اور کبھی دوپہر میں کبھی دونوں وقت ملے جب وہ شام کو آتی تو اسی ''امر بیل'' کو تھام کر میری گھنی چھاؤں میں بیٹھ جاتی جب تک سورج شب کے محل میں آرام کرنے نہ چلا جاتا وہ اپنی پُر حسرت نگاہوں سے اس منزلِ ناتمام کو دیکھا کرتی۔ لہرائی ہوئی پگڈنڈی کی خاک شفق کے پرتو سے لالہ گوں بن جاتی جیسے خونِ تمنا کی سرخی ابھر آئی ہوں۔

ماضی کی ناکامیوں کی آماجگاہ اور مستقبل امیدوں کا آئینہ ہے اور ماضی افسردگی کے قلم سے اس کے چہرہ پر ناکام آرزوؤں کے افسانے لکھا کرتا۔ جب اس کے سینے سے گہری سانسیں نکلتیں تو میرے پتے بھی ضبط نہ کر سکتے تھے اور اور پیہم چیخ اٹھتے تھے۔ کبھی اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور نہ اس نے کوئی دعا مانگی ہاں گاہے گاہے وہیں بیٹھ کر وہ کچھ گنگناتی ضرور تھی لیکن ان نغموں کو میں نہ سمجھ سکتا تھا۔

پہلے تو میری توجہ اس کے طرف منعطف ہی نہیں ہوئی لیکن شام کے سناٹے میں عموماً ادھر گزرنے لگی تو میری دلچسپی بھی رفتہ رفتہ بڑھ گئی۔ سورج کے ڈھلتے ہی میں اس کا بے تابی سے

انتظار کرنے لگتا اور اس کے آنے میں جتنی تاخیر ہوتی دل اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ خلاف معمول ایک روز وہ نہ آئی تو میں دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ دامن مغرب میں سورج نے منہ چھپالیا ۔لیلائے شب نے نقاب سے سر نکالا' ستاروں کے انجمن منعقد ہوئی ۔ چاند کی کرنوں نے اپنا ساز چھیڑا کہکشاں نے آسمان پر بجلیاں بکھیر دیں ــــــ پھر بھی وہ نہ آئی!

دو دن، تین دن، سینکڑوں دن ہزاروں دن آئے اور چلے گئے لیکن وہ نہ آئی یہاں تک کہ میں نے اس کے انتظار میں منہ موڑا اور اپنے منتشر جذبات کا مخزن اسی باوفا 'امربیل'' کو بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اسے بھول چکا تھا کہ ایک روز وہ آگئی ــــــ ایک ہیبت ناک خواب کی طرح وہ دن بھی مجھے یاد رہیگا۔ گھنگھور بادل چھائے ہوئے تھے غضب کی سردی تھی ۔ بادِتند کے جھونکے کھا کھا کر ''امربیل'' تھرتھرا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ اسے اپنے کس پہلو میں جگہ دوں ۔ یکا یک دیکھا کہ اسی خاک آلودہ راستہ پر وہ تیزی سے چلی آرہی ہے لیکن وہ بدل چکی تھی۔ وہ جمال جہاں آرا بوئے گل کی طرح غائب ہو چکا تھا۔ چہرہ پر اتنی جھریاں تھیں گویا عمر رفتہ نے اپنی آستینوں کو چنا ہو۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے ۔ جب میں نے دونوں تصویروں کا مقابلہ کیا تو دہشت سی ہونے لگی۔

الٰہی! حسن کو فنا ہے تو عشق کو لازوال کیوں بنایا؟ قریب آکر نہ اس نے ہاتھ باندھے نہ سر جھکایا اور نہ اس بیل کا سہارا لیا۔ ایک مرتبہ چاروں طرف دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ پڑی اور زور زور سے رونے لگی۔ آہ! میں اس کے گیت سننے کا آرزو مند تھا آنسوؤں کی زبان کیا سمجھتا سکتا۔ میں نے دیکھا کہ صرف ایک ساڑی باندھے ہوئے ہے جو جگہ جگہ سے شکستہ ہو چکی تھی۔ بال بکھرے بکھرے ہوئے پیر خون میں رنگے ہوئے ،جسم نازنیں خاک آلودہ۔ روتے روتے وہ کہنے لگی۔

''دیوتا! سب نے مجھے ٹھکرا دیا ۔ انسانوں کے رحم و کرم سے محروم ہو چکی ، میں نے وفائی کی ، احسان فراموشی کی ــــــ کس امید پر؟ محبت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی ۔ محبت؟ فریب، مکر، دھوکا! اس ظالم نے مجھے دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا۔ مہذب دنیا اب مجھے عصمت فروش

ہرجائی کے نام سے پکارتی ہے دیوتا! کیا تم مجھے اپنے دامنِ عاطفت میں جگہ دو گے۔ جانتے ہو، اپنے کاندھوں پر کیسے گناہ عظیم کا بار لئے آئی ہوں؟ میں ایک ایسے بچہ کی ماں ہوں جس کا باپ بننے کے لئے کوئی مرد تیار نہیں۔ دیوتا!

کیا تم میرے گناہوں کو درگزر کرو گے۔"

ان کی فریاد میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اپنی ہمدردی کا اظہار کس طرح کروں۔ کاش کہ شبنم کے کچھ قطرے ہی ٹپک پڑتے جن پر اسے میرے آنسوؤں کا گمان ہو جاتا۔

نقاہت کی وجہ سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی کئی گھنٹے گزر گئے اور وہ اسی حال میں پڑی رہی۔ بعدازاں اس کا جسم یکبارگی لرزا اور پھر اینٹھنے لگا۔ وہ خواب میں بڑبڑانے لگی۔ "کیا عورتوں کو بھی دراصل خدا ہی نے پیدا کیا تھا۔؟ اور اس بچہ کو؟ ___ اس بچہ کی پیدائش کا ذمہ دار کون ہے؟ خیر میں سہی لیکن میرے گناہوں کا خمیازہ وہ کیوں اٹھائے گا۔ خدا رحیم و کرم ہے۔ ___ شائد مردوں کے لئے لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے؟ ___ خدا، جنت، روح، دنیا، عاقبت، سب مردوں کے لئے۔ لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے ؟

___ آہ میرا بچہ! میرا بچہ !!"

آسماں پر ستاروں کو نیند آنے لگی۔ مشرق میں صرف ایک ستارہ جگمگا تارہ گیا نسیمِ صبح کی خشکی تیز تر ہو گئی۔ شب کی سیاہی اور بھی گہری ہو گئی۔ اسی عالم سکون میں یکا یک ایک روح فرسا چیخ اس کے سینہ سے نکلی اور وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنی پھٹی ساڑی کو تار تار کر ڈالا اور پھر گر پڑی۔ ایک ہچکی اور ایک چیخ ___ کتابِ زندگی کی یہ تفسیر تھی۔ وہ مر چکی تھی۔

جب سورج کی روشنی پھیلی تو میں نے دیکھا کہ وہ میرے سامنے برہنہ پڑی ہے۔ اس کا جسم زرد ہو گیا تھا، ناخن نیلے پڑ گئے تھے، بازو میں پھٹی ہوئی ساڑی پڑی تھی۔ جس پر ایک بچہ کی خون

آلودلاش رکھی ہوئی تھی ۔ برسات کے پانی میں یہ خون دور تک بہہ نکلا تھا اور آس پاس کی مٹی پر ایک سرخ تہہ پڑ گئی تھی ۔ جذبۂ محبت کی یہ مثال تھی جس کی حقیقت اور عظمت کے متعلق انسان عجیب و غریب باتیں کہا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو، ممکن ہے کہ محبت کے غلط مشاہدات نے میری تخیل کو بھی ناقص بنا دیا ہو۔ کیا یہ دو پایہ جو اپنے آپ کو انسان کہتا ہے اتنا شقی القلب اور سیاہ باطن ہو سکتا ہے؟ اس خیال سے میں اپنے آپ کو باز رکھنا چاہتا ہوں لیکن جب یاد کرتا ہوں کہ میری جڑیں ان دو بے گناہوں کے خون سے سینچی گئی ہیں جنہیں انسانیت نے محبت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا تھا تو میں حیوانیت کو اس پر فوقیت دیتا ہوں اور اپنی قسمت کو سراہتا ہوں کہ انسان نہ ہوا۔ وہ دونوں بے گناہ محبت پر قربان ہوئے یا سوسائٹی کے رواج پر یا مرد کی خواہشاتِ نفسانی پر، وہ عورت بے گناہ تھی ۔ وہ محبت کرنا چاہتی تھی لیکن اسے دھوکا ہوا۔ وہ مرد کی ناپاک ہوس رانی کی شکار ہوئی لیکن جب اس کی محبت پاک تھی تو اسے مجرم کیوں قرار دیا گیا؟ وہ خود نفس پرست نہ تھی ۔ اس ظالم سوسائٹی کو اس معصوم بچے نے کیا نقصان پہنچایا تھا؟

انسان دراصل کس سے محبت کرتا ہے ___ اپنی خودی سے یا معشوق سے؟ اپنے پسندیدہ جذبات اور توہمات کی مجسمہ صورت سے محبت کرتا ہے یا محبت پر اپنی خودی کو فنا کر دیتا ہے معلوم نہیں ! جو بھی، انسانیت کے دعوئ محبت کی حقیقت خون کی وہ بوندیں ہیں جن کی آڑ میں درندگی مسکرا رہی ہے۔

کبھی کبھی شام کو جب پرندے اپنے آشیانوں میں پر سمیٹ لیتے اور اندھیرے کے خوف سے فطرت ایک گہری سانس کھینچ کر خاموش ہو جاتی تو عالم تنہائی میں یکا یک مجھے محسوس ہوتا کہ میری زندگی ___ اتنی طوالانی زندگی یونہی برباد ہو رہی ہے ___ اس امر بیل کی گرفت میں عجیب لطیف درد پنہاں ہے۔ اے درد ہے میٹھا میٹھا، ایک ٹیس ہے دلنواز، اس احساس کو مٹانے کی میں لاکھ کوشش کرتا ہوں مگر بے سود بربادی کا یہ احساس، زندگی کی یہ تمنا کسی تصور پر مر مٹنے کی یہ آرزو کسی دوسرے خیال کو دل نشیں ہونے کی اجازت ہی نہیں دیتی ۔ میں چاہتا ہوں اپنی ہستی کو

قدرت کی لامحدودیت میں گم کردوں کبھی نہ سوچوں کہ زندگی لاحاصل اور بے معنی ہے، ایک ایک مرتبہ از سرِ نوشباب پرور اور تازہ دم ہو جاؤں۔ مگر کجا پیرانہ سال برگد کا ایک ''ٹھونٹھ'' اور کجا قدرت کا اٹل قانون! میں بولنا چاہتا ہوں لیکن زبان سے محروم ہوں، چلنا چاہتا ہوں پر پیر نہیں۔ آہ میں رونا چاہتا ہوں لیکن آنکھیں کہاں سے لاؤں۔ میں چاہتا ہوں کسی سے محبت کروں ایسی محبت جو ہمیشہ حیات تازہ بخشے اور کبھی نہ مرجھائے۔ لیکن میرا جمود مجھے تسلیم و نیاز سے روک لیتا ہے اور عشق کی بارگاہ پر جبیں رسائی کا موقع نہیں دیتا۔ یا تو میں اظہار محبت سے قاصر ہوں اور یا شرم لبوں پر مہرِ سکوت لگا دیتی ہے۔ لیکن وہ یاد واضح نہیں ہے۔ صرف ایک نقش ہے جو بھی ناکام آرزوؤں کی راکھ میں دبا ہوا۔ جس طرح کہر میں شمع روشن نظر نہیں آتی لیکن اس کی کرنوں میں جگمگاتی ہوئی شبنم کی بوندیں دکھلائی پڑتی ہیں۔ اسی طرح وہ یاد بذاتِ خود پس پردہ ہے اس کا ایک نقش باقی ہے۔ اتنا تو معلوم ہے کہ میری محبت کی ہمہ گیری اور وسعت سے ان کا تعلق ہے لیکن تعلق کیا تھا یاد نہیں آتا۔

ایک دوسرا واقعہ یاد آتا ہے جس نے کسی زمانہ میں میرے دل کی دنیا کو منور کر دیا تھا لیکن وہ روشنی گویا بجلی کی تھی جس نے میری آنکھوں کو ایک عرصہ کے لئے خیرہ کر دیا۔

میرے قریب ان دونوں لاشوں کے برآمد ہونے کے بعد شائد لوگ مجھ سے ڈر گئے تھے۔ اب نہ وہ بت شرمندۂ پرستش ہوتا اور نہ میرا چبوترا سجدہ گاہ قرار پاتا۔ بھولے بھٹکے اگر شام کو کوئی راہ گیر ادھر سے گزرتا تو سہمی ہوئی نظروں سے دائیں بائیں دیکھ کر میرے سایہ سے بچتے ہوئے تیزی سے نکل جاتا۔ دن میں کچھ گستاخ لڑکے دور کھڑے ہو کر میری طرف پھینکتا اور بھوت بھوت کا شور مچایا کرتے۔ ان کا مطلب میں صاف صاف تو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ان کے اطوار میں حقارت اور نفرت کے آثار دیکھ کر مجھے دلی صدمہ ہوتا تھا۔ کیا انسان کی عبادت ہی یا وہ ہوا سے جتنی اس کی محبت؟ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب میں ایک زمانہ کا سجدہ گاہ بنا ہوا تھا۔ میرا سنگِ آستاں اس گاؤں کا سنگِ جبیں بنا ہوا تھا۔ حسینانِ عالم بصد شوق میرے آگے سر جھکا کر اپنے دکھ درد کا مداوا مانگتے تھے۔ گویا میں ان سب لوگوں کا تنہا مشکل کشا تھا حالانکہ میں ان کے آلام کا سدِ باب نہ کر سکتا

تھا۔تاہم اپنی خاموش زبان سے میں ان کی غمگساری تو کرتا تھا۔میں بے حس اور بے زبان تھا لیکن اس سے میری توقیر پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔لیکن مقام حیرت ہے کے جیسے ہی اس دکھیاری نے میرے پاس آکر اپنی مصیبتوں کا خاتمہ کرلیا تو گویا میری ساری وقعت بھی اس کے خون میں ڈھل گئی۔کیاان تمناؤں اور دعاؤں میں صداقت کی ذرا بھی بو نہ تھی؟اس روز پتہ چلا کہ انسانیت کو اصل میں کون سا مرض لاحق ہوا گیا ہے لیکن اس احساس نے بھی مجھے نجس اور ناپاک بنادیا ہے جب میں درد کے احساس سے نابلد تھا تو کتنے مریض آتے تھے اب جب میں اس عالم گیر مرض کا علاج معلوم کر چکا ہوں تو کوئی میرے قریب بھی نہیں آتا اور اس طرح یہ احساس میرے لیے جان لیوا ہو گیا ہے !عبادت اور محبت میں کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ محبت ....روشنی ہے،عبادت تاریکی میں روشنی کی جستجو ہے۔محبت امید ہے،عبادت نا امیدی میں امید کی تلاش ہے۔میں محبت کو سمجھ سکتا ہوں کہ وہ زندگی ہے، میں عبادت کو نہیں سمجھنا چاہتا کہ وہ موت کا گیت ہے۔

خزاں یہ کہتی تھی میں شوخیِ بہار اں ہوں

رفتہ رفتہ جنون اور وحشت کا یہ دور گزر گیا اور میں از سرِ نو جوان ہونے لگا میری کونپلیں ہری ہونے لگیں اور شاخوں میں شباب کی کج ادائی آنے لگی۔میرے برگشتہ جذبات میں امید نے نئی تازگی پیدا کر دی معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کا ہر برگ و شجر امید کے ترانے الاپ رہا ہے اور زمین سے آسمان تلک ہر شئے موسیقیت کے نشے میں متوالی ہوگئی ہے۔

شہرت کی زندگی طویل نہیں، وہ نیک نامی پر محمول ہو یا بدنامی پر۔اس روز میں نے اپنی توقیر کو خاک میں ملتے دیکھا تھا آج یہ کلنک کا ٹیکا بھی مٹ گیا۔عزت کا ستون ایک لمحہ میں مسمار ہو گیا تھا۔دوبارہ اس کی تعمیر میں کئی سال لگ گئے بارے آج وہ پھر کھڑا ہو گیا ۔اب راہ گیروں اور سیلانیوں کے غول بے خوف وخطر میرے قریب آنے لگے۔گو یہ وہ میری پوجا نہ کرتے تھے ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر لاپرواہی سے میرے سایہ تلے بیٹھ جاتے تھے۔گاؤں کی عورتیں بھی میرے پاس بیٹھنے لگیں گو یہ وہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھیں۔یا تو یہ تغافل تھا یا غرورِ حسن بہر

کیف میں خوش ہوتا تھا کہ پسماندگی میں اپنے سایہ کی ٹھنڈک سے انہیں کچھ دیر سکون تو پہنچا سکا۔ اور تو اور ننھی لڑکیاں بھی میرے اردگرد ناچنے لگیں ان کے دل میں نہ عزت تھی نہ حقارت ان کے لئے زندگی ایک رقصِ شرر تھی اور بس! آہ میرے ٹوٹے ہوئے مندر کی تعمیر از سرِ نو ہوئی تھی لیکن یہ وہ مندر تھا جس سے مورت غائب ہوگئی ہو اور لوگ اس سے سرائے کا کام لینے لگے تھے۔

قسمت نے پھر پلٹا کھایا، جب مشرق کی وادیوں سے دوشیزۂ صبح آنکھیں ملتے نکلتی تو میری بلندیاں کوئل اور پپیہوں کے ساتھ غزل خواں ہو جاتیں۔ نسیمِ صبح کی جمال آرئیوں کو دیکھ کر میرے پتے فرطِ انبساط میں لرزنے لگتے۔ کنول کے پھولوں کی خوشبو ہواؤں کو مستانہ بنا دیتی۔ جب ساری دنیا بہ یک وقت تمام تر رنگینیوں کی جلوہ گاہ بن جاتی تو ''وہ'' آتی اور ان کھیتوں میں دیر تک چہل قدمی کرتی جن میں نیند کی ماتی کلیاں جاگنے کی کوشش کیا کرتی تھیں اب آفتاب کی گستاخ کرنوں کی بوسے اس کے رخساروں کو لالہ زاد بنا دیتے اور اس کے لب پر پسینہ کی بوندیں شبنم کے قطروں سے چشمک زنی کرنے لگتیں تو وہ مسکراتی ہوئی میرے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ اس کی سج دھج بھی نرالی تھی اب تک میں نے کسی حسین میں یہ انداز نہ دیکھے تھے۔ یا تو اس کا لباس آسمانی ہوتا یا نرگسی اور ناگن لٹیں ہمیشہ لہراتی رہتیں۔ اور اللہ رے دیدہ دلیری! اس کی نگاہیں کبھی نگوں نہ ہوتیں ہمیشہ سامنے کی طرف تاکتیں۔ ان میں جھجھک کا نام نہ تھا۔ ان میں ایک برق بے پناہ تھی جو دیدارِ عام کی دعوت دے رہی تھی۔ شوخی اور جادو کی لاانتہا بجلیاں جو کیف اور پلکوں کے نیچے چھپی ہوئی تھیں گویا وہ عشق کی دنیا سے پوچھ رہی تھی کہ اگر تیری پابندیوں کو توڑ دوں تو کیا ہو۔

جب وہ میرے پاس بیٹھ جاتی تو اس کے چہرہ کی جولانی اور تابانی کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ اس کا دل خوشی سے لبریز ہے میں سوچنے لگتا کہ ایسی کونسی بات ہوسکتی ہے جس کا تصور اتنا خوش کن اور جاں نواز ہو اکثر ادھر آتی اور گھنٹوں عالم تخیل میں مسرت کے طلسم گڑھا کرتی اور مجھے کبھی اس کی خوشی کا راز نہ معلوم ہوتا۔

لیکن یہ عقدہ کب تک حل نہ ہوتا حیف جس جھوٹے دیوتا کی عبادت میں میں نے عمر گزار

دی تھی یہ فریب خوردہ بھی اس کی ہی پہچان تھی ، دریائے محبت میں اس نے بھی زندگی کی ناوٗ ڈال دی تھی کیا درحقیقت اسے ساحل کا پتہ مل گیا تھا؟ کیا وہ تمناؤں اور حسرتوں کے بھنور سے نکل چکی تھی ،اب میں ان ہی گورکھ دھندوں کے سلجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک روز اسی راستہ سے میں نے ایک نوجوان کو آتے دیکھا۔اب تک یاد ہے ہاں خوب یاد ہے ____ اس نے پجارن کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے تھے اور وہ مسکرائی تھی ____ آہ وہ مسکراہٹ!

ان دونوں کی ملاقات سے مجھے ایک دلچسپ تجربہ ہوا جسے یاد کرکے اس بڑھاپے میں بھی میں ہنسا کرتا ہوں۔انسان بلائے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد اپنا اندازِ تکلم بھی بھول جاتا ہے۔وہ شاعری اور موسیقی کی دنیا میں بھٹکا کرتا ہے۔پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں جنھیں تم بے جان نہیں سمجھ سکتے۔آنکھیں اٹھتی ہیں جھپکتی ہیں اور جھک جاتی ہیں۔کاش کہ میں جانتا ہوتا ! کاش کہ میں جانتا ہوتا!

ایک عرصے تک حجاب اور نظارہ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔کبھی نوجوان پہلے آتا۔اور زیرلب کچھ گنگنایا کرتا۔اس کی آواز میں سن سکتا تھا۔جب وہ پہلے آتی تو کھیتوں میں ٹہلنے لگتی اور کبھی کبھی اوس سے بھیگا ہوا ایک آدھا تنکا لے کر اپنے دانتوں کو کریدنے لگتی۔

اب تک مجھے وہ دن یاد ہے۔وہ نور کے تڑکے آئی اور دوپہر تک بیٹھی رہی جب میں اس کے اضطراب کا تصور کرتا ہوں ، اس خلش اور تپش کو یاد کرتا ہوں تو دل میں ایک کھٹک سی ہوتی ہے۔عشق اپنا خراج مانگتا تھا آنسوؤں کی صورت میں اور غرور و تمکنت کی ضد تھی کہ ان بات رہے۔آنکھوں میں بار بار آنسو ڈبڈبا آتے تھے لیکن سوکھ کر وہیں رہ جاتے تھے۔تھک کر میرے گھنے سایہ میں اس ’’امربیل‘‘ کو لپیٹ کر وہ بیٹھ گئی۔دوپہر تک وہ بیٹھی رہی ____ لیکن وہ نہ آیا۔

آہستہ آہستہ اس کی پریشانی دور ہوگئی ۔اب انتظار تھا اس اضطرب کا نام تھا۔انجام کار وہ اٹھی اور چلی گئی۔جاتے جاتے وہ کہنے لگی ____ مجھ سے یا اس ’’امربیل‘‘ سے ’اپنے آپ سے

یا کسی نا معلوم آدمی سے کہہ نہیں سکتا ____

وہ کہنے لگی ٹھیک ہوا اس محبت کا انجام بھی یہی ہونا تھا۔ اگر فرضِ منصبی کو بھول کر راحت ہی محبت کا حاصل ہوتا تو کیا ہوتا؟ میں اپنے جذبات اور احساسات کو ظاہر نہ کر سکی لیکن اس سے کیا؟ میرے دل میں جو کچھ تھا اور ہے اس سے میری زندگی روشن ہو گئی۔ محبت مجموعہ ہے رنج و راحت کا، ہجر و وصال کا، اضطراب و مسرت کا۔ محبت ضدین کی گود میں پھولتی پھلتی ہے ورنہ محبت کتنی بے معنی اور بے لطف ہو جاتی، وہ اٹھی اور چلی گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری زندگی کے دائرے سے اور جھل ہو گئی لیکن اس کی خود فراموشی کو میں عمر بھر نہ بھولوں گا۔

اس داستانِ غم کے ساتھ میری رام کہانی بھی ختم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ محبت انسانی کے میرے مشاہدات بھی ختم ہو گئے۔ سالہا سال جس سراب صحرا کی جستجو میں سرگرداں تھا اس کا جواب مجھے ایک سوال کی صورت میں ملا۔ "ورنہ ہماری محبت کتنی بے معنی اور بے کیف ہوتی" جس حقیقت کو میں ہنوز نہ سمجھ سکا تھا۔ ایک عورت نے ایک لمحہ میں اس کا پتہ دے دیا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ محبت کا پودا تنہائی اور تاریکی میں نشو نما پاتا ہے۔ روشنی آتے ہی وہ مرجھا جاتا ہے عشق کو ظاہر کیوں کیا جائے، رسوائی کی آگ میں اسے کیوں جلایا جائے۔ میں اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا جس سے زندگی تشنۂ تکمیل رہ گئی ____ لیکن اسے کیا؟ اس خود فراموشی کا ایک لمحہ بھی تمام زندگی کے بارِ غم کا کفارہ ادا کر دے گا۔

میں دیکھتا ہوں کہ دنیا میں دو عظیم الشان طاقتوں میں تنازعہ ہو رہا ہے۔ یہ طاقتیں باہم متضاد نہیں ارتقاء کے دو مختلف راستے ہیں ان میں ایک طاقت ترکیبی ہے۔ گل و بلبل، چاند اور چاندنی، شب اور تاریکی شفق اور روشنی کی ہم آہنگی میں یہ طاقت نمایاں ہوتی ہے دوسری طاقت تخریبی ہے طوفان میں درختوں کو توڑ کر برقِ بلا سے خرمن کو جلا کر، آگ اور خون میں بربادی کے نشان چھوڑ کر وہ اپنی موجودگی کا ثبوت دیتی ہے۔ گاہے گاہے یہ دونوں طاقتیں کسی واقعہ میں اتنے عجیب طریقہ سے آپس میں گھل مل جاتی ہیں کہ ہمارے تعجب کی انتہا نہیں رہتی۔ ہماری محدود عقل حیران رہ جاتی

ہے۔شاید محبت بھی ایسا ہی واقعہ ہے۔

یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اتنے وسیع تجربات اور عمیق علم کے باوجود میں دنیا میں اکیلا ہوں۔ نہ میں کسی کا ہوں اور نہ کوئی میرا میں دوستوں کی تمنا کرتا ہوں لیکن ایک بے حس اور بے جان درخت کے لئے دوست کہاں ہیں، غم گسار اور ہمدم کہاں ہیں۔ممکن ہے کہ پہاڑ کو کبھی کسی سہارے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔لیکن چارہ سازی اور آشنائی کی تمناؤں کی گہرائی سے نکال پھینکنے کی جرأت میں اپنے آپ میں نہیں پاتا۔تو بھی میری وسعت اور عظمت سے لوگ بے حد مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کسی ہمدرد کا انتظار میرے لئے کتنا صبر آزما ہے۔میرے چاروں طرف قدرت ارتقاء کی بلندیوں پر ہمدردی اور محبت کی سیڑھیوں سے چڑھتی جاتی ہے اور میں تنہا بے چارگی کی حالت کی میں کھڑا یہ تماشہ دیکھا کرتا ہوں۔

لیکن اس وقت یہ خیال آتا ہے کہ مجھے اس فریاد کا کوئی حق نہیں۔یہ سچ ہے میری تمام خواہشیں پوری نہ ہوئیں کئی نعمتوں سے محروم رہ گیا لیکن جو کچھ حاصل کیا وہ اس زندگی کے لئے کافی ہے۔صد ہا بار دنیا کو بہار کی رنگینیوں میں شرابور دیکھا ہے۔ہزاروں آدمیوں نے میری قدم بوسی کی ہے اور بے شمار نازنینوں نے مجھے اپنا راز داں بنایا ہے۔نہ معلوم کتنی مرتبہ اس ''امر بیل'' کے بوسہ میں مجھے بہار کی مدہوشی برسات کی سحر پروری، خزاں کی گرمی، اور سرما کی تندی کا لطف بیک وقت نصیب ہوا ہے۔اس کی جانکاہ گرفت میں تڑپ تڑپ کر میں نے آزادی کی مسرت حاصل کی ہے۔ صرف ایک کھٹک دل میں باقی رہ جاتی ہے جو ہمیشہ روح کو ہٹو کے دیا کرتی ہے ___ وہ یہ کہ ___ میں بے زبان رہ گیا ! میری تمنا ایک بے معنی لفظ ہو کر رہ گئی لیکن غور کرنے کے بعد یہ خیال مجھے دلاسا دیتا ہے کہ میں ہی نہیں ساری دنیا بے زبان ہے۔

جب اپنی بے چارگی کا احساس ہوتا ہے تو میں انسان کی بے چارگی پر نظر ڈالتا ہوں۔جب سوچتا ہوں کہ قدرت نے محروم نطق رکھا۔مجھ پر ظلم کیا تو یاد آتا ہے کہ میں خود بھی تو اس دنیا کی ''زبانِ بے زبانی'' کا ایک خاموش تماشائی ہوں۔

✡✡

سعادت حسین منٹو

ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا بھی تبادلہ ہونا چاہئے۔یعنی مسلمان پاگل ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں ہندوستان کے حوالے کردیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول بہر حال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق اِدھر اُدھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں۔اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لئے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے،وہیں رہنے دئے گئے تھے۔باقی جو تھے ان کو سرحد پر روانہ کردیا گیا۔یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے۔اس لئے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں سرحد پہنچا دئے گئے۔

ادھر کا معلوم نہیں۔لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دل چسپ چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ ''زمیندار'' پڑھتا تھا اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا۔''مولبی ساب یہ پاکستان کیا ہوتا ہے''۔؟ تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا۔''ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں۔''

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح اور سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا۔ ”سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جارہا ہے۔۔۔۔۔۔ ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔“

دوسرا مسکرا دیا۔ ”مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے ۔۔۔۔۔۔ ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں۔“

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

بعض پاگل جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوادیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے، لیکن صحیح واقعات سے یہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرے دار سپاہی اَن پڑھ اور جاہل تھے ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائدِ اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ کہاں ہے؟ اس کا محلِ وقوع کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہوگیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا۔۔۔۔۔۔ میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔۔۔۔۔۔ میں اسی درخت ہی پر رہوں گا۔

بڑی مشکل کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم سی۔ ایس سی، پاس ریڈیو انجینئر جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ تھا باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا۔ یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اُتار کر دفع دار کے حوالے کر دئے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا ایک سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے گا مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں مبتلا ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سُنا کہ امرتسر ہندستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دُکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہو گئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے ____ اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے۔ اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس خیال سے کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یوروپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت رنج ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں اس مسئلہ پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں ان کی حیثیت کس قسم کی ہو گی۔ یوروپین وارڈ رہے گا یا اُڑ جائے گا۔ بریک فاسٹ

ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انہیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار کرنی پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان پر عجیب و غریب الفاظ سُننے میں آتے تھے۔ ’’اوپڑی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی مُنگ دی دال آف دی لالٹین۔‘‘ دن میں سوتا تھا نہ رات میں۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لئے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔ ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں۔ مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب بھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا۔ ’’اوپڑی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔‘‘

لیکن بعد میں آف دی پاکستان گورنمنٹ کی جگہ آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ خود اس اُلجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے پاکستان میں ہے۔ کیا پتہ ہے کہ لاہور جواب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے گا۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے گا۔ اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہو جائیں گے۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کے بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ کم نہاتا تھا اس لئے داڑھی اور بال آپس میں جم گئے تھے۔ جن کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمین دار

تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے۔ مہینہ کون سا ہے۔ یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آرہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا۔ اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار۔ ''اوپڑ دی گڑ بڑ دی دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھ میں آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کے کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی ہے۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں۔ پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ اور اس کے لئے پھل مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو

یقیناً اُسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک ایسا پاگل بھی تھا جو خود کو خدا، کہتا تھا۔ اس سے جب ایک دن بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں ہے یا پاکستان میں، تو اس نے حسبِ عادت قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں لگایا۔

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ اسے حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لئے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آکر وہ اس پر برس پڑا۔ ''اوپڑی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف واہے گوروجی دا خالصہ اینڈ واہے گوروجی کی فتح۔ جو بولے سو نہال ست سری اکال۔''

تبادلے میں کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا ملاقات کے لئے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا۔ ''یہ تم سے ملنے آیا ہے تمہارا دوست فضل دین ہے۔''

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی ____ تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ____ مجھ سے جتنی مدد ہو سکی میں نے کی ____ تمہاری بیٹی روپ کور ____

وہ کہتے کہتے رُک گیا ____ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا۔

''بیٹی روپ کور۔''

فضل دین نے رک رک کر کہا۔ ''ہاں.....وہ.....وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔''

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا۔ ''انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں ____ اب میں نے سُنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو ____ بھائی

بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاروا سنگھ سے سلام کہنا ____ اور بہن امرت کور سے بھی......... بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے۔ ____ وہ بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے۔ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے ____ دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مرگئی.........اور.........اور میرے لائق جو خدمت ہو کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں.........اور یہ تمہارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔"

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا۔"ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟"

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا۔"کہاں ہے؟ وہیں جہاں تھا۔"

بشن سنگھ نے پوچھا۔"پاکستان میں یا ہندوستان میں؟"

"ہندوستان میں نہیں پاکستان میں" فضل دین بوکھلا سا گیا۔بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا اوپڑوی گڑگڑوی اینکس دی دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی فٹے مُنہ۔"

تبادلے کی تاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو گیا۔سخت سردیاں تھیں۔جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندوستانی سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔واہگہ بارڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کاروائی ختم ہونیکے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔جو نکلنے پر رضا مند ہوتے تھے اُن کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔کیونکہ ادھر اُدھر بھاگ اُٹھتے۔جو ننگے تھے۔ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے کوئی گالیاں بک رہا ہے کوئی گا رہا ہے۔آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔رو رہے ہیں۔بک

رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی پاگل عورتوں کا شوروغوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت بج رہے تھے۔ پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جارہا ہے۔ چند جو کچھ سوچ رہے تھے۔ ''پاکستان زندہ باد۔'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا، کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سُن کر طیش آ گیا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ ''پاکستان میں یا ہندوستان میں؟'' متعلقہ افسران ہنسا۔ ''پاکستان میں۔''

یہ سُن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کردیا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے اور زور زور سے چلّانے لگا۔ ''اوپڑی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔''

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو، اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اُسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔ سورج نکلنے سے پہلے ساکت صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی ادھر اُدھر کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا، اوندھے مُنہ لیٹا تھا۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

☆☆

خواجہ احمد عباس

میری موت

لوگ سمجھتے ہیں کہ سردار جی مارے گئے۔

نہیں۔ یہ میری موت ہے۔ پرانے ''میں'' کی موت۔ میرے تعصّبات کی موت۔ اس منافرت کی موت جو میرے دل میں تھی۔

میری یہ موت کیسے ہوئی ؟ یہ بتانے کے لئے مجھے اپنے پرانے مردہ ''میں'' کو زندہ کرنا پڑے گا۔ میرا نام شیخ برہان الدین ہے۔

جب دہلی اور نئی دہلی میں فرقہ وارانہ قتل وغارت کا بازار گرم اور مسلمان کا خون سستا ہو گیا تو میں نے سوچا واہ ری قسمت پڑوسی بھی مِلا تو سکھ۔ حق ہمسائیگی ادا کرنا اور جان بچانا تو کجا، نہ جانے کب کرپان بھونک دے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک سکھوں پر ہنستا بھی تھا۔ اُن سے ڈرتا بھی تھا اور کافی نفرت بھی کرتا تھا۔ آج سے نہیں بچپن سے میں شاید چھ برس کا تھا۔ جب پہلی بار میں نے ایک سکھ کو دیکھا تھا جو دھوپ میں بیٹھا اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میں چلاّ پڑا۔ ''ارے وہ دیکھو، عورت کے منہ پر کتنی لمبی داڑھی!'' جیسے جیسے عمر گزرتی گئی یہ استعجاب ایک نسلی نفرت میں تبدیل ہوتا گیا۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں جب کسی بچے کے بارے میں نامبارک بات کا ذکر کرتیں۔ مثلاً یہ کہ اُسے نمونیہ ہو گیا تھا، یا اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو کہیں ''اب سے دُور کسی سِکھ فرنگی کو نمونہ ہو گیا تھا یا اب سے دور کسی سِکھ فرنگی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ کوسنا ۱۸۵۷ء کی یادگار تھا۔ جب ہندوستانی مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو دبانے میں پنجاب کے سکھ راجوں اور اُن کی فوجوں نے فرنگیوں کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اس وقت تاریخی حقائق پر نظر نہیں تھی،

صرف ایک مبہم سا خوف، ایک عجیب سی نفرت اور ایک عمیق تعصب، ڈر انگیریز سے بھی لگتا تھا اور سِکھ سے بھی۔ مگر انگریز سے زیادہ۔ مثلاً جب میں کوئی دس برس کا تھا۔ ایک روز دہلی سے علی گڑھ جا رہا تھا۔ ہمیشہ تھرڈ یا انٹر میں سفر ہوتا تھا۔ سوچا کہ اب کی بار سیکنڈ کلاس میں سفر کر کے دیکھا جائے ٹکٹ خرید لیا اور ایک خالی ڈبے میں بیٹھ کر گدّوں پر خوب کودا باتھ روم کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ سب پنکھوں کو ایک ساتھ چلا دیا۔ روشنیوں کو کبھی جلایا کبھی بجھایا۔ مگر ابھی گاڑی کے چلنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ لال لال منہ والے چار فوجی گورے آپس میں ڈیم بلاڈی قسم کی گفتگو کرتے ہوئے درجے میں گھُس آئے۔ اُن کو دیکھنا تھا کہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا شوق رفو چکر ہو گیا اور اپنا سوٹ کیس گھسیٹتا میں بھاگا اور ایک نہایت کھچا کھچ بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں آ کر دم لیا یہاں دیکھا تو کئی سِکھ داڑھیاں کھولے، کچھے پہنے بیٹھے تھے مگر میں اُن سے ڈر کر درجہ چھوڑ کر نہیں بھاگا۔ صرف اُن سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

ہاں، تو ڈر سکھوں سے بھی لگتا تھا مگر انگریزوں سے اُن سے زیادہ۔ مگر انگریز انگریز تھے اور کوٹ پتلون پہنتے تھے جو میں پہننا چاہتا تھا اور ڈیم بلاڈی فول والی زبان بولتے تھے جو میں بھی سیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ حاکم تھے اور میں بھی چھوٹا موٹا حاکم بننا چاہتا تھا۔ وہ کانٹے چھری سے کھانا کھاتے تھے اور میں بھی کانٹے چھری سے کھانا کھانے کا خواہاں تھا تا کہ دنیا مجھے مہذب سمجھے مگر سکھوں سے جو ڈر لگتا تھا، وہ حقارت آمیز اور کتنے عجیب الخلقت تھے۔ یہ سکھ جو مرد ہو کر بھی سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے لمبے رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزی فیشن کی نقل میں سر کے بال مُنڈانا مجھے بھی پسند نہیں تھا۔ ابا کے اِس حکم کے باوجود کہ ہر جمعہ کو سر کے بال خشخشی کرائے جائیں۔ میں نے بال خوب بڑھا رکھے تھے تا کہ ہاکی اور فٹ بال کھیلتے وقت بال ہوا میں اڑیں جیسے انگریز کھلاڑیوں کے۔ ابا کہتے 'یہ کیا عورتوں کی طرح پٹے بڑھا رکھے ہیں مگر ابا تو تھے ہی پُرانے دقیانوسی خیال کے۔ ان کی بات کون سُنتا تھا۔ اُن کا بس چلتا تو سر پر اُسترا چلوا کر بچپن میں بھی ہمارے چہروں پر داڑھیاں بندھوا دیتے، اور پھر داڑھی، داڑھی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً

ابا کی داڑھی جس کو نہایت اہتمام سے نائی فرنچ کٹ بنایا کرتا تھا یا تایا ابا کی داڑھی جو نکیلی اور چونچ دار تھی۔ مگر یہ بھی کیا کہ داڑھی کو کبھی قینچی لگے ہی نہیں۔ جھاڑ جھنکار کی طرح بڑھتی ہی رہے بلکہ تیل اور دہی اور نہ جانے کیا کیا ملکر بڑھائی جائے اور جب کئی فٹ لمبی ہو جائے تو اس میں کنگھی کی جائے جیسے عورتیں سر کے بالوں میں کرتی ہیں..........عورتیں یا مجھ جیسے اسکول کے فیشن ایبل لڑکے۔ اس کے علاوہ دادا جان کی داڑھی بھی کئی فٹ لمبی تھی اور وہ بھی اس میں کنگھی کرتے تھے۔ مگر دادا جان کی بات اور تھی۔ آخر وہ.....میرے دادا جان ٹھہرے اور سکھ پھر سکھ تھے۔

میٹرک کرنے کے بعد مجھے پڑھنے لکھنے کے لئے مسلم یونیوسٹی علی گڑھ بھیجا گیا۔ کالج میں جو پنجابی لڑکے پڑھتے تھے، اُن کو ہم دہلی اور یوپی والے نیچ، جاہل اور اُجڈ سمجھتے تھے نہ بات کرنے کا سلیقہ نہ کھانے پینے کی تمیز۔ تہذیب وتمدّن چھو نہیں گئے تھے۔ گنوار، لٹھ۔ یہ بڑے بڑے لسّی کے گلاس پینے والے بھلا کیوڑے دار فالودے اور لپٹن کی چائے کی لذت کیا جانیں۔ زبان نہایت ناشائستہ۔ بات کریں تو معلوم ہو لڑ رہے ہیں۔ اُسی، تُسی، ساڈے، تہاڈے....لاحول ولاقوۃ۔ میں تو ہمیشہ ان پنجابیوں سے کتراتا تھا مگر خدا بھلا کرے ہمارے وارڈن صاحب کا کہ انہوں نے ایک پنجابی کو میرے کمرے میں جگہ دیدی۔ میں نے سوچا چلو جب ساتھ ہی رہنا ہے تو تھوڑی بہت حد تک دوستی ہی کر لی جائے۔ کچھ دنوں میں کافی گاڑھی چھننے لگی۔ اس کا نام غلام رسول تھا۔ راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ کافی مزے دار آدمی تھا اور لطیفے خوب سُنایا کرتا تھا۔

اب آپ کہیں گے ذکر شروع ہوا تھا سردار صاحب کا یہ غلام رسول کہاں سے ٹپک پڑا مگر اصل میں غلام رسول کا اس قصے سے قریبی تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ جو لطیفے سُنا تا تھا وہ عام طور سے سکھوں کے بارے میں ہوتے تھے۔ جن کو سُن کر مجھے پوری سکھ قوم کی عادات وخصائل، اُن کی نسلی خصوصیات اور اجتماعی کیریکٹر کا بخوبی علم ہو گیا تھا۔ بقول غلام رسول کے:۔

سکھ تمام بیوقوف اور بدھو ہوتے ہیں۔ بارہ بجے تو اُن کی عقل بالکل خبط ہو جاتی ہے۔ اس کے ثبوت میں کتنے ہی واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں مثلاً ایک سردار جی دن کے بارہ بجے سائیکل پر سوار امرت سر کے ہال بازار سے گزر رہے

تھے۔ چوراہے پر ایک سِکھ کانسٹیبل نے روکا اور پوچھا ''تمہاری سائیکل کی لائٹ کہاں ہے؟'' سائیکل سوار سردار جی گڑگڑا کر بولے ''جمعدار صاحب ابھی ابھی بُجھ گئی ہے گھر سے جلا کر تو چلا تھا۔'' اس پر سپاہی نے چالان کرنے کی دھمکی دی۔ ایک راہ چلتے سفید داڑھی والے سردار جی نے بیچ بچاؤ کرایا۔ ''چلو بھائی کوئی بات نہیں لائٹ بُجھ گئی ہے تو اب جلا لو تو سُننے والوں کے پیٹ میں بَل پڑ جاتے تھے۔ اصل میں اُن کو سُننے کا مزہ پنجابی میں تھا کیونکہ اُجڈ سکھوں کی عجیب وغریب حرکتوں کے بیان کرنے کا حق کچھ پنجابی جیسی اُجڈ زبان ہی میں ہو سکتا ہے۔

سِکھ نہ صرف بیوقوف اور بدّھو تھے بلکہ گندے تھے جیسا کہ ایک ثبوت تو غلام رسول کا (جس نے سیکڑوں سکھوں کو دیکھا تھا) یہ تھا کہ وہ بال نہیں منڈاتے تھے۔ اس کے علاوہ برخلاف ہم صاف ستھرے نمازی مسلمانوں کے جو ہر اٹھوارے جمعہ کے جمعہ غسل کرتے ہیں، یہ سکھ کچھا باندھ سب کے سامنے نل کے نیچے بیٹھ کر نہاتے تو روز ہیں مگر اپنے بالوں اور داڑھی میں نا جانے کیا کیا گندی اور غلیظ چیزیں ملتے ہیں۔ مثلاً دہی۔ ویسے تو میں بھی سر میں لائم جیوس گلیسرین لگاتا ہوں جو کسی قدر گاڑھے دُودھ سے مشابہ ہوتی ہے مگر اس کی بات اور ہے۔ وہ ولایت کی مشہور پرفیوم فیکٹری سے نہایت خوبصورت شیشی میں آتی ہے اور دہی کسی گندے سندے حلوائی کی دکان سے۔

خیر جی ہمیں دوسروں کے رہنے سہنے کے طریقوں ہمیں کیا لینا۔ مگر سکھوں کا سب سے بڑا قصور تھا کہ لوگ اکھڑ پَن، بدتمیزی اور مار دھاڑ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ اب دنیا جانتی ہے کہ ایک اکیلا مسلمان دس ہندوؤں یا سکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی سِکھ مسلمانوں کے رُعب کو نہیں مانتے تھے۔ کرپانیں لٹکائے، اکڑ اکڑ کر مونچھوں بلکہ داڑھی پر بھی تاؤ دیتے چلتے تھے۔ غلام رسول کہتا اُن کی ہیکڑی ایک دن ہم ایسی نکالیں گے کہ خالصہ جی یاد ہی تو کریں گے۔

کالج چھوڑے کئی سال گزر گئے۔ طالب علم سے میں کلرک سے ہیڈ کلرک بن گیا۔ علی گڑھ کا ہوسٹل چھوڑ نئی دہلی میں ایک سرکاری کوارٹر میں رہنا سہنا اختیار کرلیا۔ شادی ہوگئی۔ بچّے ہوگئے

مگر کتنی ہی مدت کے بعد۔ مجھے غلام رسول کا وہ کہنا یاد آیا جب ایک سردار صاحب میرے برابر کے کوارٹر میں رہنے کو آئے ____ یہ راول پنڈی سے بدلی کرا کر آئے تھے کیوں کہ راول پنڈی کے ضلع میں غلام رسول کی پیش گوئی کے بموجب سرداروں کی ہیکڑی اچھی طرح سے نکالی گئی تھی۔ مجاہدوں نے اُن کا صفایا کر دیا تھا۔ بڑے سورما بنتے تھے، کرپانیں لئے پھرتے تھے۔ بہادر مسلمانوں کے سامنے اُن کی ایک نہ بنی۔ اُن کی داڑھیاں مونڈ کر اُن کو مسلمان بنایا گیا تھا۔ زبردستی اُن کا ختنہ کیا گیا تھا۔ ہندو پریس حسبِ عادت مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے یہ لکھ رہا تھا کہ سکھ عورتوں اور بچوں کو بھی مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اسلامی روایات کے خلاف ہے۔ کوئی مسلمان مجاہد کبھی عورت یا بچے پر ہاتھ نہیں اُٹھاتا۔ رہیں عورتوں اور بچوں کی لاشوں کی تصویریں جو چھاپی جارہی تھیں، وہ یا تو جعلی تھیں، اور یا سکھوں نے مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے خود اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہوگا۔ راولپنڈی اور مغربی پنجاب کے مسلمانوں پر یہ بھی الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے ہندو اور سکھ لڑکیوں کو بھگایا تھا حالانکہ واقعہ صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کی جواں مردی کی دھاک بیٹھی ہے اور اگر نوجوان مسلمانوں پر ہندو اور سکھ لڑکیاں خود ہی لٹو ہو جائیں تو اُن کا کیا قصور ہے کہ وہ تبلیغِ اسلام کے سلسلے میں اِن لڑکیوں کو اپنی پناہ میں لے لیں۔ ہاں تو سکھوں کی نام نہاد بہادری کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ بھلا اب تو ماسٹر تارا سنگھ لاہور میں کرپان نکال کر مسلمانوں کو دھمکیاں دے۔ پنڈی سے بھاگے ہوئے سردار اور اُس کی خستہ حالی دیکھ کر میرا سینہ عظمتِ اسلام کی رُوح سے بھر گیا۔

ہمارے پڑوسی سردار جی کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہوگی۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی، حالانکہ موت کے منہ سے بچ کر آئے تھے۔ مگر یہ حضرت ہر وقت دانت نکالتے ہنستے رہتے تھے، جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دراصل کتنا بیوقوف اور بے حس ہے۔ شروع شروع میں انہوں نے مجھے اپنی دوستی کے جال میں پھنسانا چاہا۔ آتے جاتے زبردستی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ نہ جانے سکھوں کا کون سا تہوار تھا اس دِن پر شادی کی مٹھائی بھی بھیجی (جو میری بیوی نے فوراً مہترانی کو

دے دی) پر میں نے زیادہ منہ نہ لگایا۔ کوئی بات کی تو کوئی سوکھا سا جواب دے دیا اور بس میں جانتا تھا کہ سیدھے مُنہ دو چار باتیں کرلیں تو یہ پیچھے ہی پڑ جائے گا۔ آج باتیں تو کل گالم گفتار۔ گالیاں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ سکھوں کی دال روٹی ہوتی ہے کون اپنی زبان گندی کرے۔ ایسے لوگوں سے تعلقات بڑھا کر۔ ہاں ایک اتوار کی دوپہر کو میں اپنی بیوی کو سکھوں کی حماقت کے قصے سُنا رہا تھا۔ اس کا عملی ثبوت دینے کے لئے عین بارہ بجے میں نے اپنے نوکر کو سردار جی کے ہاں بھیجا کہ پُوچھ کر آئے کیا بجا ہے؟'' انہوں نے کہلوا دیا کہ بارہ بج کر دو منٹ ہوئے ہیں'' میں نے کہا'' بارہ بجے کا نام لیتے گھبراتے ہیں یہ۔'' اور ہم خوب ہنسے۔ اس کے بعد میں نے کئی بار بے وقوف بنانے کیلئے سردار جی سے پوچھا'' کیوں سردار جی! بارہ بج گئے؟'' اور وہ بے شرمی سے دانت پھاڑ کر جواب دیتے جی اساں دے تاں چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں'' اور یہ کہہ کر خوب ہنسے۔ گویا بڑا مذاق ہوا۔

مجھے سب سے زیادہ ڈر بچوں کی طرف سے تھا۔ اوّل تو کسی سکھ کا اعتبار نہیں۔ کب بچے ہی کے گلے پر کرپان چلا دے۔ پھر یہ لوگ۔ راولپنڈی سے آئے تھے۔ ضرور دل میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ رکھتے ہوں گے اور انتقام لینے کی تاک میں ہوں گے۔ میں نے بیوی کو تاکید کر دی تھی کہ بچے ہرگز سردار جی کے کوارٹر کی طرف نہ جانے دیئے جائیں۔ پر بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں ۔ چند روز بعد میں نے دیکھا کہ سردار جی کی چھوٹی لڑکی موہنی اور اُن کے پوتوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ یہ بچی جس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی سچ مچ موہنی ہی تھی۔ گوری چٹی، اچھا ناک نقشہ، بڑی خوبصورت۔ کمبختوں کی عورتیں کافی خوبصورت ہوتی ہیں۔ مجھے یاد آیا غلام رسول کہا کرتا تھا کہ اگر پنجاب سے سکھ مرد چلے جائیں اور اپنی عورتوں کو چھوڑ جائیں تو پھر حُوروں کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ ہاں تو جب میں نے بچوں کو سردار جی کے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو میں انہیں گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا اور خوب پٹائی کی۔ پھر میرے سامنے کم سے کم اُن کی ہمت نہ ہوتی کہ اُدھر کا رُخ کریں۔

بہت جلدی سکھوں کی اصلیت پوری طرح ظاہر ہوگئی۔ راول پنڈی سے تو ڈرپوکوں کی طرح پٹ کر بھاگ کر آئے تھے۔ پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو اقلیت میں پا کران پر ظلم ڈھانا شروع کردیا____ ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو جامِ شہادت پینا پڑا۔ اسلامی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں عورتوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا۔ جب سے مغربی پنجاب سے بھاگے ہوئے سکھ اتنی بڑی تعداد میں دہلی میں آنے شروع ہوئے تھے۔ اس وبا کا یہاں تک پہنچنا یقینی ہوگیا تھا۔ میرے پاکستان جانے میں ابھی چند ہفتے کی دیر تھی۔ اسلئے میں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کو ہوائی جہاز سے کراچی بھیج دیا۔ اور خود خدا پر بھروسہ کر کے ٹھہرا رہا۔ ہوائی جہاز میں سامان تو زیادہ نہیں جاسکتا تھا، اس لئے میں نے پوری ایک ویگن بُک کرالی مگر جس دن سامان چڑھانے والے تھے اس دن سنا کہ پاکستان جانیوالی گاڑیوں پر حملے ہورہے ہیں۔ اسلئے سامان گھر میں پڑا رہا۔

۱۵ راگست کو آزادی کا جشن منایا گیا مگر مجھے اس آزادی میں کیا دلچسپی تھی۔ میں نے چھٹی منائی، اور دن بھر لیٹا ڈان اور پاکستان ٹائمز کا مطالعہ کرتا رہا۔ دونوں میں نام نہاد آزادی کے چیتھڑے اُڑائے گئے تھے اور ثابت کیا گیا تھا کہ کس طرح ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی سازش کی تھی۔ وہ تو ہمارے قائدِ اعظم کا اعجاز تھا کہ پاکستان لے کر ہی رہے۔ اگرچہ انگریزوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے دباؤ میں آ کر امرتسر کو ہندوستان کے حوالے کردیا۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے، امرت سر خالص اسلامی شہر ہے اور یہاں کی سنہری مسجد جو (GOLDEN MOSQU) کے نام سے دنیا میں مشہور ہے........نہیں وہ گردوارہ ہے اور (GOLDEN TEMPLE) کہلاتا ہے۔ سنہری مسجد تو دہلی میں ہے۔ سنہری مسجد ہی نہیں، جامع مسجد بھی ہے لال قلعہ ہے۔ نظام الدّین اَولیا کا مزار، ہمایوں کا مقبرہ، صفدر جنگ کا مدرسہ۔ غرض کہ چپے چپے پر اسلامی حکومت کے نشان پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی آج اُسی دہلی بلکہ کہنا چاہئے شاہ جہان آباد میں ہندو سامراج کا جھنڈا بلند کیا جارہا تھا۔ ”رولے اب دِل کھول کے اے

دیدۂ خُونبار.........اور یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا کہ دہلی جو کبھی مسلمانوں کا پایۂ تخت تھا، تہذیب و تمدّن کا گہوارہ تھا، ہم سے چھین لیا گیا تھا اور ہمیں مغربی پنجاب اور سندھ بلوچستان جیسے اُجڈ اور غیر متمدن علاقے میں زبردستی بھیجا جاتا ہے۔ جہاں کسی کو شُستہ اُردو زبان بھی بولنی نہیں آتی جہاں شلواریں جیسا مضحکہ خیز لباس پہنا جاتا ہے۔ جہاں ہلکی پھلکی سی پاؤ بھر میں بیس چپاتیوں کی بجائے دو دو سیر کی نانیں کھائی جاتی ہیں۔ پھر میں نے اپنے دل کو مضبوط کر کے سوچا کہ قائدِ اعظم اور پاکستان کی خاطر یہ قربانی تو ہمیں دینی ہی ہوگی مگر پھر بھی دلّی چھوڑنے کے خیال سے دِل مُرجھایا ہی رہا....شام کو جب میں باہر نکلا اور سردار جی نے دانت نِکال کر کہا'' کیوں بابو جی! تم نے آج کُچھ خُوشی نہیں منائی؟'' تو میرے جی میں آئی کہ اُس کی داڑھی میں آگ لگا دوں۔ ہندوستان کی آزادی اور دِل میں سِکھا شاہی آخر رنگ لا کر رہی۔ اب مغربی پنجاب سے آئے ہوئے رفیوجیز (REFUGEES) کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ دراصل پاکستان کو بدنام کرنے کے لئے اپنے گھر بار چھوڑ کر، وہاں سے بھاگے تھے۔ یہاں آکر گلی کوچوں میں اپنا رونا روتے تھے پھرتے تھے۔ کانگریسی پراپیگنڈ مسلمانوں کے خلاف زوروں پر چل رہا تھا اور اس بار کانگریسیوں نے چال یہ چلی کہ بجائے کانگریس کا نام لینے کے راشٹریہ سیوک سنگھ اور شہیدی دل کے نام سے کام کر رہے تھے۔ حالانکہ دُنیا جانتی ہے کہ یہ ہندو چاہے کانگریسی ہوں یا مہا سبھائی، سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ چاہے دُنیا کو دکھانے کی خاطر وہ بظاہر گاندھی اور جواہر لال نہرو کو گالیاں ہی کیوں نہ دیتے ہوں۔

ایک دن صبح کو خبر آئی کہ دہلی میں قتلِ عام شروع ہوگیا۔ قرول باغ میں مسلمانوں کے سیکڑوں گھر پھونک دیئے گئے ہیں۔ چاندنی چوک کے مسلمانوں کی دوکانیں لُوٹ لی گئیں اور ہزاروں کا صفایا ہوگیا۔ یہ تھا کانگریس کے ہندو راج کا نمونہ۔ خیر میں نے سوچا نئی دہلی تو مدّت سے انگریزوں کا شہر رہا ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہاں رہتے ہیں۔ کمانڈر انچیف یہاں رہتا ہے۔ کم سے کم یہاں مسلمانوں کے ساتھ ایسا ظلم نہ ہونے دیں گے۔ یہ سوچ کر میں دفتر کی طرف چلا۔

کیونکہ اس دن مجھے پراوڈ نڈ کا حساب کرنا تھا کہ دفتر کا ایک ہندو بابو ملا۔ اُس نے کہا ''یہ کیا کر رہے ہو۔ جاؤ واپس جاؤ۔ باہر نہ نکلنا کناٹ پلیس میں بلوائی مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ میں واپس بھاگ آیا۔

اپنے اسکوٹر میں پہنچا ہی تھا کہ سردار جی سے مڈ بھیڑ ہوگئی۔ کہنے لگے۔ شیخ جی فکر نہ کرنا۔ جب تک ہم سلامت ہیں تمہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔'' میں نے سوچا اس کی داڑھی کے پیچھے کتنا مکر چھپا ہے۔ دل میں تو خوش ہے۔ چلو اچھا ہوا مسلمانوں کا صفایا ہو رہا ہے.... مگر زبانی ہمدردی جتا کر مجھ پر احسان کر رہا ہے بلکہ شاید مجھے چڑھانے کے لئے یہ کہہ رہا ہے۔ کیونکہ سارے اسکوئر میں بلکہ تمام سڑک پر میں تنِ تنہا مسلمان تھا۔

پر مجھے اِن کافروں کا رحم وکرم نہیں چاہیئے۔ میں سوچ کر اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ میں مارا بھی جاؤں گا تو دس بیس کو مار کر۔ سیدھا اپنے کمرے میں گیا جہاں پلنگ کے نیچے، میری دونلی شکاری بندوق رکھی تھی۔ جب سے فسادات شروع ہوئے تھے۔ میں نے کارتوس اور گولیوں کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ پر وہاں بندوق نہ ملی۔ سارا گھر چھان مارا۔ اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

''کیوں حضور کیا ڈھونڈ رہے ہیں آپ؟ یہ میرا وفادار ملازم موجود تھا۔

''میری بندوق کیا ہوئی؟ میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اُسے معلوم ہے۔ شاید اس نے چھپائی ہے، یا چُرائی ہے۔''

''بولتا کیوں نہیں؟'' میں نے ڈانٹ کر کہا۔ تو حقیقت معلوم ہوئی کی ممدو نے میری بندوق چُرا کر اپنے چند دوستوں کو دیدی تھی، جو دریا گنج میں مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ہتھیاروں کا ذخیرہ جمع کر رہے تھے۔

''کئی سو بندوقیں ہیں سرکار ہمارے پاس۔ سات مشین گنیں، دس ریوالور اور ایک توپ۔ کافروں کو بھون کر رکھ دیں گے۔ بھون کر۔''

میں نے کہا'' دریا گنج میں میری بندوق سے کافروں کو بھون دیا گیا تو اس میں میری حفاظت کیسے ہوگی؟ میں تو یہاں نہتا کافروں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہاں مجھے بھون دیا گیا تو کون ذمّے دار ہوگا؟'' میں نے ممدو سے کہا۔

وہ کسی طرح چھپتا چھپاتا دریا گنج تک جائے اور وہاں سے میری بندوق اور سو دو سو کارتوس لیکر آئے۔ وہ چلا تو گیا مگر مجھے یقین تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

اب میں گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ سامنے کارنس پر میری بیوی اور بچوں کے تصویریں خاموشی سے مجھے گھور رہی تھیں۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے کہ اب اُن سے کبھی ملاقات ہوگی بھی یا نہیں لیکن پھر یہ خیال کر کے اطمینان بھی ہوا کہ کم سے کم وہ تو خیریت سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ کاش میں نے پراوڈنڈ فنڈ کا لالچ نہ کیا ہوتا اور پہلے ہی چلا گیا ہوتا۔ پر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے....

ست سری اکال.... ہر ہر مہادیو۔''

دُور سے آوازیں قریب آرہی تھی۔ یہ بلوائی تھے۔ یہ میری موت کے ہرکارے تھے۔ میں نے زخمی ہرن کی طرح ادھر اُدھر دیکھا۔ جو گولی کھا چکا ہو اور جس کے پیچھے شکاری کُتّے لگے ہوں۔ بچاؤں کی کوئی صورت نہ تھی۔ کوارٹر کے کواڑ پتلی لکڑی کے تھے اور اُن میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر میں بند ہو کر بیٹھ بھی رہا تو دو منٹ میں بلوائی کواڑ توڑ کر اندر آسکتے تھے'' ست سری اکال۔ ہر ہر مہادیو۔''

آوازیں اور قریب آرہی تھیں۔ میری موت قریب آرہی تھی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردار جی داخل ہوئے۔'' شیخ جی! ہمارے کوارٹر میں آجاؤ۔ جلدی کرو۔'' بغیر سوچے سمجھے! اگلے لمحے میں سردار جی کے برآمدے کی چکوں کے پیچھے تھا۔ موت کی گولی سن سے میرے سر پر سے گذر گئی۔ کیونکہ میں وہاں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک لاری آکر رُکی اور اس میں سے دس پندرہ نوجوان اُترے۔ اُن کے لیڈر کے ہاتھ میں ایک ٹائپ کی

ہوئی فہرست تھی۔ کوارٹر ۸ شیخ برہان الدین۔ اُس نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے حکم دیا اور غول کا غول میرے کوارٹر پر ٹوٹ پڑا۔ میری گرہستی کی دُنیا میری آنکھوں کے سامنے اُجڑ گئی۔ لٹ گئی۔ کرسیاں میز صندوق، تصویر۔ کتابیں، دریاں قالین، یہاں تک کہ میلے کپڑے ہر چیز لاری پر پہنچادی گئی۔

ڈاکو!

لٹیرے!!

قزاق!!!

اور یہ سردار جی جو بظاہر ہمدردی جتا کر مجھے لے آئے تھے۔ یہ کون سے کم لٹیرے تھے؟ باہر جا کر بلوائیوں سے کہنے لگے ''ٹھریئے صاحب۔ اس گھر پر ہمارا حق زیادہ ہے ہمیں بھی لُوٹ میں حصّہ مِلنا چاہئے اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو اشارہ کیا اور وہ بھی لوٹ میں شامل ہوگئے۔ کوئی میری پتلون اُٹھائے چلا رہا ہے۔ کوئی سوٹ کیس، کوئی میری بیوی بچوں کی تصویریں بھی لا رہا ہے اور یہ سب مال غنیمت سیدھا اندر کے کمرے میں جا رہا تھا۔

اچھا رے سردار! زندہ رہا تو تجھ سے پوچھوں گا۔ پر اس وقت تو میں چوں بھی نہیں کرسکتا تھا کیوں کہ فسادی جو سب مسلح تھے مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ اگر انھیں کہیں معلوم ہوگیا کہ میں یہاں ہوں....

''ارے اندر آؤ تو سی!''

دفعتاً میں نے دیکھا کہ سرادر جی ننگی کرپان ہاتھ میں لئے مجھے اندر بلا رہے ہیں۔ میں نے ایک بار اس ڈرھیل چہرے کو دیکھا جو لوٹ مار کی بھاگ دوڑ سے اور بھی خوفناک ہو گیا تھا، اور پھر کرپان کو جس کی چمکیلی دھار مجھے دعوتِ موت دے رہی تھی، بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اگر میں کچھ بھی بولا اور بلوائیوں نے سُن لیا تو ایک گولی میرے سینے کے پار ہوگی۔ کرپان اور بندوق میں سے ایک کو پسند کرنا تھا۔ میں نے سوچا ان دس بندوق باز بلوائیوں سے کرپان والا بڈھا بہتر

ہے۔میں کمرے میں چلا گیا جھجکتا ہوا خاموش۔

''اِتھے نہیں۔اوس اندر آؤ۔''

میں اندر کمرے میں چلا گیا جیسے بکرا قصائی کے ساتھ ذبح خانے میں داخل ہوتا ہے۔میری آنکھیں کرپان کی دھار سے چوندھیائی جا رہی تھی۔

''لو جی۔اپنی چیزیں سنبھال لو یہ کہہ کر سردار جی نہ وہ تمام سامان میرے سامنے رکھ دیا جو انھوں نے اور اُنکے بچّوں نے جھوٹ مُوٹ کی لوٹ میں حاصل کیا تھا۔

سردارنی بول ''بیٹا ہم تو تیرا کچھ بھی سامان نہ بچا سکے''۔میں کوئی جواب نہ دے سکا

اتنے میں باہر سے کچھ آوازیں سُنائی دیں۔بلوائی میری لوہے کی الماری کو باہر نکال رہے تھے اور اُس کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اس کی چابیاں مل جاتیں تو سب معاملہ آسان ہو جاتا۔''

''چابیاں تو اس کی پاکستان میں ملیں گی۔بھاگ گیا نہ ڈرپوک کہیں کا۔مسلمان کا بچہ تھا مقابلہ کرتا ــــــ''

ننھی موہنی میری بیوی کے چند ریشمی قمیص اور غرارے نہ جانے کس سے چھین کر لا رہی تھی کہ اُس نے یہ سُنا۔وہ بولی ''تم بڑے بہادر ہو! شیخ جی ڈرپوک کیوں ہونے لگے۔وہ تو کوئی پاکستان نہیں گئے۔''

''نہیں گیا تو یہاں سے کہیں منہ کالا کر گیا۔''

''مُنہ کالا کیوں کرتے وہ تو ہمارے ہاں.........

میرے دل کی حرکت ایک لمحے کے لئے بند ہو گئی۔بچّی اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی خاموش ہو گئی۔مگر ان بلوائیوں کے لئے یہی کافی تھا۔

سردار جی پر جیسے خون سوار ہو گیا۔انھوں نے مجھے اندر کے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی۔اپنے بیٹے کے ہاتھ میں کرپان دی اور خود باہر نکل گئے۔باہر کیا ہوا یہ مجھے ٹھیک طرح معلوم

نہ ہوا۔ تھپڑوں کی آواز ـــــــ پھر موہنی کے رونے کی آواز اور اس کے بعد سردار جی کی آواز۔ پنجابی گالیاں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کسے گالیاں دے رہے ہیں اور کیوں۔ میں چاروں طرف سے بند تھا۔ اس لئے ٹھیک سُنائی نہ دیتا تھا۔

اور پھر ـــــــ گولی چلنے کی آواز ـــــــ سردارنی کی چیخ

لاری روانہ ہونے کی گڑگڑاہٹ اور پھر تمام اسکوائر پر جیسے سناٹا چھا گیا۔ جب مجھے کمرے کی قید سے نکالا گیا تو سردار جی پلنگ پر پڑے تھے اور اُن کے سینے کے قریب۔ سفید قمیص خون سے سُرخ ہو رہی تھی۔ اُن کا لڑکا ہمسائے کے گھر سے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر رہا تھا۔

''سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟'' میری زبان سے نہ جانے یہ الفاظ کیسے نکلے۔ میں مبہوت تھا۔ میری برسوں کی دنیا خیالات محسوسات، تعصّبات کی دُنیا کھنڈر ہو گئی تھی۔

''سردار جی یہ تم نے کیا کیا؟

''مجھے کرجا اُتارنا تھا بیٹا!''

''قرضہ؟''

''ہاں! راول پنڈی میں تمہارے جیسے ہی ایک مسلمان نے اپنی جان دے کر میری اور میرے گھر والوں کی جان اور اجت بچائی تھی۔''

''کیا نام تھا اس کا سردار جی؟''

''گلام رسُول۔''

''غلام رسُول!''

اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے ساتھ قسمت نے دھوکا کیا ہو۔ دیوار پر لٹکے ہوئے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کئے۔ ایک .... دو .... تین .... چار .... پانچ ....

سردار جی کی نگاہیں گھنٹے کی طرف گئیں جیسے مسکرا رہے ہوں اور مجھے اپنے دادا یاد آ گئے جن کی کئی فٹ لمبی داڑھی تھی۔ سردار جی کی شکل اِن سے کتنی ملتی تھی۔

چھ.....سات......آٹھ.....نو.........

جیسے وہ ہنس رہے ہوں، اُن کی سفید داڑھی اور سر کے کھلے ہوئے بالوں نے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔

دس.........گیارہ.........بارہ..........

جیسے وہ کہہ رہے ہوں ''جی اساں دے ہاں تو چوبیس گھنٹے بارہ بجے رہتے ہیں۔

پھر نگاہیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

اور میرے کانوں میں غلام رسول کی آواز دور سے بہت دُور سے آئی۔ میں کہتا تھا کہ بارہ بجے ان سکھوں کی عقل غائب ہو جاتی ہے اور یہ کوئی نہ کوئی حماقت کر بیٹھتے ہیں۔ اب اِن سردار جی ہی کو دیکھو نا ______________ ایک مسلمان کی خاطر اپنی جان دیدی۔

پر یہ سردار جی مرے نہیں تھے میں مرا تھا!

☆☆

حیات اللہ انصاری

آخری کوشش

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا:

"ٹکٹ!"

گھسیٹے نے گھگھیا کر بابو کی طرف دیکھا۔انہوں نے ماں کی گالی دے کر اسے پھاٹک کے باہر ڈھکیل دیا۔ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں اور کیا ہی کیا جا سکتا ہے؟

گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سُنیں، ٹھوکریں سہیں بیسیوں بار ریل سے اتارا گیا۔ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن پیدل بھی چلنا پڑا، ایک دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے کیا؟ کسی نہ کسی طرح وطن تو پہنچ گئے ____ وطن پچیس برس کے بعد وطن۔ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے جب میں کلکتہ پہنچا تو کالی مل کھلی تھی اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔آ گئے وطن۔ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔اگر یاد غلطی نہیں کرتی تو دو کوس کا کچا راستہ اور ____ دو گھنٹے کی بات۔

اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تھی یا دکانوں کے تختے یا پھر شہروں سے میلوں دور ٹھیکے داروں کی جھونپڑیاں جس کی زمین پر اتنے آدمی ہوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر تک کی جگہ نہ ملتی تھی۔رہے اپنے لوگ سو وہاں اپنا کون تھا؟ سب غرض کے بندے، بے ایمان، حرام زادے، ایک وہ سالا تھا بھوندو اور دوسرا تھا بھورا اور وہ ڈائن بھنگوی جو خونچے کی ساری آمدنی کھا گئی، وہ ملوں کے مزدور۔بھائی ہیں بھائی ہیں، مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور سفارش لئے موجود۔

یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟ _____ جب جیلر نے آ کر مجھے حکم سنایا کہ ''تیری میعاد ختم'' تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔ بس ایک دم سے گھر کی یاد آ گئی۔ گھر! کیا چیز ہے؟

گھسیٹے کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی سکھ مل جائے گا ۔اور اب گھر قریب تھا۔

اسٹیشن سے کچھ دور آ کر گھسیٹے بھونچکا رہ گیا۔ یہاں کی دنیا اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اُڑا رہی تھی۔ جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں۔ کچی سڑک کی جگہ اب پکی سڑک تھی اور اس کے برابر مل تک ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھی۔ سڑک خوب آباد تھی۔ مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آ جا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فراٹے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔ غرض کہ جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اتر کر اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھوں۔ یہ آپ ہی آپ ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور آ کر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں، اور اوکھ کے کھیت اور باغوں کا سلسلہ آ گیا تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک ہے۔

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبہ کی تاڑ دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک مینار تو ناچتی ہوئی بیلوں سے منڈھا ہوا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلّم زمین پر لیٹا کائی کی مخملیں چادر اوڑھے تھا۔ اس پر نظر پڑنا تھی کہ بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چلی تھیں، پچیس برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے ایک دم پھڑ پھڑا کر تڑپ کر نکل آئیں اور کم سن دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اچکنے کودنے لگیں وہ زمانے آنکھوں کے سامنے پھر گیا جب اس مسجد کے گرد پانی بھر جاتا اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے اس میں نہاتے تھے۔ اس وقت بھی یہ کھڑا مینار یوں ہی کھڑا تھا اور لیٹا مینار یوں ہی لیٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہیرا، بفاتی، بلاقی، تنو، نیولا، سورج، بلی

اور وہ کنوا سالا کیا نام تھا اس کا اور کون کون ساری کی ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن دن بھر سیار مار ڈنڈا اڑا کرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار امرود کا ایک باغ تھا۔ اس پر کبھی کبھی لونڈا ڈاکہ پڑتا تھا۔ لونڈے گھس گئے اور چپکے چپکے کچے پکے امرود نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنے لگے اور رکھوالا ماں بہن کی سُناتا دوڑا اور ادھر آناً فاناً میں سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہ تھے کہ ادھر سے ایک فقیرنی آنکلی جو منمنا منمنا کر گا رہی تھی کچھ لونڈوں کو سوجھی شرارت وہ چڑیل چڑیل چلاّ کر بھاگے۔ پھر کیا تھا۔ سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بلاقی رہ گیا۔ ارے ڈر کے مارے اس کی جو گھگھی بندھی ہے اور جو لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے..........

گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملائمت آ گئی تھی اور ہوا میں خوش گوار خنکی۔ راستے کے ایک طرف پتاور کے ہرے بھرے جھنڈ تھے جن کے بیچ بیچ سے بوڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بسیرا لینے والی میناؤں اور کوؤں کا شور کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیاں، ہلواہوں کی ہٹ ہٹ! باغوں کے رکھوالوں کی ہوہو، ان سب سے ہوا اسی طرح بسی ہوئی تھی، جیسے پتاوروں کی بھینی بھینی میٹھی خوشبو سے معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے یعنی کھیت، درخت، ہوا آنے والی صدائیں اور خوشبو، سب قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں۔

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آتا ہوا ملا۔ آگے آگے ایک لڑکی پھٹی اوڑھنی سر سے لپیٹے گاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہلوں کو کندھے پر رکھے، بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی۔ مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں

کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

ادھر سورج افق میں چھپا اور ادھر قصبہ آ گیا۔ اس کا نشان ایک اکل کھرا تاڑ تھا جس سے کچھ دور ہٹ کر آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام اسے ایک بہت رومان بھری یاد انگڑائی لے کر اٹھی اور گھسیٹے کے پاؤں تھام لئے۔ وہ بلاارادہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سامنے کی جھاڑی اور گڑھیا' یہیں دلاری سے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی جھنا ایسی دلاری جس کے نہ روٹھنے کا ٹھیک پتہ چلتا تھا اور منّنے کا۔ وہاں بیٹھ کر وہ دلاری کا انتظار کرتا تھا، تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے شہر جاؤں گا، نوکری کروں گا۔ دونوں وقت چنے چباؤں گا مگر روپیہ جوڑ جوڑ کر رکھوں گا۔ پھر جو ڈھائی سو روپیہ ہو جائے گا تو واپس آؤں گا اور ہیرا لال کی طرح ایک دم سے ایک گوئی بیل لے کر کھیتی شروع کروں گا۔ اسی قت دلاری میری کتنی خوشامدیں کرے گی۔ میں تو کم سے کم دو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلنے آجایا کروں گا۔ وہ آئے گی ضرور' وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ گڑھیا میں ڈھیلے پھینکے گی، گنگنائے گی۔ میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ کر ہنسے گی ـــــــ بڑی چڑیل تھی نہ جانے اب کہاں ہے؟

گھسیٹے درختوں کے اندر گھس کر دیکھنے لگا کہ پرانی گڑھیا اب تک ہے؟ ہاں ہے تو اور وہ سامنے جمنی کا درخت بھی ہے جس کی جڑ پر وہ بیٹھتی تھی کیا زمانہ تھا!

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے۔ ایکا ایکی ایک موڑ پر چونک پڑا جیسے کوئی بسری بات ایک دم یاد آ گئی ہو۔ یہی جگہ تو ہے۔ ہاں یہیں ابا نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شبّن میاں کی قمیص کا بٹن نوچ لیا تھا۔ ادھر شبّن میاں گھر کے اندر آئے اور ادھر ڈانٹ لگائی۔ ''گھسیٹے! گھسیٹے! ـــــــ کدھر مر گیا۔؟ ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دیئے۔ ان کو اتارو؟ پھر جرابیں اُتاروں' پھر انگلیوں کو تولئے سے پونچھو'

پھر جوتی لاکر پاؤں کے نیچے دھرو ______ شبّن میاں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ ان میں سے دو ایک ہمارے پاس بھی ہوتیں! ہمارے پاس کیا تھا؟ ایک پھٹا کرتہ پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خاں صاحبن پھر کسی کا پرانا دھرانا جوڑا دے دیتیں۔ ''پھر پھاڑ لیا''۔؟ اس کے بدن پر تو کانٹے ہیں'' یہ کہاں کھونچا لگا یا؟ ______ کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی''۔ ایک بار شبّن میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیص کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے چم چم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیا۔ تھوڑی دیر میں شبّن میاں چلاّ نے لگے۔ ''ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟'' میں نے جی میں کہا۔ میں لایا ہوں۔ کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو نہ دوں گا چاہے کچھ کرو۔ بلکہ اب تو تمہارے گھر کا کام بھی نہ کروں گا۔ سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔ میری قمیص میں آستین کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور زنجیر دونوں چیزیں باہر چم چم کریں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آ گئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں گا۔ میں ادھر ادھر دبکتا پھرتا تھا کہ ابّا نے جو میری کھوج میں لگے تھے، دیکھ لیا۔ ''تو شبّن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا ______ سونے کا بٹن۔'' دو تھپّڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا بٹن کلکتہ میں چار پیسے پتہ ملتا ہے جتنے چاہو اتنے لے لو۔

چھپّروں اور نیچی نیچی کچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت چھا گئی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ جس سے دل کو عجب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولہے جل گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپّروں سے نکل نکل کر بلا کسی گھبراہٹ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کو لئے بھاگی جا رہی تھیں۔ دوارے پر لڑکے لڑکیاں اونچا نیچا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے جیسے بسیرا لیتے وقت جنگلی مینائیں ______ ایک گھوڑا دن بھر دوڑ دھوپ کر کے ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے ہنہنا رہا تھا۔ آخر مسجد آ گئی۔ اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ پہلی تاریخوں کا ہلال مسجد کے ایک

مینار سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بات یاد آ گئیں۔ جو باجے گاجے لئے مشعلیں جلائے ایک کمزور سی ناؤ پر، چڑھی گنگا کی خونی لہروں کو پار کر کے کنارے آ اُتری تھی۔

بغیا بھی آ گئی۔ اس کے پار آبادی سے ذرا نکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل امید و بیم سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پوتا چھپر۔ دو بڑی بڑی اناج کی کٹھیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اٹھ کر اماں کا گھرڑ گھرڑ چکی پیسنا اور اس پر گانا "موری چھاگل نہ بولے"۔ دن کو کام کاج کر کے آؤ اور لاکھ چلاؤں۔ "اماں روٹی دے، اماں روٹی دے۔" اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ۔ رو دھو کر اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہیں۔ جب اس کا جی چاہتا تب اٹھ کر چولہا جلاتی جمیا اور شبراتن! افوہ! دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی اور تھیں وہ بھی دونوں بڑی حرام زادی۔ کبھی جو کام کرتیں _____ ادھر ابا کلہاڑی کندھے پر رکھے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصہ آیا جو جھونٹے پکڑ کر دھوئیں دھوئیں _____ واہ ری اماں جہاں کسی کا جی خراب ہوا اس کے جی کو لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے۔ ارے آبزا سرداب دوں" _____ ادھر آنجر گجرا اتاروں _____ چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا۔" دونوں وقت ملتے نہ چلا۔ ہر وقت مٹکا اتار رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی ہے _____ کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچے پکے۔ گلے سڑے، کھٹے میٹھے ہی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر سب کھا جاتی تھی۔ کچے پکے امرود، جھربیریاں، کیتھے اور کیا کیا سب شوق سے کھاتی تھی مگر بچوں کا کھانا اسے برا نہیں لگتا تھا۔ وہ قصہ جو ہوا تھا کہ اماں کو کہیں سے گڑ کی بھیلی مل گئی تھی۔ اس نے طاق میں رکھ دی۔ میں ادھر سے آؤں چرا کر ایک ٹکڑا منہ میں رکھ لوں۔ شام کو ابا نے جو دیکھا ذرا سا گڑ تھا۔ وہ لگے ڈکارنے "کون کھا گیا؟" اماں سمجھ گئیں بولیں "چوہے بلی کم ہیں گھر میں۔" "تو کھا گئی ہے تو کیا چوہے بلی گڑ کھاتے ہیں۔؟ اماں نے کہا "کیوں؟ کیا ان میں جان نہیں ہے؟" میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لوٹوں گا تو گڑ کی ایک پاری بھی لاؤں گا۔ تب تو یہی ابا چٹخارے ماریں

گے۔۔ ''واہ کیا مجا ہے۔'' جمیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تکیں گی۔مُنہ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون ہوگا؟ ابّاں امّاں بھلا کیا زندہ ہوں گے؟ ستر اسّی برس کون جیتا ہے۔جمیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ہاں فقیرا تو جوان ہوگا۔بھورے کے بیوی بچّے ہوں گے اور بکریاں؟ اُفوہ کلّو کے ناتیوں کی ناتینیں ہوں گی۔کلّو زندہ ہو تو پہچانے گی؟ جب بھوکی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کر کیسا میں میں کرتی۔

۲

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بغیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بے تابی سے پوچھا ــــــ وہ جگہ تھی وہ ــــــ ہاں ــــــ وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اُجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا وہ۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصّہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر تھا۔آدھا جو کھڑا تھا اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپّر تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔چھپّر کے سامنے کی طرف چوحدّی جگہ جھانکڑوں، تاڑ کے پتّوں اور کسی سوکھی بیل کا مِلا جُلا ایک اژدہام تھا جن کے پتلے پتلے ٹیڑھے سائے کیچوؤں اور کھنکھجوروں کی طرح زمین پر بجبجا رہے تھے۔گھر اپنے سناٹے میں قبرستان تھا۔اندر نہ چولہا جل رہا تھا نہ چراغ۔گھر کی ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں ــــــ تم کو کیا کھلائیں گے؟''

یہی گھر جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔گھسیٹے کی امیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے پچیس برسوں کے کچلے ارمانوں کے خون سے سینچ رہا تھا، اکبارگی مرجھا گیا۔اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہوگا۔وہ لوگ کہیں اور اُٹھ گئے ہوں گے،اور بار بار بکریوں کے موت کی کڑاہند اور نابدان کی سڑاہند جو بوجھل ہوا سے دبی دبی ہوئی گھر کے گرد مقید تھیں؟ ان بالو

کے گھروندوں کو ڈھا دیتیں۔ گھسیٹے آدھ گھنٹے تک جہاں تہاں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں پر ایک پلا رو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی اور یہ کھکھارا، جواب نہ ملنے پر کھکھارا' بار بار کھکھارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا:

''ادھر چلی آؤ نا''

اس دھوکے سے گھسیٹے کی ہمت اور سکڑ گئی۔ اب کی وہ سہارا لینے کو سچ مچ کھکھارا' پھر کہنے لگا:

''کون فقیرا''؟

''ہاں!''

فقیرا ذرا چڑ کر بولا۔ ''تم کون ہو''؟

''ذرا ادھر آؤ''

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا۔ ''تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو۔'

''ذرا سنو تو بھائی، تم فقیرا ہو نا۔''

''ہاں ـــــــ کہہ تو دیا''۔

''تم یہیں رہتے ہو۔''

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ غائب ہو گیا' مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچھوائے اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہوگا۔ آخر دل کھڑا کر بولا: ''میں بائیس روز کا سفر کر کے آرہا ہوں۔ تمہارے پاس۔''

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلا ارادہ اس کی زبان سے نکل گیا: ''تو اندر آؤ''۔ اندر آکر

گھسیٹے کی ہمّت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی امید بھی بلا وجہ ہریانے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ جلایا۔۔ چھپّر کے نیچے سات بکریاں اور بکریوں کے بچے بندھے تھے۔ انھیں سے شاید گھرانے کی روٹی چلتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ کر زمیں پر ایک چھید ہا ٹاٹ بچھا تھا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہو مگر چیتھڑا ہو کر گمنام ہو گئی تھی، اوڑھنے کے لئے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے چراغ کی دُھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دُبلا پتلا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھردری اور اس پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھریاں، جیسے کچّی دیوار پر برکھا کے پانی کی لکیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اس سے زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''بھیّا تم تو جوانی میں ہی بڑھائے گئے۔''

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

''جوانی تو کِھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے۔''

''سچ ہے بھیّا۔۔ بھورا جمیا اور شبراتن کہاں ہیں''؟

اب فقیرا اٹھٹکا۔۔ پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو____ گھسیٹے تو نہیں ہو۔''

''ہاں گھسیٹے ہوں اور کون۔ بائیس دن ٹھوکریں کھا کر آ رہا ہوں۔''

بھیّا کہہ کر فقیرا اس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر اسے لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے، اس کے آنسو ڈھل ڈھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رویا۔ تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے کو ڈھارس دلائی کہ ''اب نہ رو یہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آ گئے۔ اماں کو دیکھو گے؟''

گھسٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اماں!____ ہے کیا؟''

''ہاں''۔

چھپّر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔فقیرا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا:''وہ پڑی ہے''۔

گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں اُدھر بھاگا۔

یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔سر کے بال بیمار بکری کی دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑ کر نمدے کی طرح جم گئے تھے۔آنکھیں دھول میں سوندی کوڑیوں کی طرح بے رنگ اپنے ویران حلقوں میں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ان کے کوئے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔گال کی جگہ ایک پتلی سی کھال رہ گئی تھی جو دانتوں کے غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے نیچے آ گئی تھی۔گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا' بدگوشت ہو یا ورم! جیسے روتے روتے ورم آ گیا ہو۔گردن اتنی سوکھی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آ رہی تھی۔ننگے سینے پر چھاتیاں لٹک رہی تھیں بھینچی ہوئی الٹی بنڈی کی خالی جیبیں چہرے کی ایک ایک جھرّی سخت گھناؤنی مصیبتوں کی مہر تھی جیسے دیکھ کر بے اختیار ڈھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی۔اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالا بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لے جانے لگی۔جیسے گونگا کھانے کو مانگے۔بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آیا تھا۔باب۔باب۔باب۔باب ـــــ با''

اس کی آواز ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھی، جہاں کے رہنے والے آگ سے جل مرے تھے اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کو بندر چیختے اور رات کو سیار روتے تھے۔

فقیرا نے گھسیٹے ہی طرف دیکھ کر کہا: جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا۔منہ سے نکل نکل پڑتا ہے، پھر بھی مانگے جاتی ہے۔''

آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا۔''اماں۔''

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔فقیرا نے کہا'' نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی ہے۔بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔'' بڑھیا کا پوپلا منہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، باب باب کی آواز نکل رہی تھی،اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا مگران حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دو پہر تک مسلسل چکّی پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے اس نے کیسا کیسا اپنا جی مارا۔ذرا ذرا سی چیز کے لئے کیسا کیسا ترستی رہی۔

گھسیٹے کے دل میں ماں کے لئے ترس بھرا پیار اُبل پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور تو اسے ناپاک دنیا سے اُٹھا لے۔اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اسے سکون مل جاتا،مگر افسوس آنسوؤں جیسی نعمت کوسوں دور تھی۔

فقیرا کے لئے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔اس نے کہا____ ''بھیا!تم ذرا ہاتھ منہ دھولو۔میں کھانے پینے کا کچھ سُبیتا کروں۔''

فقیرا بھاگتا ہوا بغیا کے اُس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا اُدھار مانگ لایا اور پھر چولہا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔گھسیٹے بھی چولہے کے پاس آ بیٹھا اور بولا:''اتنا آٹا؟ کیا تم نے ابھی نہیں کھایا۔؟''

''نہیں آج آٹا ختم ہو گیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یوں ہی سہی۔''

''اب کھیتی نہیں ہوتی۔''؟

''وہ کب کی بند ہو گئی۔ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہو گئی۔میں اکیلا رہ گیا۔دو برس تک ترکاریاں ورکاریاں بوئیں مگر وہ بکیں بکائیں نہیں۔لگان تک نہیں ادا ہوا۔''

''بھورے کا ہے میں پکڑا گیا؟''

''سونی چند کی ایک بکری بیچ لی تھی۔پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی

بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہوگیا۔ مگر اس کی طرف سے کوئی کا ہے کو کھڑا ہوتا؟ دو مہینے سب گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا۔ ''فقیرا! مجھ سے تو تیری طرح بھوکوں نہ مرا جائے گا اور نہ اس گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلا سے جیل ہو جائے چار دن عیس تو کرلیں گے ____ دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا ____ بانکے کہتا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔''

''جمیا اور شبراتن کہاں ہیں''؟

جمیا حرام زادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں میں بیاہ ہوگیا ہے ایک امرود کا باغ ہے کسی طرح گزر بسر ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔''

ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر فقیرا روٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا:

''تمہارے جانے کے بعد بھیا وہ آفتیں آئیں۔ سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا جمانا' تھا ابا کہا کرتے تھے کہ ''یہ سب پلتے پیٹ بھرے میں پیٹ بھرے''۔ سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گذری، جب چولہا نہ جلا ہو۔''

گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہوگیا اور لپکتے کوئلوں کی طرف تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈ رہا ہو۔

فقیرا نے اس سناٹے کو توڑا۔ ''کہاں کہاں رہے گھسیٹے؟''

ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ تھے۔ گھر یاد کر کر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گذری وہاں، ملوں کی خاک چھانی، امیدواری میں کام کیا، بھوت گھر میں روئی ڈھوئی، ہفتوں قبض رہتا تھا، چار سال رکشا چلائی، پھر خونچہ لگایا ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے کو ذرا پیسہ ہو اس کے لئے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے ویسوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو روئے رُلائی بھی نہیں آتی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پر رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ کر کھانے لگے۔ فقیرا بولا: ’’بھیا ذرا چپکے چپکے کھاؤ، اماں سُن لے گی تو چلاّ چلاّ کر رات بھر نہ سونے دے گی۔‘‘

گھسیٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا۔ ’’تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی۔‘‘

’’ہاں، مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سُن لیتی ہے اور کھانے کی بو بھی پا لیتی ہے، اور پھر باب، باب کرنے لگتی ہے۔

گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرف تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منہ کا نوالا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اُتار سکا۔

۳

گھسیٹے گھر کے دوارے ہونٹوں پر بکری کا مسکا ملے، دھوپ میں ننگے بدن بیٹھا، اپنے میلے کرتے کے چلوے چُن رہا تھا۔ کئی روز سے ہاتھوں، پیروں اور ہونٹوں کو چٹخانے دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے جن میں سیکڑوں میل کا گرد و غبار بھرا تھا جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کر جھک جاتے تھے اور بے کسی سے اپنے پتے پھڑپھڑاتے جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو للہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چادروں کو بدن پر سمیٹے، ہاتھ پاؤں سکیڑے کندھوں کو آگے جھکائے سُو سُو کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اجاڑ اجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا کہ چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن وہ ٹوٹے پھوٹے ویران چھپّر بکریوں کے مُوت کی کھراہند اور اپنی ماں کی باب، باب سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلانا اور بکریاں چرانا اور رات بڑے کی روکھی سوکھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو بھی فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی! افوہ! بدن ہے کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کھویا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک سب سے بڑی کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھسیٹے کو یہاں کی

کسی چیز ، سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں روکھی پھیکی۔ گاؤں کی عورتوں میں شرم اور کھچاؤ۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانے دار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے اور فقیرا؟ وہ بات بات میں باپ بنتا ہے۔ سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسے کمانے کا کوئی راستہ نہیں، دمڑی کے لئے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔

گھسیٹے چلوے مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ دکانوں کے تختوں پر رات کاٹنا ،وہ سڑکوں پر جو جاڑوں میں برف کی سلی اور گرمیوں میں دہکتا ہوا توا ہوتی تھیں، خچر کی طرح رِکشا لے کر دوڑنا۔ وہ کبھی کبھی تین تین فاقے کر لینا۔ اپنا گھر اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والی سنگل چائے وہ دھیلے والا کا بیڑا! وہ پیسے کی پچیس بیڑیاں! یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لئے وہ یہاں ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے سڑک کے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کے ججمانوں کی مار کھائی۔ کھانے پینے کو ترستے رہے، پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کو شہر بھاگے، وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائی، کہا چلو کلکتہ چلو، وہاں پہنچتے ہی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا، کلکتہ کے پچیس برس! افوہ! کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، رکشا تک چلائی، سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو جمانتی لاؤ۔ میں کیسے لاتا؟ جو واں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے، گھرانے کے گھرانے رہتے تھے۔ جمانتی لے آتے تھے۔ پچھن بولا۔ دو آنے روز دو کلوٹا مہاجن جمانتی ہو جائے گا۔ دو آنے اسے روز دئے، پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اسے دور سے ہی دیکھ کر لوگ ہٹ جاتے تھے۔ جب سیٹھ سے خوشامد کرو کہ ایک اچھی گاڑی دے دو تو وہ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جما کراؤ نا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑے مگر رہے وہی موچی۔ کے موچی بخار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ اسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئے، اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اب خبردار رکشا نہ چلانا اور نہ ہی

زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض اُدھار کر کے پان سگریٹ، دیا سلائی کا خنچہ لگایا۔ اب جو آتا کہتا سیزر لاؤ، نیبی کٹ لاؤ، یہ لاؤ وہ لاؤ۔ یہاں کیا تھا؟ کہتے ''نہیں ہے صاحب، نہیں ہے ہجور''۔ وہ بھی تماشا کچھ دنوں رہا، بیٹھنے کو اچھی جگہ تھی نہ اچھا سامان تھا۔ اس پر جو کچھ بھی آیا م حرام زادی بھنگوئی کھا گئی ___ نہ جانے مجھ سالے کو عورت رکھنے کی کیا پڑی تھی ___ لنگوٹی میں پھاگ ___

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقیرا سامنے آیا اور آتے ہی کڑے پن سے بولا۔ ''پھر تم نے چرا کر دودھ بیچ لیا۔ ہمارا تمہارا گذارا نہیں ہوسکتا۔ جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ''۔

گھسیٹے نے جواب دیا۔ ''کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ روز کا یہی قصہ، روز کا یہی قصہ،۔ بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصہ ہی نہیں''۔

''گھر میں حصہ، بکریوں میں حصہ، تُو حصہ بتائے گا؟ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔ پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے، گیا تھا روپیہ کمانے!''

گھسیٹے گرم ہو کر بولا۔ ''کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؟ تو خود تو زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی باتیں کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کے لیے تکڑم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ کھو کر سیکھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کہ آپ ہی آپ؟''

فقیرا نے طعن سے کہا: ''ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں وہ روپیہ کے ڈھیر تو لیکر جاتے ہی ہیں۔ بلّی جو اتنا روپیہ لایا ہے تو کیسے لایا ہے؟''

اب تو گھسیٹا تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سُن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں رہ کر کچھ نہیں کیا بالکل ہی نہیں سُن سکتا تھا۔ وہ چلّا کر بولا:

''اور تو نے کیا کر لیا ہے چوٹٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں 'اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا ؟سب کا سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے۔ میں آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا.........''

گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ وہ اپنا سر پھوڑ ڈالے جان نکال کر رکھ دے۔ کیا کرے جو فقیرا کو یقین دلا دے کہ کلکتے میں میں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔

کچھ یوں ہی تو تو میں ہوتی رہی۔ پھر فقیرا بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔

یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا بلکہ پورے چار مہینے سے ہو رہا تھا۔ روز یہی جھگڑا اُٹھتا، روز ہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کلکتہ کی یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید اب میں ہمیشہ کے لئے اس اجاڑ گاؤں میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بتانا ہے کاش ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آجاتا جو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی آتما کو سکھ دے لیتا۔ چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو دوارے بھینس بندھی ہو، کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھر والی ہو جو ساری کے پلو سے تھالی صاف کرے، اس میں دال بھات لا کر سامنے رکھ دے، اس کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف چھپّر ہو، دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی۔ بس ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب کہاں گھر والی کی خواہش اور کہاں بچّوں کا ارمان۔ چالیس کا سن ہونے کو آیا____

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اُٹھی کہ اب دو چار برس جوانی اور ہے پھر اندھیرا پاکھ۔ جانے کب موت آجائے۔

ایک زبردست اُمنگ اُٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مارو۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا

۔ پھر اس نے فقیرا کو پکارا۔ ''بھیا فقیرا!'' فقیرا پیار کی پکار سن کر فوراً پاس آ گیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حصہ کا کا ایک دم لے چکا تو گھسیٹے بولا: ''میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو کہ جس سے کچھ ملے۔ ارے ارے بھیا تم کہتے ہو کہ کلکتہ میں میں نے پچیس برس بھاڑ جھونکا، مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنا تو سیکھ گیا ہوں کہ کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگائیں، یہ کریں وہ کریں، سچ کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے۔؟''

گھسیٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے ابھی بات نہیں ہوئی پھر فقیرا کی طرف دیکھ کر بولا: ''اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں ___ وہ تم مانتے ہی نہیں ___ اس میں تمہارا بھی بھلا، ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہوں گے تو ہماری برائی کو بھی اچھائی کہیں گے۔ جوگیوں کو دیکھو، ان کے گھر ہُن برس رہا ہے ہُن کہنے کو ہم شریف اور وہ ہر ذیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آئے دن دوڑے جاتے ہیں کہ اچھے منگلو سیر بھر آٹا اُدھار دے دو، دو کنکریاں نمک دے دو' ذرا سی تمبا کو دے دو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں، دھتکاری بھی دیتے ہیں، مگر ہم پھر جاتے ہیں نہ جائیں تو کیا کریں؟''

فقیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا، گھسیٹے گھسیٹے پھر دم لے کر کہنے لگا: ''اور ہم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا؟ کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں چین سے الگ ہی رہ لیں گی۔''

گھسیٹے نے اک دم سے کچھ یاد کر کے فقیرا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا: ''ہاں تمہارا سادی بیاہ کرنا ہے روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سہی۔ ارے ہاں! اس طرح تو کہیں بھی نہیں کر سکتے اور پھر یہ اماں کے لئے بھی اچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا۔''

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا۔ مگر تب انھیں سُن کر فقیرا کو غصہ آ گیا تھا۔ روپیہ کے لئے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج ہے تو کل گیا۔ اور شرافت وہ دھن ہے جو پیڑھیوں چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا ہے۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی کیچڑ میں سوند جائے، جب بھی مانجھو چم چم کرنے لگتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے۔ مانا جوگیوں کے پاس روپیہ ہے، پیسہ ہے، گھر گرہستی ہے ہم ہی ان کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے، ہم ہی ان سے روٹی ادھار مانگتے ہیں، وہ نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہاتھی لاکھ لٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ اور وہ مکھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چبوترے پر بیٹھیں گے اور وہ دور زمین پر۔

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا، تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور گھسیٹے روپیہ کا گٹھر لے کر نہیں لوٹا، اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو کہاں پیسہ ملتا ہے۔ پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب ہی کیوں رہتا۔؟ اس جیون میں بس یہی ہے اپنا دوزخ پاٹ لو اور موقع ملے تو کسی سے ہنسی، دل لگی کر لو، اور کیا دھرا ہے؟ بھورے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سو گئی۔ لیکن اب جو گھسیٹے روزانہ شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سا فارغ ہو کر بیٹھتے، آس جگانے کا منتر اسی موہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس چونکی، انگڑائی لے کر اُٹھی اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی فقیرا جسے کل تک کی کوئی فکر نہ تھی، آج جو مایا کے مندر کی راہ سُوجھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے، ذرا یہ چھپّر بدل جاتا، تھوڑی سی بکریاں اور ہو جاتیں اور ذرا چار پانچ روپے اکٹھے ہو جاتے تو پھر ہمارا گھر بس جاتا۔ ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا، وہ رمضانی کی بیوہ، آنکھ ملاؤ تو کیسا ہنستی ہے، اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے، کیسا گدرایا بدن ہے۔ جیسے پکّا آم۔ کیسا ٹھک ٹھک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے وہ۔ دودھ وہ دوہے، اُپلے وہ تھاپے، دہی وہ متھے، اکیلی جھوؤں پانس اُٹھا اُٹھا کر کھیتوں میں وہ ڈالے، کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھا لے گا پھر میں منہ تکتا

رہ جاؤں گا۔

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیال گونجنے لگا ، وہ رمضانی کی بیوہ سے کنی کاٹنے لگا۔ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا۔ پندرہ بیس روز یوں ہی کٹ گئے ۔ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ اکبارگی پیچھے سے آگئی۔ اسے بھاگتے نہ بنی، کچھ باتیں ہوئیں، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی، پھر وہی جس کا فقیرا کو دھڑ کا تھا یعنی اسی دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

۴

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی مدھم روشنی میں اٹھے اور ٹوکرے کو بانس سے لٹکا کر ایک ڈولی سی بنالی اور اس میں خوب سا پیال بھر دیا اور پھر بڑھیا کے پاس گئے ۔گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھپکلی کی طرح اُٹھالیا۔آنکھ کا کھلنا تھا وہ لگی باب، باب، باب کرکے اشارے سے کھانا مانگنے۔گھسیٹے نے پہلی بار اسے چھوا تھا۔ اسے ایک عجیب اذیت ہوئی جس سے اس کا چہرہ ہونق ہوگیا۔ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔اور دوسری بدن کے روئیں کھڑے ہوگئے تھے۔

گھسیٹے نے اسے لے جاکر آہستہ سے جیسے کوئی شیشے کا برتن ہو،ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اسے چیتھڑوں میں چھپادیا۔

ایک طرف کا بانس فقیرا نے تھاما اور دوسری طرف گھسیٹے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔ بکریاں ان لوگوں کو جاتے دیکھ کر بے کسی سے میں میں کرنے لگیں۔

جیسے یہ لوگ ان کو ہمیشہ کے لئے بے یارومددگار چھوڑے جارہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے کالے پردوں کی اوٹ میں منہ چھپائے ہوئی گاؤں کے نکڑ پر آگئے تو پو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کر چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے

لگا: ''کہاں چلے فقیرا؟''

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو برماتا نکل گیا اس کے کندھے کا بانس کانپا۔ کسی وجہ سے گھسیٹے گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اُٹھا: ''شبراتن کا حال خراب ہے۔ اماں کو لئے وہاں جا رہے ہیں۔''

''اماں کو لئے۔؟'' کسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اُٹھا۔

''شاباش تم لوگوں کو، اپنی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہوں!'' شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا، اس وقت فقیرا اور گھسیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر، ایک گلی میں آکر ڈولی رکھی گھسیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی، اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر اس کا کانپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں دو چیتھڑے باندھ کر اس پر رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باب باب کرتے وقت کہیں ہاتھ بجائے منہ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے مگر احتیاط فضول تھی کیوں کہ دس برس سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منہ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے اب سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہیں تھی۔

بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ ہچکولے کھاتے کھاتے اور رات رہے سے اس وقت تک باب باب کرتے کرتے اتنی تھک گئی تھی کہ بلا چلائے اور کھانا مانگے، جیسے بٹھائی گئی تھی ویسی ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو بُری رہی۔ ساری کی کرائی پر پانی پھر جاتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، فوراً گھسیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرا مانگا۔ اس نے تھال پر چمٹی ہوئی بھڑوں اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کو اڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا اور جتنا شیرا بہہ آیا اسے انگلی سے پونچھ پونچھ کر ایک پتہ پر ٹپکا کر گھسیٹے کو تھما دیا اس نے لا کر شیرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اس کا چاٹنا تھا کہ وہ فوراً باب، باب کر کے مانگنے لگی۔

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آ گئی۔ گھسیٹے نے پتہ فقیرے کو پکڑا کر ہدایت کی کہ

وہ موقع پر بڑھیا کو ایک انگلی چٹا دینا۔ فقیرا زندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی، بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دکانوں سے وہ بھونچکا ہو گیا تھا، عقل چندھیا گئی تھی۔ اس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آ گئی تھی۔ گھسیٹے مشاق پیراک کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی چہلیں کرنے لگتا ہے اور فقیرا نوسکھئے کی طرح جو پانی دیکھ دیکھ کر سہا جاتا ہے، گھسیٹے فقیرے کو حکم دے رہا تھا اور وہ کل کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لیکر مسجد کے سامنے آئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کٹی انگلیاں اور بیٹھی ناک والے کوڑھی منمنا کر ڈراونی آواز میں بولنے والی آتشکی بڑھیاں، چندے چڑے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے۔ جو نہ جانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے، پھیکے، بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوڑوں کا جنگل اور بدن پر میل کی کہگل، چیتھڑے، ٹھیکرے، میل آخور، بلغم، ناک، پیپ، مکھیاں، جراثیم، فریب، جھوٹ اور ان سب کو ڈھانک دینے والی لوریاں دے دے کر، تھپک تھپک کر سلا دینے والی مہاپاپن بے حسی!

____ اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیرا نے بھی ماں کی ڈولی لیکر غوطہ مارا۔ میل کچیل ہو، چاہے ذلت ہو، حیوانیت ہو، چاہے انسانیت ہو، مایا کے مندر کو یہی راستہ جاتا ہے۔ اس وقت جبکہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں، اکیلا یہ کھلا ہے۔ صاف سیدھا راستہ، تنہا راستہ، پھوٹی آنکھ کا دیدہ۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا: ''ابے ادھر کہاں آیا؟ بھاگ یہاں سے۔''

پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیوں کہ ان کی ڈولی دیکھ ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی تھی۔ فقیرا کی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھا وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اس نے دو چار ماں بہن کی سُنا کر کہا: ''تمہارے باپ کی زمین ہے چپ

رہو ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔"

ڈانٹ سُنتے ہی فقیر تو ذرا ذرا بڑبڑا کر چپ ہو گئے مگر بوڑھیاں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کے لالچ میں دوڑا جا رہا تھا، ان کو ڈانٹ کر کہا: "چپ رہو بدنصیبو نماز ہو رہی ہے۔"

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے، کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ اگر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا بوتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کی فضا سے فقیرا ایسا متاثر ہوا کہ اس نے بے سمجھے بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی شیرا چٹا دیا۔ شیرا لگتے ہی گراموفون کے ریکارڈ کی طرح وہ بجنے لگی اور مشین کی طرح اُس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچّے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو لایا تھا، گود میں سہم کر روز سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جوان اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بٹوا لئے ادھر سے گذر رہی تھی۔ اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔۔ جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کتّے کے سامنے تر نوالے پھینک دیتا ہے کہ وہ ہمیں بھول کر اس میں جٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اس کے ہاتھ میں تھوڑی دے گا، دیگا بڑھیا کو۔ اس کے سامنے کوئی چادر ہونی چاہیے جس پر آ کر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنی انگوچا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھوکا ہوں بابا، بھوکا ہوں بابا، ایک فقیرنی گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک تگڑا حلق پھاڑ پھاڑ کر آوازیں لگانے لگا۔ "جب دیگا اللہ ہی دیگا" فقیرا بھیڑ بھاڑ دھکم دھکّا اور شور

ہنگامے سے ایسا بھونچکا ہوا کہ منہ پھیلا کر ایک طرف تکنے لگا اور شیر اچٹانا بھول گیا۔ گھسیٹے نے چلاّ چلاّ کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا جب اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے پتہ چھین کر خود ہی چٹا دیا۔ شیرے کا لگنا تھا مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے۔ پہلے سے اس نے کوئی صدا سوچی نہیں تھی۔ جلدی میں اس کے منہ سے نکلا ''اللہ ہر آفت سے بچائے۔'' اس صدا کو اس طرح دینے لگا، جیسے کوئی والنٹیر انقلاب زندہ باد کہے، کیوں کہ دوسری لے اسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ ادھر دیکھ لیتے، دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی۔

یہ درد انگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا۔ جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ آس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ یا ایک ایک دو دو پیسے لئے حسرت سے ان دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے اور دل دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڑھیا چیز کیوں نہیں ہے۔ گھسیٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی غرور سے متوالا ہو گیا۔ اور خوب کڑک کر صدا لگانے لگا آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشہ میں وہ گھسا تھا اس میں چوٹی پر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہوتا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان، اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر دونوں نعمتیں میسّر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامنے ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی کیا خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا دیکھو پیسے کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے تو جیون کا کھیون ہارے ہے مالک۔ اماں زندگی بھر کوشش کر مریں کہ کچھ پیسہ جوڑ کر گھر کی حالت سدھاریں ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں ____ حیلے روزی بہانے موت۔

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور فقیرا ڈولی لئے شہر کے باہر ایک شاہی کھنڈر کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے پھرتے رہے، تکان سے چور چور تھے

مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے، گا رہے تھے اور زور زور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سائے میں یہ ڈولی اتار دی گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے، دال بھات اور ترکاری ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر ماں کی گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینا سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں تھیں بہت سی تیل کی پوریاں، کئی قسم کی ترکاریاں، پچمیل مٹھائی، چٹ پٹے کباب، مولیاں اور بیڑی کا بنڈل۔ آج کے پھیرے میں پونے دو روپے ملے تھے۔ جس میں سے ڈیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے بھی گھسیٹے کی جیب میں اچھل رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں چن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا ڈھیر تھا جس طرح چاہے کھاؤ اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی ایک ایک ڈلی منہ میں ڈالی اور بدحواسی سے ان کو نگل گئے۔ پھر مربھکوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے گویا زندگی بھر کی بھوک اسی ایک آن میں بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی، ایک پوری کا ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دوزخ میں اتار لیتے۔ اس شور سے بڑھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی، اب دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

''لو آج تم بھی مزے دار چیزیں کھا لو۔ کبھی کاہے کو کھائی ہوں گی۔''

گھسیٹے نے کچھ نکتیاں اس کے منہ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بدحواسی سے باب، باب کرنے لگی۔ حیرت کی بات ہے وہ کسی نہ کسی طرح ہاتھ پیروں کو ہلا جلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک دفعہ اپنے منہ میں بھر لے۔ فقیرا اور گھسیٹے کے لئے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ ادھر اس کے منہ میں کچھ دیتے اور اُدھر وہ نگل کر مانگنے لگتی ____ گھسیٹے جھلا کر بولا ____ ''لو تم بھی کیا یاد کرو گی۔''

دانت سے کاٹ کر مولی کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے مُنہ میں دے دیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش اسے چبانے لگی مگر چبتا کیا وہ بار بار منہ سے نکل آتا اور پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اسے اندر ٹھیل لیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پاٹنے میں جُٹ گئے ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور آگے پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اُسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزان لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ اسے پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلاّ پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی مٹھی میں زور سے دبا لیا اور منہ کی طرف چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلےّ کی پکڑ بے تکی تھی، وہ کسی طرح منہ کے اندر نہ جاسکا۔ رس گلاّ دب رہا تھا۔ اس کا شیرا ٹھڈی باچھوں سے ہوتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں میں بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہو گئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ بیٹوں کا ہاتھ تو سُست ہوتا گیا مگر ماں کا باب باب تیز ہی ہوتا گیا۔ آخر جب گھسیٹے اور فقیرا میں نگلنے کی بالکل سکت نہ رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سے سرکا دیا، اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاّتی رہی۔ آخر چلاّتے چلاّتے تھک کر وہ بھی ٹوکرے میں گر پڑی۔

فقیرا بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں چھپّر نیا ہو گیا تھا۔ اسمیں ایک طرف لپا پتا چولہا تھا جسے رمضانی کی بیوہ جھکی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلہ لئے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوہ جلدی جلدی گرما گرم سُرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں (گھر میں پھول کی تھالی بھی آ گئی ہے۔) ایک طرف بکری کا مسکا بھی ہے ـــــــ فقیرا خوش

تھا۔ بہت خوش۔

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی سی کامیابی! پونے دو روپے اور صرف ایک دن میں! پچاس روپیہ مہینہ! افوہ! اگر ہم کہیں کلکتہ میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی! سنگل چائے، بیڑیاں، تاڑی خانہ، بھنا گوشت، وہ سالی نخریلی رنڈیاں، وہ ان کا مٹک مٹک چلنا، گود میں بل کھا کھا جانا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ کچھ دیر انہی خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ سب بکریاں اپنی کر لی ہیں۔ حصّہ مانگا تو سسرا بگڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اماں میں بھی حصہ بٹائے گا ____ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب فقیرا کا حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی، آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ امّاں کو میں نہیں دے سکتا۔ اگر وہ تکرار کرے گا تو ماروں گا، سر پھوڑ دوں گا ____ حرامی سالا فقیرا!''

گھسیٹے سوچ سوچ کر کھولنے لگا فقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا۔ ''فقیرا سونا بعد میں پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چک جانا چاہیے۔''

''کاہے کا حصّہ بانٹ؟''

''ہاں اب تو کہو گے کاہے کا حصّہ۔ ارے گھر کا، بکریوں کا اور جو کمایا ہے اُس کا۔''

فقیرا تلملا کر اُٹھ بیٹھا۔

''پھر وہی گھر بکریاں۔ ہزار بار کہہ دیا کہ ابا کا بنایا چھپّر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ میں نے بنوایا ہے۔ اور وہ بکریاں بھی مر کھپ گئیں۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں چلا ہے حصہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تو جو ہماری روٹی توڑتا رہا ہے؟''

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصّے میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا: ''اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم

ہی لے جاؤ۔ مگر لاؤ ہماری اماں کو ہمیں دے دو۔ اتنے دنوں اگر تم نے کھلایا ہے تو اب ہم بھی کھلائیں گے۔

''ہاں اب تو تو کھلائے ہی گا؟ پندرہ برس میں پالتا رہا۔ گو، موت صاف کرتا رہا۔ تب اماں کی یاد نہ آئی۔ اب جو کمائی کے قابل ہوگئی تو اماں تیری ہے۔ تجھے دے دوں؟ مجال ہے تیری تو لے جائے؟''

گھسیٹے پر بھوت سوار ہوگیا اور وہ غصّے میں ماں کی طرف لپکا۔ جیسے اس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا، مگر فقیرا فوراً کود کر سامنے آ گیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارہ حد سے اونچا ہوگیا۔ اس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکّا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا گویا گھڑی ہے۔ جس طرح بلّی چوہے پر جھپٹتی ہے فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلّی کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو عوعو کر کے حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوئی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں گئی تھی۔ نہ جانے فقیرا جیسے ہی اس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا ہے گھسیٹے بھوکے بھیڑیے کی رطرح اس پر پھاند پڑا۔ وہ تڑسے کھڑے قد نیچے گر پڑا۔ اور بڑھیا چیختی، قلابازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اس کے سینے اور منہ پر گھونسے جمانے لگا۔ گھسیٹے جیسے جیسے گھونسے مارتا ویسے ویسے زور سے گلا دباتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دئے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈیلے غلوں کی طرح باہر نکل آئے، منہ بھیانک ہوگیا اور ہاتھ پاؤں بر رگئے۔ اب گھسیٹے کا غصہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہوگیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ رام لیلا کے بیچا کی طرح ہونق ہوگیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لیے۔ کلکتہ میں ایسے ایسے کئی قصے یہ دیکھ

چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کسے پرواہوتی ہے۔۔ مر گیا ____ مر گیا ____ ہا ____ فقیرا ____ ناحق مرا۔ مان لیتا میری بات۔ میں نے کیا برا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک امّاں تم نے رکھی ہے۔ اب مجھے دے دو۔ ارے ہاں۔ میں بھی تو کچھ دنوں زندگی کی بہار دیکھ لوں۔ میرے بھی تو جان ہے۔ مجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا، جیسا کیا ویسا بھگتا۔

ہاں جلدی سے امّاں کو لو اور بھاگو ____ پیاری امّاں ____ کلکتہ وہاں کی بھیک کا کیا کہنا! اب مزا ملے گا کلکتہ کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مُڑا، دیکھا تو وہ آدھی چت آدھی پٹ، مٹی کے چونتھ کی طرح ڈھیر ہے۔؟ آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔ منہ کلھیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک میں لتھڑی آدھی چبی آدھی پوری غذا نکل رہی ہے۔ نکتیاں، گلاب جامن، پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے۔ لونڈے کے لونڈے۔ زرد زرد پھین۔ گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا ____ بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونا بلاؤ کا بھٹ معلوم ہوتا تھا۔ پت جھاڑ ہوا کے جھکڑ سینکڑوں میل سے درختوں کو تاراج کرتے مردہ پتّیوں کو اٹھا اٹھا کر پٹکتے۔ وحشت ناک سُروں میں سائیں میں سائیں کرتے ایک طرف سے آرہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جارہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اڑا کر لے جائیں گے، گھسیٹے ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی۔ دونوں کے پہلو میں اس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مر کر وہ اس کی دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔ اس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی۔ فقیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اس کی یاد کلکتہ کی بے کسی میں بھٹکے مسافر کا دیا تھی۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا کا رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب تو کشتی کنارے لگ چکی ہے پیشہ

مل گیا ہے اور اس کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آ گیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا مگر ابھی خود اس کے قابل نہیں بنا تھا____ امید کی آخری کرن ڈوب گئی۔ اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں، طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف تھیں۔ اس کے بھیانک بھنور منہ پھاڑے بڑھ رہے تھے اور پاس تنکے کا سہارا نہ تھا۔

گھسیٹے سر جھکائے افق کی طرف چل کھڑا ہوا۔

الیاسف نے پہلے بستی کو جانے کا خیال کیا مگر خود ہی اس خیال سے خائف ہو گیا۔ اور الیاسف کو بستی کے خالی اور اونچے گھروں سے خفقان ہونے لگا تھا اور جنگل کے اونچے درخت رہ رہ کر اسے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ الیاسف بستی واپس جانے کے خیال سے خائف چلتے چلتے جنگل میں دو نکل گیا۔ بہت دور جا کر اسے جھیل نظر آئی کہ پانی اس کا ٹھہرا ہوا تھا۔ جھیل کے کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا۔ جی ٹھنڈا کیا۔ اسی اثنا میں وہ موتی ایسے پانی کو تکتے تکتے چونکا۔ یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اک چیخ نکل گئی۔ اور الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا۔ اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

☆☆

قاضی عبدالستار

مالکن

۱۹۵۰ء میں جو سیلاب آیا تھا، اس نے سیتا پور سے لے کر لکھیم پور کھیری تک کے سارے ''گانجر'' کے علاقے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا لیکن گھا گھرا نے کمال ہی کر دیا صدیوں سے بنا بنایا راستہ چھوڑ کر سات میل پیدل چل کر آئی اور سڑک کاٹنے والے انجن کی طرح چھوٹے موٹے دیہاتوں کو زمین کے برابر کرتی ہوئی رونق پور میں داخل ہوگئی۔ رونق پور پہلے ہی سے خالی ڈھالی کی طرح ننگا پڑا تھا سارے گاؤں میں بس حویلی کھڑی تھی۔ حویلی کی کھڑکیوں سے اکا دکا بدحواس آدمیوں کے چہرے نظر آجاتے تھے جیسے شہد کی مکھیوں کے بڑے چھتے لٹک رہے ہوں۔ حویلی کچی تھی لیکن کوئی سو برساتوں کے خلاف سینا تانے کھڑی تھی۔ اس کی دیواروں کے چوڑان پر جہازی پلنگ بچھائے جا سکتے تھے مشہور تھا کہ ایک نوسکھیا چور رونق پور کے نجیب الطرفین کا مہمان ہوا۔ رال ٹپکاتی نظروں سے دیکھ ہتھیلیاں کھجلانے لگا اور کنکھیوں سے ہاتھ کی صفائی دکھلانے کی اجازت طلب کرنے لگا میزبان کو دل لگی سوجھی اس نے کچھ اتا پتا بتا کر آدھی رات کو رخصت کر دیا۔ مہمان ایک دیوار پر سابر لیکر جٹ گیا کھودتا رہا۔ یہاں تک کی فجر کی آذان ہوگئی۔ دیوار اسی طرح کھڑی تھی اسی ٹھاٹ باٹ سے کھڑی تھی۔ وہ بیچارہ نامراد واپس ہوا۔ لیکن بنانے والوں نے حویلی بنائی تھی ''جل بھون'' نہیں بنایا تھا اوپر سے ہتھیا نکہت برستا تھا اور نیچے بر جھائی ہوئی مست ہتھنی کی طرح گھا گھرا چولی کر رہی تھی۔ پہلے پھاٹک گرا پھر دیوان خانہ جو ڈیوڑھی گر گئی اور اندر کئی درجے بیٹھ گئے جب چودھری گلاب کی نمک حلالی کو غیرت آئی۔ علاقے بھر کے نامی کہاروں اور پچھڑوں کی چھوٹی سی فوج بنائی اور ان کے بازو کے بجرے پر چڑھ کر تھان گاؤں سے نکلے اور رونق پور کی حویلی

پراتر گئے دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی مالکن کو کانپتی ہوئی آواز میں خطاب کیا۔

''حضور اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے حکم دیجئے تو جان پر کھیل کر پالکی چڑھالاؤں اگر سرکار کی جوتیاں تک بھیگ جائیں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔گھاگھرا کی پاگل موجوں کی دل ہلا دینے والی بھیانک آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔چودھری گلاب نے آہستہ سے پھر کہا___ تو آواز آئی۔

''تم کیسی باتیں کرنے لگے ہو چودھری گلاب خدا نہ کرے میں اپنی زندگی میں حویلی کے باہر قدم نکالوں اور مرنے والے کے نام پر سیاہی لگاؤں۔کوئی سو برس پہلے یہی جہاں اب حویلی کھڑی ہے یہاں رونق پور کا قلعہ تھا۔اسی طرح گھاگھرا کی موجوں کی طرح انگریزوں کی توپیں آئی تھیں۔ان سے آگ برستی تھی اور قلعہ جل کر خاک ہو گیا تھا تو کیا ہم بھاگ گئے تھے۔؟......ہم مٹ گئے تھے۔سو ہم آج پھر مٹ جائیں گے۔''چودھری گلاب کھڑے رہے مالکن پیچوان کی گڑگڑاہٹ سنتے رہے۔

ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔میر محمد علی بیگ مر چکے تھے۔میر محمد علی بیگ کی بیوہ رونق پور کی ''مالکن''پر کسٹوڈین کی مصیبت نازل ہو چکی تھی۔میر محمد علی بیگ نے نقدی میں چھوڑا ہی کیا تھا؟اور انہیں کچھ چھوڑنے کی پڑی ہی کیا تھی!نہ آل نہ اولاد،ایک میاں بیوی اور اتنی بڑی جائداد۔مالکن نے گہنے پاتے بیچ کر حکومت کو یقین دلانے کی کوشش کی کے میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان گئے ہیں۔برسوں کی مسلسل اور یقین دہانی کے بعد ایک روز چودھری گلاب الہ آباد سے یہ پروانہ لائے کہ حکومت نے مان لیا کے واقعی میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان گئے ہیں وہ رات عجیب رات تھی۔مالکن ساری رات جانماز پر بیٹھی رہی ساری رات شکرانے کی نمازیں پڑھتی رہی۔عورت ساری رات حقے کی چلمیں بھرتی رہی اور چلمیں سلگ سلگ کر جلتی رہیں اور صبح ہوتے ہی حویلی کے سامنے پٹواری نے ڈگی پیٹ کر زمینداری کے خاتمے کا اعلان کر دیا پھر تو جیسے لٹس مچ گئی۔دور دور تک پھیلی ہوئی زمینیں اور باغ درخت گھٹیا بتاشے کی طرح بٹ گئے جیسے بندوق کا فائر

ہوتے ہی پرندوں کے غول اُڑ جائیں۔ مگر مالکن نے ہمت نہ ہاری چودھری گلاب کو ہدایتیں دے کر انگنت مقدمیں لڑتی رہیں۔ جیسے حضرت محل نے غدر میں فوجیں لڑائیں تھی شکست تو حضرت محل کی طرح رونق پور کی مالکن کو بھی ہوئی۔ لیکن حضرت محل کی طرح رونق پور کی مالکن نے شکست مانی نہیں مگر کب تک؟ ایک ایک کر آدمی بکھرنے لگے عورتیں نکلنے لگیں آخر چودھری گلاب نے بھی جانا کم کر دیا اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے تیرے میرے لئے مقدمیں لڑانے لگے ہولی دیوالی پر آتے اور پاؤ سیر مٹھائی کا دونا نذر میں بھیجتے اور وضع داری کو نبھائے جاتے۔

مقدمے جونک کی طرح لگ گئے اور مالکن کا ایک ایک قطرہ چوس لیا۔ اور اندر سے باہر تک سب اجڑ گئے۔ بیل، شامیانے چھلداریاں، جامے، قالیں، دیغ، پتیلے کرسی، میزیں، پلنگ، پیڑھی سب باورچی خانے کو زندہ رکھنے کے لئے کر مر گئے۔

پھر ایک دن جب وہ نماز پڑھ کر اٹھیں۔ مونجھ کی پٹاری کے پان دان سے کھجور کی گٹھلیوں کے دو ڈلے اور پتی کے تمباکو کا پھنکا لگا لیا اور کھنڈر کے اس حصے کی طرف چلیں جو کسی زمانے میں باورچی خانہ کہلاتا تھا۔ بغیر دروازوں کے لمبے چوڑے کمرے کے کونوں میں لڑھکی ہوئی مٹی کی ہانڈیوں کے منہ دیکھے جوان کے پیٹ کی طرح خالی تھے گھٹنوں پر ہتھیلیاں جما کر آہستہ آہستہ وہیں زمین پر بیٹھ گئیں جیسے جواری سب کچھ ہار کر بیٹھ رہے۔ ان کے لنگڑاتی ہوئی نگاہیں اس سنسان ویران لق ودق کھنڈر میں دیکھتی رہی، جس کی چھتیں گر چکی تھیں۔ دھنیاں جل چکی تھیں۔ دروازے بک چکے تھے اور جس کی در و دیوار خدمت گزار انسانوں کی مودب پرچھائیوں کے رت جگوں کو ترستے تھے اور شاید ترستے ہوئے بھول چکے تھے ان کی بھوکی آنکھوں سے دو میلے میلے آنسو گرے اور پیوبند لگے ہوئے سوتی تنزیب کے میلے دوپٹے میں کھو گیے پھر انہوں نے ایک انجانی آہٹ محسوس کی اور کسی نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا لیکن کانوں سے ٹکراتی ہوئی اس مقدس آواز کو سنتی رہیں جس میں مامتا کا رس ٹپک رہا تھا۔

"زیب النساء بیگم .... تم اشراف زادوں کی اولاد ہو جن کی تلوار نے سلطنتوں کی

تقدیریں لکھی ہیں اور تخت و تاج کے فیصلے کیسے ہیں تم ان درویشوں کی بیٹی ہو جن کی قلم نے قرآن شریف نقل کئے ہیں اور پیٹ بھرا ہے۔ تم تلوار نہیں ہلا سکتیں........ تم قلم نہیں اٹھا سکتیں........ لیکن تم سوئی تو چلا سکتی ہو تمہارے ہاتھ کے انگر کھے پہن کر میں نے چھتر منزل کلب کی میموں کے ساتھ ڈنر اڑائے ہیں اور لنچ کھائے ہیں........ کیا کہا تم نے؟ اب انگر کھے کون پہنتا ہے؟........ اب اگر انگر کھے نہیں پہنتا تو کوئی نہ کوئی کرتے ضرور پہنتا ہوگا........ تم کو یاد ہے؟ میں نے لکھنؤ سے کٹاؤ کے جو کرتے سلوائے تھے ان کی سلائی اس سستے زمانے میں کیا تھی؟ پانچ روپے فی کرتا تم ویسا کرتا دو دن میں سی سکتی ہو۔''

جب وہ اٹھیں تو ان کی بے پناہ بے قراری کو قرار آ چکا تھا۔ جیسے ایک بھیانک خواب دیکھ کر جاگ اٹھی ہوں جیسے سارے دن کی سخت محنت کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے نہا کر باہر نکلیں ہوں۔ وہ بڑے حوصلے سے قدم اٹھا رہیں تھیں کہ اس طرف سے آواز آئی جہاں کبھی ڈیوڑھی ہوا کرتی تھی۔ انہوں دوپٹے کو اس طرح بنا کر اوڑھا کے تمام پیوبند ادھر ادھر ہو گئے اور کچے آنگن میں آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئیں اس ویران پھاٹک کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں جو کبھی کے گرانڈیل منقش دروازے کا سہارا تھا۔

''میں ہوں مالکن........ گلاب لال۔''

''اچھے ہو........ چودھری گلاب؟''

''مالکن کی کرپا ہے........''

''کیسے آ گئے۔''

''ایک سندیسہ آیا ہے۔''

''کیا۔''

''پاکستان سے خان صاحب آئے ہیں ___ وہ جو بڑی مسجد کے پچھواڑے رہتے تھے۔''

''ہاں ہاں منے خاں........ جن کا بھتیجہ ہمارے یہاں سپاہیوں میں تھا۔''

''جی ہاں۔ جی ہاں وہی۔ ان کے تو بڑے رتبے ہیں پاکستان میں سب لڑکے ان کے بڑی بڑی جگہوں پر ہو گئے ہیں۔''

''اچھا۔''

''جی ہاں...... موٹر پر آئے ہیں وہ لکھنؤ سے آپ کے بھائی افضل مرزا صاحب جو آج کل کراچی میں بڑے کمشنر ہیں انہوں نے کہلا بھیجا ہے کہ آپ چلی آویں۔''

''افضل مرزا میرا بھائی تھوڑی ہے موا...... میرے ایک رشتے کے چچا کا بیٹا ہے۔''

''تو انہوں نے آپ کو بلایا ہے...... بلکہ خاں صاحب تو کہتے تھے کے ان کو پاس پوٹ بھی انہوں نے اس لئے بڑی دوڑ دھوپ کر کے دلایا ہے کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ لے آویں۔''

''مجھ کمبخت کی ماری پر اب ایسے پیمبری کے وقت پڑ گئے ہیں کہ موئے ایروں غیروں کے ساتھ دوسرے ملک سدھار جاؤں گی۔ اس سے کہنا کہ اپنے ہوتوں سوتوں کو سمیٹ لے جائے اپنے ساتھ پاکستان کو...... مجھے تو اب ایک ہی جگہ جانا لکھا ہے جب تک حکم نہیں آتا تب تک بیٹھی ہوں۔''

''وہ کہہ رہے تھے۔''

''گولی مارو چودھری گلاب...... کہنا سننا کا ہے کا......''

''جی...... بہتر ہے''

''ہاں میں تم سے ایک بات کہنے والی تھی۔''

''حکم''

''یہاں رونق پور میں یا...... کسی اور گاؤں میں کوئی......''

''جی۔''

''میں نے کہا سرکار میں سمجھا نہیں۔''

''کوئی کرتے پہنتا ہے۔''

مالکن نے ایسی بھرّائی ہوئی ـــــ چیخ مارتی ہوئی آواز میں کہا جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر سن کر پھٹ پڑی ہو۔ بوڑھا چودھری گلاب اس عجیب وغریب سوال کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔

''کرتے؟''

''ہاں تم سے کیا چھپانا چودھری گلاب........تم تو اس حویلی کے تنکے تنکے سے واقف ہو تم تو حویلی کی دائی گیری کر چکی ہو دائی سے کیا پیٹ چرانا آدمی سب چلے گئے۔ ـــــ عورتیں ادھر ادھر ہو گئیں اتنی بڑے گھر میں اکیلی بیٹھی کوّے ہنکایا کرتی ہوں۔ رات تو روتے گزر جاتی ہے مگر یہ پہاڑ ایسے دن چھاتی پر سوار رہتے ہیں ٹالے نہیں ٹلتے ہیں۔ کوئی کرتہ ورتہ ہوتا تو سینے پرونے میں دل اٹک جاتا۔

حویلی کے بوڑھے رازدار کے تخیل کی آنکھیں بھوکی مالکن کو بلکتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ اور اس کے کانوں میں بے آواز سسکیاں زہر کی بوندیں ٹپکا رہی تھیں۔

تم کھڑے کھڑے تھک گئے ہوں گے چودھری گلاب ـــــ''

''نہیں مالکن میں شام تک آجاؤں گا''

''مگر دیکھو۔ کسی ایسے ویسے کا کرتہ نہ لے آنا میرے پاس۔''

''نہیں مالکن۔''

''میرا نام نہ لینا کسی سے۔''

''یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے مالکن؟ میں کوئی آج حویلی میں نوکر ہوا ہوں۔''

سڑک کے کنارے املی کے پیڑ کی جڑ سے چودھری گلاب نے اپنا ٹٹو کھولا اور سوار ہو کر بغیر خان صاحب سے ملے ہوئے تھان گاؤں چلے گئے۔ گھر پہنچ کر بیٹھک کے تخت پر سلفہ گڑگڑاتے رہے۔ جب سورج اوپر آگیا تب چودھرائن نے دروازے سے جھانک کر ''چوکے'' کے تیار ہونے کی خبر دی وہ اونگھتے ہوئے اٹھے آنگن میں نیم کے پیڑ کے نیچے بنے ہوئے پکّے کی چبوترے

پر کھڑے ہو کر جھوٹ موٹ نہائے اور سر جھکائے ہوئے چوکے پر بیٹھ گئے۔ چودھرائن روٹی سینک سینک کر رکھتی جا رہی تھی مگر وہاں پہلا نوالہ ہی ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔

''کا تمرا جی ماندہ ہے۔''

''ہاں۔''

''تو تھوڑا بہت تو کھائے لیو۔''

''تمرے پاس کتنے روپے ہیں۔''

''روپے؟ مورے پاس اپنی ایک چھدام نائیں ہے بڑے بھیا کے کچھ دام دھرے ہیں۔''

''کتنے ہیں بھلا۔''

''ہیں کوئی دس گھاٹ پچاس۔''

''لی آوَ۔''

''ابھیں۔''

''ہاں''

پہلے روٹی تو کھائے لیو۔''

''پہلے لے آوَ۔''

چودھری گلاب نے مارکین کی تھیلی سے چالیس روپے کاغذ نکال کر گنے اور تھیلی چوم کر کھڑے ہو گئے۔ چودھرائن پہلے آنکھیں پھاڑے دیکھا کیں پھر بکنے جھکنے لگیں لیکن چودھری گلاب نے ان کی بکواس پر کان نہ دھرے۔ الگنی سے اپنا کرتا اتار پہنا۔ دھوتی باندھی ٹوپی سر پر اور انگوچھا کندھے پر رکھ کر چلے آئے۔ گھاس کھاتے ہوئے ٹٹو کے منہ میں لگام چڑھا دی۔ گھسیٹتے ہوئے تھان کے باہر لائے اور سوار ہو گئے۔ بھوکا ٹٹو اپنی چال بھر چل رہا تھا۔ لیکن چودھری گلاب کے ذہن میں آٹا پیسنے والے کئی انجن دھڑ دھڑا رہے تھے۔ چودھری گلاب میر محمد علی بیگ کے زمانے میں منشی تھے۔ لیکن ان کے مرتے ہی جب حویلی اجڑنے لگی اور بڑے چھوٹے مختار شہد کی

مکھیوں کی طرح دوسرے باغوں کی تلاش میں حویلی سے اُڑ گئے۔ تب مالکن نے اپنے ایک ایک تنکے کی باقاعدہ دیکھ بھال چودھری گلاب کے سپرد کر دی تھی۔ چودھری ان لوگوں میں تھے جو حال کی جیب سے آنے والے بُرے دنوں کا منہ بھرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ لیکن لڑکوں کی پڑھائی لکھائی اور شادی بیاہ کے جھمیلوں میں سب جمع جتھا پر لگا کر اڑ گیا۔ ان کا بڑا لڑکا تحصیل میں اور دوسرا نہر میں چپراسی تھا۔ دونوں خود تنگی ترشی سے بسر کرتے تھے۔ دونوں مڈل پاس تھے۔ لیکن چودھری کے لاکھ دوڑ دھوپ کے باوجود کوئی پٹواری ہوسکا اور نہ پٹرول، مجبوراً انہوں نے چپراسیوں میں بھرتی کرا دیا۔ اب وہ آئے دن منہ کھولے ہاتھ پسارے ان کے سامنے کھڑے رہتے۔ لیکن چودھری خود ہی کھکھ بیٹھے تھے ان کا بھرنا کہاں سے بھرتے اس وقت گھر والی کی بات سے وہ چکر میں پڑ گئے۔ بڑکوا اتنا گرہست اور سگھڑ کب سے ہوگیا۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا وہ یہی سب کچھ الا بلا سوچتے ہوئے رونق پور کے گنج میں آ گئے۔ بزازے کی دوکان پر انہوں نے اپنا ٹٹو روکا اور اتر کر بہت بڑھیا والی تنزیب کے تھان پرکھنے لگے۔ دو کرتوں کا کپڑا بغل میں مار کر وہ سیدھے حویلی پہنچے۔ دل ہی دل میں اپنے باپ منشی چھمن لال کی پڑھائی ہوئی ساری فارسی کا آموختہ پڑھ کر مالکن سے مخاطب ہوئے اور ان کو یقین دلایا کہ پوری رازداری کے ساتھ وہ چیت پور کے ٹھاکر گھنشام سنگھ سے کرتوں کا کپڑا لے آئے ہیں۔ یہ کہتے کہتے ان کا حلق سوکھ گیا۔ کانٹے سے پڑنے لگے۔ ساری جان پسینے میں نہا گئی۔ ان کی مٹھی میں دبے ہوئے پچیس روپوں کی پڑیا بھیگ گئی۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہ کہ وہ کیا کہہ کہہ کر کیا بہانہ بنا کر یہ پچیس روپے مالکن کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔ آخر وہ ہار کر اپنے لکڑی کے پیروں پر اپنے وجود کا منوں بار گھسیٹتے ہوئے رونق پور کے بنئے کی دوکان پر آ گئے۔ رام پرشاد گدّی پر بیٹھا گاہکوں کو پڑیاں بانٹ رہا تھا۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے مالکن کا حساب مانگا تو پتہ چلا کہ وہ سو سے اوپر ہے۔ اس لئے تو رام پرشاد نے ان کا سودا بند کر دیا تھا۔ اسی لئے تو مالکن کا باورچی خانہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ رام پرشاد کی دوکان کے تختے پر بیٹھے ہوئے اپنے پچیس روپوں کی پڑیا کو نہارتے رہے۔ بیٹھے رہے پھر اٹھ کر اپنے ٹٹو پر سوار ہو گئے

جیسے لڑائی میں ہار مان لی ہو۔

مالکن دیر تک کپڑا لیے جھنگا کھٹولے پر پڑی رہیں۔ انہیں پہلی بار عرفان ہوا تھا کہ کرتا سینے کے لئے صرف ہاتھ کے فن اور آنکھوں کی روشنی ہی کی نہیں سوئی اور تاگے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کے جتنے میں سوئی تاگا آتا ہے اتنے میں ایک وقت کے آلو اور دو وقت کے چنے بھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خدا نے ان کی سن لی اور ان کی ناؤن ناخن کاٹنے آ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اپنے خیالوں کی کچی نیند سے چونک پڑیں اور ناؤن سے ایسے لہجے میں مخاطب ہوئیں جیسے لہجے میں اگر وہ اپنے سنہرے دنوں میں مخاطب ہوتیں تو وہ سارے رونق پور میں اپنی خوش نصیبی کا ڈھنڈھورا پیٹ آتی۔

''ارے اے قادری کی دھی۔''

''جی، بی بی۔''

''میرا ایک کام کر دو گی اتنے وقت۔''

''بتایئے۔''

''ذرا لپکتی ہوئی رام پرشاد کی دوکان چلی جاؤ ایک مہین سوئی اور چھوٹی پیچک لے آؤ لیکن اس حرام زادے سے میرا نام نہ لینا۔ نہیں تو ٹکا سا جواب دے دے گا۔ کل میں نے دو پیسے کا نمک ، خیر چھوڑ......تم ذرا چلی جاؤ.....''

وہ اپنی داہنی کنپٹی پر لیکھ ٹٹولتی ہوئی آنگن پار کرنے لگی۔ مالکن بیٹھی سوچتی رہیں معلوم نہیں کیا سوچتی رہیں۔ جب ناؤن سوئی تاگا لے آئی۔ تو اسی کی قینچی منگوائی اور کرتے بیونتے بیٹھ گئیں۔ قینچی چلاتے چلاتے انہیں خیال آیا کہ چودھری چیت پور کے ٹھاکر کی ناپ تو لائے ہی نہیں کرتا کیسے کاٹا جائے۔ وہ بجھ کر رہ گئیں۔ تھان گاؤں اچھا خاصہ تین چار میل دور تھا۔ اب ایسا آدمی اس وقت کہاں جڑتا جو اسی وقت چودھری کو بلا کر کہتا۔ پھر انہوں نے دیوار پر چڑھی ہوئی دھوپ دیکھی اور یاد کیا کہ آج منگل کو رونق پور کی بازار ہوتی ہے۔ ممکن ہے ٹھاکر آ جائیں بازار کرنے۔ اپنے اس

وہم پر ایمان لا کر وہ ایک بار پھر بڑے حوصلے سے اٹھیں وضو کے بدھنے میں گھڑے سے پانی انڈیلا وضو کیا اور نماز کے لئے وہ چٹائی بچھائی جس پر کپڑے کے پیوند لگے تھے جیسے تیسے نماز کا فرض ادا کیا۔ چھوٹا سا وظیفہ پڑھ کر لمبی سی دعا مانگی کہ اے پروردگار عالم اپنی رحمت کے صدقے میں چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ کے دل میں یہ نیکی ڈال دے کہ وہ آکر اپنے کرتے کی ناپ دے جائیں اور میری خوشامد کریں کہ میں کل تک ان کا کرتا سی دوں اور مجھے اتنی طاقت دے کہ میں ساری رات لالٹین کی روشنی میں بیٹھ کر کرتا سی سکوں۔ وہ گڑگڑاتے، گڑگڑاتے نڈھال ہوگئیں۔ اسی جانماز پر نڈھال ہو کر پڑ رہیں۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ہوئی۔ مہترانی ہمیشہ کی طرح دوقتی کمانے آئی تھی۔ وہ نئی امید سے تازہ دم ہو کر اٹھ بیٹھیں۔

''بانکے کی بہو۔''

''بی بی۔''

''بانکے ہیں گھر پر؟''

ذرا جلدی سے جا کے بلا لا......کوئی کام نہیں ہے___بس ایک بات۔

''ذرا جلدی جا کر بلا......کوئی کام نہیں۔ بس ایک بات پوچھنا ہے۔''

وہ الٹے پاؤں چلی گئی۔ پھر دروازے پر صدا بلند ہوئی۔

''سرکار کی بڑھتی ہو___راج پاٹ بنا رہے۔''

''بانکے۔''

''سرکار۔''

''چیت پور تمہاری جمانی میں ہے؟''

''ہاں جور۔''

''ٹھاکر گھنشیام کو پہچانتے ہو۔''

''ان کا سرکار کون نا ئیں پہچانت ہے......دور دور تک ان کا نام باجت ہے۔''

''بازار تو آتے ہوں گے۔''

'' برابر مالک..... برابر۔''

''تو تم ذرا خیال کر کے ان کو میرے پاس بلانا مجھے ایک کام ہے ان سے۔

''بہت نیک مالک۔ ابہن لیو آپ...... کا کچھ دور تھوڑے ہے۔''

بانکے تو اپنا چرودھا جوتا بجاتا اور رٹی ہوئی دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ لیکن اپنی زبان کی دڑا کی پر مالکن پچھتاتی رہیں شرماتی رہیں اور بیٹھی دعائیں مانگتی رہیں کہ خدا کرے ٹھاکر دروازے پر نہ آئیں۔ بلکہ کسی نوکر کے ہاتھ اپنا کرتا بھجوا دیں۔ ورنہ میں ان سے کس طرح بات کروں گی۔ میں کیا کہوں گی۔ وہ کیا کہیں گے۔ یا اللہ کچھ ایسا کیجو کہ مرنے والے کے سامنے میری آنکھیں نہ نیچی ہوں۔

☆

بانکے نے اپنی بکری کے سُوپ پیٹھ پر باندھے اور بازار کے ایک نکّو پر جہاں اڈّھے کھولے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بیلوں کے گھنگھروں بجاتا اور دھول اڑاتا ٹھاکر کا اڈّھا آ گیا۔ وہ اپنے سُوپ سنبھال کر اُٹھا ہی تھا کہ ایک گاہک پھاند پڑا۔ اس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر پیسے گنتا ہوا وہ اٹھ کر کے پیچھے بھاگا۔ ٹھاکر آدمیوں کو چیرتے ہوئے رام پرشاد کی دوکان پر پہنچے۔ رام پرشاد نے جلدی سے کھڑے ہو کر سلام کیا اور دو ایک گاہکوں کو نمٹا کر دوکان کے باہر پڑی دری ڈال دی۔ ٹھاکر نے بیٹھ کر تولیے سے اپنا منہ پونچھا، پھر اسی سے پیروں کی گرد جھاڑی، نگاہ اٹھائی تو سامنے بانکے جھکا ہوا ڈنڈوت کر رہا تھا۔

''کاہے رے۔''

''ایک اُجڑ (عذر) ہے۔''

''ہاں''

''مالکن آپ کا بلائن ہیں۔''

''مالکن۔''؟

''ہاں......یہاں کے سرکار کی مالکن۔''

''اچھا......کا ہے بلائن ہیں......کچھ اتا پتا ہے بھلا۔؟''

''یو سرکار آپ جان سکت ہو......ہم کا نیں معلوم۔''

ٹھاکر چیت پور کے نمبری زمیندار تھے اور میر محمد علی بیگ مرحوم کے ہوا خواہوں میں تھے۔ مرحوم کے ایک ایک فاتحے میں شریک ہوئے تھے۔اس کے بعد ادھر بھول کر بھی نہ گزرے تھے۔ اب آج اس اچانک پیام سے گھبرا گئے تھے۔پھر کچھ سوچ کر فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دُور گئے تھے کہ چودھری گلاب سے مڈبھیڑ ہوئی۔چودھری گلاب نے کترا کر نکل جانا چاہا۔ لیکن ٹھاکر نے دبوچ لیا۔

''ارے چودھری۔ای مالکن کاہے بلائن ہیں ہم کو۔؟''

چودھری کا خون خشک ہوگیا۔لیکن ننگے بازوؤں پر انگوچھا پھیلا کر بولے۔

''وہ......وہ......دراصل ٹھاکر صاحب مالکن نے آپ کو اس لئے تکلیف دی تھی کہ ایک کام کے سلسلے میں انہیں ضرورت تھی اور آپ کی سواری تو تھان گاؤں سے نکلتی ہی ہے۔اسی لئے آپ کو۔''

''اچھا......میں کہوں کہ ایسی کیا بات آپڑی۔پھر ٹھیک ہے......تو مطلب ہے کہ اب وہاں جانے کی چنتا تو ہے نہیں۔''

''اب آپ کیوں تکلیف کریں گے......میں تو آ ہی گیا۔''

ٹھاکر کے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا۔

☆

مالکن چودھری گلاب کا دیا ہوا کرتا دیکھتی رہیں۔جو سنلائٹ صابن سے بھینچا گیا تھا۔اور سنلائٹ صابن کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔شکنیں تک برابر نہیں ہوئی تھیں۔پھر یہ سوچ کر چپ ہو

رہیں کہ جب رونق پر پوری یہ بیتی ہے تو چیت پور پر بھی کچھ نہ کچھ تو گزری ہی ہوگی۔ پھر وہ اسی وقت کرتا کاٹنے بیٹھ گئیں۔ جب تک اندھیرا نہ ہوگیا اور ان کو سوئی نظر آتی رہی وہ اسی طرح پُرنم آنکھیں جھکائے اپنی تقدیر کا لکھا پورا کرتی رہیں اور روٹی دال کے خواب دیکھتی رہیں۔ مغرب کے بعد انہوں نے پیتل کی وہ لالٹین جلائی جس کی چمنی جگہ جگہ سے ٹوٹی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد بھبک اٹھتی تھی، جیسے مالکن کے دُکھ پر روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں ہوں۔ دُکھتے ہوئے سر پر چیتھڑے کی پٹی باندھے رنجور آنکھوں سے کپڑا ابھڑائے وہ سلتی رہیں۔ اپنے دستر خوان کے چاک کو بھرتی رہیں، اپنی تار تار جیب کو رفو کرتی رہیں، جھاگ ایسی سفید تنزیب کے ویرانے میں لکڑیاں بنتی رہیں، ارہر کی دال چنتی رہیں، اور موتی ایسے صاف صاف گیہوں کے اُجلے اُجلے آٹے کو گوندھنے کا سامان کرتی رہیں پھر سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے سدھ ہوکر بانس کے جنگلے پر دہری ہوگئیں۔

جیسے جیسے چودھری گلاب کے ٹین کے بکس میں مہین سلائی کے پھول ایسے سبک سجل کرتوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ویسے ویسے ان کے چہرے پر جھریوں کا جال اور گہرا ہوتا گیا۔ کھچڑی بال ایک دم سے پک گئے جیسے پلاؤ کے چاول دودھ میں ابال کر تھالی میں ڈال دیئے گئے ہوں گھر پر سوگ سا چھا گیا۔ گھر والی نے پہلے خود چودھری کو سمجھایا پھر لڑکوں کو ان کے حلقوں سے بلا کر اس مورچے پر لگا دیا۔ پھر تینوں نے مل کر ایک دوپہر کو گھر کے آنگن میں مہابھارت چھیڑ دی۔ جیسے جیسے بات بڑھتی گئی خون گرم ہوتا گیا۔ چھوٹے نے جو تاڑی کی ایک ہی کُجھی میں بولایا تھا کڑک کر کہا۔

''ارے اماں تم کا جانو...... یو بُڑھیا ملکن سے پھنسا ہے۔''

بوڑھے چودھری گلاب نرائن جن کی جوانی ان کے اپنے سر کی طرح بے داغ تھی، اس الزام کو سن کو دیوانے سے ہوگئے۔ وہ جہاں کھڑے ہوئے چوکھی لڑ رہے تھے وہیں زمین پر دھپ سے بیٹھ گئے، یا اس طرح گرے کہ بکھر نہ سکے۔ چھوٹا لڑکا ثبوت دے رہا تھا۔

''جب بہیا (سیلاب) آئی ہے اوئی سال تو یہ جان پر کھیل اد کا بدمعاس کا بچا دے گئے

وہیں ُ...... گئے رہیں کہ نائیں گئے رہیں؟ تم اپنے منہ سے بتاؤ اماں۔''

چودھری گلاب نرائن کے بے نور آنکھوں نے گھر والی کے چہرے پر یقین کی پر چھائیں دیکھ لی۔ گویا شکاری نے زخمی جانور پر دوسرا فیر کر دیا ہو۔ وہ اپنی کانپتی ٹانگوں پر اپنے وجود کی لاش اٹھا کر اٹھے اور کڑھتے ہوئے دروازے سے نکلے۔ اپنی چوکھٹ...... اپنے ہاتھوں سے چوما۔ اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے، بغیر آنکھوں سے ایک آنسو بہائے اس پُختہ کنویں پر چڑ گئے جس کی جگت آدمی بھر اونچی تھی اور اس طرح ٹوٹ کر گرے جیسے گراری تک آ کر جہازی کھڑے کی رسی ٹوٹ جائے۔ اتنے زور کا دھماکہ ہوا کہ سارا تھان گاؤں الٹ پڑا۔ آدمی کنویں کے اندر اتر گئے۔ چودھری گلاب نرائن نکال بھی لئے گئے۔ لیکن وہ تو اسی وقت مر گئے تھے جب اپنے بیٹے کے منہ سے اپنی مالکن کے ساتھ اپنے تعلق کی بات سنی تھی۔

کہانیوں سے...... چٹ پٹی کہانیوں سے انسانوں کو...... گاؤں کے ان انسانوں کو جن کے حواس ہر طرح کی بھوک سے بلبلاتے رہتے ہیں...... جو پیدائشی محبت ہوتی ہے...... قاتل محبت ہوتی ہے اس محبت نے چودھری گلاب نرائن کی خودکشی کے خاکے میں رنگ بھر لیا اور مشہور ہو گیا کہ مالکن...... تو چودھری گلاب نرائن پر میر محمد بیگ کی زندگی ہی میں مرتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد تو اور کھیل کھیلیں۔ متّے خاں نے کتنا کتنا کہا لیکن وہ چودھری کو چھوڑ کر پاکستان جانے پر رضا مند نہ ہوئیں۔ پاکستان جانے پر جہاں لوگ اپنی آل اولاد اپنے محلے دو محلے اپنے گاؤں گرام تک چھوڑ کر چلے گئے۔

پھر مالکن کو علاقے کی وہ آوارہ عورتیں ناک پر انگلی رکھ کر گھورنے لگیں جن کی جوانی کی کالی راتیں عاشقوں کے بوسوں کے چراغوں سے جگمگا چکی تھیں۔ وہ مالکن کو گھور رہی تھی۔ ادھیڑ مالکن کی کمر سیدھی تھی ایک سفید لٹ چاندی کے جھومر کی زنجیر کی طرح ان کی پیشانی پر جھولتی رہتی ہے نازک خدوخال کے سفید چہرے پر بھوک نے سائے ڈال دیئے تھے لیکن برسوں کی حکومت اور امارت کی بخشی ہوئی تاب ابھی مرنہیں پائی تھی۔ ان گنت جاگتی راتوں نے ان کی آنکھوں کا نشہ سکھا

دیا تھا۔ لیکن اب بھی وہ پلکیں اٹھا کر آنکھیں پوری کھول دیتیں تو مخاطب کی نظریں چوروں کی طرح راستہ ڈھونڈنے لگتیں۔ نوکرانیوں کے سے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی وہ بیگموں کی طرح جگمگایا کرتیں۔ ان کو دیکھ کر تو ایسی جھوٹی کہانی بھی سچی معلوم ہوتی۔ دُور دُور تک پھیلی ہوئی بکھری ہوئی ٹوٹی ہوئی عمارت کی یادگار میں وہ محرم کی ایک ''روشن چوکی'' کی طرح جھلملایا کرتیں۔ دل ہلا دینے والی یادوں کے مودّب قافلے اُن کی کم نور آنکھوں کے سامنے سے دبے پاؤں گزرتے رہتے چیت، بیساکھ کے جلتے تپتے دن، ساون بھادوں کی روتی ہوئی کلموہی راتیں ...... سب کھوٹے سکوں کی طرح ان کے وجود کی ''گولک'' میں کھنکھنایا کرتیں اور وہ ان کی بے فیض ''جھنا جھن سے بے نیاز چھوٹی چھوٹی ماوی کلفتوں کے ناقابل بیان بوجھ میں دبی کراہا کرتیں۔

ایک دن جب وہ چودھری گلاب نرائن کا انتظار کرتے کرتے سوکھ چکی تھیں اور بھیا تک دنوں کا انتظار کرنے لگیں تھیں جو ان کے لئے فاقوں کی سوغات لیکر آنے والے تھے کہ چودھری گلاب سنگھ کی خودکشی کی کہانی ٹوٹی دیواروں کو پھلانگ کر ان کے کچے آنگن میں چڑیل کی طرح ناچنے لگی۔ قہقہے لگانے لگی۔ ان کے منہ پر تھوکنے لگی۔ رونق پور کی مالکن کے اس منہ پر تھوکنے لگی۔ جس کے سامنے رونق پور کا سارا علاقہ آنکھ اُٹھانے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ وہ اٹھ کر بغیر دروازوں کی کوٹھری میں گر پڑیں۔ ننگی زمین کے ٹھنڈے فرش پر دوزانو ہو کر اس خدائے قہار کے سامنے گڑ گڑاتی رہیں جو اپنے پیارے بندوں پر اس لئے مصیبتیں نازل کرتا ہے کہ ان کے نفس کا تزکیہ ہو سکے۔ ان کے ایمان پر صیقل ہو سکے۔ پھر انہی دنوں رونق پور کی بتیس سال کی زندگی میں پہلی بار انہوں نے چودھری گلاب نرائن کو مرد کے روپ میں دیکھا۔ انہوں نے دیکھا۔ حویلی کے اندرونی حصے کے دوسرے درجے کے سیاہ ستونوں والے دالان کے پیچھے لابنے کمرے میں جوٹ کی موٹی موٹی چٹائیوں پر فرشی قالین پڑے ہیں۔ ایک طرف چوکے کے مسند پر گاؤ سے لگے ہوئے محمد علی بیگ مرحوم بیٹھے ہوئے ہیں۔ دور کونے میں سلگتی ہوئی مہکتی ہوئی سٹک کی کامدار نے ان کی زانو پر پڑی ہے جس کی گنگا جمنی منہال سے ان کی انگلیاں کھیل رہی ہیں نگاہیں دیوار گیر پر جڑی ہوئی

ہیں۔اس کے سامنے ہاتھی دانت کے نازک کام کی بھاری سی میز ناشتے کی پلیٹیوں کا بوجھ اٹھائے خوب صورت کنیز کی طرح دوزانوں ہے۔وہ اپنی مسہری سے اٹھیں ایک ہاتھ میں فرشی کے بھاری پائنچے لئے دوسرے ہاتھ سے اس پتولی بیل سے جھولتے ہوئے دوپٹے کا پلو سنبھالا۔موٹے موٹے زیورں سے ہلکی ہلکی زرّین جھنکار پیدا کرتی ہوئی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور ان کے ململ کے کرتے کی ملی دلی آستیں پر انگشتانوں اور انگھوٹھیوں سے مرصع ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''تم اتنے اداس کیوں ہو......''

''اداس......نہیں تو۔''

''نہ تم نے غسل کیا......نہ ناشتہ کیا......کتنی دیر سے اسی طرح بیٹھے ہو۔''

''ہوں۔''

''ایک بات کہوں۔''

''غصہ تو نہ کروگے۔''

''اُہ۔ہوں۔''

''حکیم ڈاکٹر دوائیں کرتے ہیں نصیبے بنانے......مجھ کوکھ جلی کے مقدر ہی میں اولا د نہیں ہے تو حکیم ڈاکٹر کیا کرلیں گے......میری مانو......دوسری شادی۔''

''چپ رہو۔''

وہ اتنے زور سے گرجے کہ باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی عورتوں کے ہاتھ سوکھ گئے، کتنی ہی دیر تک ویسی ہی بھیانک خاموشی مسلط رہی۔پھر ایک عورت سائے کی طرح چلتی ہوئی آ کر تخت کے سامنے کھڑی ہوگئی۔مالکن نے اشارے سے پوچھا۔کیا ہے۔''

تھان گاؤں والا گلاب نرائن دیوڑھی پر کھڑا ہے۔''

''بلاؤ۔''

دالان کے پردے بندھے تھے۔کمرے کے دروازوں پر چلمنیں پڑی تھیں۔تھوڑی دیر بعد

ایک اوسط قد کا سوکھا سا آدمی آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کرتے کے ایک مونڈھے پر پیوبند لگا تھا۔ نسبتاً اجلی دھوتی پر گھٹنے کے پاس پھانک سلی ہوئی تھی دھوتی سے نکلی ہوئی سوکھی ماری پنڈلیاں گرد میں اٹی ہوئی تھیں، پنجے جوتے میں بند ہونے کی وجہ سے صاف تھے۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا۔ ٹوپی میں میل کی گوٹ تھی۔ وہ سہا ہوا کھڑا رہا اور دونوں ہاتھوں سے ایک جھولا سنبھالے ہوئے تھا۔

''دوا لے آئے۔''

''ہاں سرکار''

''اس آدمی نے گڑگڑا کر کہا۔''

''دے دو۔''

اس نے دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو اس طرح جھولا پکڑا دیا جیسے وہ جھولا نہیں شیشے کا پیالہ ہے اور اس میں لبالب عطر بھرا ہوا ہے...... پھر آواز آئی۔

اس کو گلاب کو دو آنے پیسے اور خوراک دلوا دو۔

اب ان کے آنسو خشک ہو گئے تھے اور وہ یادوں کے میلے میں کھو گئی تھیں۔ جب وہ اپنے آپ کو ملیں تو دھوپ آنگن میں اترنے لگی تھی۔ اور ذہن میں آئے ہوئے جان دینے کے سارے منصوبے دیوالی کے چراغوں کی طرح بجھ چکے تھے۔ وہ باہر نکلی ہی تھیں کہ کمر پر ٹوکرا رکھے اور ہاتھ بھر کا گھونگھٹ لٹکائے بانکے کی بہو کمانے آ گئی۔

''ارے تم چیت پور جاؤ گی۔''

''ہاں بی بی۔''

''تو ذرا ٹھاکر سے کہہ دینا کہ شام کو اگر بازار آئیں تو مجھ سے مل لیں۔''

''بہت اچھا۔''

مالکن اتنا کہہ کر باورچی خانے کی طرف مڑی ہی تھیں کہ وہ دروازے پر کچھ تند تیز آوازیں شریر لڑکوں کی طرح اچھلنے پھاندنے لگیں۔ مالکن کی نگاہوں کا اشارہ پا کر مہترانی گئی اور تھوڑی دیر

بعد ایک لابنی دُبلی عورت کے ساتھ واپس آئی جو لال کنارے کی سفید دھوتی پہنے تھی۔ مہترانی نے اس عورت کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔

''ای تھان گاؤں والے چودھری گلاب کی چھوٹی بہو ہیں..... لیلا دھر کی دولہن۔''

مالکن چونک پڑیں۔ پھر اپنے اعصاب کو سنبھال کر یہ سوچنے لگیں کہ اسے کس طرح مخاطب کریں اور کیا بات کریں کہ اس نے اپنی بغل سے مڑے ہوئے کرتے نکالے اور مالکن کے ہاتھ میں پکڑا کر ہر جذبے سے خالی آواز میں منمنائی۔

''اے کرتے آپے دھر لیو۔''

جملہ پورا کرتے ہوئے وہ تیر کی طرح آنگن ختم کر کے ٹیڑھی میڑھی اونچی نیچی دیواروں کے پیچ وخم میں غائب ہوگئی۔ ذرا دیر تک مہترانی نے ان کا جائزہ لیا اور دوسرا گھر کمانے چلی گئی۔ مالکن پھول سے کرتے داہنے ہاتھ میں اٹھائے آنگن میں کھڑی رہیں۔ جیسے زندگی کی لڑائی میں ہار مان لی ہو اور مصیبتوں کے فاتح لشکر کے سامنے سفید جھنڈا کھول دیا ہو۔

شام کو ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ سے مالکن کہہ رہی تھیں۔

''اپنے کرتوں کی تنزیب تو آپ بھیجتے رہئیے گا لیکن پہلے میرے یہ چاروں کُرتے بکوا دیجئے۔''

☆☆

حجاب امتیاز علی

درزی

میں لاہور کے جگمگاتے فیشن ایبل لبرٹی مارکیٹ سے بیگرزان کی طرف جانکلی۔ اور اس راستے سے کرسچین ہاسٹل (یوسی ایچ) کی طرف کار موڑ رہی تھی کہ چند منٹوں میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس کی تفصیل من وعن آپ کو سناتی ہوں۔

اس واقعہ سے ایک دن پہلے رات کے پون بجے جب شمی نے مجھے کسی درزی کی دکان پر چلنے پر اصرار کیا تو میں حیران ہو کر بولی۔ ''مگر اس وقت؟''

''ہاں ہاں اِسی وقت روحی ابھی۔۔۔۔۔عید کی مصروفیت کی وجہ سے آج کل دن کے وقت درزی نہیں ملتا۔ تم جلدی سے اپنی کار نکالو۔'' شمی نے اِصرار کیا۔

''اچھا........'' میں نے بادلِ ناخواستہ مان لیا اور گراج سے اپنی کار باہر نکال لائی

شمی ایک گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں اپنے کپڑوں کا بنڈل ہاتھ میں لئے کار میں میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد کار چلا کار چلاتے چلاتے میں نے پوچھا۔ ''اتنی رات گئے تمہاری ضد پر نکلی ہوں۔ لاہور کوئی محفوظ شہر بھی نہیں ہے۔ تمہیں اپنے کپڑے لینے ہیں یا کسی درزی کی تلاش ہے؟''

''درزی کی تلاش ہے۔ موزوں درزی نہیں مل رہا۔ عید کا زمانہ ہے۔ چلو جلدی چلو۔'' اُس نے کہا۔

جب ہم گھر سے چلیں تو لوگوں کا ہجوم اُبلتے سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ آنے والی عید کی خرید وفروخت پر لوگ یوں دیوانہ وار رواں دواں تھے جیسے عید پھر کبھی نہیں آئے گی۔ میں اور شمی

درزی کی تلاش میں بڑی تیزی کے ساتھ شہر کی طرف جارہے تھیں۔ شاید کوئی خالی درزی مل جائے تو شمی اپنا لباس سلوائے شمی بڑبڑا رہی تھی ''دیکھو تو روحی۔ آج کل انسان کس طرح انسان کے درپے آزار ہو رہا ہے۔ گاہکوں کو درزی نہیں ملتے اور لباس پہننے کی تاریخ سر پر آجاتی ہے۔''

میں ہنس پڑی۔ ''یہ دنیا کا کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں ہے شمی۔ آج اس کائنات میں .... سوچتی ہوں تو انسان کے سبھی مسائل مجھے ادھورے ہی نظر آتے ہیں۔ تم ایک درزی کے مسئلے کو اتنی اہمیت دے رہی ہو!''

کپڑوں کی تھیلی سیٹ پر پھینکتے ہوئے شمی کہنے لگی۔ ''ہر انسان کے لئے اپنا مسئلہ اہم ہوتا ہے روحی۔ تم جانتی ہو دو دن سے درزیوں کی دکان پر ماری ماری پھر رہی ہوں کہ خدا کے لئے میرا لباس سی دو۔ مجھے پرسوں پہننا ہے مگر کسی نے حامی نہ بھری۔ کہنے لگے چھ چھ مہینوں سے عید کے کپڑے سل رہے ہیں۔ اب نیا کپڑا نہیں لیا جاسکتا۔''

میں بولی۔ ''ٹھیک تو کہتے ہیں۔ دیکھو اب عید سر پر آگئی ہے۔''

''لیکن یہ لباس مجھے عید سے پہلے پہننا ہے۔''

''عید سے پہلے؟'' میں نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

''ہاں.....''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر تم یہ بھی جانتی ہو کہ پاکستان میں عید کی تیاریاں تمام رات بلکہ سحر کی اذان تک ہوتی رہتی ہیں۔ درزی بے چارے نمازِ سحر کے وقت دو گھڑی کے لئے دکان بند کرتے پھر اپنے کام پر لگ جاتے ہیں۔ اب تم عید کے بعد ہی اپنا جوڑا سلوانا۔''

وہ بھونچکی ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ ''عجب باتیں کرتی ہو۔'' یہ کہہ کر چپ ہوگئی۔ شہر کے درزیوں سے مایوس ہو کر اب ہم گلبرگ واپس جارہی تھیں۔ شہر کا یہ حصہ نسبتاً پُرسکون ہے درزی کے نہ ملنے سے سہمی ہوئی گھر کی طرف لوٹ رہی تھیں۔ اچانک سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ایک بہت تناور درخت پر سے ایک ہولناک ''تو تو'' کی صدا بلند ہوئی جسے سن کر اسٹیئرنگ پر مرے ہاتھ کانپ

گئے۔

شمی کو بھی اس کا احساس ہوا پریشان ہو کر کہنے لگی۔ ''سنا تم نے؟ رات کا پرندہ اچانک چیخ اٹھا تھا۔ خدا کی پناہ۔''

میں بے حد خوف زدہ ہو کر کہنے لگی۔ ''شکر ہے کہ پرندہ تھا۔ انسانوں سے کتراتی ہوں۔ پرندے ان کی طرح ظالم نہیں ہوتے۔''

شمی کہنے لگی۔ ''اس قسم کے پرندے تو ایشیائی گرم راتوں میں چیختے ہی رہتے ہیں۔''

''ہاں.....'' میں نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''لیکن مجھ میں دوبارہ رات کے اس پرندے کی قو قو سننے کی ہمت نہیں، شمی کچھ مخصوص سی آواز تھی......''

شمی کہنے لگی۔ ''روحی۔ کیا ہرج ہے ذرا لبرٹی مارکیٹ کے درزیوں سے بھی پوچھ لیں۔''

میں نے کار لبرٹی مارکیٹ کے آخری حصہ کی طرف موڑ لی جہاں چند درزیوں کی دکانیں تھیں۔ مگر کسی نے حامی نہ بھری تو آخر مایوس ہو کر لبرٹی مارکیٹ سے ملحق بیکرزان کے چھوٹے رستے سے یو سی ایچ کی طرف چل پڑی۔ ہسپتال کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ وہ میری کار کے آگے آ گیا۔ شاید وہ سڑک پار کرنا چاہتا تھا، اگر میں نے بڑی ہوشمندی سے بریک نہ دبا لیا ہوتا تو وہ قیمہ ہو جاتا۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ کار ٹھہرا کر میں نے چیخ کر کہا۔ ''تم اپنے ہوش میں ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بغل میں ایک پوٹلی جس میں سے کچھ سفید رنگ کے کپڑے باہر لٹک رہے تھے۔

شمی چیخ پڑی۔ ٹھہرو روحی۔ ٹھہرو... شاید درزی ہو اس کے بغل میں کپڑے ہیں پھر کار سے گردن باہر نکال کر پوچھنے لگی۔ ''تم درزی ہو؟''

''ہاں......'' اُس نے اقرار کیا۔ مگر اُس کی آواز میں پھنکار سی تھی۔ جیسے کوئی گلے کا مریض آہ بھر بھر رہا ہو۔

شمی بے حد خوش ہو گئی کہنے لگی۔ ''تمہاری بغل میں کپڑوں کا بنڈل دیکھ کر میں سمجھ گئی تھی۔''

میری نظر دوبارہ درزی کے ادھ کھلے بدن پر گئی۔ کچھ کپڑے باہر لٹک رہے تھے۔
وہ سفید رنگ کے عجیب بے ڈھنگے سے لمبے لمبے کپڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے جھرجھری سی محسوس ہونے لگی۔

شمی درزی سے کہہ رہی تھی۔ ''میرا ایک لباس سی دو گے؟'' درزی نے پہلی دفعہ نظر اُٹھا کر، ہم دونوں کو دیکھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ ضرورت مند کون ہے۔ اُس وقت میں نے دیکھا کہ درزی کا رنگ دودھ کی طرح سفید تھا۔ وہ ایک درمیانہ قد کا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ غور سے دیکھنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ اُس کی آنکھوں کا رنگ بھی سفید ہے۔ سیاہی کہیں نام کو نظر نہ آئی۔ یا شاید شاید سڑک کی مدھم روشنی میں مجھے اُس کی آنکھ کی سیاہی نظر نہ آئی ہو۔ وہ مجھے اپنی سفید رنگت اور سفید آنکھوں کی وجہ سے انتہائی خوفناک لگا۔ لیکن میں شمی سے اُس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ اُس وقت خلافِ توقع درزی کے دستیاب ہونے پر بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ اُس نے غالباً درزی کو غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ درزی کا لباس بھی مجھے اچھا نہ لگا۔ ایک سفید رنگ کی عبا پہن رکھی تھی جو رات کی پُراسرار ہواؤں میں متحرک تھی۔

شمی کہنے لگی۔ ''مگر یہ مقام تو کپڑے دکھانے اور ناپ دینے کا نہیں۔ میرے گھر آ جاؤ۔''

''بس.... مجھے آنا ہی پڑے گا۔ درزی نے اپنی دھیمی آواز میں کہا۔ جانے کیوں.... مجھے اس کے یہ الفاظ اور آواز بھی مایوس اور ناگوار سی لگی۔ بھلا اُسے کیا مجبوری تھی کہ اُسے آنا ہی پڑے گا؟ کوئی چور یا ڈاکو یا جاسوس تو نہیں؟ میں سوچنے لگی۔ لیکن شمی ان ساری باتوں کو نظر انداز کر رہی تھی، اور خوش تھی۔ کیوں کہ اُسے بمشکل ایک درزی ستیاب ہوا تھا۔

''گھر کا پتہ لکھ دوں؟'' وہ اپنا دستی بٹوہ کھولنے لگی تا کہ کاغذ اور پنسل نکالے

''اس کی ضرورت نہیں۔'' درزی کی آواز بہت مدھم پڑ گئی تھی۔ اُس کا یہ جواب سن کر میں اور بھی بدگمان ہو گئی کہ ضرور یہ کوئی مشکوک آدمی ہے۔

شمی کو بھی شاید کچھ تعجب ہوا پوچھنے لگی۔ ''تو پھر پہنچو گے کیسے؟''

''جہاں پہنچنا ہوتا ہے پہنچ جاتا ہوں۔'' درزی کا یہ جواب بھی مجھے ناگوار گزرا۔ اور میرے شبہات یقین کے درجے پر جا پہنچے۔

''کب آؤ گے؟'' شی نے سوال کیا۔

''کل۔''

''کس وقت؟''

''اسی وقت۔''

شی حیران ہو کر کہنے لگی۔ ''اس وقت؟..... مگر اس وقت تو رات کے دو بج رہے ہیں''

''اس سے پہلے مجھے فرصت نہیں۔ اور یہی وقت ہے۔'' یہ کہتے کہتے ہوئے وہ یوسی ایچ کے گیٹ کی طرف چلا گیا۔

میں پریشان ہو کر بولی۔ ''تم نے اچھا نہیں کیا شب۔ جانے وہ کون تھا!

''درزی تھا۔ اور کون ہوتا؟ شی چیں بچیں ہو کر بولی، پھر کہنے لگی۔ ''اس کی بغل میں کپڑوں کی گھڑی دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ درزی ہے۔''

''لیکن تم نے وہ کپڑے بھی دیکھے جو گھڑی کے باہر لٹک رہے تھے؟'' میں نے کار چلاتے چلاتے پوچھا۔

''ہیں تو........ کیوں کیا بات تھی کپڑوں پر روحی؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''سفید رنگ کے لمبے لمبے سے تھے اور اندھری رات میں مجھے سفید کپڑا بُرا لگتا ہے شی۔'' میں نے کہا۔

وہ ذرا بُرا مان کر کہنے لگی۔ ''توبہ روحی۔ تمہاری نازک مزاجیوں نے آفت ڈھا رکھی ہے۔ تم کو تو متاثر ہونے کا بہانہ چاہئے۔ موسیقی، شعر رنگ کے سوا تم کو کوئی چیز ہی پسند نہیں آتی۔''

''اتنا مبالغہ نہ کرو شی، مجھے اس کائنات کا سارا حُسن پسند ہے۔'' یہ کہہ کر میں چپ ہو گئی۔

اچانک کسی درخت پر رات کا ایشیائی پرند بول پڑا۔ ''تو۔ تو۔ تو'' اس کے ساتھ ہی میں نے

کار کی رفتار تیز کردی۔ رات کے سناٹے میں میرے لئے اس کی یہ نامانوس پکارنا قابلِ برداشت تھی۔

وہ ایک بے حد ویران اور اندھیری ایشیائی رات تھی۔ اندرون شہر آنے والی عید کی تیاریاں اور ہنگامے تھے۔ مگر شہر سے باہر گلبرگ حسبِ معمول خاموش اور کچھ زیادہ ہی پُر سکون تھا۔ آسمان پر تارے بھی مجھے دم بخود معلوم ہو رہے تھے اور ہوا بھی تھم تھم کر چلتی تھی۔ ہم گھر کی طرف جا رہی تھیں۔ مجھے جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ بالکل خاموش تھی۔

''اب اتنی چپ کیوں ہوگئی ہو روحی؟ تمہیں تو ہر موضوع پر بات کرنے یا کوئی شعر سنانے کا مرض ہے۔ خدا کے لئے کوئی بات کرو۔ ہول آرہا ہے۔ تمہاری خاموشی اور رات کے سناٹے سے'' شمی نے بے زار بلکہ قدرے خفا ہو کر کہا۔

میں بولی۔ ''ایک بات کہوں شمی؟''

''کہو کہو۔'' شمی نے کہا۔

میں کہنے لگی۔ ''جو تمہارا درزی تھا نا...... اس کی آنکھیں دودھ کی طرح سفید تھیں۔ مجھے تو اس کی آنکھوں کی سیاہی کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ تمہارے کپڑے کیونکر سئے گا؟''

شمی ذرا پریشان ہوگئی کہنے لگی۔ ''کیا واقعی؟ میں نے خود ہی پیش کیا۔ خیر یہ اس کی ذمہ داری ہے۔''

''مگر اس کی آنکھیں؟'' میں نے سوال کیا۔

شمی اچانک خوف زدہ ہو کر کہنے لگی۔ ''کیا واقعی اُس کی آنکھیں ایسی تھیں جیسے تم کہہ رہی ہو؟''

''ہاں.....'' میں نے کہا۔ ''کم از کم میں نے سیاہی نہیں دیکھی۔'' یہ کہتے ہوئے مجھ پر ایک ذہنی انتشار سا طاری ہوگیا۔ ویسے بھی میں ایک بزدل عورت ہوں۔ جس چیز سے ڈرنا چاہئے اس سے نہیں ڈرتی جس سے نہیں ڈرنا چاہئے اس سے خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔

گھر پہنچتے ہی میری بوڑھی جبشن خادمہ زوناش بڑبڑانے لگی۔ حسبِ عادت ناخوشی کے لہجے میں بولی۔ ''رات گزر چکی ہے خاتون روحی۔ اور آپ دونوں درزی کی تلاش میں نکلی نکلی اب گھر پہنچی ہیں۔ کافی پئیں گی کہ چائے؟''

''کافی.....''میں نے کہا

''درزی مل گیا تھا خاتون شمی؟''زوناش نے پوچھا۔

''ہاں مل گیا تھا زوناش۔''شمی نے خوش ہو کر کہا۔ پھر کہنے لگی۔''دیکھو وہ کل رات دو بجے آئے گا خیال رکھنا۔''

زوناش یہ سن کر متوحش سی ہو گئی۔ ویسے بھی بات بات پر دعائیہ انداز میں آئتیں پڑھنا اس کی عادت تھی۔ ایک عربی دعا پڑھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''دو بجے رات بی بی؟''

''ہاں ہاں کل دو بجے رات۔ اس کے پاس وقت نہیں ہے۔ گھنٹی کی آوام سنتے ہی دروازہ کھول دینا۔''شمی نے تاکید کی۔

زوناش خوف زدہ ہو گئی۔ کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرا دن نکل آیا اور اپنے وقت پر ختم ہو گیا۔ سورج حسبِ معمول محوِ خواب ہو گیا اور اندھری رات بیتنے لگی۔

رات کے کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب شمی نے اچانک خوابگاہ کا دروازہ کھولا اور آواز دی۔

''زوناش زوناش! میرے سر میں درد ہو رہا ہے''ایسپرو'' کی گولی دو اور تم ذرا میرے پاس آ بیٹھو اور سر دبا دو۔''

''بہت اچھا بی بی۔''یہ کہتے ہوئے وہ شمی کے کمرے میں چلی گئی۔ ذرا دیر کے بعد اس نے میری خواب گاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ بدحواس سی ہو رہی تھی کہنے لگی۔

''خاتون شمی کے سر میں درد ہو رہا ہے، مجھے تو ان کی حالت......!''

گھڑیال نے ٹن ٹن دو بجائے۔ باہر کے صدر دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں ڈرتے ڈرتے جا کر دروازہ کھول دیا۔

وہاں درزی کھڑا تھا۔

''میں کفن سینے آیا ہوں۔''

☆☆

علی سردار جعفری

چھرو مانجھی

ہوا بہت دھیرے سروں میں گا رہی تھی۔ دریا کا پانی آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ تھوری دیر پہلے نغمہ بڑا پُر شور تھا لیکن اب اس کی تانیں مدھم پر چکی تھیں اور ایک نرم اور لطیف گنگناہٹ باقی رہ گئی تھی۔ وہ لہریں جو پہلے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، اب اپنے سیال ہاتھوں سے تھکے ہوئے ساحل کا جسم سہلا رہی تھیں۔ ہماری کشتی بڑی نرمی کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ کنارے سے دور آ کر بیچ دریا میں ماہی گیروں نے اپنے چپو چھوڑ دیئے تھے اور بادبان کھول دیئے تھے۔ اور سمندر کی طرف دوڑتی ہوئی موجیں کشتی کو بہائے لیے جا رہی تھیں بادبان میں ہوا بھری ہوئی تھی اور اس کا سینہ غرور سے پھلا ہوا تھا۔ ہماری کشتی لمبی لمبی نازک اور پتلی سمپانوں کو، اُن میں بیٹھے ہوئے مانجھیوں کے گیتوں کو، بڑے سے سیاہ فام جہاز کو اور ساحل کے پاس شہر کی چمکتی ہوئی روشنی کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتی جا رہی تھی، سمپانیں موجوں میں، ساحل اندھیرے میں اور روشنیاں ننھے ننھے خوبصورت ستاروں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔

بوڑھے ماہی گیر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''رات اچھی ہے۔ آج طوفان کا خطرہ نہیں ہے۔ ایک گھنٹے میں چاند نکل آئے گا۔''

نوجوان ماہی گیر نے جو اس کا بیٹا تھا کہا کہ۔ ''اتنی دیر میں ہم کھلے سمندر میں پہنچ جائیں گے ''۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں دریائے کرنافلی خلیج بنگال میں جا کر ملتا ہے۔ جس کے کنارے چٹ گاؤں کا شہر آباد ہے۔ سبز اور نیلی پہاڑیوں کے دامن میں سپاری کے خوبصورت اور چھریرے بدن کی دو

شیزاؤں کی طرح نازک درختوں کے سائے میں، جب سمندر کا پانی اترا تو دریا کا دھارا اُلٹا بہنے لگتا ہے اور ماہی گیر اپنے جال دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ جب سمندر کا پانی اترتا ہے تو دریا پھر سمندر کی پھیلی ہوئی آغوش کی طرف لپکتا ہے۔ اور ماہی گیر اپنی کشتیاں اور جال لے کر کھلے سمندر میں چلے جاتے ہیں اور ساحل کے کنارے کنارے کوکس بازار تک مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ گھروں پر ان کی بیویاں اور محبوبائیں اُن کا انتظار کرتی ہیں اور سمندر میں ان کے گیت تیرتے رہتے ہیں جنھیں سننے کے لیے دُور دُور کی مچھلیاں سمیٹ آتی ہیں اور ان کے جال بھر جاتے ہیں اور کشتیاں بھی بھاری ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنے مضبوط بازوؤں کی قوت سے چپو جلاتے ہیں۔ ان کی سانس پھول جاتی ہے۔ گیتوں کی تجن وزنی ہو جاتی ہے۔ گلے کی رگیں ابھر آتی ہیں۔ بازوؤں کی مچھلیاں تڑپنے لگتی ہیں، ہتھیلیاں لال ہو جاتی ہیں اور جب وہ اپنے گاؤں کے کنارے آ کر شکار بھری کشتیوں کو خالی کرتے ہیں تو اُن کی بیویوں اور محبوباؤں کی آنکھیں رنگ برنگی مچھلیوں کو دیکھ کر چمک اُٹھتی ہیں اور وہ اپنا دل ہمیشہ کے لیے بہادر ماہی گیروں کو دے دیتی ہیں۔ اور رات کو جب تیل کی کمی سے چراغ کی مدھم لوٹمٹمانے لگتی ہے اور ہوا کی ہلکی سی پھونک اُسے بجھا دیتی ہے تو یہ تھکن سے چور ماہی گیر ان کے نیلگوں سینوں پر جن میں مچھلی کی بو آتی ہے، اپنا سر رکھ کر سو جاتے ہیں۔

لیکن جب سے لڑائی شروع ہوئی تھی اور جاپان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا تب سے ماہی گیروں کو عام طور سے سمندر میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کھلے سمندر میں جانے کے لیے انہیں فوجی افسروں سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔ جو چند امیر ماہی گیروں کو ملتا تھا کیونکہ دوسرے ماہی گیر رشوت دینے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ کوکس بازار جانے کے تمام راستے بند ہو گئے تھے کیونکہ بندرگاہ بہت بڑی چھاؤنی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ سڑک سے صرف فوجی لاریاں گزرتی تھیں اور سمندر سے صرف جنگی جہاز۔ مجھے اخباری نمائندے کی حیثیت سے خاص اجازت نامہ ملا تھا جس پر فوجی افسروں کے علاوہ چٹ گاؤں کی ڈپٹی کمشنر کی مہر بھی لگی ہوئی تھی۔

بوڑھے ماہی گیر نے اپنی چلم سلگائی۔ نوجوان ماہی گیر مانجھیوں کے گیت گانے لگا۔ میں

کشتی میں لیٹ کر خواب دیکھنے لگا۔ میری نگاہ دُور دُور تک سر پر سے گزرتے ہوئے ہوائی جہازوں کی سُرخ اور سبز روشنیوں کا تعاقب کرتیں اور پھر آسمان میں بکھرے ہوئے ستاروں میں کھو جاتیں جو نیلے آسمان کی گود میں دریا کی موجوں کی طرح بہہ رہے تھے۔

بوڑھا ماہی گیر میرے پاس سرک آیا اور چلم میری طرف بڑھا دی۔ میں نے ایک لمبا سا کش لے کر پوچھا ''تم اپنا جال ساتھ لائے ہو؟''

''نہیں جال کا کیا ہوگا۔ جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے سمندر میں جال ڈالنے کی اجازت نہیں ہے''۔

''کیوں نہیں؟''

''کہتے ہیں پانی میں بڑے بڑے بم ڈال دئے گئے ہیں تاکہ دشمن کے جہاز نہ آسکیں اور میں سوچتا ہوں کہ سرکار کے جہاز کیسے چلتے ہیں؟''

''بم تو سرکار ہی نے ڈالے ہیں۔'' بیٹے نے اپنا گیت بند کر کے جواب دیا۔ ''انہیں معلوم ہے کے بم کہاں کہاں پڑے ہیں اور وہ اپنے جہازوں کو بچا کر نکال لے جاتے ہیں۔''

''ہم تو تباہ ہوگئے۔'' بوڑھے نے اپنی داستان شروع کی۔ رات کے اندھیرے میں اُس کا جھریوں پڑا چہرا بڑا پروقار معلوم ہو رہا تھا جس پر پچاس برسوں کی صعوبتوں کے نشان تھے۔

''پچاس برس سے دریا میں جال ڈال رہا ہوں۔ اس کے ایک ایک حصے کو جانتا ہوں۔ بہتی ہوئی موجوں کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ ان کے نیچے کتنی مچھلیاں ہیں۔ سمندر کی مچھلیاں اور دریا کی مچھلیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ جب وہ چلتی ہیں تو موجوں کی رفتار میں فرق آجاتا ہے اور میں ایک نظر میں بھانپ لیتا ہوں کہ کون سی مچھلی جا رہی ہے۔ آسمان کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ موسم کتنی دیر میں بدل جائے گا۔ سمندر میں طوفان کب آئے گا اور دریا کا پانی الٹا کب بہے گا؟ پچاس برس سے کچھ نہیں تو لاکھوں مچھلیاں پکڑ ڈالی ہوں گی۔ لیکن آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ ہم جو محنت کرتے ہیں وہ دولت کہاں جاتی ہیں؟ ہم دریا میں خالی جال ڈال دیتے ہیں۔ جب اُسے کھینچتے ہیں تو اُس میں

چاندی بھری ہوتی ہیں جو جھلمل جھلمل چمکتی ہیں۔عورتیں اس چاندی کو بھر کر بازار لے جاتی ہیں اور اس کے بدلے میں تانبے، گلٹ اور کاغذ میں تبدیل ہوجاتی ہے اور ہمارے جسم سوکھتے چلے جاتے ہیں اور آنکھیں دھنستی چلی جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں لکڑی کی طرح خشک ہوتے جاتے ہیں۔میں پچاس برس سے چٹ گاؤں کے بازاروں کے لئے دریا سے چاندی نکال رہا ہوں لیکن مجھے تانبے اور گلٹ کے ٹکڑوں اور کاغذ کے میلے پرزوں کے سوا کچھ نہ ملا اور وہ بھی میرے پاس نہیں رہے ۔جیسے زندہ مچھلیاں تڑپ کر نکل جاتی ہیں، یہ ٹکڑے بھی ہماری ہتھیلیوں سے پھسل جاتے ہیں اور ہماری مفلسی پہلے سے بھی زیادہ بھیانک ہوجاتی ہے۔''

نوجوان ماہی گیر، باپ کی داستان غم سے بے نیاز کشتی کے اگلے سرے پر بیٹھا ہوا ایک عشقیہ گیت گا رہا تھا۔بوڑھے نے اپنا سلسلہء کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔''تم پڑھے لکھے ہو، بہت سے دیس دیکھے ہوں گے تم جانتے ہوگے کہ ہماری دولت کہاں جاتی ہے؟''

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بوڑھے ماہی گیر نے اس کا موقع نہیں دیا اور بہتی ہوئی موجوں کی طرف دیکھ کر اپنے سوال کا جواب دینے لگا۔جیسے وہ سب کچھ جانتا ہے۔

''یہ دریا ہزاروں برس سے بہہ رہا ہے اور اس کا پانی سمندر میں گر رہا ہے۔میری عمر ساٹھ برس کی ہونے کو آئی لیکن میں نے ایک دن بھی نہیں دیکھا کہ اس کی موجوں کا بہاؤ رک گیا ہو۔ ایک کے پیچھے دوسری موج دیوانہ وار سمندر کی طرف چلی آرہی ہے۔سمندر جس کی تہہ کا کچھ پتہ نہیں جو آکاش کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ہماری محنت بھی اسی طرح بہتی ہوئی کسی بڑے سے سمندر کی طرف چلی جارہی ہے۔سمندر جس کی تہہ کا کچھ پتہ نہیں جو آکاش کی طرح پھیلا ہوا ہے۔کوئی اندھا سمندر ہے جو ہماری چاندی کی طرح چمکتی ہوئی محنت کو نگلے جارہا ہے۔چاندی ہی تو ہے جو بہہ رہی ہے۔دیکھوں یہ موجیں چاندی کی طرح چمک رہی ہیں۔دریا کا رنگ سفید ہے اور سمندر کا رنگ نیلا اور یہ سفید چاندی نیلے سمندر میں جاکر کھو جاتی ہے۔''

میں نے موجوں کی طرف دیکھا۔جو واقعی بہتی ہوئی چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔

ہمارے بائیں طرف دور افق میں مہینے کی آخری راتوں کا چاند ابھر رہا تھا جس کی نرم کرنیں فضا سے گزر کر دریا کے جسم میں پھیل گئی تھیں اور مٹیالے پانی کو سیال چاندی میں تبدیل کر رہی تھیں۔ بوڑھے کا سیاہی مائل چہرہ چاندی کی ہلکی سی سرخی مائل روشنی میں چمک اُٹھا تھا اور سفید بادبان بادل کا ایک خوبصورت ٹکڑا معلوم ہوتا تھا جو ہمیں چاندی کے دریا میں بہائے لئے جا رہا تھا۔

بوڑھے ماہی گیر نے نظر اُٹھا کر چاندی کی طرف دیکھا پھر بادبان کی طرف۔ بادبان کچھ ٹیڑھا ہو گیا تھا یا شاید ہوا کا رخ بھی بدلنا ضروری تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ دونوں نے لپٹی ہوئی رسیاں کھولیں اور بادبان کا رخ بدل کر میرے پاس آبیٹھے۔

''جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے، مفلسی اور بڑھ گئی ہے۔ پہلے قحط پڑا، پھر وبائیں پھیلیں۔ ایسا قحط اور ایسی وبائیں تو میں نے دیکھی نہیں تھیں۔ ہیضہ اور پھر کالا آزار۔ پھر بد چلنی۔ ہمارے گاؤں کے گاؤں اُجڑ گئے۔ بوڑھے اور بچے مر گئے۔ لڑکے آوارہ ہو گئے اور لڑکیاں گھر بار چھوڑ کر چلی گئیں۔ پھر یہاں فوج آ گئی اور ہمارے لڑکے اور لڑکیاں ماہی گیری چھوڑ فوج میں مزدوری کرنے لگے۔ ماہی گیری کیسے کرتے؟ نہ جال تھے، نہ کشتیاں۔ سر چھپانے کیلئے گھر بھی نہیں تھا۔ یہ سب چیزیں تو قحط ہی کے زمانے میں بک چکی تھیں۔ اب لڑکے بے حیا ہو گئے تھے۔ لڑکیاں اور بھی زیادہ بے شرم ہو گئی ہیں۔ سپاہی انہیں روپے دیتے اور وہ سپاہیوں کو اب کیا کہوں؟ کیا دیتی ہیں۔ پہلے انہیں جال کی مرمت کرنی پڑتی تھی۔ سر پر مچھلیوں کی ٹوکری رکھ کر بازار جانا پڑتا تھا۔ پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا تھا۔ تو بھی محنت سے جسم تندرست رہتے تھے۔۔ چہرے پر ایمانداری کی چمک ہوتی تھی۔ اور اب......؟ اب کیا ہے۔ ذرا سی آنکھیں مٹکائیں، ذرا سا کولھا چلایا اور کام بن گیا۔ مجھ ہی کو دیکھوں۔ میرے گاؤں میں تین سو گھر تھے اور صرف آٹھ گھر رہ گئے ہیں۔ باقی سب اُجڑ گئے ان کھنڈروں میں بیٹھ کر گھٹنے روتے ہیں۔ میری بیوی قحط میں مر گئی۔ دو بیٹیاں تھیں، وہ گھر سے بھاگ گئیں۔ اب سنا ہیں کہ اراکان روڈ پر مزدوری کر رہی ہیں۔ مزدوری تو کیا کر رہی ہونگی یہ تو ایک بہانا ہے۔ ایک کا نام رادھا ہے اور دوسری کا ساوتری۔ یہ نام تمھیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ

تمہارا باپ زندہ ہے۔ نیا جھونپڑا لیا ہے، جال بھی ہیں اور کشتی بھی اور دریا میں بہت سی مچھلیاں ہیں۔ رادھا اور ساوتری آجائیں تو ہم خوب مچھلیاں پکڑیں گے۔ ہمارا ایک جال بھی ٹوٹا پڑا ہے ،اُس کی مرمت بھی ان کے بغیر کیسے ہوگی؟

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسوں آگئے۔ وہ چپ ہو گیا اور بہتے ہوئے پانی کی موجیں گننے لگا۔ جیسے وہ ان موجوں کے آئنے میں اپنی ساری گزری ہوئی زندگی کا عکس ڈھونڈھ رہا تھا۔ اُس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس کا اُجڑا ہوا گاؤں، مرے ہوئے ساتھی، بیوی جو داغ مفارت دے گئی، گھر چھوڑ کر بھاگ جانے والی بیٹیاں جو اس کو اب بھی اتنی ہی پیاری تھیں۔ وہ سب ان موجوں پہ تیر رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھے ماہی گیر کی انگلیاں کانپ رہی ہیں اور آنکھوں سے بہہ کر آنسو اس کی جھریوں میں بھر گئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگا۔" رادھا اور ساوتری ہی کو کیوں بُرا کہو۔ آج کل سب لڑکیاں ایسی ہی ہوگئی ہیں۔ ہمارے یہاں کالے گورے ہزاروں سپاہی آگئے ہیں۔ وہ لڑکیوں کیلئے موزے لاتے ہیں سفید اور لال پاوڈر سے بھرے ہوئے ڈبے لا تے ہیں چھوٹے چھوٹے آئینے لاتے ہیں اور لڑکیاں دیوانی ہو جاتی ہیں اور اپنا منہ رنگ کر اُن کے پیچھے دوڑتی ہیں۔ سپاہی دریا میں اور تالابوں میں ننگے نہاتے ہیں اور لڑکیاں کنارے کھڑی ہو کر اُن کا تماشہ دیکھتی ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ اور کئی بار سوچا کہ یہ سب لڑکیاں قحط اور وبا میں مر کیوں نہیں گئیں، مچھلیاں پکڑنا، کھیت بونا اچھا پیشہ ہے۔ مانا کہ اس سے غریبی دور نہیں ہوتی لیکن عزت تو باقی رہتی ہیں۔ گھر بار تو رہتا ہے۔ لیکن یہ منہ پر رنگ پوت کے دیسی بدیسی سپاہیوں سے آنکھیں لڑانا کہاں کا پیشہ ہے؟ لیکن اب جسے دیکھو وہ یہی کر رہی ہے۔ سپا ہی اپنے موٹروں پر گزرتے ہیں تو سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی لڑکیوں کو اپنے ساتھ بیٹھا لیتے ہیں اور دو تین میل آگے جا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں سے دوسرے سپاہی انہیں اُٹھا لے جاتے ہیں ۔ چٹ گاؤں سے پتنگا اور پتنگا سے راموورراموسے کوکس بازار تک یہی سلسلہ ہے۔ سب لڑکیاں

خراب ہو گئیں ہیں۔کوئی اچھی نہیں رہ گئی۔میں سوچتا ہوں ہم پر جاپانی بم کیوں نہیں گرتے۔''
پچھّم کے ساحل پر ایک گاؤں آباد تھا اور اس کے سر سبز درختوں کا جھنڈ چاندنی میں آہستہ آہستہ پیچھے سرک رہا تھا۔بوڑھے ماہی گیر نے اپنی انگلی کا اشارہ کر کے کہا۔'' وہ گاؤں دیکھتے ہو۔قحط کے زمانے میں وہاں کے تمام آدمی مر گئے۔اُن کی لاشیں گیدڑوں اور کتوں سے کھائیں۔ اس سال درختوں میں پھل نہیں آئے بلکہ شاخوں پر گدھ پلے تھے جو اکثر زندہ آدمیوں پر بھی جھپٹ پڑتے تھے۔کوئی آدمی اس طرف آنے کی ہمت بھی نہ کرتا تھا۔ایک رات کیا ہوا کہ ٹھیک بارہ بجے کے وقت دوسرے گاؤں سے ایک شعلہ بلند ہوا اور اس گاؤں کی طرف چلا۔تھوڑی دیر میں پچھّم کی طرف سے ایک شعلہ اُٹھا اور وہ بھی اس گاؤں کی طرف چلا اور پھر دونوں شعلے مل گئے ۔اس کی خبر چاروں طرف پھیل گئی۔اب روز رات کے وقت بارہ بجے دو شعلے ناچتے ہوئے چلتے تھے۔ایک پورب سے اور دوسرا پچھّم سے اور دونوں اس گاؤں میں آکر مل جاتے تھے۔کسی نے کہا ۔بھوت ہیں۔کسی نے کہا پریت ہیں اور تم جانتے ہی ہو کہ مرنے کے بعد انسان بھوت پریت بن جاتے ہیں اور یہاں تو ہزاروں آدمی ٹھٹھرے پڑے تھے۔جب میں نے پہلی بار ان بھوتوں کو دیکھا تو میرا دل کانپ اُٹھا۔میں ڈرپوک آدمی نہیں ہوں لیکن بھوت پریت سے تو سبھی ڈرتے ہیں۔''
بیٹے نے باپ کو ٹوک دیا۔''یوں نہیں ہوا تھا۔میں سناتا ہوں۔میں نے تو ان شعلوں کو پکڑا تھا۔''

''سچ !تم نے ان شعلوں کو پکڑلیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا

بوڑھے نے خوش ہو کر کہا۔''میرا بیٹا بڑا بہادر ہے۔''اور نوجوان ماہی گیر کا سینہ اور چوڑا ہو گیا اور بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اُٹھیں۔

اُس نے بہت گمبھیر لہجہ میں کہا کہ ''کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان بھوتوں کو پکڑلے۔ارد گرد کے تمام گاؤں تھر تھر کانپتے تھے۔کوئی کہتا تھا بھوت ہیں۔کوئی کہتا تھا کہ انگریزوں نے ایسے بم بنائے ہیں جو رات بھر خود بخود پہرہ دیتے رہتے ہیں اور دشمن کو پہچان کر اس پر جھپٹ پڑتے ہیں

۔بات ہی ایسی تھی۔اس سے پہلے چٹ گاؤں کے کسی آدمی نے شعلوں کو چلتے نہیں دیکھا تھا۔ میرے دل میں کچھ اور ہی آئی۔ میں نے کہا کہ جان رہے یا جائے، میں ضرور پتہ لگاؤں گا کہ یہ شعلے کیا ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں؟''

چاند اتنی دیر میں کافی اُنچا ہو گیا تھا اور اس کی کرنوں کی پھوار ہوا کے جھونکوں کے ساتھ زمین پر گر رہی تھی۔ رات ٹھنڈی ہو چلی تھی۔ دونوں ماہی گیروں نے ایک چلم اور بھری اور باری باری اُس کا کش لے کر میری طرف بڑھا دی۔

''میں کئی دن تک منصوبے باندھتا رہا لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں تیار ہو گیا۔ میں نے اپنی لنگوٹ کس کر باندھ لی اور ہاتھ میں بلم لے لیا اور رات کے گیارہ بجے سے جا کر راستے میں بیٹھ گیا جہاں سے وہ دونوں شعلے گزرتے تھے۔ میرا دل سینے سے نکل کر میرے کانوں میں آ گیا تھا اور اس کی دھڑکن سے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ میں جس پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا، اُس کی شاخیں میرے سر پر چڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ اب مجھے کچل دیں گی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف گھاس میں دبکے ہوئے کیڑے مکوڑوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں یا کبھی کبھی کتے رونے لگتے تھے۔ گیدڑ بولنے لگتے تھے یا پیڑوں پر بیٹھے گدھ اپنے پر پھڑ پھڑانے لگتے۔ گیارہ بجے، سوا گیارہ بجے، ساڑھے گیارہ بجے، پونے بارہ بجے۔ بس اب بارہ بجنے ہی والے تھے اور میرے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے اور خون معلوم ہو رہا تھا رگوں کو پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔

ٹھیک اُس وقت جب شہر کے گھنٹے نے بارہ بجائے تو میں نے دیکھا کہ دور میرے سامنے زمین سے ایک شعلہ اُٹھا اور میری طرف چلنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے دوسری طرف سے ایک اور شعلہ اُٹھا اور وہ بھی میری طرف بڑھنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں۔ دونوں شعلے میرے قریب آتے جا رہے تھے اور میں آنکھیں پھاڑیں ہوئے ہوئے اپنے سامنے سے آتے ہوئے شعلے کو دیکھ رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں اس کی چمک بہت تیز تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ

شعلہ زمین پر نہیں چل رہا بلکہ ہوا میں اُڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ ہوا میں معلق شعلہ میرے قریب آتا گیا۔ میرا بدن سن ہو گیا۔ زبان منہ میں اینٹھ گئی۔ بلم کو چھوا تو وہ کئی من کا معلوم ہو۔ میرے پیر زمین نے پکڑ لئے تھے اور اب مجھ میں اٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ میں نے عمر میں پہلی بار یہ محسوس کیا کہ میں بزدل ہوں۔ مگر اب کیا ہوتا؟ موت میرے سر پر آ گئی تھی اور وہ شعلہ مجھ سے دو تین گز کے فاصلے پر تھا اور میں اس کے راستے میں بیٹھا ہوا تھا۔ یکا یک میرے جسم میں ایک آگ سے لگ گئی۔ خون جو میری رگوں میں جم گیا تھا، پھر تیزی سے دوڑنے لگا اور کسی نے مجھے زمین سے اوپر اُچھال دیا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔۔۔کون ہے۔''

نوجوان ماہی گیر جب سو گیا تو بوڑھا ماہی گیر اپنی پھٹی ہوئی قمیض پر ایک پھٹی صدری پہننے لگا۔ رات کی خشکی بڑھ رہی تھی۔ ہم شاید سمندر کے قریب پہنچ رہے تھے کیونکہ بوڑھا ماہی گیر کشتی میں لیٹے ہوئے چپوؤں کو اِدھر اُدھر لگا رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے بھی بھیگے ہوئے تھے اور ان میں ہلکے سے نمک کا ذائقہ تھا۔

میں نے حیرت اور شوق سے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

نوجوان ماہی گیر نے اپنی چلم سے دو تین لمبے لمبے کش اور لئے اور پھر دریا میں چلم اُلٹ دی۔

''ہاں تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا 'کون ہے؟' اسی کے ساتھ فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی اور زمین پر بہت سارے انگارے بکھر گئے۔ میرے سامنے ایک ننگ دھڑنگ عورت کھڑی تھی جس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔''

''عورت؟'' میں نے پوچھا جیسے مجھے یقین نہ آیا ہو۔

''ہاں عورت۔۔۔۔ جوان عورت۔ ایسی ہی کوئی بیس برس کی اور سر سے پاؤں تک ننگی۔ میں نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ اُس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی بلکہ میرے کندھے پر سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگی اور میرا سینہ اس کے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ کوئی دس گز کے فاصلے پر

انگارے کا ایک ڈھیر اور پڑا تھا اور اندھیرے میں ایک پرچھائیں سی بھاگتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں نے پوچھا 'تو کون ہے؟' لیکن وہ مسلسل روئے جارہی تھی آخر میں نے اس کا چہرہ اپنے کندھے سے اُٹھایا اور اُسے غور سے دیکھا۔ ارے یہ تو چہرو تھی۔ عبداللہ چاچا کی بیٹی۔ میں نے کہا۔ ''چہرو تجھے کیا ہو گیا ہے۔ یہ رو کیوں رہی ہے؟ منہ سے بولتی کیوں نہیں میں بھلا تیرا کیا بگاڑوں گا؟ میں گنیش ہوں گنیش مچھیرا۔''

''ہاں!'' اس نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے بڑی شرم آرہی تھی کہ ایک ننگی عورت میری گود میں ہے میں نے بہت کوشش کی لیکن آنکھیں بند نہیں کر سکا۔ ستاروں کی روشنی میں میں نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ بے حد خوبصورت تھی جیسے کوئی اپسرا۔

''وہ اپنے گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ عمر بیس برس کی ہو گئی تھی لیکن اب تک بیاہ نہیں ہوا تھا۔ اُسکے باپ کے پاس بیاہ کرنے کے لئے روپیہ تھا ہی نہیں۔ گاؤں کے تمام لڑکوں کی رال اس پر ٹپکتی تھی اور جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتی تھی، یا ذرا مسکرا دیتی تھی، اُس کا دل کئی دن تک دھڑکتا رہتا تھا۔ میں نے بھی اُسے کئی بار دیکھا تھا اور دل میں یہ سوچتا تھا کی کاش وہ مچھیری ہوتی یا میں مسلمان ہوتا۔ میں اس سے ضرور شادی کر لیتا لیکن مشکل یہ تھی کہ میں مچھیرا تھا اور وہ مسلمان۔ لیکن آج رات کو بارہ بجے گاؤں کی یہ سب سے زیادہ خوصورت لڑکی جس پر ہر جوان لڑکا اپنی جان چھڑکتا تھا، اکیلی اور ننگی میری گود میں تھی۔ چاروں طرف سے سڑی ہوئی لاشوں کی بو آرہی تھی۔ درختو پر گدھ اپنے پروں کو پھڑ پھڑا رہے تھے، کتے رو رہے تھے اور گیدڑ بول رہے تھے۔ اور چہرو میرے سینے پر سر رکھے ہوئے تھی۔

''میں چہرو کو لیکر کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا کہ اسے جی بھر کر رو لینے دو۔ جب اس کے سارے آنسو بہہ جائیں گے، تب بات کروں گا۔''

بوڑھے ماہی گیر نے آواز دی۔ ''سمندر آگیا چپو سنبھال لو۔'' گنیش پیچھے اور اس کا باپ

آگے بیٹھ گیا اور چپو چپاچپ چلنے لگے۔ میں بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ دریا کی انفرادیت غائب ہو چکی تھی اور اب ہمارے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ سمندر پر ایک غنودگی طاری تھی۔ لہریں آہستہ آہستہ سانسیں لے رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکیں بڑے ہلکے تھے۔ ہماری کشتی پورب کی طرف مڑ گئی تھی اور چاند ہماری سر پر چمک رہا تھا۔ ایک خوبصورت چہرے کی طرح جو مکان کی سب سے اُونچی منزل کی کھڑکی سے جھانک رہا ہو۔ اور راہگیروں پر اپنے حسن کی بارش کر رہا ہو۔ دونوں ماہی گیر بڑی پھرتی اور صفائی سے چپو چلا رہے تھے۔ اُن کے جسم کے ایک ساتھ آگے جھکتے تھے اور پھر سیدھے ہو جاتے تھے۔ سیدھے ہوتے وقت اُن کے کندھے بلند ہوتے تھے اور سینے تن جاتے تھے۔ چپوں اُن کے ہاتھ معلوم ہوتے تھے جو سمندر تک پھیلے ہوئے تھے اور موجوں کو اس طرح کاٹ رہے تھے جیسے ہنسیا دھان کے پکے کھیتوں کو کاٹتا ہے۔ اُن کے بازوؤں کی جنبش ایک خاموش ہم آہنگی اور ترنم تھا جو سمندر کے موجوں کے ترنم سے مل گیا تھا۔

وہ دونوں بڑی دیر تک کشتی کھیتے رہے۔ یہاں تک کہ چاند پچھّم کی طرف ڈھل گیا اور ایک گول ٹکیا سمندر کی سطح کے قریب لرزنے لگی۔ باپ اور بیٹا دونوں تھک کر چور ہو گئے اور رستانے کے لئے انہوں نے پھر چپو نکال کر کشتی میں لٹا دیئے۔ گنیش نے اپنی ہتھیلیاں ملیں۔ بوڑھے ماہی گیر نے پھر چلم بھری اور کشتی کی ایک دیوار سے سہارا لے کر لیٹ گیا۔ بادبان میں بھری ہوئی ہوا کشتی کو آہستہ آہستہ چلا رہی تھی۔

میں نے گنیش کو آواز دی۔ وہ مسکرانے لگا۔ ’’تم چہرو کے بارے میں سوچ رہے ہو گے؟‘‘

’’ہاں‘‘

’’میرے دل میں بھی چہرو ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ اُس کا نام گل چہر تھا اور وہ ایک بہت غریب لڑکی تھی۔ سب لوگ اُسے چہرو کہتے تھے۔ قحط میں اس کے ماں باپ، بھائی بہن، سب مر گئے۔ وہ اکیلی رہ گئی۔ اُس زمانے میں تو بھیک بھی نہیں ملتی تھی۔ فاقے کرنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ لیکن چہرو خوبصورت تھی۔ اُس کی ایک سپاہی سے آشنائی ہو گئی۔ کوئی پنجابی

سپاہی تھا اور وہ دونوں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ ملنے کی یہ انوکھی ترکیب نکالی کہ رات کے بارہ بجے دونوں ننگے ہو جاتے تھے اور سروں پر آگ کی تھالی بھر کر رکھ لیتے تھے اور اُس گاؤں میں چلے جاتے تھے جہاں کسانوں کی لاشیں سڑ رہی تھیں۔''

لیکن وہ اس طرح کیوں ملتے تھے؟''

میں نے بھی چہرو سے یہی سوال کیا کہ تو نے یہ کیا تماشہ کیا ہے۔ رات کے بارہ بجے ننگی ہو کر چڑیلوں کی طرح کیوں نکلتی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ لوگ سچ مچ مجھے چڑیل اور میرے سپاہی کو بھوت سمجھیں۔ میں نے کہا کہ تو اس کے ساتھ نکاح کیوں نہیں کر لیتی؟ تو اُس نے بتایا کہ وہ ایک بار اپنے سپاہی کے ساتھ کمپ گئی تھی تو فوجی افسروں نے اُسے دیکھ لیا اور اسے سزا دی۔ پھر فوجی ٹھیکیداروں نے اُس کے پاس آدمی بھیجے کہ چل تجھے بڑے افسروں کے پاس لے چلیں گے لیکن وہ بڑے افسروں کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ کوئی بیسوا تھوڑی تھی۔ اُسے سچ مچ اپنے سپاہی سے محبت تھی۔ اس لئے رات کے بارہ بجے جب تمام گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے گھروں میں چھپ جاتے تھے تو وہ اپنے سر پر آگ کی بھری ہوئی تھال رکھ کر نکلتی تھی اور اپنے سپاہی سے مل کر واپس چلی جاتی تھی۔ سپاہی اُس کے کھانے اور رہنے کا خرچ دیتا تھا۔ جب میں نے یہ سنا تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ میں نے اس سے معافی مانگی لیکن اُسنے کہا کہ ''اب میں اپنے سپاہی سے نفرت کرنے لگی ہوں'' میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟'' تو بولی کہ ''وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ڈرپوک کہیں کا؟ وہ تو کہو کہ تم تھے اور تم مجھے جانتے ہو۔ کوئی اور ہوتا تو کیا ہوتا؟ اور تم نے بھی مجھے ننگا دیکھا ہے۔ بتاؤ تمہیں میرا جسم دیکھنا کا کیا حق ہے؟ میں تمھاری بیوی نہیں ہوں، تمہاری معشوقہ نہیں ہوں۔ تم نے میرے جسم پر اپنی نگاہیں کیسے ڈالیں؟'' یہ کہہ کر چہرو مجھ سے لڑنے لگی۔ وہ تن کر کھڑی ہوگئی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور اس نے اپنے خوبصورت بالوں سے اپنا سینہ چھپا لیا تھا۔ میں نے کہا چہرو میں تم کو گھر پہنچا آؤں لیکن اُس نے انکار کر دیا، ''کیا سمجھتے ہو؟ میں ڈرتی ہوں میں خود چلی جاؤں گی۔ جہاں میرا دل چاہے گا، وہاں جاؤں گی۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔''

وہ دیر تک کھڑی ہوئی سانس لیتی رہی اور پھر خود ہی بڑی نرمی سے بولی۔ ''تم کسی سے کہو گے تو نہیں؟'' میں نے وعدہ کیا تو وہ مسکرائی۔ اس سے میری ہمت بڑھی۔ اور میں نے کہاں۔ ''چھرو میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ مجھ سے بیاہ کرو گی؟'' وہ بہت زور سے ہنسی قہقہہ مار کر، جس کی آواز سن کر کتے پھر رونے لگے۔ اور گدھ اپنے پر پھڑ پھڑانے لگے۔ میں نے کہاں۔ ''میں نے کہا چھرو میں سچ مچ تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ میں دو برس سے تمہارا دیوانہ ہوں''۔

چھرو پھر سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی۔ ''تم نے پہلے کیوں نہیں بیاہ کی بات کی۔ مجھے دو وقت کھانا دے سکو گے؟ میری بہن دس برس کی بیاہی تھی لیکن اُس کے میاں نے اُسے ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیا۔ میری ماں نے مرنے سے پہلے اپنے تین برس کے بیٹے کو گھر سے دھکیل دیا، ایک مٹی بھر چاول کے لیے میرا باپ گلا گھونٹنا چاہتا تھا۔ بتاؤ تم مجھ سے بیاہ کر کے مچھلی اور بھات کہاں سے دو گے؟ آج تم نے مجھے ننگا دیکھا ہے تو تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی، لیکن اس محبت سے تم چاول نہیں خرید سکو گے۔ چاول.... چاول.... دو روپیہ سیر بک رہا ہے.... دو روپیہ سیر۔'' یہ کہتی ہوئی وہ چلی گئی۔ چھرو چلی گئی اور اس کا خوبصورت جسم اندھیرے میں کھو گیا۔ میرے سامنے انگاروں کا ڈھیر پڑا تھا جو رفتہ رفتہ بجھتے جا رہے تھے۔ وہ راتوں رات کہیں نکل گئی اور آج تک واپس نہیں آئی۔ اس قصے کو چھ مہینے ہو گئے ہیں۔ میں اپنے دل میں چھرو کی یاد لیے بیٹھا ہوں۔ جب بہت اُداس ہوتا ہوں تو کشتی لے کر دریا میں نکل جاتا ہوں۔ جسمانی محنت سے دل کا درد دُور ہو جاتا ہے۔''

گنیش تھوڑی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر خاموشی سے چپو چلانے لگا۔ اُس کا بوڑھا باپ خرّانٹے لے رہا تھا اور سمندر کی موجیں سسک رہی تھیں۔

میں بھی لیٹے لیٹے سو گیا۔ گنیش رات بھر اکیلا چپو چلاتا رہا۔ جب صبح میری آنکھ کھلی تو سورج نکل رہا تھا۔ سمندر کی موجیں ناچ ناچ کر گیت گا رہی تھیں۔ ہمارے پیچھے سبز رنگ کا زمردیں سمندر تھا اور سامنے سنہرے رنگ کا سمندر جس کے کنارے کوکس بازار کا دلکش ساحل پھیلا ہوا تھا۔ سپاری کے نازک درخت سر اُٹھائے ہوئے کھڑے تھے۔ جیسے ابھی سمندر سے نہا کر نکلے ہوں اور دھوپ

میں اپنے بال سکھار ہے ہوں ۔ دونوں ماہی گیر تیز تیز چپو چلا رہے تھے اور کشتی کوکس بازار کے ننھے سے دریا کے دہانے میں داخل ہورہی تھی۔

اب ہم پتلے سے دریا کے اندر تھے اور ہمارے دونوں طرف کالی کیچڑ اور پھر سنہرے رنگ کا ساحل تھا۔ ایک طرف ہزاروں موٹریں اور توپیں کھڑیں تھیں ۔ دوسری طرف ہوائی اڈے پر سینکڑوں جہاز بڑی بڑی ٹڈیوں کی طرح اپنا سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کئی جہاز سر پر منڈلا رہے تھے ۔جہاز توڑ توپیں اپنے دہانے آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے جاپانی جہازوں کا انتظار کررہی تھیں اور بہت سے سپاہی، افسر اور مزدور ریت پر چل پھر رہے تھے۔ بیچ دریا میں ایک لکڑی کا پل بنا ہوا تھا جس کے پاس کئی کشتیاں اور سمپانیں تیر رہی تھیں ۔ ہماری کشتی بھی پل سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

یکا یک گنیش کی زبان سے نکلا۔ ''چہرو''

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ پل پر ایک دبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی۔ اُس نے زرد مخمل کی پتلون اور سبز مخمل کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اُس کے کٹے ہوئے بال سمندر سے آنے والی ہوا سے اڑ رہے تھے۔ بھنویں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں سورج کی کرنوں سی تیزی تھی۔ میں نے پھر نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ اُس کے رخسار پاؤڈر اور رنگ سے گلابی ہورہے تھے۔ اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ایک بڑی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی اور داہنے میں ایک فوجی بید تھا۔

اُس نے بید سے میری طرف اشارہ کر کے کہاں ۔ ''بھدرلوک'' اور اُس کی آنکھوں میں ایک وحشی چمک ناچ اُٹھی۔ (بھدرلوک، بنگالی زبان میں شریف، سفید پوش)

بوڑھے ملاح نے جلدی سے کہاں۔ ''پرمٹ دکھاؤ''

میں نے جلدی سے پرمٹ نکالا اور کشتی میں کھڑے ہوکر چہرو کی طرف دیکھا لیکن اُس نے پرمٹ کی طرف دیکھا بھی نہیں اور مجھ سے کہاں۔ ''کشتی سے نیچے اترو۔''

میں نے پل پر چڑھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اُس نے اپنے بید سے ایک ٹھوکا دے کر کہا۔اُوپر مت چڑھو، کشتی سے اُترو۔''

لیکن نیچے سیاہ رنگ کی کیچڑ تھی میں حیران تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

گنیش نے کہاں۔''چہرو تو کتنی بدل گئی ہے؟ دیکھتی نہیں نیچے کتنا کیچڑ ہے۔''

''دیکھ رہی ہوں۔'' چہرو نے گنیش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہاں۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اسے نیچے اتارو۔ یہ بھدرلوک ہے اور بھدرلوک کو پل پر چڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔اسے کیچڑ پر چلاؤ تا کہ اس کے سفید کپڑے لت پت ہو جائیں۔ جلدی کرو دوسری کشتیاں آرہی ہیں۔''

چہرو کی آواز میں ایک قسم کا وقار تھا۔آنکھوں میں وہی وحشی چمک، گنیش اور بوڑھے ملاح کے چہروں پر پریشانی تھی۔ میں نے پیچھے موڑ کر دیکھا کئی فوجی کشتیاں آرہی تھیں۔

میں کیچڑ میں چلنے کو تیار ہو گیا اور اپنے جوتے اتارنے لگا۔گنیش نے اپنی مضبوط بازوؤں کی جنبش سے میرا سارا سامان اُٹھا کر ساحل پر پھینک دیا۔بوڑھے ملاح نے کہاں۔''چہرو! تو بڑی افسر ہو گئی ہے اور ہم سب کو بھول گئی ہے'' پھر میری طرف اشارہ کر کے بولا۔''یہ بھدرلوک نہیں ہیں۔بمبئی سے آئے ہیں۔غریبوں کی سیوا کرتے ہیں۔''

آخری جملہ سُن کر چہرو کو گھن آ گئی۔اُس کے ہوٹ تلخی سے اینٹھ گئے اور اُس نے اپنی وحشی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔''سب بھدرلوک ایک سے ہوتے ہیں اور غریبوں کی سیوا کرتے ہیں چاچا! میں تمہیں بھولی نہیں ہوں۔اپنی ماں کی کوکھ کو بھی نہیں بھولی ہوں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں کون ہوں؟ تم مچھیرے ہو اور میں کسان کی لڑکی ہوں۔ میں ہر بھدرلوک کو اس کیچڑ میں چلاتی ہوں۔تم نے اسے سمندر میں ڈبو کیوں نہیں دیا۔بھدرلوک کہیں کا؟''

میں اتنی دیر میں کیچڑ میں اتر چکا تھا۔اور جیب سے پیسے نکال کر کشتی کا کرایہ ادا کر رہا تھا۔

میرے پیر گھٹنوں گھٹنوں تک سیاہ کیچڑ میں دھنس گئے تھے۔ پُل پر کھڑی چھرو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اور گنیش اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جب میں کیچڑ سے گزر کر ساحل پر پہنچا تو چھرو کا قہقہہ بلند ہوا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر گنیش کو پل کے اُپر چڑھا لیا اور اس سے ہنس ہنس کر آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرنے لگی۔

گنیش نے پکار کر باپ سے کہا۔ ''بابا! تم جاؤ، میں یہیں رہوں گا۔''

بوڑھے ملاح نے ملامت بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا اور بولا۔ ''پاگل مت بن بیٹا۔ چھرو تیرے کام کی نہیں رہ گئی ہے۔'' چھرو نے مسکرا کر گنیش کے رخسار پر اپنی ہتھیلی سے ایک ہلکی سی تھپکی دی اور اُسے سہارا دے کر پل سے نیچے کی کشتی میں اُتارنے لگی۔ گنیش نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کود کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں چپو اُٹھا لئے اور انہیں تیز تیز چلاتا ہوا کشتی سے نکال لے گیا۔ چھرو کی نگاہیں اُس کا دور تک تعاقب کرتی رہیں۔

میں ایک میلے تولیے سے اپنے پیروں کی کیچڑ پوچھ رہا تھا کہ چھرو پل سے اتر کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی اور پوچھنے لگی۔ ''تم کہاں سے آئے ہو؟ بمبئی سے؟''

''جہنم سے'' میں نے جل کر جواب دیا۔

''میں کبھی کبھی بھدر لوک کو پیٹ بھی دیتی ہوں اپنے بید سے۔'' چھرو مانجھی کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

میں نے گردن اٹھا کر اس عجیب و غریب لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھو کی چمک میں بلا کا جادو تھا۔ اور پیشانی پر نفرت اور شرارت سے پڑی ہوئی ہلکی ہلکی شکنیں اُس کے خوبصورت بیضوی چہرے کے معصومیت دوقار کا اضافہ تھی۔ میں اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ گنیش کی کہانی نے میرا شوق اور بھی بڑھا دیا تھا لیکن چھرو کے تیور بڑے خطرناک تھے اور مجھے زبان کھولنے کی اجازت ہی نہیں دیتے تھے۔

''مجھے گالی کیوں دیتی ہوں؟ میں بھدر لوک نہیں ہوں۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا

''اچھا تم بھدر لوک گالی سمجھتے ہو؟ وہ ہنسی۔ ''مگر تمہارے کپڑے تو ویسے ہی ہیں۔''

''تمھارے کپڑے؟''

''یہ تو میں نے بھدر لوکوں کو جلانے کے لئے پہنے ہیں۔'' مجھے اچھے تھوڑی لگتے ہیں ''

''اور چہرے پر رنگ جو تم نے پوت رکھا ہے؟''

''روزی کمانے کے لئے۔''

میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ یہ بے حیائی تھی؟ بے باکی تھی یا انتقام کا جذبہ؟ میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

''اچھا تم بھدر لوک نہیں ہو اور غریبوں کی سیوا کرتے ہو؟ اُس نے بڑے طنز سے پوچھا۔ ''کالا بازار کرتے ہو یا لڑکیاں بیچتے ہو۔'' اس کی ماتھیں کی شکنیں اور گہری ہو گئیں اور تیوروں پر بل پڑ گئے۔ ہونٹو پر ایک تلخ سی ہنسی آئی اور وہ مجھے نفرت اور حقارت سے دیکھتی ہوئی چلی گئی اور میں سوچتا رہ گیا کہ یہ کیسی لڑکی ہے؟ جس میں کسانوں کی بو باس تک باقی نہیں رہ گئی ہے۔

یہ بغاوت اور انتقام نہیں ہے۔ صرف مزاج اور آوارگی ہے۔ یہ پارے سے بنی ہوئی لڑکی جس کی رگوں میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں خود اپنی ذات سے انتقام لے رہی ہے۔ اپنی فطرت اور اپنی انسانیت سے بغاوت کر رہی ہے جیسے سمندر کی کوئی بے تاب موج طوفان کی آغوش سے نکل کر ساحل پر آپڑی ہے تھپیڑے سے خشک ریت کو سمندر بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ننھے خاک کے ذرے اُسے اپنا رزق سمجھ کر ایک ایک گھونٹ کر کے۔ پی جائیں گے۔

کوکس بازار میں ہر ایک کی زبان پر چہرو مانجھی کا نام تھا۔ چہرو چوبیس برس کی کسان کی لڑکی تھی جس نے مزدوری کرتے کرتے مزدوروں کی سرداری حاصل کر لی تھی اور اب مانجھی کہلاتی تھی ۔جس نے تھابنی (دھوتی) اور گچھا (چولی) ترک کر کے انگریزی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ جو اپنے حسن کی وجہ سے فوجی افسروں کے منہ چڑھی ہوئی تھی، جو کسی سفید پوش آدمی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ جو ہر ایک کی بے عزتی کر دیتی تھی۔ جو درجنوں شریف آدمیوں کو کیچڑ میں چلا چکی تھی۔

عورتیں خاص طور سے اس سے نفرت کرتی تھیں لیکن مرد کچھ للچائے ہوئے لہجے میں اُس کی مذمت کرتے تھے۔

دوسرے دن میں نے اسے ایک جیپ میں گزرتے دیکھا۔ اُس کی گود میں پھولوں کا ایک بڑا سا گچھار کھا تھا۔

تیسرے دن وہ مجھے ایک چرنگ (لکڑی کا جھونپڑا) کے پاس کھڑی ہوئی مل گئی اور مجھے دیکھ کر مسکرادی۔

میں نے کہا۔ ''کیسی ہو چِرو؟''

''کیسی ہوں؟'' اس کی آنکھیں پھر چمک اٹھیں ''اچھا یہ بتاؤ، میں پتلون اور جیکیٹ پہن کر کیسی لگتی ہوں؟''

''بالکل انگلستان کی شہزادی معلوم ہوتی ہو۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اُس کے دونوں رخساروں میں دو چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے اور خوبصورت دانتوں کی قطار چمکنے لگی۔ اتنے میں ایک فوجی ٹرک آیا۔ چِرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور اُچک کر اُس میں بیٹھ گئی۔ جب ٹرک چلا تو وہ کھڑی تھی اور اُس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے اور بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ گاڑی کے پہیوں سے اڑنے والی سرخ دھول نے جو سپاری کے درختوں تک بلند ہوگئی تھی، اُسے ڈھانپ لیا۔

شام کو سارے کوکس بازار میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہر شخص یہ کہہ رہا تھا کہ چِرو کو یہاں سے نکال دو۔ اُس نے راموروڈ پر ٹرک سے اتر کر کسی شریف آدمی کو مارتے مارتے لہولہان کر دیا تھا۔ ساری بستی اس کے خلاف ہوگئی تھی لیکن فوج کا خوف انہیں زبانی احتجاج سے آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔ رات کو خبر آئی کہ فوجی افسروں نے اسے سزا دی ہے اور اب وہ ساحل کے علاقے سے باہر بستی میں نہیں نکلنے پائے گی۔ لوگ اطمینان کی سانس لے کر سو گئے اور پھر چِرو کے افسانے مزے لے لے کر بیان کرنے لگے۔

صبح ساحل پر چہرو مزدوروں کی ایک ٹولی کو کچھ ہدایت دے رہی تھی۔ اُس وقت سمندر سے پانی چڑھ رہا تھا اور لہریں دوڑ دوڑ کر ساحل کا منہ چوم رہی تھیں۔ بڑی بڑی سو گز لمبی لہریں روئی کے گالوں کی طرح بہتی ہوئی اور اپنی چاندی اُچھالتی ہوئی آتی تھیں اور ریت پر جھاگ چھوڑ کر چلی جاتی تھیں۔ چہرو ایک نیلے رنگ کا چست لباس پہنے ہوئے تھی اور ابھی سمندر سے نہا کر نکلی تھی۔ اس کی بانہیں ننگی تھیں بدن پر سمندر کے نمک کا بورادہ جما ہوا تھا۔ بھیگے بال اُلجھے ہوئے تھے اور چہرو کا گندمی رنگ سمندر کے نمکین پانی سے مل کر نکھر آیا تھا۔ میں نے پہلی بار اُس کے سڈول جسم کی دلکشی کا اندازہ کیا۔

وہ مجھے دیکھ کر ایک بار تن گئی اور اس کا سینہ سمندر کی کسی لہر کی طرح بلند ہو گیا۔ ''کیا تم بھی مزدوری چاہتے ہو؟ میں نے کل شام تمہاری ہی طرح ایک بھدر لوک کو پیٹا تھا جو مجھے سڑک کنارے کھڑا گھور رہا تھا۔ کیا تمہاری بھی شامت آئی ہے؟''

''تمہیں بھدر لوک سے اتنی نفرت کیوں ہے؟''

''تم سے مطلب؟ تم ہوتے کون ہو؟''

''میں کیسے بتاؤں جب تم سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی ہو؟''

میں حیران رہ گیا۔ اُس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دوڑتی ہوئی بالکل ساحل کے کنارے پہنچ گئی جہاں سمندر کی موجیں ریت کا منہ دھو رہی تھیں۔ وہ بھیگی ہوئی ریت پر بیٹھ گئی۔ اپنے پیر سمندر کی طرف پھیلا دیئے اور کہنیاں نرم مخملی ریت پر ٹکا دیں۔

''مجھے ایک بات بتاؤ گے؟'' اُس نے ایسی محبت سے پوچھا جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہوں

''پوچھو؟''

گنیش نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا ہے؟''

''ہاں وہ تم سے محبت کرتا ہے۔''

اُس کے چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا۔ اور آنکھوں میں بے انتہا نرمی اور لطافت آ گئی جیسے کسی نے جادو کے زور سے اس کی وحشت اور خشونت کو بدل دیا ہو اور وہ بے انتہا حسین ہو گئی۔ سمندر کی موجیں اُس کے پیروں کو چوم رہی تھیں اور ہوا کی غیر مرئی انگلیاں اُس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔

وہ بڑی دیر تک اپنے ہاتھوں سے گھروندے بناتی رہی اور بگاڑتی رہی۔ مجھے اس ریت سے بڑی محبت ہے۔ میں اسی سے پیدا ہوئی ہوں۔ گنیش بھی اسی سے پیدا ہوا ہے۔ میں اکثر آ کر اس ریت کی گود میں لیٹ جاتی ہوں اور گھنٹوں خواب دیکھتی رہتی ہوں۔ بڑے بڑے دھان کے کھیت کاٹ رہی ہوں اور دھان کی بالیاں سمیٹ سمیٹ کر کھلیان لگا رہی ہوں۔ میں کٹے ہوئے کھیتوں کی منڈیروں پر گاتی ہوئی گھوم رہی ہوں، زمین گا رہی ہے، آسمان گا رہا ہے ہوائیں گا رہی ہیں اور دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے جس میں گنیش بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے جال میں بڑی بڑی مچھلیاں تڑپ رہی ہیں جنہیں دیکھ کر چھوٹے چھوٹے بچے تالیاں بجا بجا کر ہنس رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں۔

''وہ چپ ہو گئی اور ریت کے گھروندے کو اپنی مٹھی میں اُٹھا لیا۔

''میں گنیش سے بہت باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کا باپ موجود تھا۔ بڈھا کھوسٹ کہتا ہے کہ میں گنیش کے قابل نہیں رہ گئی ہوں اور وہ اپنے باپ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ بزدل کہیں کا۔ دیکھو نا مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔'' اُس نے آخری جملہ بچوں کی طرح کہا۔

''مگر تم خود جو اسے چھوڑ کر چلی آئیں؟''

''محبت کرنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہوتی ہیں۔ مجھے بزدل آدمیوں سے بڑی نفرت ہے۔ میں ایسے آدمی پسند کرتی ہوں جو ہنستے ہوئے موت کے منہ میں چلے جائیں۔ دیکھو سمندر میں طوفان آ رہا ہے۔ پانی گزوں اُچھل رہا ہے۔ اگر میں گنیش سے اس وقت کشتی کھینے کے لئے کہوں تو وہ کبھی تیار نہ ہو گا۔ کنارے کھڑا ہوا جال پھینکے گا۔ مچھیرا ہے نہ مچھیرا؟ مجھے بھی مچھلی کی طرح پکڑنا

چاہتا ہے۔ بتاؤ میں مچھلی تو نہیں ہوں۔ بولو کیا میں مچھلی ہوں؟''

''نہیں''

''میں مچھلی نہیں ہوں۔ میں عورت ہوں چہرو ہوں۔ گل چہر ہے میرا نام مجھے کوئی مچھلی کی طرح نہیں پکڑ سکتا۔''

ایک مزدور دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ ''چہرو مانجھی! چہرو مانجھی! تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔''

''کہہ دو نہیں آتی''

''وہ بوتھی ڈانگ جا رہے ہیں۔ موٹر میں بیٹھے ہیں۔''

''بس کہہ دو۔ نہیں آتی۔ میں بوتھی ڈانگ نہیں جاؤں گی۔ میں سمندر میں جا رہی ہوں۔''

مزدور چلا گیا۔ میں نے پوچھا ''کس نے بلایا ہے؟''

''کوئی نہیں۔ وہ لال منہ کا بندر ہے۔ اُس کا تبادلہ ہو گیا اور مجھے بوتھی ڈانگ لے جانا چاہتا ہے۔ میں نہیں جاتی۔ اُس کے جیسے ہزاروں یہاں ملیں گے۔ کوئی میں ڈرتی تھوڑی ہوں۔ کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔ آؤ۔ طوفان میں کشتی چلائیں بڑا مزہ آئے گا۔''

میں کہنا چاہتا تھا کہ کشتی الٹ جائے گی لیکن اس ڈر سے چپ رہا کہ وہ مجھے بزدل سمجھے گی۔

اُس نے ایک نازک سی سمپان کا انتخاب کیا۔ اور پل پر چڑھ کر اُس میں کود گئی۔

میں نے پوچھا۔ ''میں بھدرلوک ہوں۔ کیا کیچڑ میں چلکر آؤں؟''

''پل سے ہو کر آ جاؤ۔ تم بھدرلوک نہیں ہو۔ جب تم میرے کہنے سے بغیر احتجاج کئے کیچڑ میں چلنے کو تیار ہو گئے، تب ہی سمجھ گئی تھی کہ تم بھدرلوک نہیں ہو۔''

اُس نے چپو سنبھال لئے اور سمپان کھینے لگی۔ اُس کے ہاتھ بڑی مشاقی سے چل رہے تھے۔ جب سمندر کا پانی چڑھ رہا ہوں، اُس وقت کشتی کھینا مذاق نہیں ہے۔ میرا دل کانپ رہا تھا کہ کہیں سمپان اُلٹ نہ جائے لیکن چہرو بڑے اطمینان سے چپو چلا رہی تھی۔

''تمہیں چپو چلانا آتا ہے؟''

''ہاں بمبئی میں سمندر میں کشتی کھے چکا ہوں۔''

''اور تیرنا بھی آتا ہے؟''

''ہاں کچھ یوں ہی سا۔''

''پھر ڈر کی کوئی بات نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ چپوؤں کو اور زیادہ تیز چلانے لگی۔

کھلا ہوا سمندر جوش کھائے پانی کی طرح اُبل رہا تھا اور ہماری سمپان غصے میں بپھری ہوئی موجوں پر ایک سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ موجوں کے تھپیڑے بڑے سخت تھے اور سمپان بری طرح ڈگمگانے لگی تھی۔ ایک موج کشتی کے اوپر سے گزر کر ہمیں بھگو گئی۔

میں نے کہا۔ ''چپو مجھے دے دو۔''

''تم مجھ سے اچھا چپو نہیں چلا سکتے۔''

''تم سمپان واپس لے چلو۔ اُلٹ جائے گی۔''

''تم ڈر رہے ہو؟''

میں نے لپک کر چپو پکڑ لئے۔ چہرو نے انہیں میرے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کی۔ ایک بار سمپان پھرکی کی طرح ناچ اُٹھی اور ایک بڑی سی غضب ناک موج نے آکر اُسے دس بارہ فٹ اُپر اُٹھا لیا اور ایک زبردست جھٹکے سے ساحل پر پھینک دیا۔ ایک دوسری موج ہمارے اُوپر سے گزر گئی۔ اور سمندر غرانے لگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ چہرو کہاں گری اور میں کہاں گرا، جب موج ہمارے اُپر سے گزری تو میں ریت پر پڑا ہوا تھا اور چہرو مجھ سے کئی گز دور کھڑی ہوئی تھی اور کشتی موجوں کے تھپیڑوں میں تھی۔ ایک چپو ریت میں دھنسا ہوا تھا اور دوسرا آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے ہوئے فریاد کر رہا تھا۔ اُس نے پکار کر پوچھا۔ ''چوٹ تو نہیں لگی؟''

''نہیں ریت بہت نرم ہے۔'' میں نے جواب دیا حالانکہ میرے گھٹنے اور کہنیاں چھل گئی تھیں۔ چہرو پھر میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ''میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی اس دنیا کو اسی طرح

اُٹھا کر پھینک دے۔ جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو میں خوشی سے دیوانی ہو جاتی ہوں اور میں سوچتی ہوں یہ طوفان بڑھتا جائے گا، یہاں تک کہ آسمان اور زمین کے بیچ میں صرف سمندری ہی سمندر رہو گا۔ اس کی نیلی موجوں میں، ہم تم، گنیش، چاند، سورج، ستارے سب ڈوب جائیں گے۔''

میں نے کہاں۔ ''تم پگلی ہوں چھرو''

''ہاں میں سچ مچ پگلی ہوں۔ تم بھی پگلے ہوں جو میرے پاس بیٹھے ہو۔ گنیش بھی پگلا ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہے اور وہ لاکھوں کسان اور مچھیرے سب پگلے تھے جو چار دانہ چاول کے لئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ صرف بھدر لوک پگلا نہیں ہے۔ باقی سب پگلے ہیں۔''

''تمہیں بھدر لوک سے اتنی نفرت کیوں ہے؟'' میں نے موقع پا کر پوچھا۔

چھرو ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اس کی نظروں کی وحشی چمک اُس کی آنکھوں میں واپس آ گئی۔

''جانتے ہوں میں کیا کرتی ہوں؟ اس نے مجھ سے پوچھا۔ 'میں اپنا جسم بیچتی ہوں۔ اجنبی آدمی تم وہ پہلے شخص ہو جس سے میں اس طرح بات کر رہی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں میں بہت خوبصورت ہوں۔ مجھے اپنی صورت اور اپنا جسم بہت اچھا لگتا ہے۔ اور میں اسے بیچتی ہوں۔ ایک رات کے تیس روپے لیتی ہوں اور فوجی افسر مجھے اس سے زیادہ روپے دیتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو گے یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ نہیں میں تو کسان کی بیٹی ہوں۔ دھرتی کی طرح پاک۔ میں نے یہ پیشہ کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن جب میرے ماں باپ مر گئے اور سارا گاؤں اُجڑ گیا اور میں ہزاروں لاشوں کے بیچ میں اکیلی رہ گئی اور لاشوں کو نوچ نوچ کر کھانے والے کتے مجھے اپنے دانت پسیتے تھے تو گیارہ دن کے فاقوں کے بیچ میں لڑکھڑاتی ہوئی اپنے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئی، مٹھی بھر چاول بھیک مانگنے کے لئے۔ وہ چاول کا دھان میں نے پچھلی بار اپنے ہاتھوں سے کاٹا تھا۔ زمیندار کے گھر میں چاول بھرا ہوا تھا۔ لاشوں کی طرح بوریاں گنجی ہوئی تھیں۔ وہ اس کا بیوپار کرتا تھا۔ کالے بازار کا بیوپار جہاں وہ ہمارے کھیتوں کا پیدا کیا ہوا چاول ساٹھ روپے من بیچ رہا تھا۔ میں گیارہ دن کی بھوکی تھی اور دنیا میں کوئی سہارا نہیں تھا۔ کئی بار میں نے سڑی ہوئی لاشوں کا

گوشت کھانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گھن آ گئی۔ میں نے زمیندار سے مٹھی بھر چاول مانگے۔ اُس سے پوچھا کیا قیمت دو گی؟ مگر میرے پاس کیا تھا۔ میں نے کہاں خیرات دے دو۔ اُس نے کہاں میں کئی خیراتی اسکول اور یتیم خانے چلا رہا ہوں؟ چٹ گاؤں میں میرا خیراتی لنگر خانہ چل رہا ہے۔ آخر کہاں تک خیرات دوں؟ میں نے پوچھا پھر میں کیا کروں؟ چٹ گاؤں تک جانے کی سکت نہیں ہے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، اُس نے کہا۔ ''تمہارے پاس جوانی ہے، خوبصورت چہرہ ہے۔ بھرا ہوا جسم ہے۔ اسے کہیں جا کر بیچ آؤ۔''

لیکن میرا جسم کوئی چاول کی بوری تو نہیں تھا جو میں اسے بیچ دیتی۔ میں وہاں سے بھاگ آئی۔ لیکن دو دن کے بعد جب میں تیرہ دن کی بھوکی تھی، میں اپنا جسم لاش کی طرح گھسیٹ کر زمیندار کے پاس لے گئی۔ میں نے کہاں۔ میں اپنا جسم مٹھی بھر چاول کیلئے بیچنے آئی ہوں۔ اِسے خریدو گے؟ وہ خفا ہو گیا۔ بھدر لوک بڑے عزت والے ہوتے ہیں۔ اُس نے کہاں میں کوئی دلال ہوں۔ میں نے کہا۔ میں اپنا جسم کہاں بیچنے جاؤں؟ مجھ سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔ زمیندار نے اپنے گھر سے اسے نکال دیا۔ اُس کا بیٹا جو مجھے گھسیٹ کر باہر لایا تھا، سیر بھر چاول میں میرا جسم لے گیا۔ تب سے میں محسوس کرتی ہوں کہ میرا جسم میرے پاس نہیں ہے۔ میری جوانی نہیں ہے۔ میری خوبصورتی نہیں ہے۔ یہ سب تو سیر بھر کچے چاول میں بک چکی ہیں۔ اس کے بعد مجھے ایک سپاہی ملا۔ وہ ڈرپوک تھا۔ پھر کنیش ملا۔ وہ بھی بزدل نکلا۔ اور اب کوکس بازار میں میری حکومت ہے۔ یہاں جتنے آدمی ہے سب بزدل ہیں۔ یہاں بہت سے بھدر لوک آتے ہیں۔ اپنا بیوپار کرنے کے لئے، فوجی ٹھیکہ لینے کیلئے۔ میں انہیں کیچڑ میں چلاتی ہوں۔ کبھی کبھی کسی کو پیٹ بھی دیتی ہوں۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ میرے الٹ کر تھپڑ مار دے۔ انہیں روپے کی ہوس اور لالچ نے بزدل بنا دیا ہے۔ وہ جانتے ہے کہ میں فوجی افسروں کے منہ چڑھی ہوں اور وہ مجھے تھپڑ مار کر انہیں ناراض نہیں کر سکتے۔ انہیں روپیہ کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے گاؤں کی بہو بیٹیاں لا کر فوجی افسروں کے ہاتھ بیچ جاتے ہیں۔ تم سمندر کے راستے واپس مت جانا اراکان روڈ سے ہو کر جانا۔ چٹ

گاؤں سے اسی میل دور ہے لیکن یہاں سے چپٹ گاؤں تک تین لاکھ عورتیں ہیں جو میری طرح پیشہ کر رہی ہیں اور ان کی کمائی بھدر لوک کھا رہے ہیں۔ تم بھدر لوک نہیں ہو۔ اس لئے میری بات سمجھ جاؤ گے۔ وہ کہتے ہے چھرو مانجھی بد ماش ہے، چھرو مانجھی آوارہ ہے، چھرو مانجھی بیسوا ہے، لیکن بھدر لوک مجھ سے زیادہ آوارا ہیں، وہ سب بیسوا ہیں، دلال ہیں۔ اُن کی عزت، اُن کا مذہب، اُن کا دیوتا سب کچھ روپیہ ہے۔ اس کیلئے وہ اپنی ماؤں کو بیچ ڈالیں، اپنی بیٹیوں کو بیچ ڈالیں۔ اُن کی عزت اور شرافت صرف ان کے کپڑوں میں ہے۔ کیا بمبئی میں بھی بھدر لوک ہوتے ہیں؟''

''بھدر لوک ہر جگہ ہوتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا

''پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے ان سے بڑی نفرت ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

سورج کی کرنیں بہت تیز ہو گئی تھیں۔ چھرو مانجھی کے گندمی رنگ چہرے پر پسینے کے موتی چمک رہے تھے۔ سمندر کی موجیں اُس کے قدم چوم رہی تھیں اور ہوا کی غیر مرئی انگلیاں اُس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور جیسے کوئی غنودگی کے عالم میں باتیں کر رہا ہوں، زیرِ لب آہستہ آہستہ کہا:

''جب یہاں سے جانا تو گنیش سے کہہ دینا کہ میں اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔ میں اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔''

☆☆

کرشن چندر

مہالکشمی کا پل

مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار مہالکشمی جی کا ایک مندر ہے۔ اسے لوگ ریس کورس بھی کہتے تھے۔ اس مندر میں پوجا کرنے والے لوگ ہارتے زیادہ ہیں جیتتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدرو ہے جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دُھلتی ہے اور بدرو میں انسان کے جسم کی غلاظت اور جن دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کے پل کے اوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑھیاں لہرا رہی ہیں۔ پل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ایک ساڑھیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑھیاں کوئی بہت قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ یہاں ہر روز ان ساڑھیوں کو دھوکر سوکھنے کے لئے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے آر پار جاتے ہوئے لوگ مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ، گاڑی کی کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ اکثر ان ساڑھیوں کو ہے ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں۔ بھورا، گہرا بھورا، مٹ میلا، نیلا، قرمزی، بھورا، سرخ گہرا نیلا اور لال۔ وہ لوگ اکثر انہیں رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے دوسرے لمحے میں گاڑی پُل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔ ان ساڑھیوں کے رنگ اب جاذبِ نظر نہیں رہے۔ کسی زمانہ میں ممکن ہے جب یہ نئی خریدی گئی ہوں ان کے رنگ خوصورت اور چمکتے ہوئے ہوں۔ مگر اب نہیں ہیں۔ متواتر دھوئے جانے سے ان کے رنگوں کی آب وتاب مرچکی ہے اور ان یہ ساڑھیاں اپنے پھیکے سیٹھے روز مرّہ کے انداز کو لئے بڑی بے دلی سے جنگلے پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انہیں سو بار دیکھئے یہ کبھی آپ کو خوبصورت نہ دکھائی دیں گی۔ نہ ان کا رنگ و روپ اچھا ہے۔ نہ ان کا کپڑا۔ یہ بڑی

سستی، گھٹیا قسم کی ساڑھیاں ہیں ہر روز دُھلنے سے ان کا کپڑا ابھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں کہیں روزن بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں اُدھڑے ہوۓ ٹانکے اور کہیں بدنما داغ جو اس قدر پائدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں دُھلتے بلکہ اور گہرے ہوتے جاتی ہیں۔ میں ان ساڑھیوں کی زندگیوں کو جانتا ہوں۔ کیونکہ میں ان لوگوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہالکشمی کے پُل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متمول نہیں ہے۔ بڑی غریب سی چال ہے میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں۔ ابھی وزیر اعظم کی گاڑی آنے میں بہت دیر ہے۔ آپ انتظار کرتے کرتے اکتا جائیں گے۔ اس لئے اگر آپ ان چھ ساڑھیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سُن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ ادھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑھی لٹک رہی ہے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑھی لٹک رہی ہے وہ کبھی بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہوگی۔ مگر وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ آپ نہیں، میں اس کا گہرا بھورا رنگ دیکھ سکتا ہوں۔ کیوں کہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا۔ اب اس دوسری ساڑھی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے۔ جیسا شانتی بائی کی ساڑھی کا اور شاید آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے فرق محسوس کرسکیں۔ میں بھی جب ان کے پہننے والیوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں، تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں۔ مگر یہ پہلی ساڑھی ہے اور جس کا گہرا بھورا رنگ صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے۔

شانتا بائی کی زندگی بھی اس ساڑھی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔ شانتا بائی برتن مانجھنے کا کام کرتی ہے۔ اس کی تین بچے ہیں ایک بڑی لڑکی ہے۔ دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال کی ہوگی۔ سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔ شانتا بائی کا خاوند سیؤں مل کے کپڑے کھاتے میں کام کرتا ہے۔ اسے بہت جلدی جانا ہوتا ہے۔ اس لئے شانتا بائی اپنے خاوند کے لئے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا رکھتی ہے۔ کیوں کہ صبح اُسے خود برتن صاف کرنے کے لئے اور پانی ڈھونے کے لئے دوسرے گھروں میں جانا ہوتا ہے۔ اور اب وہ ساتھ میں اپنی چھ

برس کی بچّی کو بھی لے جاتی ہے۔ اور دوپہر کے قریب چال میں واپس آتی ہے۔ واپس آ کے وہ نہاتی ہے۔ اور ساڑھی دھوتی ہے اور سکھانے کے لئے پل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے۔ اور پھر ایک بے حد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانا پکانے جاتی ہے۔ شانتا بائی کے گھر کا چولہا اسی وقت سلگ سکتا ہے۔ جب دوسروں کے یہاں چولہے ٹھنڈے ہو جائیں۔ یعنی دوپہر کے دو بجے اور رات کے نو بجے۔ ان اوقات کے اِدھر اور اُدھر اسے دونوں وقت گھر سے باہر برتن مانجھنے اور پانی ڈھونے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اب تو چھوٹی لڑکی بھی اس کا ہات بٹاتی ہے۔ شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے۔ چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ اب میں جب کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اس کے گال سُرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں۔ اس دن شانتا بھی میرے نمستے کا جواب نہیں دیتی۔ جلتی بھُنتی بڑبڑاتی چولہا سلگانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اور چولہے میں آگ کم اور دھواں زیادہ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے دھوئیں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ کر چیختا ہے۔ تو شانتا بائی اس کے چینی ایسے نازک رخساروں پر زور زور سے چپتیں لگانے سے باز نہیں آتی۔ اس پر بچہ اور زیادہ چیختا ہے۔ یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے کیوں کہ اسے دودھ نہیں ملتا۔ اور اسے اکثر بھوک لگتی رہتی ہے اور دو سال کی عمر ہی میں اسے باجرے کی روٹی کھانا پڑتی ہے۔ اسے اپنی ماں کا دودھ اپنے دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے چھ سات ماہ نصیب ہوا وہ بھی بڑی مشکل سے۔ پھر یہ بھی خشک باجری اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہمارے چال کے بچے اسی خوراک پر پیتے ہیں۔ وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو دن بھر خشک باجری اور ٹھنڈا پانی پی ہی کر کام کرنے جاتے ہیں۔ اور ان کی بھوک بڑھتی جاتی ہے۔ اور ہر وقت معدے کے اندر اور دل کے اندر دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اور جب پگار ملتی ہے تو ان میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانے کا

رُخ کرتے ہیں۔ تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لئے یہ دھمک زائل ہو جاتی ہے۔ لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی پی نہیں سکتا۔ ایک دن پئے گا دو دن پئے گا۔ تیسرے دن تاڑی کے لئے پیسے کہاں سے لائے گا۔ آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے راشن کا خرچہ ہے۔ بھاجی ترکاری ہے۔ تیل اور نمک ہے۔ بجلی اور پانی ہے۔ شانتا بائی کی بھوری ساڑھی ہے۔ جو چھٹے ساتویں ماہ تار تار ہو جاتی ہے۔ کبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی۔ یہ مِل والے بھی پانچ روپئے چار آنے میں کسی نکمی ساڑھی دیتے ہیں۔ اس کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی۔ چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کے، جوڑ کے، گانٹھ کے، ٹانکے لگا کے کام دیتا ہے۔ اور پھر وہی پانچ روپے چار آنے خرچ کرنے پڑتے ہیں اور وہی بھورے رنگ کی ساڑھی آجاتی ہے۔ شانتا بائی کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ اس لئے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اسے گھروں میں جھاڑو دینا ہوتی ہے۔ برتن صاف کرنے ہوتے ہیں۔ تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا ہوتا ہے۔ وہ بھورا رنگ نہیں پسند کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ، گلابی، بسنتی، نارنجی پسند کرے گی ___ وہ اتنی بیوقوف نہیں ہے۔ دو تین بچوں کی ماں ہے۔ لیکن کبھی اس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے پہنے تھے۔ انھیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا۔ جب وہ دھاروار میں اپنے گاؤں میں تھی۔ جہاں اس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی۔ جہاں میلوں میں اس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے جہاں اس کے باپ کے دھان کے کھیت تھے۔ ایسے شوخ ہرے ہرے رنگ کے کھیت اور آنگن میں پیرو کا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے تو وہ توڑ توڑ کے کھایا کرتی تھی۔ جانے اب وہ پیروؤں میں مزا ہی نہیں ہے۔ وہ شیرینی اور گھلاوٹ ہی نہیں ہے۔ وہ رنگ، وہ چمک دمک کہاں جا کے مرگئی۔ وہ سارے رنگ کیوں یک لخت بھورے ہو گئے۔ شانتا بائی کبھی برتن مانجتے مانجتے، کھانا پکاتے، اپنی ساڑھی دھوتی اسے پل کے جنگلے پر لا کر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اس کی بھوری ساڑھی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹری پر بہتے جاتے ہیں اور دوسرے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت کو پُل کے اوپر جنگلے میں

ایک بھوری ساڑھی کو پھیلاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور بس دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

جیونا بائی کی ساڑھی جو شانتا بائی کی ساڑھی کے ساتھ لٹک رہی ہے گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ بظاہر اس کا رنگ شانتا بائی کی ساڑھی سے بھی پھیکا نظر آئے گا۔ لیکن اگر آپ اسے غور سے دیکھیں گے تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ بھی پانچ روپئے چار آنے کی ہے اور بڑی ہی بوسیدہ ہے۔ دو ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی لیکن اب وہاں پر ٹانکے لگ گئے ہیں۔ اور اتنی دور سے معلوم بھی ہوتے ہیں۔ وہاں آپ وہ بڑا ٹکڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے۔ اور اس ساڑھی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑھی بہت پھٹ چکی تھی، لگایا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی اس پہلی ساڑھی کا ہے اور اس دوسری ساڑھی کو مضبوط بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھنگ سوچا کرتی ہے۔ پرانی یادوں سے نئی یادوں کو تلخیوں کو بھول جانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ جیونا بائی اپنے اس خاوند کے لئے روتی رہتی ہے۔ جس نے ایک دن اسے نشے میں مار مار کر اس کی آنکھ کانی کر ڈالی تھی۔ وہ اس لئے نشے میں تھا وہ اس روز مل سے نکالا گیا تھا۔ بڈھا ڈھونڈا اب مل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گو وہ بہت تجربہ کار تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا۔ بلکہ وہ تو اب دن رات کھانسی میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ کپاس کے ننھے ننھے ریشے اس کے پھیپھڑوں میں جا کے ایسے دھنس گئے تھے جیسے چرخیوں اور اٹیوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے مہین دھاگے پھنس جاتے ہیں۔ جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے اسے دمے میں مبتلا کر دیتے۔ اور جب برسات نہ ہوتی تو وہ دن بھر رات بھر کھانستا۔ ایک خشک اور مسلسل کھنکھار گھر میں اور کارخانے میں جہاں وہ کام کرتا تھا سنائی دیتی رہتی۔ مل کے مالک نے اس کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سنا اور ڈھونڈو کو مل سے نکال دیا۔ ڈھونڈو داس رہ رہ کے چھ ماہ بعد مر گیا۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا کیا ہوا اگر غصے میں آ کر اس

نے جیونا بائی کی آنکھ نکال لی۔ تیس سال شادی شدہ زندگی ایک لمحے کے غصّے پر قربان نہیں کی جاسکتی اور اس کا غصہ بجا تھا۔ اگر مِل مالک ڈھونڈو کو یوں بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا کی آنکھ نکل سکتی تھی۔ ڈھونڈو ایسا نہ تھا۔ اسے اپنی بے کاری کا غم تھا۔ اپنی ۳۵ سالہ ملازمت سے برطرف ہونے کا غم تھا اور سب سے بڑا رنج اِس بات کا تھا کہ مِل مالک نے چلتے وقت اسے ایک دھیلا بھی تو نہیں دیا۔ ۳۵ سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مل میں کام کرنے کے لئے آیا تھا۔ اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا۔ اور دروازے سے باہر نکلنے پر اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آنے پر اسے ایک دھچکا سا لگا۔ باہر آکے اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان ۳۵ سالوں میں کسی نے اس کا سارا رنگ، سارا خون، اس کا سارا رس چوس لیا ہو۔ اور اسے بیکار سمجھ کر باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا ہو۔ اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اس بڑی چمنی کو دیکھنے لگا جو بالکل اس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی۔ یکا یک ڈھونڈو نے غم اور غصّے سے اپنے ہاتھ ملے۔ زمین پر زور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانے میں چلا گیا۔

لیکن جیونا کی ایک آنکھ جب بھی نہ جاتی۔ اگر اس کے پاس علاج کے لئے پیسے ہوتے۔ وہ آنکھ تو گل گل کر، سڑ سڑ کر، خیراتی ہسپتالوں میں ڈاکٹروں، کمپونڈروں اور نرسوں کی بداحتیاطی اور گالیوں اور لاپراوائیوں کا شکار ہوگئی۔ اور جب جیونا اچھی ہوگئی تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکا۔ ان دنوں میں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اسے چند گھروں میں برتن مانجنے کا کام دلوادیا تھا۔ اور گو وہ اب بوڑھی تھی۔ اور مشاقی اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی۔ پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں جھوٹی طاقت کے بودے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبودار تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سُنتی رہی۔ اور کام کرتی رہی۔ کیونکہ اس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔ لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا اور اب جیونا بائی اکیلی تھی۔ خیریت اس میں تھی کہ بالکل اکیلی تھی۔ اور اب اسے صرف اپنا دھندا کرنا تھا۔ شادی کے دو

سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا تو جیونا بائی کو یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہنے بسر کر دی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کرے گی۔ وہ ایسا نہ کرے گی، اس کا اسے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا۔ وہ کبھی فارس روڈ نہیں گئی کیونکہ اسے اس کا یقین تھا کہ اس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی۔ یہاں اپنی کھولی میں کیا نہیں تھا۔ پانچ روپے چار آنے والی دھوتی تھی۔ باجرے کی روٹی تھی۔ ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی عزت تھی۔ اور یہ سب کچھ چھوڑ کے وہ فارس روڈ پر کیوں جانے لگی۔ اسے تو کوئی بدمعاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کے لے گیا تھا۔ کیوں کہ عورت محبت کے لئے سب کچھ کر گزرتی ہے۔ خود وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈو کے لئے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر یہیں چلی آئی تھی۔ جس دن ڈھونڈ مرا اور جو لوگ اس کی لاش کو جلانے کے لئے لے جانے لگے اور جیونا نے اپنی سیندور کی ڈبیا اپنی بیٹی کی انگیا پر انڈیل دی۔ جو اس نے بڑی مدّت سے ڈھونڈو کی نظروں سے چھپا کر رکھی تھی۔ عین اُسی وقت ایک گدرائے ہوئے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا لباس پہنے اس سے آکے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اسے دیکھ کر جیونا کو یقین آ گیا کہ جیسے اب سب کچھ مر گیا ہے اس کا پتی اس کی بیٹی، اس کی عزّت، جیسے وہ زندگی بھر روتی نہیں، غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اس کے پاس کچھ نہیں تھا، شروع ہی سے کچھ نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اسے نہتا، ننگا اور بے عزّت کر دیا گیا تھا اور جیونا کو ایک لمحے میں احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں اس کا خاوند زندگی بھر کام کرتا رہا اور وہ جہاں اس کی آنکھ اندھی ہوگئی اور وہ جگہ جہاں اس کی بیٹی اپنی دکان سجا کر بیٹھ گئی، ایک بہت بڑا اندھا کارخانہ ہے جس میں کوئی ظالم جابر ہاتھ انسانی جسموں کا رس نکالنے کے لئے گنّے کا رس نکالنے والی مشین میں ٹھونستا جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکتا جاتا ہے۔ اور یکا یک جیونا اپنی بیٹی کو دھکا دے کر الگ کھڑی ہوگئی اور

چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

تیسری ساڑھی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے۔اور مٹیالا بھی ہے کچھ ایسا عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا اور غلیظ ہوتا جاتا ہے۔یہ میری بیوی کی ساڑھی ہے۔میں فورٹ میں دھنو بھائی کی فرم میں کلرکی کرتا ہوں۔پینسٹھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سیوُن مل اور بکسر یا مل کے مزدوروں کو بھی یہی تنخواہ ملتی ہے۔اس لئے میں بھی انہیں کے ساتھ آٹھ نمبر کی چال کی ایک کھولی رہتا ہوں ۔ میں دسویں پاس ہوں۔ ٹائپ کر سکتا ہوں۔ میں انگریزی میں لکھ سکتا ہوں۔ میں اپنے وزیر اعظم کی تقریر جلسے میں سُن کر سمجھ بھی لیتا ہوں۔آج تھوڑی دیر بعد ان کی گاڑی مہالکشمی پر آئے گی۔نہیں وہ ریس کورس نہیں جائیں گے۔وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے۔اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے۔ان لاکھوں میں بھی ایک ہوں گا۔میری بیوی کو اپنے وزیر اعظم کی باتیں سننے کا بہت شوق ہے۔مگر اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا کیوں کہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وقت پریشانی سی رہتی ہے۔جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جاتی ہے۔راشن تو روز کم پڑتا۔ہے ہے۔اب نل میں پانی بھی کم آتا ہے۔رات کو سونے کے لئے جگہ بھی کم پڑتی ہے اور تنخواہ تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینے میں صرف پندرہ دن چلتی ہے۔باقی پندرہ دن سود خور پٹھان چلاتا ہے۔اور وہ بھی کیسے گالیاں بکتے جھکتے،گھسٹ گھسٹ کر کسی سُست رفتار مال گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں مگر یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔میرے پاس ان کی فیس کے پیسے کبھی نہ ہوں گے۔پہلے پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا تو ساوتری کو اپنے گھر یعنی کھولی میں لایا تھا۔تو میں نے سوچا تھا ان دنوں ساوتری بھی بڑی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی۔گوبھی کے نازک نازک پتوں کی طرح پیاری پیاری باتیں۔جب وہ مسکراتی تو سنیما کی تصویر کی طرح خوبصورت دکھا کرتی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے اس کی جگہ ایک مستقل تیوری نے جگہ لے لی ہے ہے، وہ ذرا سی بات پر بچوں کو بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیتی ہے۔اور میں تو کچھ بھی کہوں کیسے بھی کہوں

کتنی ہی لجاجت سے کہوں وہ تو مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ پتہ نہیں ساوتری کو کیا ہو گیا ہے پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں سنتا ہوں۔ گھر پر بیوی کی گالیاں سنتا ہوں۔ اور ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑھی کی ضرورت ہے۔ شاید اسے صرف ایک نئی ساڑھی ہی نہیں، ایک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے، ماحول ایک نئی زندگی کی ضروت ہے، مگر اب ان باتوں کو سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو آزادی آ گئی ہے اور ہمارے وزیر اعظم نے بھی کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو یعنی ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ میں نے ساوتری کو اپنے وزیر اعظم کی تقریر جو اخبار میں پڑھی تھی سنائی تو وہ سُن کر آگ بگولہ ہو گئی اور اس نے غصے میں آ کر چولھے کے قریب پڑا چمٹا میرے سر پر دے مارا۔ یہ زخم کا نشان جو آپ میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں اسی کا نشان ہے۔ میری بیوی کے چہرے پر کئی نشان ہیں۔ مگر آپ انہیں نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ ان میں سے ایک نشان تو اس مونگیا رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی کا ہے جو اس نے اوپیرا ہاؤس کے نزدیک بھیجی مل بھوندو رام پارچہ فروش کی دکان پر دیکھی تھی۔ ایک نشان اس کھلونے کا ہے جو پچیس روپئے کا تھا۔ اور جسے دیکھ کر میرا بچہ خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا تھا۔ لیکن جسے ہم خرید نہ سکے۔ اور جسے نہ پا کر میرا بچہ دن بھر روتا رہا۔ ایک نشان اس تار کا ہے جو ایک دن جبل پور سے آیا تھا۔ جس میں ساوتری کی ماں کی شدید حالت کی خبر تھی۔ ساوتری جبل پور جانا چاہتی تھی۔ لیکن ہزار کوشش کے بعد بھی مجھے کسی سے روپئے اُدھار نہ مل سکے۔ اور ساوتری جبل پور نہ جا سکی۔ ایک نشان اس تار کا ہے جس میں اس کی ماں کی موت کا ذکر تھا۔ ایک نشان .... مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں۔ وہ چتلے چتلے، گدلے گدلے غلیظ داغ سے ساوتری کی پانچ روپئے چار آنے والی ساڑھی میں منتقل ہوتے جائیں گے۔

چوتھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یوں تو یہ سب مختلف رنگوں کی ساڑھیاں ہیں لیکن بھورا رنگ ان سب میں جھلکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے۔ جیسے ان کی قیمت ایک ہے۔ جیسے یہ سب زمین سے کبھی اوپر نہیں اٹھیں گی۔ جیسے انہوں نے کبھی ہنستی ہوئی دھنک، افق پر چمکتی شفق، بادلوں میں لہراتی ہوئی برق نہیں دیکھی ہے۔ جیسے شانتا بائی کی جوانی ہے وہ۔ جیونا کا بڑھاپا ہے۔ وہ ساوتری کا ادھڑ پن ہے۔ جیسے یہ سب ساڑھیاں زندگیاں، ایک رنگ ایک سطح ایک تواتر ایک مسلسل یکسانیت لئے ہوئے ہوا میں جھولتی ہیں۔

یہ قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جھبّو بھیئے کی عورت کی ہے۔ میری بیوی اس سے کبھی بات نہیں کرتی۔ کیوں کہ ایک تو اس کے بچہ وچہ نہیں ہے۔ اور ایسی عورت جس کے کوئی بچہ نہیں ہو بڑی بے حس ہوتی ہے۔ وہ جادو ٹونے کر کے دوسرے کے بچّوں کو مار ڈالتی ہے۔ اور بد روحوں کو بلا کے اپنے گھر میں بسا لیتی ہے۔ میری بیوی اسے کبھی منہ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھبّو بھیّا نے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھبّو بھیّا مراد آباد کا رہنے والا ہے۔ لیکن بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کر ادھر چلا آیا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان میں بڑے مزے سے گفتگو کرسکتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے بہت جلد پوروائل کے گنی کھاتے میں جگہ مل گئی۔ جھبّو بھیّا کو شروع ہی سے بیاہ کا بہت شوق تھا۔ اسے بیڑی کا، تاڑی کا کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ شوق تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ جب اس کے پاس ستّر اسّی روپئے اکٹھا ہو گئے تو اس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی۔ تا کہ وہاں اپنی برادری سے کسی کو بیاہ لائے۔ مگر پھر اس نے سوچا ان ستّر اسّی روپیوں میں کیا ہوگا۔ آنے جانے کا کرایہ بھی بڑی مشکل سے پورا ہوگا۔ چار سال کی محنت کے بعد اس نے یہ رقم جوڑی تھی۔ لیکن اس رقم سے وہ مراد آباد جاسکتا تھا۔ جا کے شادی نہیں کرسکتا تھا اس لئے جھبّو بھیّا نے یہیں ایک بدمعاش سے بات چیت کر کے اس عورت کو سو روپئے میں خرید لیا۔ اسّی روپیہ اس نے نقد دیئے بیس روپئے اُدھار میں رہے جو اس نے ایک سال کے عرصے میں ادا کئے۔ بعد میں جھبّو کو معلوم ہوا کہ یہ عورت بھی مراد آباد کی رہنے والی تھی۔ دھیرج کے گاؤں کی اور اس کی برادری ہی کی تھی۔ جھبّو بڑا خوش ہوا۔ چلو یہیں بیٹھے بیٹھے سب کام ہو گیا۔ اپنی ذات برادری کی اپنے ضلع کی،

اپنے دھرم کی عورت یہیں بیٹھے بٹھائے سو روپے میں مل گئی۔ اس نے بڑے چل چلاؤ سے اپنا بیاہ رچایا۔ اور پھر اُسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی لڑیا بہت اچھا گاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنی پاٹ دار آواز میں زور سے گانے بلکہ گانے سے زیادہ چلّانے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی میں دن رات گویا کسی نے ریڈیو کھول دیا ہو۔ دن میں کھولی میں لڑیا کام کرتے ہوئے گاتی تھی۔ رات کو جھبّو اور لڑیا دونوں گاتے تھے۔ ان کے یہاں کوئی بچہ نہ تھا۔ لڑیا میں ایک اور بات بھی تھی۔ جھبّو نہ بیڑی پیتا۔ نہ سگریٹ۔ نہ تاڑی۔ لڑیا بیڑی سگریٹ تاڑی سبھی کچھ پیتی تھی۔ کہتی تھی پہلے وہ سب کچھ نہیں جانتی تھی۔ مگر جب بدمعاش کے پلّے پڑی اسے یہ سب باتیں سیکھنا پڑیں۔ اور اب وہ ان سب باتیں تو چھوڑ سکتی ہے مگر بیڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی۔ کئی بار تاڑی پی کر لڑیا نے جھبو پر حملہ کیا۔ اور جھبّو نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس موقع پر تو وہ بہت شور مچاتا تھا۔ اور رات کو دونوں کو گالیاں بکتے جو وہ دونوں کو بکتے دیکھ کر پنجرے میں ٹنگا ہوا طوطا زور زور سے چلّا کر وہی گالیاں بکتا جو وہ دونوں بکتے تھے۔ ایک بار تو اس کی گالی سن کر جھبّو غصّے میں آ کر طوطے کو پنجرے سمیت بدرو میں پھینکنے لگا تھا۔ مگر جیونا نے بیچ میں پڑ کر طوطے کو بچا لیا۔ طوطے کو مارنا بڑا پاپ ہے۔ جیونا نے کہا۔ تمہیں برہمنوں کو بلا کے پراشچت کرنا پڑے گا اور تمہارے پندرہ بیس روپے کھل جائیں گے۔ یہ سوچ کر جھبّو نے طوطے کو بدرو میں غرق کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو وہ جھبّو کو ایسی شادی پر چاروں طرف سے گالیاں پڑیں۔ وہ خود بھی لڑیا کو بڑے شبہ کی نظروں سے دیکھتا رہا اور کئی بار اُسے بلا وجہ پیٹا اور خود بھی مل سے غیر حاضر رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ لڑیا نے اپنا اعتبار ساری چال میں قائم کر لیا۔ لڑیا کہتی کہ کوئی عورت سچے دل سے بدمعاشوں کے پلّے پڑنا پسند نہیں کرتی۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے چاہے وہ چھوٹا ہی سا گھر ہو۔ وہ ایک خاوند چاہتی ہے جو اس کا اپنا ہو۔ چاہے وہ جھبّو بھیّا ایسا شور مچانے والا، زبان دراز، شیخی خور ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو۔ اور اب لڑیا کے پاس گھر بھی تھا اور جھبّو بھی تھا اور اگر بچہ نہیں تھا تو کیا ہوا ہو جائے گا۔ اور اگر

نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی۔ یہ میاں مٹھو ہی اس کا بیٹا بنے گا۔

ایک روز لڑیا اپنے میاں مٹھو کا پنجرہ جھلا رہی تھی۔ اور اسے چوری کھلا رہی تھی اور اپنے دن کے سپنوں میں اس ننھے سے بالک کو دیکھ رہی تھی جو فضا میں ہمکتا ہمکتا اس کی آغوش کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا کہ چال میں شور سا بڑھنے لگا۔ اور اس نے اس دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبّو کو اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ اور ان کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ لڑیا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھاگتی بھاگتی نیچے گئی۔ اور اس نے بڑی درشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کر اپنے کندھے پر اُٹھالیا۔ اور اپنی کھولی میں لے آئی۔۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ جھبّو سے کسی کھاتے کے مینجر نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس پر جھبّو نے بھی اسے دو ہاتھ جڑ دیئے۔ اس پر بہت واویلا مچادی۔ اور مینجر نے اپنے بدمعاشوں کو بلا کر جھبّو کی خوب ٹھکائی کی۔ اور اسے مل سے باہر نکال دیا۔ خیریت ہوئی کہ جھبّو بچ گیا۔ ورنہ اس کے مرنے میں کوئی کسر نہیں تھی۔ لڑیا نے بڑی ہمّت سے کام لیا۔ اس نے اسی روز سے اپنے سر پر ٹوکری اُٹھالی۔ اور گلی گلی ترکاری بھاجی بیچنے لگی۔ جیسے وہ زندگی میں یہی دھندا کرتی آئی تھی۔ اس طرح محنت مزدوری کر کے اس نے اپنے جھبّو کو اچھا کرلیا۔ جھبّو اب بھلا چنگا ہے مگر اب اسے کسی مل میں کام نہیں ملتا۔ وہ دن بھر اپنی کھولی میں کھڑا مہالکشمی کے اسٹیشن کے چاروں طرف بلند و بالا کارخانوں کی چمنیوں کو تکتا رہتا ہے۔ سیوئن مل، نیو مل، اولڈ مل، معراج مل۔ لیکن اس کے لئے کسی مل کی جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ مزدور کو گالی کھانے کا حق ہے۔ گالی دینے کا حق نہیں ہے۔ آج کل لڑیا بازاروں اور گلیوں میں آوازیں دے کر بھاجی ترکاری فروخت کرتی ہے۔ اور گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی ہے۔ اس نے بیڑی، تاڑی سب چھوڑ دی ہے۔ وہاں اس کی ساڑھی، قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹتی جارہی ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور اگر جھبّو کو کام نہ ملا تو لڑیا کو اپنی ساڑھی میں پرانی ساڑھی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے۔ اور اپنے میاں مٹھو کو چوری کھلانا بند کرنا پڑے گا۔

پانچویں ساڑھی کا کنارا گہرا نیلا ہے۔ ساڑھی کا رنگ گدلا سُرخ ہے، لیکن کنارا گہرا نیلا

ہے۔اور اُس نیلے رنگ میں اب بھی کہیں کہیں چمک باقی ہے۔ یہ ساڑھی دوسری ساڑھیوں سے بڑھیا ہے۔ کیونکہ یہ ساڑھی پانچ روپئے چار آنے کی نہیں ہے۔اس کا کپڑا،اس کی چمک دمک کہہ دیتی ہے کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔آپ کو دور سے یہ مختلف معلوم ہوتی ہوگی۔مگر میں جانتا ہوں کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔اس کا کپڑا بہتر ہے۔اس کا کنارا چمک دار ہے۔اِس کی قیمت پونے نو روپئے ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کی ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کے بیاہ کی ہے۔منجولا کے بیاہ کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں۔اس کا خاوند گذشتہ ماہ چرخی کے گھومتے ہوئے ہتے کی لپیٹ میں آکے مارا گیا تھا۔اور اب سولہ برس کی خوب صورت منجولا بیوہ ہے۔اس کا دل جوان ہے۔اس کا جسم جوان ہے۔اس کی امنگیں جوان ہیں لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ اس کا خاوند مل کے ایک حادثے میں مر گیا ہے۔وہ پٹہ بڑا ڈھیلا تھا اور گھومتے ہوئے بار بار پھٹپھٹاتا تھا اور کام کرنے والوں کے احتجاج کے باوجود اسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا۔کیوں کہ کام چل رہا تھا اور دوسری صورت میں تھوڑی دیر کے لئے کام بند کرنا پڑتا۔پٹہ کو تبدیل کرنے کے لئے روپیہ بھی خرچ ہوتا۔ مزدور تو کسی وقت بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔اس کے لئے روپیہ تھوڑی خرچ ہوتا ہے لیکن پٹہ تو بڑی قیمتی شے ہے۔

جب منجولا کا خاوند مارا گیا تو منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی۔ جو نا منظور ہوئی۔ کیوں کہ وہ اپنی غفلت سے مرا تھا۔اس وجہ سے منجولا کو کوئی ہرجانہ نہ ملا۔اور وہ اپنی وہی نئی دُلہن کی ساڑھی پہنے رہی جو اس کے خاوند نے پونے نو روپئے میں اس کے لئے خریدی تھی۔ کیوں کہ اُس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہیں تھی۔ جو وہ اپنے خاوند کے مرجانے کے بعد بھی دولہن کا لباس پہننے پر مجبور تھی۔اور جو ساڑھی تھی وہ یہی گدلے سرخ رنگ کی۔ پونے نو روپئے کی ساڑھی جس کا رنگ گہرا نیلا ہے۔

شاید اب منجولا بھی پانچ روپئے چار آنے کی ساڑھی پہنے گی۔اس کا خاوند زندہ رہتا جب وہ دوسری ساڑھی پانچ روپئے چار آنے کی لاتی۔اس لحاظ سے اس کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں

آیا۔ مگر فرق اتنا ضرور ہوا ہے کہ وہ یہ ساڑھی آج پہننا چاہتی ہے۔ ایک سفید ساڑھی پانچ روپے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دلہن نہیں، بیوہ معلوم ہوسکے۔ یہ ساڑھی اسے دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ اس ساڑھی سے جیسے اس کے مرحوم خاوند کی مضبوط باہیں لپٹی ہیں جیسے اس کے ہر تار پر اُس کے شفاف بوسے مرتسم ہیں، جیسے اس کے تانے بانے میں اس کے خاوند کی گرم گرم سانسوں کی حدت آمیز غنودگی ہے۔ اس کے سیاہ بالوں والی چھاتی کا سارا پیار دفن ہے۔ جیسے یہ ساڑھی نہیں ہے۔ ایک گہری قبر ہے جس کی ہولناک پہنائیوں کو وہ ہر وقت اپنے جسم کے اردگرد لپیٹ لینے پر مجبور ہے۔ منجولا زندہ قبر میں گاڑی جارہی ہے۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے۔ لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ اسے پہننے والی مرچکی ہے۔ پھر بھی یہ ساڑھی یہاں جنگلے پر بدستور موجود ہے۔ روز کی طرح دُھلی دُھلائی ہوا میں جھول رہی ہے۔ یہ مائی کی ساڑھی ہے جو ہماری چال کے دروازہ کے قریب اندر کھلے آنگن میں رہا کرتی تھی۔ مائی کا ایک بیٹا تھا سیتو، وہ اب جیل میں ہے سیتو کی بیوی اور اس کا لڑکا یہیں نیچے آنگن میں دروازے کے قریب دیوارے کے نیچے پڑے رہتے ہیں۔ دستور اور سیتو کی بیوی اور اس کی لڑکی اور بڑھیا مائی یہ سب لوگ ہماری چال کے بھنگی ہیں۔ ان کے لئے کھولی بھی نہیں ہے۔ اور ان کے لئے اتنا کھانا کپڑا بھی نہیں ملتا جتنا ہم لوگوں کو ملتا ہے اس لئے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں، وہیں کھانا پکاتے ہیں، وہیں پڑ کے سو رہتے ہیں۔ یہیں یہ بڑھیا مائی ماری گئی تھی۔ وہ بڑا سوراخ جو آپ اس ساڑھی میں دیکھ رہے ہیں۔ پلو کے قریب، یہ گولی کا سوراخ ہے۔ یہ کارتوس کی گولی مائی کو بھنگیوں کے ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی۔ نہیں، وہ اس ہڑتال میں حصّہ نہیں لے رہی تھی، وہ بے چاری تو بہت بوڑھی تھی پھر نہ سکتی تھی۔ اس ہڑتال میں تو اس کا بیٹا سیتو اور دوسرے بھنگی شامل تھے۔ یہ لوگ مہنگائی مانگتے تھے۔ اور کھولی کا کرایہ مانگتے تھے یعنی اپنی زندگی کے لئے دو وقت کی روٹی کپڑا اور سر پر ایک چھت چاہتے تھے اس لئے ان لوگوں نے ہڑتال کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون قرار دے دی گئی تو ان لوگوں نے جلوس نکالا۔ اور اس جلوس میں مائی کا بیٹا سیتو آگے

آگے تھا اور خوب زور شور سے نعرے لگاتا تھا اور پھر جب جلوس بھی خلاف قانون قرار دیا گیا تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی۔ ہم لوگوں نے اپنے دروازے بند کر لئے لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروزہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا۔ اور پھر ہم کو اپنے بند کمروں میں ایسا معلوم ہوا گویا اِدھر اُدھر سے چاروں طرف ریل چل رہی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد بالکل سناٹا ہو گیا۔ اور جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا۔ اور ہماری چال کے دروازے کے قریب بڑھیا پڑی تھی۔ یہ اسی بڑھیا کی لال ساڑھی ہے جس کا بیٹا سیتو اب جیل میں ہے۔ اس لال ساڑھی کو اب بُوھیا کی بہو پہنتی ہے۔ اس ساڑھی کو بڑھیا کے ساتھ جلا دینا چاہئے تھا مگر کیا کیا جائے تن ڈھکنا زیادہ ضروری ہے۔ مردوں کی عزّت اور احترام سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے۔ یہ ساڑھی جلنے جلانے کے لئے نہیں ہے، تن ڈھکنے کے لئے ہے۔ ہاں کبھی کبھی سیتو کی بیوی اس کے پلّو سے اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے۔ کیوں کہ اس میں پچھلے اسّی برسوں کے سارے آنسوں اور ساری اُمنگیں اور ساری فتحیں اور شکستیں جذب ہیں۔ آنسو پونچھ کر سیتو کی بیوی پھر اسی ہمّت سے کام کرنے لگتی ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، کہیں گولی نہیں چلی، کوئی جیل نہیں گیا۔ بھنگن کی جھاڑو اسی طرح چلنے لگی۔

اے لو، باتوں باتوں میں وزیراعظم صاحب کی گاڑی نکل گئی۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی۔ وزیراعظم صاحب درشن دینے کے لئے گاڑی سے نکل کے تھوڑی دیر کے لئے پلیٹ فارم پہ ٹہلیں گے۔ اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑھیوں کو بھی دیکھ لیں گے جو مہالکشمی کے پُل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں۔ یہ چھ سارھیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں۔ ایسی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں جہاں ایک کونے میں چولہا سلگتا ہے۔ ایک ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے۔ اور ہر طاقچے میں شیشہ ہے۔ کنگھی ہے اور سیندور کی ڈبیہ ہے۔ کھاٹ پر ننھا بچہ سو رہا ہے۔ الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں

جنہیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے پیارے بچّوں کی مائیں ہیں۔ ہمارے بھولے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں۔ ہماری معصوم جبتوں کا گیت ہیں۔ ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں۔ وزیراعظم صاحب یہ ہوا میں جھولتی ہوئی ساڑھیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں تم سے کچھ مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بڑا ملک، کوئی بڑا عہدہ، کوئی بڑی موٹر کار، کوئی پرمٹ، کوئی ٹھیکا، کوئی پراپرٹی، یہ ایسی کسی چیز کی تم سے طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں۔ دیکھئے یہ شانتابائی کی ساڑھی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ جینابائی کی ساڑھی ہے جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزّت مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑھی ہے جس کے گیت مر چکے ہیں۔ اور جس کے پاس اپنے بچّوں کے اسکول کے لئے فیس نہیں ہے۔ یہ لڑیا ہے جس کا خاوند بیکار ہے اور جس کے کمرے میں ایک توتا ہے جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دلہن کی ساڑھی ہے جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے پٹے سے بھی کم قیمت ہے۔ یہ بڑھیا بھنگن کی لال ساڑھی ہے جو بندوق کی گولی کو ہل کی پھال میں تبدیل کرنا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اُٹھے۔ اور گندم کے سنہرے خوشے ہنس کر لہرانے لگیں۔

لیکن وزیراعظم کی گاڑی نہیں رُکی اور وہ ان ساڑھیوں کو نہیں دیکھ سکے اور تقریر کرنے کے لئے چوپاٹی چلے گئے۔ اس لئے اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کی گاڑی اِدھر سے گزرے تو آپ ان چھ ساڑھیوں کو ضرور دیکھئے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں اور پھر آپ ان رنگا رنگ ریشمیں ساڑھیوں کو بھی دیکھئے جنہیں دھوبیوں نے اُسی پل کے دائیں طرف سوکھنے کے لئے لٹکا رکھا ہے اور جو اُن گھروں سے آئی ہیں جہاں اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اونچی اونچی تنخواہوں کے پانے والے رہتے ہیں۔ آپ اس پُل کے دائیں بائیں دونوں طرف دیکھئے اور پھر اپنے آپ سے پوچھئے کہ آپ کس طرف جانا چاہتے یں۔ دیکھئے! میں آپ سے اشتراکی بننے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں، میں صرف یہ جاننا چاہتا

ہوں کہ آپ مہالکشمی کے پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف۔

☆☆

راجندر سنگھ بیدی

لاجونتی

''ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے........''

(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ری ہاتھ بھی لگاؤ تو کمہلا جاتے ہیں۔)

ــــــــ ایک پنجابی گیت

بٹوارا ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا اور پھر سب مل کران کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بدن صحیح وسالم تھے، لیکن دل زخمی.....

''گلی گلی محلے محلے'' پھر بساؤ'' کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تندہی کے ساتھ'' کاروبار میں بساؤ'' '' زمین پر بساؤ'' اور گھروں میں بساؤ پروگرام شروع کر دیا گیا تھا لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا'' دل میں بساؤ'' اور پروگرام کی نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوئی تھی

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لئے مندر کے پاس محلے'' ملاّ شکور'' میں ایک کمیٹی قائم ہوگئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے سندر لال بابو کو اس کا سکیریٹری چن لیا گیا۔ وکیل صاحب صدر، چوکی کلاں کا بوڑھا محرر اور محلے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لئے کہ سندر لال کی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام بھی لاجو.........لاجونتی تھا۔

چنانچہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو، اس کا ساتھی رسالو اور نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے'' ہتھ لائیاں کملانی لاجونتی دے بوٹے........'' تو سندر لال کی آواز ایک دم بند

ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بات سوچتا، جانے وہ کہاں گئی ہوگی۔ کس حال میں ہوگی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہوگی، وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں؟.....اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے۔

اور اب تو یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دکھ سے بچنے کے لئے پبلک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا کہ انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر اسے ٹھیس لگ سکتی ہے۔ وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے۔ جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو کمھلا جاتا ہے لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ بے جگہ اٹھنے بیٹھنے، کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسی ہی معمولی باتوں پر پیٹ دیا کرتا تھا۔

اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈالی کی طرح نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا چکا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح بے قراری تھی۔ اس کا اضطرار شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ بن کر اس بڑے سے پتے پر کبھی ادھر اور کبھی ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔ اس کا دبلا پن اس کی صحت کے خراب ہونے کی دلیل نہ تھی، ایک صحت مندی کی نشانی تھی جسے دیکھ کر بھاری بھرکم سندر لال پہلے تو گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ، ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مار پیٹ تک سہ گزرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا اور اس نے حدوں کا خیال ہی نہ کیا جہاں پہنچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے۔ اس حدوں کو دھندلا دینے میں لاجونتی خود بھی تو ممد ثابت ہوئی تھی۔ چونکہ وہ دیر تک اداس نہ بیٹھ سکتی تھی اس لئے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندر لال کے صرف ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی اور گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہہ اٹھتی ______ ''پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی.....'' صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک دم ساری مار پیٹ بھول چکی ہے۔ گاؤں کی

دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مرد ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں بلکہ عورتوں میں کوئی بھی سرکشی کرتی لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کے کہتیں ___ ''لے وہ بھی کوئی مرد ہے۔ بھلا۔ عورت جس کے قابو میں نہیں آتی۔ اور یہ مار پیٹ دن کے گیتوں میں چلی گئی تھی خود لاجو گایا کرتی تھی میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بڑی پتلی ہے لیکن پہلی فرصت میں لاجو نے شہر ہی کی ایک لڑکے سے لو لگالی اور کا نام تھا سندر لال، جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور اس نے دولہا کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا ''تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار، بیوی بھی چٹ پٹی ہوگی'' لاجونتی نے سندر لال کی اس بات کو سن لیا تھا مگر وہ یہ بھول ہی گئی کہ سندر لال کتنے بڑے بڑے اور بھدّے بوٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی اپنی کمر کتنی پتلی!

اور پربھات پھیری کے سمے ایسی ہی باتیں سندر لال کو یاد آئیں اور وہ یہی سوچتا ایک بار، صرف ایک بار لاجو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسالوں اور لوگوں کو بتا دوں ان بیچاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ فسادیوں کی ہوسنا کیوں کا شکار ہونے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا۔ انہیں اپنا نہیں لیتا، ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہئے.......... وہ ان عورتوں کو گھروں میں آباد کرنے کی تلقین کیا کرتا اور انہیں ایسا مرتبہ دینے کی پریرنا کرتا جو گھر میں کسی بھی عورت، کسی بھی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ___ انہیں اشارے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہئے جو ان کیساتھ ہوئیں ___ کیوں کہ ان کے دل زخمی ہیں۔ وہ نازک ہیں، چھوئی موئی کی طرح ___ ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جائیں گی.........

''دل میں بساؤ'' پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے محلہ ملاّ شکور کی اس کمیٹی نے کئی پربھات پھیریاں نکالیں۔ صبح چار پانچ بجے کا وقت ان کے لئے موزوں ترین وقت ہوتا تھا۔ نہ لوگوں کا شور، نہ ٹریفک کی الجھن، رات بھر چوکیداری کر کے کتے تک بجھے ہوئے تنوروں میں

سردے کر پڑے ہوتے تھے۔اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے لوگ پربھات پھیری والوں کی آواز سن کر صرف اتنا کہتے ____ او! وہی منڈلی ہے! اور پھر کبھی صبر اور کبھی تنگ مزاجی سے وہ بابو سندر لال کا اندوہ گیں پروپیگنڈا سنا کرتے۔عورتیں جو بڑی محفوظ اس پار پہنچ گئی تھیں گوبھی کے پھولوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوند ان کے پہلو میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پربھات پھیری کے شور پر احتجاج کرتے "دل میں بساؤ" کے فریادی اور اندوہ گیں پروپگنڈے کو صرف ایک گانا سمجھ کر پھر سو جاتا۔

لیکن صبح کے سمے کان میں پڑا ہوا شبد بیکار نہیں جاتا۔وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو بھی نہیں سمجھتا۔پر گنگناتا چلا جاتا ہے۔اسی آواز کے گھر کر جانے کی بدولت ہی تھا کہ انہیں دنوں جب کہ مِس مر دولا سارا بھائی ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ عورتیں تبادلے میں لائیں تو محلّہ ملّا شکور کے کچھ آدمی انہیں پھر سے بسانے کے لئے تیار ہو گئے۔ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر انہیں ملنے کے لئے گئے۔مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے اپنے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیئے۔رسالو اور نیکی رام اور سندر لال بابو کبھی "مہندر سنگھ زندہ باد" اور کبھی "سوہن لال زندہ باد" کے نعرے لگاتے......اور وہ نعرے لگاتے رہے حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے۔

لیکن مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں باپ، بہن بھائیوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لئے انہوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنویں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی لیکن انہیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انہیں نہیں پہچانتے۔

پھران میں سے کوئی بی بی جی میں اپنا نام دہراتی ____ سہاگ وتی ____ سہاگ........اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی........تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہادری؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تمہارے........اور بہادری چلاّ دینا چاہتا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کے نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسماں کی طرف دیکھتا جو دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے۔ جو صرف ایک حد ہے جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔

لیکن فوجی ٹرک میں مس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں، ان میں لاجو نہ تھی۔ سندر لال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے نیچے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دو چند کر دیا۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پربھات پھیری کے لئے نہ نکلتے تھے بلکہ شام کو بھی جلوس نکالنے لگے اور کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے جس میں کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکاروں سے ملی جلی ایک تقریر کر دیا کرتا اور رسالو ایک پیکدان لئے ڈیوٹی پر ہمیشہ موجود رہتا۔ لاؤڈ اسپیکر سے عجیب طرح کی آوازیں آتیں۔ پھر کہیں نیکی رام محرر چوکی کچھ کہنے اٹھتے لیکن وہ جتنی بھی باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندر لال بابو اٹھتا لیکن ایک دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا گلا رک جاتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور روہانسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا۔ آخر بیٹھ جاتا۔ لیکن مجمع پر ایک عجیب طرح کی خاموشی چھا جاتی اور سندر لال بابو کی ان دو باتوں کا اثر جو کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے چلی آتیں، وکیل کالکا پرشاد صوفی کی ساری ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا لیکن لوگ وہیں رو دیتے، اپنے جذبات کو آسودہ کر لیتے اور پھر خالی الذہن گھر لوٹ جاتے۔

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کے سمے بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہنچ گئے۔ مندر کے باہر پیپل کے پیڑ کے اردگرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی

شرڈھالو بیٹھے تھے اور رامائن کی کتھا ہو رہی تھی۔ نارائن بابا رامائن کا وہ حصہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھوبی نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اور اس سے کہہ دیا ____ میں راجا رام چندر نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسا لے گا اور رام چندر جی نے مہاستونتی سیتا کو گھر سے نکال دیا ____ ایسی حالت میں جب کہ وہ گربھ وتی تھی۔'' کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے؟'' ____ نارائن باوا نے کہا ____ ''یہ ہے رام راج! جس میں ایک دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔''

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک چکا تھا اور لوگ رامائن کی کتھا اور شلوک کا وورنن سننے کے لئے ٹھہر چکے تھے۔ سندر لال آخری فقرے سنتے ہوئے کہہ اٹھا۔

''ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہئے بابا!''

''چپ رہو جی'' ____ ''تم کون ہوتے ہو؟'' ____ خاموش! مجمع سے آوازیں آئیں اور سندر لال نے بڑھ کر کہا ____ ''مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

پھر ملی جلی آوازیں آئیں ____ ''خاموش! ____ ہم نہیں بولنے دیں گے۔'' اور ایک کونے میں سے یہ بھی آواز آئی ____ ''ماردیں گے۔''

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا ____ ''تم شاستروں کی مان مرجادا کو نہیں سمجھتے سندر لال!''

سندر لال نے کہا ____ ''میں ایک بات سمجھتا ہوں بابا ____ رام راج میں دھوبی کی آواز تو سنی جاتی ہے لیکن سندر لال کی نہیں۔''

انہیں لوگوں نے جو ابھی مارنے پہ تلے تھے، اپنے نیچے سے پیپل کی گولریں ہٹا دیں اور پھر سے میٹھے ہوئے بول اٹھے۔'' سنو، سنو، سنو،......''

رسالو اور نیکی رام نے سندر لال بابو کو ٹھوکا دیا اور سندر لال بولے۔'' شری رام نیتا تھے، پر یہ کیا بات ہے بابا جی، انہوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا، مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وشواس

نہ کر پائے؟''

نارائن بابا نے اپنی داڑھی کی کھچڑی پکاتے ہوئے کہا____ ''اس لئے کہ سیتا ان کی اپنی پتنی تھی۔ سندر لال! تم اس بات کی مہانتا کو نہیں جانتے۔''

''ہاں بابا____ ''سندر لال بابو جی نے کہا____ ''اس سنسار میں بہت سی اسی ایسی باتیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر ظلم نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا ہی بڑا پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا...... آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی...... اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں بہنوں کی طرح ایک چھل اور کپٹ کی شکار نہ تھی؟ اس میں سیتا کے اور استیہ کی بات ہے یا راکشش راون کے وحشی پن کی جس کے دس سر انسان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھے کا؟

.........آج ہماری سیتا نردوش گھر سے نکال دی گئی ہے............ سیتا....... لاجونتی ....اور سندر لال بابو نے رونا شروع کر دیا۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ سُرخ جھنڈے اٹھالئے جن پر آج ہی اسکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کر چپکا دیئے تھے اور پھر وہ سب ''سندر لال بابو زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے چل دیئے۔ جلوس میں سے ایک نے کہا____ ''مہاستی سیتا زندہ باد'' ایک طرف سے آواز آئی۔ ''شری رام چندر......''

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں____ ''خاموش! خاموش!'' اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا اکارت چلی گئی۔ بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد حکم سنگھ محرر چوکی کلاں جا رہے تھے، اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زمین پر مارتے اور ایک فاتحانہ سی آواز پیدا کرتے ہوئے____ اور ان کے درمیان کہیں سندر لال جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے۔ آج اس کے دل کو بری طرح ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گا رہے تھے۔

''ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے.....'' ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلہ ملاشکور کے مکان ۴۱۴ کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کربناک انگڑائیاں لے رہی تھی کہ سندر لال کا ''گرائیں'' لال چند جسے اپنا اثر درسوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو لے دیا تھا، دوڑا دوڑا آیا اور اپنے گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا ــــــ

'بدھائی ہو سندر لال۔''

سندر لال میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا ــــــ ''کس بات کی بدھائی لال چند؟''

''میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے۔''

سندر لال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمبا کو فرش پر گر گیا ــــــ ''کہاں دیکھا ہے؟'' اس نے لال چند کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ پانے پر جھنجھوڑ دیا۔

''واگہ کی سرحد پر۔''

سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا۔ ''کوئی اور ہوگی۔''

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا ــــــ ''نہیں بھیا وہ لاجو ہی تھی لاجو....''

''تم اسے پہچانتے بھی ہو؟'' سندر لال نے پھر سے میٹھے تمبا کو کو فرش پر سے اٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی چلم حقے پر سے اٹھا لی اور بولا ــــــ ''بھلا کیا پہچان ہے اس کی؟''

''ایک تیندولہ ٹھوڑی پر ہے دوسرا گال پر ــــــ''

''ہاں ہاں ہاں'' اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا۔ ''تیسرا ماتھے پر''۔ وہ نہیں چاہتا تھا اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم اسے لاجونتی کے جانے پہچانے جسم کے سارے تیندولے یاد آ گئے جو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر بنوائے تھے جو ان ہلکے ہلکے سبز دانوں کی مانند تھے جو چھوئی موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ کمھلانے لگتا ہے۔

بالکل اسی طرح ان تیندلوں کی طرف انگلی کرتے ہی لاجونتی شرماتی تھی ____ اور گم ہو جاتی تھی، اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔ گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہو گئے ہوں اور کسی نامعلوم خزانے کے لٹ جانے سے وہ مفلس ہو گئی ہو....... سندر لال کا سارا جسم ایک اَن جانے خوف، ایک ان جانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا ____

''لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی؟''

لال چند نے کہا ____ ''ہند پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا نا۔''

''پھر کیا ہوا ____؟ سندر لال نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔''کیا ہوا پھر؟''۔

رسالوں بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے ہوئے بولا ____ ''سچ مچ آ گئی ہے لجونتی بھابی؟''

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''واگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں ____ لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ ہمارے والنٹیئر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیڑ بوڑھی اور بیکار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازع پر لوگ جمع ہو گئے اور ادھر کے والنٹیئروں نے لاجو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا''تم اسے بوڑھی کہتے ہو؟ دیکھو..... دیکھو.... جتنی عورتیں تم نے دی ہیں ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟ اور ہاں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندولے چھپا رہی تھی۔''

پھر جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں نے اپنا اپنا ''مال'' واپس لے لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا ____ ''لاجو ____ لاجو بھابی..... مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا۔

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا؟ جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں دور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی.....اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں

میں زبان نکالے ہانپ رہا۔ منہ سے اتنا بھی نہیں نکلتا ____ ''پانی دے دو''۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ بٹوارے سے پہلے اور بٹوارے کے بعد کا تشدد ابھی تک کارفرما ہے۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے اب لوگوں میں پہلا سا دریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو، سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو ____ تو وہ جھٹ سے کہتا ''مر گئے'' اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بڑے ٹھنڈے دل سے تاجر انسانی مال، انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ مویشی خریدنے والے کسی بھینس یا گائے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ، اس کے نکھار، اس کے عزیز ترین رازوں، اس کے تیندولوں کے شارع عام میں نمائش کرنے لگے۔ تشدد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا ہے۔ پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک رومال ڈال لیتے اور یوں ''گپتی'' کر لیتے گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہو جاتا تھا۔ اب ''گپتی'' کا رومال بھی ہٹ چکا تھا اور سامنے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے۔ یہ سارا لین دین یہ سارا کاروبار پرانے زمانے کی داستان معلوم ہو رہا تھا جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ ازبیک ان گنت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا ان کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کر دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا پڑ جاتا ہے اور اس کے ارد گرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور سرخیاں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لئے دوڑتی ہیں...... ازبیک آگے گزر جاتا ہے اور ناقابلِ قبول عورت ایک اعترافِ شکست، ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازار بند تھامے اور دوسرے سے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپائے سسکیاں لیتی ہے......

سندر لال امرتسر (سرحد) جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی۔ ایک دم ایسی خبر مل جانے سے سندر لال گھبرا گیا۔ اس کا ایک قدم فوراً دروازے کیطرف بڑھا لیکن

وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کمیٹی کے تمام پلے کارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اس نے مردانہ وار اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے چوکی کلاں کی طرف چل دیا کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں مغویہ عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی تھی۔ اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی۔ وہی سندر لال کو جانتی تھی، اس کے سوائے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جب کہ وہ ایک مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کر آئی تھی، نہ جانے کیا کرے گا۔'' سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ خالص اسلامی طرز کا لال دو پٹہ اوڑھے تھی اور بائیں بکل مارے ہوئے تھی...... عادتاً محض عادتاً ____ دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالآخر اپنے صیاد کے دام سے بھاگ نکلنے کی آسانی تھی اور سندر کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹے کو ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ ہندو مسلمان کی تہذیب کی بنیادی فرق ____ دائیں بکل اور بائیں بکل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہی تھی......اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی، ایک امید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ۔

سندر لال کو دھچکا سا لگا۔ اس نے دیکھا لاجونتی کا رنگ کچھ نکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی بہ نسبت کچھ تندرست سی نظر آتی تھی۔ نہیں وہ موٹی ہوگئی تھی ____ سندر لال نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا وہ سب غلط تھا۔ وہ سمجھتا تھا غم میں گھل جانے کے بعد لاجونتی بالکل مریل ہو چکی ہوگی اور آواز اس کے منہ سے نکالے نہ نکلتی ہوگی۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے، اسے بڑا صدمہ ہوا، لیکن وہ چپ رہا کیونکہ کے اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگر چہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو پھر چلی کیوں آئی؟ اس نے سوچا شاید ہند سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا ____ لیکن اس چیز کو وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سنولایا ہوا چہرہ زردی لئے ہوئے تھا اور غم، محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ

غم کی کثرت سے موٹی ہوگئی تھی اور صحت مند نظر آتی تھی لیکن یہ ایسی صحت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے.......

مغویہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا۔ لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقابلہ کیا۔ اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ کسی نے کہا ____ ''ہم نہیں لیتے مسلمران (مسلمان) کی جھوٹی عورت ____'' اور یہ آواز رسالو؟ نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرر کے نعروں میں گم ہوکر رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹتی اور چلاّتی آواز آرہی تھی۔ وہ سانس بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی شدھی کا شدت سے قائل ہو چکا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا آج اس نے کوئی نیا وید، کوئی نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصے دار بنانا چاہتا ہے..... ان سب لوگوں اور ان آوازوں میں گھرے ہوئے لاجو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جا رہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انھیں اتنی لمبی اذیت دیئے جانے پر تاسف بھی۔

لاجونتی کے چلے آنے پر سندر لال بابو نے اسی شد و مد سے 'دل میں بساؤ' پروگرام کو جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھا دیا تھا۔ اور وہ لوگ جنہیں سندر لال کی باتوں میں خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی، قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ مکان نمبر ۴۱۴ کی بیوہ کے علاوہ محلہ ملاّ شکور کی بہت سی عورتیں سندر لال بابو سوشل ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں۔

لیکن سندر لال کو کسی کی اعتنا یا بے اعتنائی کی پروانہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آ چکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا۔ سندر لال نے لاجو کی سورج مورتی کو اپنے دل میں استھاپت کر لیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی سندر لال

کے غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندر لال لاجونتی کو اب لاجو کے نام سے نہیں پکارتا تھا، وہ اسے کہتا تھا ''دیوی!'' اور لاجو ایک انجانی خوشی سے پاگل ہو جاتی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی سندر لال کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ دھل جائیں، لیکن سندر لال لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے کھل جانے میں بھی ایک طرح سے سمٹی رہتی۔ البتہ جب سندر لال سو جاتا تو اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی۔ جب سندر لال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ ''نہیں''، ''یونہیں'' ''اونہوں'' کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکا ہارا سندر لال پھر اونگھ جاتا...... البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندر لال نے لاجونتی کے 'سیاہ دنوں' کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا۔

''کون تھا وہ؟''

لاجونتی نے نگاہ نیچی کرتے ہوئے کہا ____ ''جماں'' پھر وہ اپنی نگاہیں سندر لال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندر لال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ لاجونتی نے پھر آنکھیں نیچی کرلیں اور سندر لال نے پوچھا۔

''اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟''

''ہاں۔''

''مارتا تو نہیں تھا۔''

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا ____ ''نہیں......'' اور پھر بولی۔ ''وہ مارتا نہیں تھا۔ پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی...... اب تو نہ مارو گے؟''

سندر لال کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے

کہا ___ ''نہیں دیوی! اب نہیں........نہیں ماروں گا.........''

''دیوی!'' لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سندر لال نے کہا۔ ''جانے دو بیتی باتیں! اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری ہانی نہیں کرتا اپنی کرتا ہے۔''

اور لاجونتی کی من کی بات من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب 'دیوی' کا بدن ہو چکا تھا۔ لاجونتی کا نہ تھا۔ وہ خوش تھی بہت خوش، لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے۔ لیٹی لیٹی بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پا کر ایکا یکی اس کی طرف متوجہ ہو جائے.......

جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی۔ اس لئے نہیں کہ سندر لال بابو نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لئے کہ وہ لاجونتی سے لاجو کی وہی پرانی لاجو ہونا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سندر لال نے اسے یہ محسوس کرا دیا جیسے وہ ___ لاجونتی کوئی کانچ کی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے پر لاجو نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی، پر اجڑ گئی.... سندر لال کے پاس اس کے آنسو دیکھنے کے لئے آنکھیں تھیں اور نہ آہیں سننے کے لئے کان!....... پربھات پھیریاں نکلتی رہیں اور محلہ ملاّ شکور کا سدھارک رسالو اور نیکی رام کے ساتھ مل کر اسی آواز میں گاتا رہا۔

''ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے......''

☆☆

مُمتاز شیریں

انگڑائی

''آپا گلنار آپا! دیکھو مجھ فنا.....'' جاوید ننھے ننھے ہاتھوں سے میری ساری کھینچ رہا تھا۔

ارے ہٹ بھی۔ جب دیکھو آپا آپا........ دیکھ تو میری ساری کا ناس کئے دے رہا ہے۔ سفید ساری آج ہی تو پہنی تھی۔ اور یہ دھول میں اٹے ہوئے ہاتھ مٹی سے کھیل رہا تھا کیا بدتمیز!''

میں نے غصہ سے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس نے رونی صورت بنالی۔ ''نہیں تو آپا........ مجھ فنا تجھ ہمالے لوڈپل........'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ انہیں بلاؤنا........ مجھ فنا کتنی اچھی ہیں۔ اچھ دن مجھے کیک دیا تھا اول کوکو..... کچھی اچھی کوکو........ آپا انھیں بلالو اچھی آپا۔''

''ارے!'' میں چونک پڑی۔ ''مس فنانس یہاں!'' میں نے دریچہ کی طرف نگاہ ڈالی۔ ہاں وہ سچ مچ کچھ دور کسی عورت سے باتیں کرتی ہوئی آرہی تھیں۔ ''تو انہیں بلالوں؟'' میں نے سوچا' پھر جلدی سے کمرہ کا جائزہ لینے لگی۔ کتابیں بکھری ہوئی اور فرنیچر! ایک کرسی دیوار کی طرف منہ کئے کونے میں پڑی ہے تو ایک کمرے کے عین بیچ میں۔ گویا اپنی پالش سے بے نیازی پر نازاں بیٹھی ہو اور صوفیہ! ہونہہ۔ یہ بڑا سا سوراخ اور اس میں سے میلی میلی روئی جھانکتی ہوئی...... ٹیبل کلاتھ؟ اس پر تو جاوید نے بڑے ہی خوشنما نقش بنا رکھے ہیں؟ اُف کس بدتمیز نے فرش پر کاغذ بکھیرے ہیں؟ ایسے شریر بچے بھی کسی کے ہوتے ہیں؟ اور دھول کی ایک انچ موٹی تہہ!...... یہ کریمن بھی کہاں مرگئی؟ کم بخت سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ صبح صبح کمروں میں جھاڑو دے دیا کرے۔'' کریمن! او کریمن ذرا جھاڑو لیتی آنا! کیا تم یہ دھول بیچنے کے لئے جمع کر کے رکھتی ہو؟''

''آئی بی بی! ابھی آئی۔ ذرا توے سے روٹی اتارلوں۔ جل جائیگی۔'' بھاڑ میں جائے وہ اس کی روٹی۔ کمبخت ہر وقت چولہے میں گھسی رہتی ہے......... آخر میں کیوں اتنا جل رہی تھی۔ مجھے خود شرم آنے لگی بے چاری غریب کیا کرے ایک ہی تو تھی اور گھر کا سارا کام اس کے سر۔ ہم ایسے کوئی امیر تو نہ تھے کہ دس نوکر رکھتے۔ ایک بھی غنیمت ہے۔

میں نے جلدی سے ٹیبل کلاتھ بدل کرسیوں کو اپنی اپنی جگہ گھسیٹ کر فرش پر بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹنے لگی۔ سمیٹتے سمیٹتے اٹھ کر کھڑکی پر نظر ڈالی تو میری سانس جیسے رُک گئی۔ اُف مس فناس کتنی نزدیک آگئی تھیں! ''ذکیہ! زبیدہ!'' میں حلق پھاڑ کر چلائی۔ جواب ندارد! دروازے میں جا کر دیکھا تو بس جل ہی گئی۔ دونوں آنگن میں موجود! ذکیہ جاوید کو اٹھائے کھڑی تھی تو زبیدہ گیٹ پر چڑھی ہوئی گردن بڑھا کر مس فنانس کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ذکیہ! کچھ مدد بھی کروگی؟ شرم نہیں آتی تمہیں یوں باہر کھڑی ہو۔'' ''خفا کیوں ہوتی ہو آپا! میں ہمیشہ گیٹ میں تھوڑے ہی کھڑی ہوتی ہوں؟ یونہی آج.......'' پھر وہ میرے پھولے چہرے کو دیکھ کر ہنس پڑی۔ ''اخاہ۔ آپا! آج تو آپ کے غصے کا پارہ سوڈگری پر چڑھا ہوا تھا۔

اہاہا۔ ابھی اتارے دیتی ہوں۔ اپنی آپا کا ٹیمپریچر۔ دیکھونا۔ ایسے مزے کی بات بتاؤں گی۔''

منہ بنا کر تالی بجاتے ہوئے۔ ''بتادوں آپا؟........او........اوں........ مس فنانس یہاں سے گذر رہی ہیں۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہی ہے۔ اچھا آؤ ذرا کمرے کو صاف کرنے میں مدد دو۔ تمہیں تو بس باتیں ہی آتی ہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''تو آپا مس فنانس کو بلاؤ گی؟'' اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ زبیدہ بھی ناچ رہی تھی۔ اوہ! ابھی تک یہ بچے مس فنانس کو اتنا چاہتے ہیں!

ذکیہ پھر دروازے کی جانب تکنے لگی۔ میں بھنا گئی۔ کاغذ سارے کمرے میں پھیلے پڑے تھے۔

''ہونہہ! میں نہیں بلاؤں گی! دیکھو تو گھر کتنا صاف ہے۔'' میں نے جھنجلا کر سمیٹتے ہوئے

کاغذوں کو زمین پر دے مارا۔

''کیا کہہ رہی ہو آپا؟'' ذکیہ تعجب سے میرا منہ تکنے لگی۔ میں نے اس کی طرف توجہ کئے بغیر زبیدہ کو پکارنا شروع کیا۔ ''زبیدہ! آ جاؤ اندر۔''

''کیوں آپا؟'' زبیدہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ ''آ جاؤ! اگر مس فنانس تمہیں دیکھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہمارا ہی گھر ہے اور وہ یقیناً مجھ سے ملنے آئیں گی۔'' میں نے جاوید کو بھی اندر گھسیٹتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو اور اچھا ہوگا۔ وہ کیوں نہ آئیں آپا۔؟''

''گویا تم نے گھر کو بہت اچھی طرح سجا رکھا ہے!'' ''ہم ابھی سب ٹھیک کر دیں گے۔ انہیں آنے دو آپا!'' دونوں نے نہایت اشتیاق سے التجا کی۔

''کہہ جو دیا کہ نہیں بلائیں گے۔''

''اوہ آپا! مس فنانس! اور اتنے دنوں کے بعد انہیں دیکھنا نصیب ہوا۔ آخر تمہیں کالج چھوڑے ہوئے دو تین ماہ ہو گئے ہیں نا؟ اتنے دنوں بعد اتفاقاً وہ خود ہمارے شہر میں آئیں ہمارے گھر پر سے گذریں اور تم!......... تم انہیں نہ بلاؤ۔ آپا تم مس فنانس پر'' ذکیہ سنجیدہ لہجہ میں کہتی کہتی یکا یک زور سے ہنس پڑی اور شرارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''ہوں! اچھا میں جان گئی.......... جب سے پرویز بھیا.........''

''اری چپ! بہت باتیں بنانے لگی ہے''۔ میں نے زور سے ایک چٹکی اس کی لی۔ ''ہونہ آپا! تم بہت بنتی ہو۔ ابھی دیکھو نا پرویز کا نام آتے ہی کیسے شرما گئیں۔'' میں یونہی شرماتی لجاتی۔ سمٹی سمٹائی سب کچھ بھول کر وہیں کھڑی رہی گویا اس نام نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ کیسا حسین نام ہے۔ کتنا پیارا نام ہے، پرویز!

میں اس شیریں تصور سے چونکی تو سامنے کیا دیکھتی ہوں، دروازے کے کواڑ کھلے پڑے ہیں۔ پردہ ہوا سے اڑا جا رہا ہے اور مس فنانس ہمارے گھر کے بالکل مقابل میں کھڑی مجھے ٹکٹکی

باندھے دیکھ رہی ہیں۔ جونہی میں نے انہیں دیکھا وہ مسکرا کر ہمارے گھر کی طرف بڑھنے لگیں۔

''یا اللہ! اب کیا کیا جائے؟'' میں ذکیہ کو جھنجھوڑنے لگی۔ ''اب تم ہی سب کچھ دیکھ لو۔ دیکھو وہ آرہی ہیں۔'' میں بے تحاشا وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں جا کر دم لیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا مس فنانس برآمدے کے بازو والے کمرے میں کرسی پر بیٹھی تھیں اور ذکیہ ایک خوشنما برتن میں کیلے اور سنگترے لئے ان کے پاس کھڑی تھی۔ ''گلنار کو بلاؤ نا'' مس فنانس کہہ رہی تھیں۔ اچانک انہوں نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور مسکرا کر آواز دی۔ گلنار، میں شرما کر دروازے کے اوٹ میں ہوگئی......... میرے یوں شرمائے جانے سے وہ کیا سمجھتی ہوں گی؟ یہی نا کہ میرے جذبات ان کی طرف اب بھی ایسے ہی ہیں۔ ہونہہ! انہیں کیا معلوم کہ میں اب....... مگر نہیں یہ غلط فہمی ضرور ہوگی۔ میں پہلے تو ان کے سامنے یونہی شرمایا کرتی تھی۔ جب وہ کہیں سے آنکلتیں تو میں بھاگ کر کہیں جا چھپتی، وہ میری طرف دیکھتیں تو میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیتی تو دل تو یہی چاہتا کہ وہ یونہی دیکھتی رہیں۔ عجیب لڑکی تھی، کچھ سال پہلے! رفتہ رفتہ میں ان سے کھل کر باتیں کرنے لگی تھی۔ پھر بھی جب کبھی ان سے اچانک مڈبھیڑ ہو جاتی تو میری بدحواسی نہ پوچھئے، وہ دن بھی کیا دن تھے۔ چھٹی ہونے پر کالج کے برآمدے میں گھنٹوں ان کا انتظار کرنا میرا معمول تھا۔ ہفتہ بھر جس دن ان کا گھنٹہ نہ ہوتا۔ وہ دن کس قدر منحوس دکھائی دیتا تھا۔ ہاں میں ان پر مرتی تھی۔ انہیں دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی، اور لڑکیاں مجھے کیسے تنگ کرتی تھیں۔'' گلنار! جانے تم کیوں مس فنانس پر مرتی ہو۔ وہ کونسی ایسی حسین ہیں۔ بلکہ بدصورت بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔''

جی چاہتا ہے کہ ان چڑیلوں کے منہ نوچ لوں۔ انہیں کیا معلوم کہ وہ مجھے کیسی حسین نظر آتی تھیں۔ دوسری لڑکیاں تو کیا میں زرینہ سے بھی اس دن سے خفا ہو کر روٹھ گئی تھی۔ گو زرینہ میری سب سے پیاری سہیلی تھی۔ ہاں اسی دن میں نے کالی ساڑھی پہن رکھی تھی اور پربھا سے سادر مانگ کر سیاہ بوٹو بھی لگایا تھا۔ میں اور زرینہ ہاسٹل میں ٹہل رہے تھے۔ اندرا بھی کہیں سے آنکلی

''آہا۔ آج تم تو بلا کی حسین نظر آ رہی ہو گلنار'' !مس فنانس کیسی''۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔ ہونہہ! مس فنانس!'' زرینہ نے طنز سے کہا تھا۔'' مس فنانس!'' وہ تین مرتبہ مر کر جنم لیں تو شاید تمہارا حسن انہیں نصیب نہ ہو!'' مجھے کتنا غصہ آیا تھا میں اس پر روٹھ گئی تھی۔ ''اچھا بھئی وہ تجھ سے پانچ گنا زیادہ حسین ہیں۔ خوش ہو گئی اب تو!'' وہ پھر قہقہہ لگانے لگی۔ اور اندر ابھی مسکرانے لگی۔ جی میں آیا زرینہ سے لڑ پڑوں۔ آخر وہ کون ہوئی مس فنانس کی توہین کرنے والی۔ یہاں میرا دل جل رہا ہے۔ اور وہ یوں ہی کھڑی ہنس رہی تھی! اگر ایک بات بھی ان کے خلاف کہی جاتی تو میں زرینہ سے کیا کالج کی سب لڑکیوں سے لڑنے کے لئے تیار تھی، بھلا میں ایک ہی تھی کئی لڑکیاں میرا ساتھ دیتیں۔ اور بھی تو انہیں چاہتی تھیں، للیتا غریب لڑکی وہ تو مجھ ہی کو اُن کی محبت کا حقدار سمجھتی۔ میرے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کرتی بلکہ مس فنانس کو مجھ سے محبت کرتے دیکھ کر اور خوش ہوتی۔ کیسی بے لوث لڑکی تھی۔ اس کے خلاف وہ لکشمی! حسد کی پتلی۔ کیا کیا جتن نہ کرتی تھی، کہ مس فنانس کی توجہ میری بجائے اس پر ہو، نہ جانے کہاں سے لاتی تھی ایسی خوبصورت ساڑھیاں اور انہیں کس سلیقے سے پہننے کی کوشش کرتی، جھوٹے موتیوں کے طرح طرح کے زیوارات پہنا کرتی۔ اور بعد میں تو اُس نے برقی مشین سے اپنے بالوں کو گھنگھریالے بنالیا تھا۔ ہونہہ، ان سب جتنوں سے کیا ہوتا۔ وہ حسین تو تھی نہیں۔ مس فنانس مجھ ہی کو دیکھا کرتیں۔ وہ جل مرتی، مس فنانس کے خاص سب جیکٹ پر تو وہ دنیا بھر کی کتابیں پڑھتی، مگر کہیں مجھ سے اچھا لکھ سکتی تھی! مجھ سے زیادہ نمبر بھی کبھی لئے تھے؟ آخر کچھ بھی نہ بن پڑا، تو مجھ سے خوب جلا کرتی، اور ہمیشہ اس کوشش میں لگی رہا کرتی کہ ایسی باتیں کرے جن سے میرے دل کو ٹھیس لگے، یہ دیکھ کر کہ میں حسین سمجھی جاتی تھی وہ کیسے کڑھتی تھی۔ کہا کرتی لگی'' ہونہہ! سُرخ و سفید رنگ کے بغیر بھی کوئی حَسین تھی، لیکن دراز قد اور دبلی پتلی، مگر اس کے چھریرے بدن میں خاک بھی حُسن نہ تھا۔ وہ ایسے دکھائی دیتی تھی گویا ایک لانبی سی لکڑی کو تراش کر صاف کر دیا گیا ہو۔ نہ وہ بدن کے دلکش نشیب و فرزانہ کوئی لچک کی دل کشی۔ مگر مسکرا کر چپ ہو رہتی، اور یہ ظاہر نہ ہونے دیتی کہ میں اس کے طعن کو

سمجھ گئی ہوں۔ کبھی وہ کسی گوری رنگت والی لڑکی کو دیکھ کر کہتی۔'' دیکھو گلنار وہ لڑکی کتنی حسین ہے۔'' اور اس کی بتائی ہوئی لڑکی اتنی بدصورت، اتنی کریہہ صورت ہوتی کہ میں بے اختیار ہنس پڑتی، نکٹی ناک، پھیلے ہوئے نتھنے، بے حد موٹے ہونٹ، بھدّا جسم مگر ہاں سفید رنگت! میں ہنس کر کہتی، '' تمہاری حُسن شناسی کی داد دیتی ہوں۔'' جب ان باتوں سے کام نہ چلتا۔ تو سیدھی ذاتیات پر اُتر آتی، اور بار بار مجھے'' کالی کہتی، حالانکہ میرا رنگ اچھا خاصا گندمی تھا اور زینت وہ تو مس فنانس کے پیچھے ہی لگی رہتی تھی۔ کس سادگی سے شکایت کرتی تھی۔

'' گلنار مس فنانس تو تمہیں ہی زیادہ چاہتی ہیں۔'' اور وہ بے حد موٹی لڑکی......لڑکی بہت نہیں بلکہ عورت......وہ بھی تو انہیں کا دم بھرا کرتی تھی، اور اپنی محبت کیسی عجیب طرح سے جتایا کرتی تھی۔ مس فنانس کو بھی بے اختیار ہنسی آجاتی......اور نینی.........

'' گلنار بی بی۔''

'' کیا ہے کریمن''!

'' بیگم نے میٹھے ٹکڑے اور سموسے بنانے کے لئے کہا ہے۔ وہ جو کوئی مس صاحبہ آئی ہیں نا! بہت کام ہے بیٹی، ذرا اس روٹی کے ٹکڑے کو تو کاٹ لو اچھی بیٹی، عمر بھر دعا دیتی رہوں گی، میں نے کواڑ کھولے اور آہستہ آہستہ جھانک کر دیکھا کہ کہیں مس فنانس اِدھر تو نہیں دیکھ رہی ہیں! امّی بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں، وہ امی سے باتیں کرنے میں مشغول تھیں، میں جلدی سے نظر بچا کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ چاقو کو اچھی طرح سے صاف کر کے روٹی کے ٹکڑے کاٹنے کے لئے بیٹھ گئی، کریمن نے گلا ہوا قیمہ چولہے پر رکھا اور میں نمک مرچ پیاز ڈال کر بھوننے لگی......تو یہ شاہی ٹکڑے پکائے جا رہے ہیں۔ یہ انہیں بہت مرغوب تھے نا! اور میں نے کتنی دفعہ شاہی ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے پکا کر انھیں بھیجے تھے، ان دنوں وہ یہیں کالج میں پروفیسر تھیں۔ اور میں روتی جاتی تھی پھر میں نے رو دھو کر ابا کو مجھے بنگلور بھیجنے پر رضامند کر لیا۔ جہاں مس فنانس کام کر رہی تھیں اور ان سے جا ملی تھی۔ دیکھتے دیکھتے دو سال یونہی گزر گئے، مجھے اس کالج کا آخری امتحان

دینا تھا اور اس کے بعد مس فنانس سے دائمی جدائی! میں اس کا خیال بھی نہیں کر سکتی تھی، کاش اس کالج میں ایم اے کا کورس بھی ہوتا اور میں دو سال اور ان کے ساتھ رہ سکتی!.......پھر میں نے اس مرتبہ فیل ہونے کی ٹھان لی تھی، ایک ایسی لڑکی کے لئے جو جماعت میں اول آیا کرتی تھی۔فیل ہونا کتنی شرم کی بات تھی، اسبات کا مجھے خیال تک نہ آتا تھا۔ پروفیسروں نے مجھ سے کتنی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ میں کانوکیشن، میں بہت تمغے اور انعامات حاصل کرونگی۔سب لڑکیوں میں اوّل آنا تو میرا معمول تھا اس کے الگ تمغے ملیں گے، سوشیالوجی اور انگریزی میں تو ریاست بھر میں اوّل رہوں گی، لڑکے دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔اور کالج کا نام کیسے چمکے گا۔ان کی اُمیدوں پر پانی پھرنے کی مجھے پرواہ نہ تھی۔

آخر وہ دن آگیا جب امتحان ختم ہو چکا تھا۔اور میں مس فنانس سے آخری بار ملی تھی، انہیں خدا حافظ کہہ کہ جب ہاسٹل لوٹی تو سیدھی اپنے کمرے میں جا کر بستر پر جاگری اور تکیوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اتنا روئی کے آنکھیں سرخ ہو گئیں، اور تکیہ پوش بھیگ گیا۔پھر جب زرینہ آئی تو اس نے مجھے گلے لگایا۔اور تسلی دینی شروع کی، وہ جتنا مناتی تھی اور زیادہ میں روتی جاتی.......اس رات زرینہ کتنی دیر تک میرے پاس بیٹھی سمجھاتی رہی۔یہاں تک کہ میری آنکھیں جو رونے کی وجہ سے بری طرح جل رہی تھیں۔نیند کے غلبے سے بند ہونے لگیں۔کتنی محبت کرنے والی لڑکی تھی زرینہ!.........

''تو تم نے ٹکڑے کاٹ لئے بیٹی؟ اِدھر لاؤ انہیں میں گھی میں بھون دوں اور اچھی بیٹی ذرا ان پوریوں میں قیمہ بھر کے سموسے بنالینا۔بیگم نے جلدی تیار کرنے کے لئے کہا ہے۔کیا کروں بیٹی! تم دیکھتی ہو بہت بوڑھی ہوگئی ہوں، ہاتھ سے زیادہ کام نہیں بن پڑتا۔ورنہ میں تمہیں کام کرنے کے لئے کہتی، توبہ توبہ.......اس بوڑھے منہ میں کیڑے پڑ جاتے۔یہ نازک نازک ہات جو صرف قلم پکڑتے تھے۔ان میں میں موئی نوکرانی کام کرتے دیکھتی! آنکھیں نہ پھوٹ جائیں!''
بوڑھی کریمن خوشامدیں کرنے لگی۔ میں بغیر جواب دیئے قیمہ بھر کر سموسے بنانے لگی۔

..........وہ خود بھی مجھے کتنا چاہتی تھیں، کئی بار انہوں نے اپنے گھر پر بلایا تھا اور کتنا اصرار کرتی تھیں کہ میں ان کے ساتھ سیر کو جایا کروں۔ اس دن ان کی آواز میں کیسی التجا تھی۔ صرف ایک بار آجاؤ گلنار! میں تمہیں اپنی کار میں گھما لاؤں گی۔ فلاں فلاں گارڈن لے جاؤں گی'' میں نے بصد ناز اُن کی التجا کو ٹھکرا دیا تھا......اور اپنے پرچوں میں مجھے کتنے زیادہ مارکس دے دیتی تھیں۔ اسی پچاسی فیصدی! یہ دیکھ کر لڑکیاں مجھ سے، بہت جلتیں۔ کہا کرتیں آخر تم تو ان کی فیورٹ ہونا۔ ہمیں کہاں سے ملیں اتنے نمبر میرا نام اس چٹخارے سے لیتی تھیں گویا ان کے منہ میں لذیذ مٹھائی رکھی ہو۔ جب میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھیں تو ان کا تبسم کتنا محبت آمیز ہوتا تھا۔

میرے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہوتی کہ انہیں مس فنانس کی بجائے ''انجیلنا'' کہا کروں یا کم از کم ایک بار چپکے سے کہہ دوں'' میری انجلینا'' مگر مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ ان کے سامنے کہتی نہیں تھی۔ تو کیا خطوں میں جو جی میں آیا لکھ دیتی تھی۔ میرے دل کی ملکہ۔ میری جان ملکہ، میری آسمانی اینجلنا۔ اور کیا کچھ نہیں لکھا کرتی تھی۔ عجیب رومان بھرے خط لکھا کرتی تھی۔ اور وہ کبھی خفا نہ ہوتی تھیں۔ انہوں نے بھی تو ایک دن.......اس دن میں اور للیتا اِن کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ باتوں باتوں میں للیتا نے پوچھا تھا۔ ''مس فنانس آپ گھوڑے کی سواری جانتی ہیں؟'' ''نہیں'' انہوں نے جواب دیا۔ ''مگر بہت دنوں سے سیکھنے کی خواہش ہے، اور اس کے لئے رائیڈنگ سوٹ بھی سلانے والی ہوں۔'' اور پھر اچانک میری جانب مخاطب ہو کر کہا۔ ''کوٹ اور پتلون گلنار'' اس انداز سے کہا تھا کہ میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔'' میں تو اس سوٹ میں بالکل مرد معلوم ہوں گی نا، میں دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔ ہاں ان میں کچھ کچھ مردانی جھلک بھی تو تھی، بہت دراز قد، چوڑا چکلا سینہ اور ایسی نظروں سے دیکھتی تھی کہ میں بے اختیار شرما جاتی۔ خواہ کتنی ہی لڑکیوں میں کھڑی ہوں۔ وہ باتیں تو اور لڑکیوں سے کر رہی ہوتیں۔ مگر نظر مجھ پر جمی ہوتیں، اور نارنجی ساڑھی میں وہ کیسی بھلی معلوم ہوتی تھیں شاید ساڑھی کے عکس کی وجہ سے چہرے کا رنگ سنہری ہو جاتا۔ اور رخساروں پر ہلکی سرخی جس میں کچھ

نیلاہٹ کی آمیزش بھی ہوتی....... اور دور سے تو چیچک کے داغ بھی دکھائی نہیں دیتے تھے...........

میں نے سموسوں کی سینی کریمن کے آگے رکھ دی۔ کریمن انہیں تلنے لگی۔ اب کہیں فرصت ملی۔ ان کاموں سے۔ اتنی دیر چولہے کے پاس بیٹھنے سے بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا، ساڑھی کے آنچل سے انہیں خشک کرتے ہوئے پھر اس کمرے کی طرف نظر دوڑائی۔ جہاں مس فنانس بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہی ساحرانہ مسکراہٹ جو مجھ پر جادو سا کر دیتی تھیں اب میں بخوشی ان کے پاس جانے کے لئے تیار تھی۔ دفعتاً میری نظر ساڑھی پر پڑی۔ جگہ جگہ مٹی لگی ہوئی تھی۔ اور جاوید کے ہاتھوں کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔ میں یہ ساڑھی پہن کر کیسے جاسکوں گی؟ اتنے میں زبیدہ آنکلی۔

''زبیدہ'' میں نے آواز دی، توجہ کئے بغیر وہ بھاگی جارہی تھی ''زبیدہ اِدھر تو آؤ۔''

''ہونہہ، نیں آؤں گی۔ مجھے فنانس کے پاس جانا ہے۔'' ''اپنی آپا کی بات مان لو، چاکلیٹ دوں گی، منی کو۔''

''کیا ہے آپا؟'' چاکلیٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''اچھی منی مجھے الماری میں سے ایک ساڑھی لا دونا۔ دیکھو یہ کیسی میلی ہو رہی ہے۔ مس فنانس کے پاس یہ پہن کر کیسے جاؤں اور یہ لو الماری کی کنجیاں۔''

''ہاں آپا، جلدی جاؤ۔ مس فنانس تمہیں ہی یاد کر رہی ہیں'' ....تو وہ اب بھی مجھے چاہتی ہیں؟ ہاں شاید دو ماہ پہلے میں نے ایک لڑکی کے ذریعہ ایک خط بھیجا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ خط پاکر خوش ہوگئی تھیں .... اور اس دن بھی تو وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جارہی تھیں نا جب میں اطلاع دئے بغیر اچانک اس کالج میں آئی تھی۔ جہاں وہ اب کام کر رہی تھیں۔ میں ایک ایسی جگہ چھپ گئی تھی، جہاں سے انہیں میں دیکھ سکتی تھی۔ مگر وہ مجھے نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اور ایک لڑکی کو اُن کے پاس بھیجا تھا کہ انہیں اطلاع کردے میں اس کالج میں داخلے کے لئے آئی ہوں انہوں نے فرطِ

مسرت سے کئی بار میرا نام دہرایا تھا۔گلنار گلنار یہاں سچ کہو! لڑکی نے انہیں یقین دلایا۔وہ کہاں ہیں بتاؤ نا؟'' لڑکی انہیں بتا رہی تھی، میں کس جگہ ہوں مگر وہ دیکھے بغیر، گلنار! گلنا! تم کہاں ہو! کہتی ہوئی ہر طرف گھوم رہی تھیں۔انہیں یوں بے تاب دیکھنے میں بڑا مزا آیا تھا.........

''لو اللہ اللہ کرکے سب چیزیں تیار ہو گئیں، اب میں اس بوڑھے جسم کو آرام تو دے دوں۔''

کم بخت بوڑھی۔جب دیکھو بڑبڑاتی رہتی ہے۔میں جھلا کر رہ گئی۔

''خدا بھلا کرے۔گلنار بی بی کا مجھ بوڑھی کی کتنی مدد کرتی ہے۔'' کریمن باورچی خانے میں ٹاٹ بچھا کر ہیں لیٹ گئی، اہا بیٹی تم یہیں ہو۔ابھی ابھی یاد کر رہی تھی۔دیکھا بہت نہیں کہتی۔کتنی ہی جگہ کام کیا پر نانا ایسی بچی کہیں نہیں دیکھی، ذرا سے لونڈے تک مجھے ڈانٹ دیتے تھے، میری بی بی نے تو اب تک سخت لفظ بھی نہ کہا۔اب تو میرے کام کرنے کے دن گئے۔اسی لئے تو تمہارے ہاں بھی کام چھوڑ دیا تھا، سچ کہتی ہوں بیٹی صرف تمہاری شادی کی خبر سن کر آئی ہوں، تمہیں ان آنکھوں سے دلہن بنی دیکھوں۔بہت دنوں سے یہی ارمان ہے خدا کرے بہت اچھا دولہا نصیب ہو۔''

بھلا پرویز سے اچھا دولہا اور بھی کوئی ہوگا؟ ایک ہلکی سی مسکراہٹ میرے لبوں تک آگئی میں نے جلدی سے منہ پھیر لیا کہ کہیں کریمن دیکھ نہ لے۔

پھر جیسے دماغ خیالات سے یک لخت خالی ہو گیا ہو۔اُن کی جگہ پرویز پرویز پرویز.........

اور میں ایک حسین دنیا میں جا پہنچی۔جذبات کی ایک رنگین دنیا۔ہاں نہایت حسین، کالج اور مس فناس والی دُنیا سے کہیں زیادہ حسین!!

کبھی میں یہ سوچا کرتی تھی کہ میری شادی ہو جائے تو اپنے شوہر سے محبت بھی کر سکوں گی ایک دفعہ زرینہ نے جو پامسٹری جانتی تھی۔میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا۔'' تمہارے شوہر کو تم سے محبت بیحد ہوگی'' لو مجھے اپنے اس ہونیوالے شوہر پر کتنا رحم آیا تھا کہ میں اس کی محبت کا جواب نہ دے سکوں گی اور اب؟......اب تو میں اپنے پرویز کو دیوانہ دار چاہونگی۔

''آپا ساڑھی لے لو''۔میں نے زبیدہ سے ساڑھی لے کر میز پر رکھ دی۔اور بال بنانے

لگی۔ آخر میں مس فنانس کو کیسے بھلا سکتی! وہ بھی تو مجھے بیحد چاہتی تھیں، ہونہہ! چاہتی ہوں گی۔ کبھی انہوں نے اس کا زبان سے اظہار بھی کیا تھا؟ میں ساتھ ہوتی تو ڈر کے مارے مری جاتی تھیں۔

''گلنار۔ لڑکیاں کیا کہتی ہوں گے۔ گلنار اگر پرنسپل دیکھ لیں تو؟''

لڑکیاں دیکھیں تو دیکھیں۔ ہم نے کوئی جرم کیا تھا کہ یوں ہی ڈریں۔ اف رے بزدلی۔ اور جب ہمارے مضامین کی کاپیاں تصحیح کر کے کلاس میں لاتی تھیں، تو میرے لکھے ہوئے نظریوں اور نکتوں کی تو بہت تعریف کرتیں۔ مگر کبھی لڑکیوں کو بتایا بھی تھا کہ یہ میرے پیش کیے ہوئے نکتے ہیں۔ جوابات کے پرچے واپس کرتے ہوئے کبھی بھولے سے میرا نام لیا تھا.........

مگر وہ مجھ ہی کو سب سے زیادہ نمبر دیتی تھیں.......ہونہہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ میں تو ہر پرچہ میں اوّل آتی تھی، لیکن کوئی استانی اتنے نمبر نہیں دیتی تھی، لیکن مس فنانس تو اسی پچاسی نمبر دے دیتی تھیں۔ ہونہہ! صرف زیادہ نمبر دے دیئے تو کیا ہوا، مجھے کتنی خوشی ہوتی۔ اگر وہ کلاس میں لڑکیوں کے سامنے میری تعریف کرتیں۔ اور کہتیں۔ دیکھو گلنار نے کتنے نمبر لئے ہیں۔ فلاں نمبر نے اتنے مارکس لئے، فلاں نمبر نے یہ کیا ہے۔ وہ کیا ہے، وہ کیا ہے فلاں نمبر فلاں نمبر، میں تو بس ''فلاں نمبر'' ہی ہو کر رہ گئی تھی، اور وہ مس تھیں۔ آکسفورڈ کی ایم اے وہ تو آدھ گھنٹے تک میرے مضمون کی تعریف کرتی تھیں۔ گو ان کے جانچنے کا معیار بہت ہی اعلیٰ تھا، اور مسز سوشیل! سربنی نے کہا تھا کہ وہ میرا پرچہ لئے بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ ''ماشاءاللہ گلنار نے تو اس دفعہ کمال ہی کر دیا۔ کتنے اچھے جواب ہیں۔ میں نے تو اس پرچہ کو کئی مرتبہ پڑھا۔ وہ دوسری ٹیچر اور لڑکیوں کے سامنے ہمیشہ میری تعریف کرتی رہتی تھیں۔ اور مس کملا بائی بھی، لیڈی ٹیچرز تو کیا مرد پروفیسر بھی میری ذہانت اور قابلیت کی داد دیتے تھے، فقط تھیں، تو مس فنانس جو تعریف میں ایک لفظ بھی کہنا شاید اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھیں ہونہہ!

اور میرا دل کیسے چاہتا تھا کہ وہ میرے حُسن کی تعریف کریں ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی بے تابی سے کہہ دیں۔ گلنار تم کتنی حسین ہو! کم از کم ایک دفعہ بے اختیار ان کے منہ سے نکل جائے۔ آج تو

تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو، گلنار، یا یہی سہی، یہ ساڑھی تو تمہیں بہت سجتی ہے۔

میں اس کے لئے کتنے جتن کرتی تھی۔ جس دن ان کا گھنٹہ ہوتا۔ وہ ہی ساڑھیاں پہنتی۔ جو مجھے بھاتی تھیں، بالوں کو خاص توجہ سے سنوارتی، کبھی کبھی بوٹو لگاتی، اچھی اچھی خوش رنگ ساڑھیاں پہنتی۔ اور مجھے اپنی کلائیوں اور انگلیوں پر بہت ہی ناز تھا...... میں اپنے ہاتھ میز پر اس انداز سے ٹیکے رہتی کہ چوڑیاں جم کر کلائیوں پر آپڑیں۔ اور مس فنانس کی سیٹ سے انگلیوں کی خوبصورتی کا اچھی طرح جائزہ لیا جاسکے...... مگر یہ تو ظاہر تھا کہ وہ مجھے حسین سمجھتی تھیں۔ ورنہ یوں نہ تکتی رہتیں۔ اور جب کبھی محسوس ہوتا کہ آج خصوصیت سے اچھی نظر آرہی ہوں۔ ایسے موقعوں پر تو وہ مجھے بہت ہی توجہ سے دیکھ رہی ہوتیں۔ ان کی نگاہ مجھ پر سے ہٹتی ہی نہ تھیں........ اچھا یوں ہی سہی، لیکن کیا میں پتھر کا ایک مجسمہ تھی، یا نقاش کی بنائی ہوئی تصویر تھی کہ یوں خاموش داد ملتی۔ آخر میں ایک انسان تھی۔ ایک سترہ سالہ نوخیز لڑکی رومانی اور جذباتی، کبھی تعریف کردیتیں تو ان کا خزانہ کھو جاتا، مانا کہ وہ پروفیسر تھیں، مسز سوشیل بھی تو پروفیسر ہی تھیں کیا وہ میری صورت کی تعریف نہ کرتی تھیں۔ اِس دن جناب مجھے ایک شیلو میں حصہ لینا تھا جس میں یہ بتایا جانے والا تھا کہ ملکہ نور جہاں رقص اور موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ مسز سوشیل میرا میک آپ کرتی ہوئی کیسے سراہتی جاتی تھیں، گلنار، نور جہاں کی تمثیل کے لئے تمہی موزوں ہو۔'' تم کیسی اچھی انگریزی لکھتی ہو، مسٹر سوشیل بھی تمہارے ہی گن گاتے رہتے ہیں۔ وہ بھی تمہارے ٹیچر رہ چکے ہیں نا؟ لپ اسٹک روز لگا چکنے کے بعد انہوں نے کہا۔'' اب آنکھیں اُوپر اُٹھاؤ، ان کا میک اَپ بھی کردوں۔'' اور میں نے اپنی آنکھیں اُوپر اٹھائیں تو اللہ کتنی خوبصورت آنکھیں!!............ اور کس شدت سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش مسز سوشیل کی بجائے مس فنانس ہوتیں۔ آخر میں مس فنانس ہی کو کیوں چاہتی تھی۔ مس فنانس میں کون سے سرخاب کے پَر لگے ہوئے تھے؟......... اور زرینہ بھی تو میری آنکھوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتی تھی، اور للیتا۔ وہ تو اشعار لکھا کرتی تھی میری آنکھوں پر!! زینی بھی کہا کرتی تھی نا۔'' گلنار۔ تم چشمہ نہ پہنا کرو۔ یہ

تمہاری حَسین آنکھوں کو چھپا دیتا ہے۔'' سبھی تعریف کرتی تھیں اس لئے تو میں اس کا خاص خیال رکھتی تھی کہ مس فنانس میری آنکھوں کو دیکھیں اور ان کی کلاس میں چشمہ بھی تو اتار کر رکھ دیتی تھی۔ گو مجھے بورڈ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے میں بہت دِقت ہوتی، ہونہہ اس بے حس پر کچھ اثر بھی ہوتا تھا؟ مگر پرویز، پرویز کی حسن شناس نگاہیں پہلی ہی نظر میں میری آنکھوں کا حسن دیکھ لیں گی، وہ بے اختیار کہہ اُٹھیں گے تمہاری آنکھیں، غزالی آنکھیں، کتنی سیاہ کیسی مدھ بھری!!.........کالج ڈے میں، میں نے صرف اس لئے ڈرامہ میں پارٹ ادا کیا تھا کہ مس فنانس دیکھیں۔ برنارڈ شا کے ڈرامے ''سینٹ جون.........(SAINT JOAN) کا انتخاب ہوا تھا، اور میں جون بنی تھی۔ مجھے کس طرح سے سنوارا گیا تھا۔ میں خود آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی تھی، پھر مجھے ہنسی بھی آ گئی، جون ایک دیہاتی لڑکی۔ پھر ایک قیدی جو کورٹ میں لائی جا رہی تھی۔ کیا اس وقت وہ بنی سنوری ہو گی لیکن یہاں کی فلموں اور اسٹیجوں پر تو صرف یہی خیال رکھا جاتا ہے کہ جو لڑکی ہیروئن کا پارٹ ادا کرے وہ خوبصورت ہو، اور اسے اچھی طرح سے سنوارا جائے۔ لیکن یہ تو مسز سوشیل اور مس جونس کی غلطی نہ تھی۔ انہوں نے میرا ٹھیک ہی میک اَپ کیا تھا۔ مس جونس نے اپنا خاکی رنگ کا رائڈنگ سوٹ مجھے پہنایا تھا۔ خاکی کوٹ اور خاکی پتلون اور میرے لانبے بال پنوں میں لپیٹ کے شانوں پر ڈال دیئے گئے تھے۔ بالوں میں کنگھی تک نہ کی تھی۔ بال پیشانی اور رخساروں پر نہایت بے ترتیبی سے بکھیر دیئے گئے تھے، غلطی تو دیدی ہی کی تھی جس نے ڈیوک آف آرک کا پارٹ ادا کیا تھا۔ وہ اپنے لبوں پر لپ اِسٹک لگا رہی تھی۔ ڈرامے کا وقت ہو گیا تھا۔ مجھے جاتی دیکھ کر اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچ لیا۔ ''ہائے گلنار، یہ کیا؟ تم تو ہیروئن ہو۔ روز نہ لپ اسٹک! اس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا دیا، اور گالوں پر روز مل دیا۔ اور جاتے ہوئے میں نے آئینہ پر نظر ڈالی تو خود ہی ٹھٹک گئی، بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے بال تو اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ مس فنانس آج میری تعریف ضرور کریں گی، بلکہ تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ ڈرامے کے اختتام پر مس سوشیل، مس جونس، مسز ڈیانیل دوڑی ہوئی اسٹیج پر چڑھ

آئیں اور پردے کے پیچھے آکر بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مجھے مبارک باد دی کہ میں نے جون کے سے مشکل پارٹ کو بہت اچھی طرح نبھایا تھا۔ سب میری اداکاری پر عش عش کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ اور مس فنانس! انہوں نے حاضرین میں شامل ہو کر ڈرامہ دیکھا نہیں۔ پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر اداکار لڑکیوں کو ہدایات دیتی رہیں۔ میں نے کتنی التجا کے ساتھ کہا تھا کہ آپ حاضرین میں بیٹھ کر ڈرامہ دیکھیں۔ ان کے دونوں شانے پکڑ کی نہایت ملتجی نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔ میری یہ ملتجی نگاہیں تو پتھر سے دل کو پگھلا دیتیں، لیکن وہ تو شاید پتھر سے بھی زیادہ بے حس تھیں۔ ''گلنار کیا کروں میں نے اپنے ذمہ یہ کام لیا ہے تو مجھے کرنا ہی ہوگا۔'' واہ رے تمہارا کام تاہم انہوں نے پردے کے پیچھے سے تو دیکھا تھا۔

اس رات مجھے ہاسٹل لوٹنے میں بہت دیر ہوگئی تھی، گو ہاسٹل کالج ہی کے کمپاؤنڈ کے اندر تھا۔ لڑکیاں قدم قدم پر مجھے گھیرے لیتی تھیں۔ ''گلنار تو نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔' تمہاری اداکاری کے کیا کہنے۔ تم اسٹیج پر کتنی حسین نظر آرہی تھیں گلنار۔'' ان سب سے پیچھا چھڑا کر تھکی ہاری ہاسٹل لوٹی۔ زرینہ باہر کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میری اچھی گلنار تم بال کٹوا کر یونہی میک اَپ کیا کرونا۔ آج تو پری معلوم ہو رہی ہو۔ لیکن بھئی جون کے لئے ہمارا میک اَپ ٹھیک نہ تھا۔ انکوزیٹر (INQUSITOR) کہہ رہا تھا (Joan You Look very pale today) اور تمہارے گالوں سے شفق پھوٹ رہی تھی۔ ہم دونوں ہنسنے لگے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم دوڑتے ہوئے ڈائننگ ہال پہنچے۔ سب لڑکیاں کھانے پر بیٹھ چکی تھیں۔ میرے جاتے ہی سبھوں نے تعریف کی بوچھار کر دی، اور اس رات میں کیسی خوش خوش بستر پر جا لیٹی۔ نیند ہی نہ آتی تھی، ہونہہ! ان سب تعریفوں کی مجھے کیا پروا۔ کل میں اپنی مس فنانس اپنی انجلینا سے ملوں گی تو وہ یہ کہیں گی۔ یوں تعریف کریں گی .... دوسری صبح ان امنگوں اور امیدوں کو لئے ہوئے گئی تو اپنی انجلینا کے پاس کیا رکھا تھا؟ ایک جذبات سے عاری چہرہ اور پھیکی بے مزہ باتیں .... زرینہ سچ کہتی تھی، ''گلنار تو اتنی رومانوی لڑکی اور مس فنانس کی سی بے حس اور سرد مہر

کہیں تمہارا جوڑ ہے۔ تم تو آگ ہو اور وہ برف .... ہاں وہ جذبات سے بالکل عاری تھیں بے حس اور مردہ دل، پتھر کا مجسمہ، برف کا تودہ۔ بھلا پرویز سے ان کی کیا مناسبت، میرے پرویز کی رگ رگ میں زندگی ہے، بجلی ہے تصویر ہی میں وہ کتنے رومانٹک معلوم ہوتے تھے، اور میں نے اس دن چوری سے جھانک کر انہیں دیکھ بھی لیا تھا نا، جب آپا نے انہیں سلامی دینے (نذرانہ پیش کرنے کے لئے) کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس دن بھی زرینہ آئی ہوئی تھی اور جبین بھی ''دولہا بھائی بھی آگئے'' زبیدہ کی آواز آئی۔ اور میرا دل کیسے دھڑکنے لگا۔ زرینہ اور جبین بھاگ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں، زرینہ مجھے بھی گھسیٹنے لگی۔ ''اٹھو گلنار تم بھی اپنے دولہا کو دیکھ لو نا۔'' میں پہلے تو جھجکی، گو میرا جی بے اختیار چاہا تھا کہ انہیں ایک نظر دیکھ لوں۔ ''امّی کیا کہیں گی؟'' ''اری امّی کی بچی اُٹھ، ایسا زرین موقعہ کھودے گی زرینہ نے آخر مجھے کھینچ لیا۔ وہ ابا کے سامنے کیسے شرمائے کھڑے تھے، پھر جب وہ ہال میں آئے تو ہم نے دروازے کو سوراخوں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ کم بخت سوراخ کتنے چھوٹے تھے، آخر ہمیں ایک ترکیب سوجھ گئی جبین نے ہمارے کمرے کی روشنی گل کردی تا کہ باہر والے ہمیں دیکھ نہ سکیں اور زرینہ نے آہستہ سے چٹخنی کھول کر ایک کواڑ کو ذرا سا کھول دیا۔ پھر کیا تھا جبین اور زرینہ دونوں ٹوٹ پڑیں۔ مگر نہ جانے کیوں میں پیچھے ہٹنے لگی ....

''بڑا خوبصورت نوجوان ہے'' گل زرینہ نے فرطِ مسرّت سے مجھے گلے لگا لیا، میں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ ''میری گل ایسا اچھا جوڑ ہے، تیرا اور اس کا'' وہ میری تھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اُٹھاتے ہوئے بولی! اس کی آنکھوں سے کیسی محبت ٹپک رہی تھی۔ وہ پھر جھانکنے لگی۔ ''فارم بھی بہت اچھا ہے، اور آنکھیں کیسی حسین ہیں۔ اِدھر آ تو گل، بڑی آئی کہیں کی۔ امّی سے ڈرنے والی۔'' زرینہ مجھے پھر گھسیٹنے لگی۔ ''دیکھا تو نے اپنے پرویز کی آنکھوں کو، بخدا تیری آنکھوں کا جواب ہیں وہ تو'' .... ہاں میں نے دیکھا سب کچھ دیکھا۔ اس خوبصورت چہرہ کو، ان تبسّم آمیز ہونٹوں کو ان حسین آنکھوں کو جن میں شوخی اور بے تابی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی .... اری بڑا

رومانٹک معلوم ہوتا ہے۔گل۔تجھ پر دیوانہ نہ ہو جائے،تو میرا ذمہ۔ابھی سے کہہ دیتی ہوں۔گل، وہ تجھے آنکھوں میں بٹھائے گا۔گلے کا ہار بنائے گا۔'' اور میں وفورِ جذبات سے پھنکی جا رہی تھی۔ اس کے بازؤوں میں رگر پڑی.........دیوانی مس فنانس پر مری جاتی تھی آخر تو نے کیا اُمیدیں باندھ رکھی تھیں، اس پتھری بے حس عورت سے مسرّت ہو یا رنج۔غصہ ہو یا بے تابی وہی پھیکا چہرہ۔وہی بے نور آنکھیں۔پرویز کو دیکھ کتنا اکسپریشن ہے اس کے چہرے پر۔گویا جذبات کی شعائیں پھوٹ رہی ہیں۔'' .... ہاں وہ اس وقت مجسم اضطراب نظر آرہے تھے۔ان کی آنکھیں کس بے تابی سے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں کیوں؟ شاید اس لئے کہ کہیں میں نظر آجاؤں؟

جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ دروازے توڑ دوں۔سب کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے ان کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاؤں.........کاش میں کسی پردہ کی آڑ ہی میں کھڑی ہوتی......... ایک لمحہ کے لئے پردہ کھسک جاتا، اور میں ان کی طرف شوخ نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیتی۔پھر جلدی سے نظریں جھکا کر شرما جاتی اور انہیں دم بخود کر دیتی۔ہاں وہ ضرور دم بخود ہو جاتے۔میں اس نیلی جارجٹ کی نقرئی بارڈر والی ساڑھی میں بہت دل کش نظر آرہی تھی نا.........ہونہہ! میں یہ والی ساڑھی پہن کر کیوں جاؤں۔میں جارجٹ کی ساڑھی پہنوں گی۔جو میرے پرویز کی لائی ہوئی ہے۔میں نے ساڑھی کھینچ کر پھینک دی جو ابھی پہنی تھی، اور ذکیہ کو آواز دی، ذکیہ ایک برتن میں سموسے لئے جا رہی تھی، ذکیہ ذرا میری نیلی ساڑھی لے آنا۔وہی جارجٹ کی۔''اچھا لے آؤں گی۔مگر تم جلدی آنا۔''

میں نے بے پروائی سے اس کمرے کی طرف نگاہ کی، مس فنانس ہاتھ پر تھوڑی رکھے اوپر دیکھ رہی تھیں، جذبات سے خالی بے نور آنکھیں بے حد پتلے پھیکے رنگ کے ہونٹ، زرد چہرہ جس پر چیچک کے داغ ہی داغ تھے۔مجھے ایسا دکھائی دینے لگا کہ وہ داغ بڑھ رہے ہیں، گہرے ہو رہے ہیں اور پھیلتے جا رہے ہیں۔ان کی صورت کیسی کریہہ ہوتی جا رہی ہے۔جلدی سے اندر کھسک گئی، اور سر کو زور کا جھٹکا دیا کہ دماغ پر کھنچی ہوئی تصویر مٹ جائے۔اس کی جگہ دماغ کے پردے پر ایک

اور تصویر اُبھرنے لگی، پرویز کی، وہ خوبصورت نیلی آنکھیں، بڑی بڑی بادامی، نشیلی، لانبی خمیدہ، پلکیں، کشادہ حسین پیشانی اور ہونٹ کتنی حسین تراش تھی ان ہونٹوں کی، رسیلے بھرے ہوئے اور کناروں پر وہ ہلکا سا خم، گویا وہ مسکرانے کے لئے ہی بنائے گئے ہوں۔ وہ سانولا سانولا رنگ، شیام سندر، ہاں میرے شیام اور میں ____ میں نے میز پر رکھی ہوئی تصویر اُٹھالی، پرویز کی اور فرط بے تابی سے اسے چوم لیا۔ ''یہی ساڑھی ہے نا'' میں نے گھبرا کر تصویر رکھ دی۔ ذکیہ ساڑی لئے کھڑی تھی۔ ''ہاں یہی۔'' ''آپا جلدی سے آؤ نا۔ سموسے ٹھنڈے ہو رہے ہیں، اور یہاں ساڑھیوں پر ساڑھیاں دی جا رہی ہیں۔ اِدھر یہ بے پروائی۔ اُدھر دیکھو تو بے چاری مس فنانس نے گلنار گلنار کی رٹ لگا رکھی ہے۔''

اچھا ابھی آئی۔ میں نے پھر تصویر اُٹھالی۔ اور سب کچھ بھول کر تصویر میں کھوگئی۔ کیسا ہنس مکھ چہرہ۔ آہا یہ ہونٹ، نظر بار بار ان ہونٹوں پر ہی جا کر جمتی تھی، یہ ہونٹ اور......اُف کیا خیال آیا کہ میں مارے شرم کے عرق ہوگئی۔ میں نے تصویر رکھدی۔ اور ساڑھی پہننے لگی۔ اور ان کی شخصیت میں کتنی دل کشی تھی، اُف کس بلا کا بجیلا پن۔ دراز قد، چوڑا سینہ۔ لانبے مضبوط بازو، ان بازوؤں میں.....اُف پھر کیسے خیال آ رہے تھے، جیسے رگ رگ میں بجلیاں کوندرہی تھیں۔ دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی، اور خون جیسے اُبلا جا رہا تھا، نس نس میں گرمی آگ۔ اُف یہ جذبات کا ہجوم، یہ طوفان میں بستر پر جا کر گری۔ اور تکیوں میں منہ چھپالیا۔ یہ ہیجان۔ کیسی لذت تھی اس میں!

''گلنار آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے''۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ امّی کھڑی تھیں۔ ان کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا یہ مس فنانس کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں تمہیں کچھ بھی پاس ہے۔ بڑوں کا۔ اور وہ تمہاری اُستانی ہیں۔'' امّی بڑابڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

''تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔'' ''تمہیں کو یاد کر رہی ہیں۔'' تمہارے نام کی رٹ لگا رکھی ہے۔'' اچھا بھئی جاؤں گی.......... ہاں کیوں نہیں؟ ضرور جاؤں گی۔ یہ ساڑھی پہن کر جو پرویز نے لا کر دی ہے۔ اور ہاں وہ انگوٹھی پہنوں گی۔ جو پرویز سے میرے منسوب ہونے کی نشانی ہے

میں نے ایک چھوٹی سی مخمل کی ڈبیا نکالی۔کیسی خوبصورت انگوٹھی تھی۔ میری انگیج منٹ رنگ ۔P۔ پرویز کے نام پہلا حرف کیسی خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ ہیروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ اور ان سفید نگینوں میں ایک سبز رنگ جگمگا رہا تھا۔ میں نے فخر سے دیکھا۔ اور انگوٹھی پہن لی، ہاں اسی طرح جاؤں گی، اور انہیں بتادوں گی کہ مجھے اپنی شادی کی کس قدر خوشی ہے ۔وہ اپنے دل میں خیال کر رہی ہونگی کہ میں ان سے شرمندہ ہوں۔ منہ بسورے ہوئے بڑی ہی مغموم صورت بنائے اِن کے پاس آؤنگی۔ درد بھرے لہجہ میں اپنی مصیبت بیان کروں گی کہ میرے دل پر کیا بیت رہی ہے اور شاید رونے بھی لگوں۔ ہونہہ! میں انہیں کیسے حیران کردوں گی۔ساڑھی پر نظر پڑتے ہی کہہ اُٹھیں گی نا ''کیسی خوبصورت ساڑھی ہے۔'' اور میں بڑے فخر سے کہوں گی یہ پرویز لائے ہیں۔ پرویز ہی کی باتیں کروں گی۔ خوشی سے جھومتی ہوئی انہیں بتاؤں گی۔ کہ پرویز کس قدر حسین ہیں۔ انہیں اپنی شادی میں شرکت کرنے پر اصرار کروں گی......اور جذبات کی شدت کا پورے طور پر احترام کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دوں گی میں پرویز سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ یہ سن کر بس جل ہی جائیں گی جلیں گی؟......ضرور اس وقت جب میں چھٹی لئے بغیر اپنے گھر آئی تھی، وہ بار بار پوچھ رہی تھیں نا '' گلنار۔ کہیں تمہاری شادی تو نہیں ہو رہی ہے!'' میں نے کہا۔ ''نہیں'' انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا۔ ''تم مجھ سے چھپاتی ہو گلنار!'' اور جب ہی تو انہوں نے میری منگنی کی خبر ملنے کی مبارک باد تک نہ لکھ بھیجی تھی......اور اب میرے چہرے پر بجائے رنج کے یہ وفورِ شوق، مسرت اور بے تابی دیکھ کر کیسے جل اُٹھیں گی۔

ہونہہ! جلیں تو جلیں! خوب جلیں میری بلا سے!!

میں نے چلتے چلتے پرویز کی تصویر لے لی۔

☆☆

عصمت چغتائی

دو ہاتھ

رام اوتار لام پر سے واپس آرہا تھا۔ بوڑھی مہترانی ابا میاں سے چھٹی پڑھوانے آئی تھی۔ رام اوتار کو چھٹی مل گئی۔ جنگ ختم ہوگئی تھی۔ نا! اس لئے رام اوتار تین سال بعد واپس آرہا تھا۔ بوڑھی مہترانی کی چیپڑ بھری آنکھوں میں آنسو ٹمٹا رہے تھے، مارے شکر گذاری کے وہ دوڑ دوڑ کر سب کے پاؤں چھو رہی تھی۔ جیسے ان پیروں کے مالکوں نے ہی اس کا اکلوتا پوت لام سے زندہ سلامت منگوالیا۔

بڑھیا بچاس برس کی ہوگی، پر ستر کی معلوم ہوتی تھی۔ دس بارہ کچے پکے بچے جنے۔ ان میں سے بس رام اوتر وا بڑی منتوں، مرادوں سے جیا تھا۔ ابھی اس کی شادی رچائے سال بھر بھی نہیں بیتا تھا کہ رام اوتار کی پکار آگئی۔ مہترانی نے بہت واویلا مچائی۔ مگر کچھ نہ چلی اور جب رام اوتار وردی پہن کر آخری بار اُس کے پیر چھونے آیا تو اُس کی شان و شوکت سے بے انتہا مرعوب ہوئے۔ جیسے وہ کرنل ہی تو ہو گیا تھا۔

شاگرد پیشے میں نوکر مسکرا رہے تھے۔ رام اوتار کے آنے کے بعد جو ڈرامہ ہونے کی امید تھی سب اسی پر آس لگائے بیٹھے تھے حالانکہ رام اوتار لام پر توپ، بندوق چھوڑنے نہیں گیا تھا۔ پھر بھی سپاہیوں کا میلا اٹھاتے اٹھاتے اُسمیں کچھ سپاہیانہ آن بان اور اکڑ پیدا ہوگئی ہوگی۔ بھوری وردی ڈانٹ کر وہ پرانا رام اوتر وا واقعی نہ رہا ہوگا۔ ناممکن ہے وہ گوری کے کرتوت سنے اور اُس کا جوان خون ہتک سے کھول نہ اٹھے۔

بیاہ کر آئی ہے تو کیا مسمسی تھی گوری۔ جب تک رام اوتار رہا اُس کا گھونگھٹ فٹ بھر لمبا رہا اور کسی نے اُس کے رُخ پر نور کا جلوہ نہ دیکھا۔ جب خصم گیا تو کیا بلک بلک کر روئی تھی۔ جیسے اُسکی

مانگ کی سیندور ہمیشہ کے لئے اُڑ رہا ہو۔ تھوڑے دن روئی روئی آنکھیں لئے۔ سر جھکائے میلے کی ٹوکری ڈھوتی پھری۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے گھونگھٹ کی لمبائی کم ہونے لگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے یہ سارا بسنت رت کا دھرا ہے۔ کچھ صاف گو کہتے تھے۔ گوری تھی ہی چھنال۔ رام اوتار کے جاتے ہی قیامت ہوگئی۔ کمبخت ہر وقت ہی ہی، ہر وقت اٹھلانا۔ کمر پر میلے کی ٹوکری لے کر کانسے کے کڑے چھنکاتی جدھر سے نکل جاتی، باورچی کی نظر توے پر سلگتی ہوئی روٹی سے اُچٹ جاتی۔ بہشتی کا ڈول کنویں میں ڈوبتا ہی چلا جاتا۔ چپراسیوں تک کی بلا لگی پگڑیاں ڈھیلی ہوکر گردن میں جھولنے لگتیں۔ اور جب یہ سراپا قیامت گھونگھٹ میں سے بان پھینکتی گزر جاتی تو پورا شاگرد پیشہ ایک بے جان لاش کی طرح سکتہ میں رہ جاتا۔ پھر ایک دم چونک کر وہ ایکدوسرے کی دُرگت پر طعنہ زنی کرنے لگتے۔ دھوبن مارے غصّے کے کلف کی کونڈی لوٹ دیتی۔ چپراسن چھاتی سے چمٹے لونڈے کے بے بات دھمو کے جڑنے لگتی اور باورچی کی تیسری بیوی پر ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا۔

نام گوری تھی۔ پر کمبخت سیاہ بہت تھی۔ جیسے اُلٹے توے پر کسی پھوڑیا نے پراٹھے تل کر چمکتا ہوا چھوڑ دیا ہو۔ چھوٹی پھکنا سی ناک، پھیلا ہوا دہانہ، دانت مانجھنے کا سات پُشت نے فیشن ہی چھوڑ دیا تھا۔ آنکھوں میں پلیوں کاجل تھوپنے کے بعد بھی دائیں آنکھ کا بھینگا پن اوجھل نہ ہوسکا پھر بھی ٹیڑھی آنکھ سے نہ جانے کیسے زہر میں بجھے تیر پھینکتی تھی کہ نشانے پر بیٹھ ہی جاتے تھے۔ کمر بھی لچک دار نہ تھی۔ خاصی کٹھلا سی جدھر جاتی کڑوے تیل کی سڑانڈ چھوڑ جاتی۔ ہاں آواز میں بلا کی کوک تھی۔ تیج تیوہار پر لہک کر کجریاں گاتی تو اُس کی آواز سب سے اونچی لہراتی چڑھتی چلی جاتی۔

بڑھیا مہترانی، یعنی اس کے ساس بیٹے کے آتے ہی اس سے بے طرح بدگمان ہوگئی بیٹھے بٹھائے احتیاطاً گالیاں دے دیتی۔ اس پر نظر رکھنے کے لئے پیچھے پیچھے پھرتی۔ مگر بڑھیا اب ٹوٹ گرد ہیں تھم گئی تھی۔ ہماری پرانی مہترانی تھی۔ ہم لوگوں کے آنول نال اُسی نے گاڑے تھے۔ جوں ہی اماں کے درد لگتے۔ مہترانی دہلیز پر آکر بیٹھ جاتی اور بعض وقت لیڈی ڈاکٹر تک کو نہایت مفید ہدایتیں دیتی بلیات کو دفع کرنے کے لیے کچھ منتر تعویذ لاکر پٹی سے باندھ دیتی۔ مہترانی کی گھر

میں خاصی بزرگانہ حیثیت تھی۔

اتنی لاڈلی مہترانی کی بہو یکایک لوگوں کی آنکھوں میں کانٹا بن گئی۔۔ چپراسن اور باورچن کی تو بات اور تھی۔ ہماری اچھی بھلی بھاوجوں کا ماتھا اُسے اٹھلاتے دیکھ کر ٹھنک جاتا۔ اگر وہ اس کمرے میں جھاڑو دینے جاتی جس میں اس کے میاں ہوتے تو وہ ہڑبڑا کر دودھ پیتے بچّے کے مُنہ سے چھاتی چھین کر بھاگتیں کہ کہیں وہ ڈائن اُن کے شوہروں پر ٹونا ٹوٹکا نہ کر رہی ہو۔

گوری کیا تھی بس ایک مرکھنا لمبے لمبے سینگوں والا بجار تھا کہ چھوٹا پھرتا تھا۔ لوگ اپنے کانچ کے برتن بھانڈے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر کلیجے سے لگاتے اور جب حالات نے نازک صورت پکڑی تو شاگرد پیشے کی مہیلاؤں کا ایک باقاعدہ وفد ماں کے دربار میں حاضر ہوا۔ بڑے زور شور سے خطرہ اور اس کے خوفناک نتائج پر بحث ہوئی۔ پتی رکھشا کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں سب بھاوجوں نے شدو مد سے ووٹ دیئے اور اماں کو صدرِ اعزازی کا عہدہ سونپا گیا، ساری خواتین حسبِ مراتب زمین، پیڑھیوں اور پلنگ کی ادوائن پر بیٹھیں۔ پان کے ٹکڑے تقسیم ہوئے اور بڑھیا کو بلایا گیا۔ نہایت اطمینان سے بچّوں کے منہ میں دودھ دے کر سبھا میں خاموشی قائم کی گئی۔ اور مقدمہ پیش ہوا۔

''کیوں ری چڑیل، تو نے بہو قطامہ کو چھوٹ دے رکھی ہے کہ ہماری چھاتیوں پہ کودوں دلے۔ ارادہ کیا ہے تیرا۔ کیا مُنہ کالا کرائے گی؟''

مہترانی تو بھری ہی بیٹھی تھی۔ پھوٹ پڑی۔ ''کیا کروں بیگم صاحب حرام خور کو چار چوٹ کی مار بھی دیتی تو۔ روٹی بھی کھانے کو نا دیتی۔ پر رانڈ میرے تو بس کی نہیں۔''

''ارے روٹی کی کمی ہے اُسے۔'' باورچن نے اینٹا پھینکا۔ سہارنپور کی خاندانی باورچن اور پھر تیسری بیوی ___ کیا تیہا تھا کہ اللہ کی پناہ! پھر چپراسن نائن اور دھوبن نے مقدمہ کو اور سنگین بنا دیا۔ بیچاری مہترانی بیٹھی سب کی لتاڑ سنتی اور اپنی خارش زدہ پنڈلیاں کھجلاتی رہی۔

بیگم صاحب آپ جیسی بتاؤ ویسے کرنے سے موئے نا تھوڑے ئی۔ پر کا کروں کا رانڈ کا ٹینٹوا دبائے دیؤں۔'' ٹینٹوا دبنے کے حسین خیال سے مہیلاؤں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور سب کو بڑھیا سے بے

انتہا ہمدردی پیدا ہوگئی۔

اماں نے رائے دی ____ ''موئی کو میکے پھنکوا دے۔''

''اے بیگم صاحب' کہیں ایسا ہو سکے ہے؟'' مہترانی نے بتایا کہ بہو مفت ہاتھ نہیں آئی ہے۔ ساری عمر کی کمائی پورے دو سو جھونکے ہیں تب مسٹنڈی ہاتھ آئی ہے۔ اتنے پیسوں میں دو گائیں آجاتیں اور مزے سے بھر کلسی دودھ دیتیں۔ پر یہ رانڈ تو دولتیاں ہی دیتی ہے۔ اگر اسے میکے بھیج دیا گیا تو اس کا باپ اسے فوراً دوسرے مہتر کے ہاتھ بیچ دے گا۔ بہو صرف بیٹے کے بستر کی زینت ہی تو نہیں، دو ہاتھوں والی ہے چار آدمیوں کا کام نپٹاتی ہے۔ رام اوتار کے جانے کے بعد بڑھیا سے اتنا کام کیا سنبھلتا۔ یہ بڑھاپا تو اب بہو کے دو ہاتھوں کے صدقے میں بیت رہا ہے۔

مہیلائیں کوئی ناسمجھ نہ تھیں۔ معاملہ اخلاقیات سے ہٹ کر اقتصادیات پر آ گیا تھا۔ واقعی بہو کا وجود بڑھیا کے لئے لازمی تھا۔ دو سو روپے کا مال کس کا دل ہے کہ پھینک دے۔ ان دو سو کے علاوہ بیاہ پر جو بنیے سے لے کر خرچ کیا تھا، ججمان کھلائے تھے۔ برادری کو راضی کیا تھا۔ یہ سارا خرچ کہاں سے آئے گا۔ رام اوتار کو جو تنخواہ ملتی تھی۔ وہ ساری اُدھار میں ڈوب جاتی تھی۔ ایسی موٹی تازی بہو اب تو چار سو سے کم میں نہ ملے گی، پوری کوٹھی کی صفائی کے بعد اور آس پاس کی چار کوٹھیاں نمٹاتی ہے۔ رانڈ کام میں چوکس ہے ویسے۔

پھر بھی اماں نے الٹی میٹم دیدیا کہ۔ ''اگر اس لُچی کا جلد از جلد کوئی انتظام نہ کیا گیا تو کوٹھی کے احاطہ میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔''

بڑھیا نے بہت واویلا مچائی۔ اور جا کر بہو کو منہ بھر بھر کر گالیاں دیں۔ جھونٹے پکڑ کر مارا پیٹا بھی۔ بہو اس کی زر خرید تھی۔ پٹتی رہی، بڑبڑاتی ہی اور دوسرے دن انتقاماً سارے عملے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ باورچی، بہشتی، دھوبی اور چپراسیوں نے تو اپنی بیویوں کی مرمت کی۔ یہاں تک بہو کے معاملہ پر میری مہذب بھابیوں اور شریف بھائیوں میں بھی کھٹ پٹ ہوگئی۔ اور بھابیوں کے میکے تار جانے لگے۔ غرض وہ ہرے بھرے خاندان کے لئے سئی کا کانٹا بن گئی۔ مگر دو چار دن کے بعد بوڑھی مہترانی کے دیور کا لڑکا رتی رام اپنی تائی سے ملنے آیا۔ اور پھر وہیں رہ پڑا۔ دو چار کوٹھیوں میں کام بڑھ گیا تھا سو بھی اُس نے سنبھال لیا۔ اپنے

گاؤں میں آوارہ ہی تو گھومتا تھا۔اس کی بہوابھی نابالغ تھی۔اس لئے گونانہیں ہوا تھا۔

رتی رام کے آتے ہی موسم ایک دم لوٹ پوٹ کر بالکل ہی بدل گیا۔جیسے گھنگھور گھٹائیں ہوا کی جھونکوں کے ساتھ تتر بتر ہوگئیں۔بہو کے قہقہے خاموش ہوگئے۔کانسے کے کڑے گونگے ہوئے۔اور جیسے غبارے سے ہوانکل جائے تو وہ چپ چاپ جھولنے لگتا ہے۔ایسے بہو کا گھونگھٹ جھولتے جھولتے نیچے کی طرف بڑھنے لگا۔اب وہ بجائے بے تھے بیل کے نہایت شرمیلی بہو بن گئی۔جملہ مہیلاؤں نے اطمینان کا سانس لیا۔اسٹاف کے مرد وے اُسے چھیڑتے بھی تو وہ چھوئی موئی کی طرح لجا جاتی اور زیادہ آنکھ دکھاتے تو وہ گھونگھٹ میں سے بھینگی آنکھ کو اور ترچھا کر کے رتی رام کی طرف دیکھتی جو فوراً بازو کھجلاتا سامنے آکر ڈٹ جاتا۔بڑھیا پُرسکون انداز میں دہلیز پر بیٹھی ادھ کھلی آنکھوں سے یہ طربیہ ڈرامہ دیکھتی اور گڑگڑی پیا کرتی۔چاروں طرف ٹھنڈا ٹھنڈا سکون چھا گیا۔جیسے پھوڑے کا مواد نکل گیا ہو۔

مگر اب کے بہو کے خلاف ایک نیا محاذ قائم ہوگیا۔اور وہ عملے کی مرد جاتی پر مشتمل تھا۔ بات بے بات باورچی جو اُسے پراٹھے تل کر دیا کرتا تھا کونڈا صاف نہ کرنے پر گالیاں دینے لگا۔ دھوبی کو شکایت تھی کہ وہ کلف لگا کر کپڑے رسّی پر ڈالتا ہے۔یہ حرامزادی خاک اُڑانے آجاتی ہے۔چپراسی مردانے دس دس مرتبہ جھاڑوں دلواتے پھر بھی وہاں کی غلاظت کا رونا روتے رہتے۔ بہشتی جو اس کے ہاتھ دھلانے کے لئے کئی مشکیں لئے تیار رہتا تھا،اب گھنٹوں صحن میں چھڑکاؤ کرنے کو کہتا۔مگر ٹالتا رہتا تھا کہ وہ سوکھی زمین پر جھاڑو دے تو چپراسی گرد اُڑانے کے جرم میں اسے گالیاں دے سکے۔

مگر بہو سر جھکائے سب کی ڈانٹ پھٹکار ایک کان سے سُنتی دوسرے کان سے اُڑا دیتی۔نہ جانے ساس سے کیا جا کر کہہ دیتی کہ وہ کائیں کر کے سب کا بھیجا کھانے لگتی۔اب اس کی نظر میں بہو نہایت پارسا اور نیک ہو چکی تھی۔

پھر ایک دن داڑھی والے داروغہ جو تمام نوکروں کے سردار تھے اور ابا کے خاص مشیر سمجھے جاتے تھے۔ابا کے حضور میں دست بستہ حاضر ہوئے۔اور اس بھیانک بدمعاشی اور غلاظت کا رونا

رونے لگے جو بہو اور رتی رام کے ناجائز تعلقات سے سارے شاگرد پیشے کو گندہ کر رہی تھی۔ ابا نے معاملہ سیشن سپرد کر دیا۔ یعنی اماں کو پکڑا دیا۔ مہیلاؤں کی سبھا پھر سے جڑی اور بڑھیا کو بلا کر اُس کے لتے لئے گئے۔

مہترانی نے ایسے چندھرا کر دیکھا جیسے کچھ نہیں سمجھتی غریب کہ کس کا ذکر ہو رہا ہے، اور جب اُسے صاف بتایا گیا کہ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ بہو اور رتی رام کے تعلقات نازیبا حد تک خراب ہو چکے ہیں۔ دونوں بہت ہی قابلِ اعتراض حالتوں میں پکڑے گئے ہیں تو اس پر بڑھیا بجائے اپنی بہتری چاہنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کے بہت چراغ پا ہوئی۔ اور واویلا مچانے لگی کہ رام اوتر ا ہوتا تو ان لوگوں کی خبر لیتا جو اس کی معصوم بہو پر تہمت لگاتے ہیں۔ بہو نگوڑی تو اب چپ چاپ رام اوتار کی یاد میں آنسو بہایا کرتی ہے۔ کام کاج بھی جان توڑ کرتی ہے۔ کسی کو شکایت نہیں ہوتی ٹھٹول بھی نہیں کرتی۔ لوگ اس کے ناحق دشمن ہو گئے ہیں۔ بہت سمجھایا مگر وہ ماتم کرنے لگی کے ساری دنیا اُس کی جان کی لاگو ہو گئی ہے۔ آخر بڑھیا اور اُس کی معصوم بہو نے لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ تو کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ وہ تو سب کی راز دار ہے۔ آج تک اُس نے کسی کا بھانڈا نہیں پھوڑا۔ اُسے کیا ضرورت جو کسی کے پھٹے میں پیر اڑاتی پھرے۔ کوٹھیوں کے پچھواڑے کیا نہیں ہوتا؟ مہترانی سے کسی کا میلا نہیں چھپتا۔ ان بوڑھے ہاتھوں نے بڑے لوگوں کے گناہ دفن کئے ہیں۔ یہ دو ہاتھ چاہیں تو رانیوں کے تخت اُلٹ دیں۔ پر نہیں۔ اُسے کسی سے بغض نہیں۔ اگر اس کے گلے پر چھری دبائی گئی تو شاید غلطی ہو جائے ویسے وہ کسی کے راز اپنے بوڑھے کلیجے سے باہر نہیں نکلنے دے گی۔

اس کا تیہا دیکھ کر فوراً چھری دبانے والوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ ساری مہیلائیں اُس کو بیچ کرنے لگیں۔ بہو کچھ بھی کرتی تھی اُن کے اپنے قلعے تو محفوظ تھے۔ تو پھر شکایت کیسی؟ پھر کچھ دن کے لئے بہو کے عشق کا چرچا کم ہونے لگا۔ لوگ کچھ بھولنے لگے۔ مگر تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ بہو کا بھاری بھر کم جسم بھی دال کے کالے کو زیادہ دن نہ چھپا سکا۔ اور لوگ

شد ومد سے بڑھیا کو سمجھانے لگے۔ مگر اس نئے موضوع پر بُڑھیا بالکل اڑن گھائیاں بتانے لگی۔ بالکل ایسی بن جاتی جیسے ایک دم اونچا سننے لگی ہے۔ اب وہ زیادہ تر کھاٹ پر لیٹی بہو اور رتی رام حکم چلایا کرتی۔ کبھی کھانستی چھینکتی باہر دھوپ میں آ بیٹھتی تو وہ دونوں اُس کی ایسی دیکھ دیکھ کرتے جیسے وہ کوئی پٹ رانی ہو۔

بھلی بیویوں نے اُسے بہت سمجھایا۔ رتی رام کا مُنہ کالا کر۔ اور اس سے پہلے کہ رام اوتار لوٹ کر آئے بہو کا علاج کروا ڈال۔ وہ خود اس فن میں ماہر تھی۔ دو دن میں صفائی ہو سکتی ہے۔ مگر بُڑھیا نے کچھ سمجھ کر ہی نہ دیا۔ بالکل ادھر ادھر کی شکاتیں کرنے لگی کہ اُس کے گھٹنوں میں پہلے سے زیادہ اینٹھن ہوتی ہے۔ نیز کوٹھیوں میں لوگ بہت ہی زیادہ بادی چیزیں کھانے لگے ہیں۔ کسی نہ کسی کوٹھی میں دست لگے ہی رہتے ہیں۔ اس کی ٹال مٹول پر ناصحین جل کر مرنڈ ہو گئے۔ مانا کہ بہو عورت ذات ہے، نادان ہے، بھولی ہے ___ بڑی بڑی شریف زادیوں سے خطا ہو جاتی ہے۔ لیکن اُن کی اعلیٰ خاندان کی معزز ساسیں یوں کان میں تیل ڈال کر نہیں بیٹھ جاتیں۔ پر نہ جانے یہ بڑھیاں کیوں سٹھیا گئی تھی۔ جس بلا کو وہ بڑی آسانی کوٹھی کے پچھواڑے کی تہہ میں دفن کر سکتی تھی اُسے آنکھیں میچ پلنے دے رہی تھی۔

رام اوتروا کے آنے کا انتظار تھا۔ ہر وقت دھمکیاں تو دیتی رہتی تھی۔

"آن دے رام" اوتروا کا۔ کہاں گی۔ توری ہڈی پسلی ایک کر دیہئے ___ "اور اب رام اوتروالام سے زندہ واپس آ رہا تھا۔ فضا نے سانس روک لی تھی۔ لوگ ایک مہیب ہنگامے کے منتظر تھے۔

مگر لوگوں کو سخت کوفت ہوئی جب بہو نے لونڈا جنا۔ بجائے اُسے زہر دینے کے بڑھیا کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ رام اوتار کے جانے کے دو سال بعد پوتا ہونے پر قطعی متعجب نہ تھی۔ گھر گھر پھٹے پرانے کپڑے اور بدھائی سمیٹتی پھری۔ اس کا بھلا چاہنے والوں نے اُسے حساب لگا کر بہت سمجھایا کہ یہ لونڈا رام اوتار کا ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر بڑھیا نے قطعی سمجھ کر نہ دیا۔ اُس

کا کہنا تھا' اساڑھ میں رام اوتار لام پر گیا۔ جب بڑھیا پہلی کوٹھی کے نئے انگریزی وضع کے سنڈاس میں گر پڑی تھی اب چیت لگ رہا ہے اور جیٹھ کے مہینے میں بڑھیا کو لُو لگی تھی مگر بال بال بچ گئی تھی۔ جبھی سے اس کے گھٹنوں کا درد بڑھ گیا ___ "وید جی پورے حرامی ہیں۔ دوا میں کھریا ملا کر دیتے ہیں۔" اس کے بعد وہ بالکل اصل سوال سے ہٹ کر خیلاؤں کی طرح اول فول بکنے لگتی۔ کس کے دماغ میں اتنا بوتا تھا کہ وہ اس کے بعد وہ بات کائیاں بڑھیا کو سمجھاتا جسے نہ سمجھنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

لونڈا پیدا ہوا تو اُس نے رام اوتار کو چھٹی لکھوائی۔

"رام اوتار کو بعد چما پیار کے معلوم ہو کہ یہاں سب کشل ہیں اور تمہاری کشلتا بھگوان سے نیک چاہتے ہیں اور تمہارے گھر میں پوت پیدا ہوا ہے۔ سو اس خط کو تار سمجھو اور جلدی سے آجاؤ۔"

لوگ سمجھے تھے کہ رام اوتار ضرور چراغ پا ہوگا۔ مگر سب کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی جب رام اوتار کا مسرت سے لبریز خط آیا کہ وہ لونڈے کے لئے موزے اور بنیائن لا رہا ہے۔ جنگ ختم ہوگئی اور اب بس آنے ہی والا تھا۔ بڑھیا پوتے کو گھٹنے پر لٹائے کھاٹ پر بیٹھی راج کیا کرتی بھلا اس سے زیادہ حسین بڑھاپا کیا ہوگا کہ ساری کوٹھیوں کا کام ٹرت پھرت ہو رہا ہو۔ مہاجن کا سود پابندی سے چک رہا ہو اور گھٹنے پر پوتا سو رہا ہو۔

خیر لوگوں نے سوچا، رام اوتار آئے گا، اصلیت معلوم ہوگی تب دیکھ لیا جائے گا۔ اور اب رام اوتار جنگ جیت کر آ رہا تھا۔ آخر سپاہی ہے، کیوں نہ خون کھولے گا۔ لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ شاگرد پیشے کی فضا جو بہو کی تو تا چشمی کی وجہ سے سوگئی تھی، دو چار خون ہونے اور ناکیں کٹنے کی آس میں جاگ اٹھی۔

لونڈا سال بھر کا ہوگا جب رام اوتار لوٹا۔ شاگرد پیشے میں کھلبلی مچ گئی۔ باورچی نے ہانڈی میں ڈھیر سا پانی جھونک دیا تا کہ اطمینان سے مچیٹے کا لطف اٹھائے۔ دھوبی نے کلف کا برتن اتار کو منڈیر پر رکھ دیا اور بہشتی نے ڈول کنویں کے پاس پٹک دیا۔

رام اوتار کو دیکھتے ہی بڑھیا اُس کی کمر سے لپٹ کر چنگھاڑنے لگی۔ مگر دوسرے لمحے کھیسیں کاڑھے لونڈے کو رام اوتار کی گود میں دے کر ایسے ہنسنے لگی جیسے کبھی روئی ہی نہ ہو۔

رام اوتار لونڈے کو دیکھ کر ایسے شرمانے لگا جیسے وہی اس کا باپ ہو۔ جھٹ پٹ اُس نے صندوق کھول کر سامان نکالنا شروع کیا۔ لوگ سمجھے کھکری یا چاقوں نکال رہا ہے۔ مگر جب اس نے اس میں سے لال بنیائن اور پیلے موزے نکالے تو سارے عملے کی قوت مردانہ پر ضرب کاری لگی۔

ہت تری کی، سالا سپاہی بنتا ہے، ہجڑا زمانے بھر کا۔

اور بہو! سمٹی سمٹائی جیسے نئی نویلی دلہن، کانسی کی تھالی میں پانی بھر کر رام اوتار کے بدبودار فوجی بوٹ اتارے اور چرن دھو کر پیئے۔

لوگوں نے رام اوتار کو سمجھایا۔ پھبتیاں کہیں، اُسے گاؤدی کہا۔ مگر وہ گاؤدی کی طرح کھیسیں کاڑھے ہنستا رہا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو، رتی رام کا گونا ہونے والا تھا، سو وہ چلا گیا۔

رام اوتار کی اس حرکت پر تعجب سے زیادہ لوگوں کو غصہ آیا۔ ہمارے ابا جو عام طور پر نوکروں کی باتوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے تھے وہ بھی جز بز ہو گئے۔ اپنی ساری قانون دانی کا داؤ لگا کر رام اوتار کو قائل کرنے پر تُل گئے۔

''کیوں بے، تو تین سال بعد لوٹا نا؟''

''معلوم نہیں ہجور تھوڑا کم جیادہ..... اِتا ہی رہا ہوگا۔''

''اور تیرا لونڈا سال بھر کا ہے۔''

''اِتا ہی لگے ہے سرکار، پر بڑا بدماس ہے سسر۔'' رام اوتار شرمایا۔

''ابے تو حساب لگالے۔''

''حساب؟ ..... کیا لگاؤں سرکار۔'' رام اوتار نے مرگھلی آواز میں کہا۔

''الو کے پٹھے یہ کیسے ہوا۔''

''اب جے میں جانوں سرکار..... بھگوان کی دین ہے۔''

''بھگوان کی دین تیرا سر......... یہ لونڈا تیرا نہیں ہو سکتا۔''

ابا نے اُسے چاروں اُور سے گھیر کر قائل کرنا چاہا کہ لونڈا حرامی ہے۔ تو وہ کچھ کچھ قائل سا ہو گیا۔ پھر مری ہوئی آواز میں احمقوں کی طرح بولا۔

''تو اب کا کروں سرکار.......حرامجادی کو میں نے بڑی ماردی۔'' وہ غصّے سے بپھر کر بولا۔

''ابے نرا اُلّو کا پٹھا ہے تو.........نکال باہر کیوں نہیں کرتا کمبخت کو۔''

''نہیں سرکار، کہیں ایسا ہوئے سکے ہے۔'' رام اوتار گھگھیانے لگا۔

''کیوں بے؟''

''حجور، ڈھائی تین سو پھر دوسری سگائی کے لئے کاں سے لاؤں گا اور برادری جمانے میں سو دو سو الگ اگر کھرچ ہو جائیں گے۔''

''کیوں بے، تجھے برادری کیوں کھلانی پڑے گی؟ بہو کی بدمعاشی کا تاوان تجھے کیوں بھگتنا پڑے گا؟''

''جے میں نہ جانوں سرکار یہ ہمارے میں ایسا ہووے ہے۔''

''مگر لونڈا تیرا نہیں رام اوتار......اس حرامی رتی رام کا ہے۔'' ابا نے عاجز آ کر سمجھایا۔

''تو کا ہوا سرکار......میرا بھائی ہوتا ہے رتی رام۔ کوئی گیر نہیں، اپنا ہی کھون ہے۔''

''نرا اُلّو کا پٹھا ہے۔'' ابا بھنا اٹھے۔

''سرکار'' لونڈا بڑا ہو جاوے گا، اپنا کام سمیٹے گا۔'' رام اوتار نے گڑگڑا کر سمجھایا۔ ''وہ دو ہاتھ لگائے گا، سو اپنا بڑھاپا تیر ہو جائے گا۔'' ندامت سے رام اوتار کا سر جھک گیا۔

اور نہ جانے کیوں، ایک رام دم اوتار کے ساتھ ابا کا سر بھی جھک گیا۔ جیسے ان کے ذہن پر لاکھوں کروڑوں ہاتھ چھا گئے.........یہ ہاتھ حرامی ہیں نہ حلالی۔ یہ تو بس جیتے جاگتے ہاتھ ہیں جو دنیا کے چہرے سے غلاظت دھو رہے ہیں۔ اس کے بڑھاپے کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔

یہ ننھے مُنّے مٹی میں لتھڑے ہوئے سیاہ ہاتھ دھرتی کی مانگ میں سیندور سجا رہے ہیں۔

☆☆

قرۃ العین حیدر

نظارہ درمیاں ہے

تارابائی کی آنکھیں تاروں ایسی روشن ہیں اور وہ گرد پیش کی ہر چیز کو حیرت سے تکتی ہے۔ دراصل تارابائی کے چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں ہیں۔ وقت کی سوکھی ماری لڑکی ہے جیسے بیگم الماس خورشید عالم کے ہاں کام کرتے ہوئے صرف چند ماہ ہوئے ہیں اور اپنی مالکن کے شان دار فلیٹ کے ساز و سامان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہے کہ ایسا عیش و عشرت اس سے پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ گورکھپور کے ایک گاؤں کی بال دوھوا ہے۔ جس کے سسُر اور ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے ماما نے جو بمبئی میں دودھ والا بھیا ہے۔ اسے یہاں بلا بھیجا تھا۔

الماس بیگم کے بیاہ کو بھی ابھی تین چار مہینے ہی گذرے ہیں۔ ان کی منگلورین آیا جوان کے ساتھ آئی تھی ''ملک'' چلی گئی تو ان کی بے حد منتظم خالہ بیگم عثمانی نے، جو ایک نامور سوشل ورکر ہیں۔ ایمپلائیمنٹ ایکس چینج فون کیا اور تارابائی پٹ بجنے کی طرح آنکھیں جھپکاتی کمبالا ہل کے اسکائی اسکریپر گلِ نسترن کی دسویں منزل پر آن پہنچیں۔ الماس بیگم نے ان کو ہر طرح قابلِ اطمینان پایا۔ مگر دوسرے ملازموں نے ان کو تارابائی کہہ کر پکارا تو وہ بہت بگڑیں۔ ''ہم کوئی پتر یا ہیں؟'' انہوں نے احتجاج کیا۔ مگر اب ان کو تارابائی کے بجائے تارادائی کہلانے کی عادت ہوگئی ہے۔ اور وہ چپ چاپ کام میں مصروف رہتی ہیں اور بیگم صاحب اور ان کے صاحب کو آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھا کرتی ہیں۔

الماس بیگم کا اگر بس چلے تو وہ اپنے طرح دار شوہر کو ایک لمحے کے لئے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں اور وہ جوان جہان آیا کو ملازم رکھنے کی ہرگز قائل نہیں تھیں۔ مگر تارابائی جیسی بے زبان اور سگھڑ خادمہ کو دیکھ کر انہوں نے اپنی تجربہ کار خالہ کے انتخاب پر اعتراض نہیں کیا۔

تارابائی صبح کو بیڈروم میں چائے لاتی ہے۔ بڑی عقیدت سے صاحب کے جوتوں پر پالش اور کپڑوں پر استری کرتی ہے۔ان کے شیو کا پانی لگاتی ہے۔ جھاڑ پونچھ کرتے وقت وہ بڑی حیرت سے ان خوبصورت چیزوں پر ہاتھ پھیرتی ہے جو صاحب اپنے ساتھ پیرس سے لائے ہیں۔ان کا وائلن وارڈ روب کے اوپر رکھا ہے۔ جب پہلی بار تارابائی نے بیڈروم کی صفائی کی تو وائلن پر بڑی دیر تک ہاتھ پھیرا کی۔ مگر پرسوں صبح حسب معمول جب وہ بڑی نفاست سے وائلن صاف کر رہی تھی تو نرم مزاج اور شریف صاحب (بیگم صاحب تتیا مرچ ہیں) اسی وقت کمرے میں آگئے اور اس پر برس پڑے کہ وائلن کو ہاتھ کیوں لگایا اور تارابائی کے ہاتھ سے چھین کر اسے الماری کے اوپر پٹخ دیا۔ تارابائی سہم گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور صاحب ذرا شرمندہ سے ہو کر باہر برآمدے میں چلے گئے، جہاں بیگم صاحب بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ ویسے بیگم صاحب کی صُبحیں ہیئر ڈریسر اور بیوٹی سیلون میں گزرتی ہیں۔ منی کیور، پیڈی کیور، تاج فیشل ــــ ایک سے ایک بڑھیا ساڑیاں، درجنوں رنگ برنگے سلیکس اور عطر کے ڈبے اور گہنے ان کی الماریوں میں پڑے ہیں۔ مگر تارابائی سوچتی ہے۔ ''بھگوان نے میم صاحب کو دولت بھی، اجت بھی اور ایسا سندر پتی بھی۔ بس شکل دینے میں کنجوسی کر گئے۔''

صاحب سُنا ہے میم صاحب مس صاحب لوگ سوسائٹی میں بے حد مقبول تھے۔ مگر بیاہ کے بعد سے بیگم صاحب نے ان پر بہت سی پابندیاں لگادی ہیں۔ دفتر جاتے ہیں تو دن میں کئی بار فون کرتی ہیں۔ شام کو باہر جائیں تو بیگم صاحب کو پتہ رہتا ہے کہ کہاں کہاں گئے ہیں اور ان جگہوں پر فون کرتی رہتی ہیں۔ شام کو سیر و تفریح یا ملنے ملانے کے لئے دونوں میاں بیوی باہر جاتے ہیں تب بھی بیگم صاحب بڑی کڑی نگرانی رکھتی ہیں۔ مجال ہے جو وہ کسی دوسری لڑکی پر نظر بھی ڈال لیں۔

صاحب نے یہ سارے قاعدے قانون ہنسی خوشی قبول کر لئے ہیں، کیونکہ بیگم صاحب بہت امیر ہیں اور صاحب کی نوکری بھی ان کے دولت مند سُسر ہی نے دلوائی ہے ورنہ بیاہ سے پہلے صاحب بہت غریب آدمی تھے۔ اسکالرشپ پر انجینئرنگ پڑھنے فرانس گئے تھے۔ واپس آئے تو

روزگار نہیں ملا۔ پریشان حال گھوم رہے تھے جب ہی بیگم صاحب کے گھر والوں نے اُنہیں پھانس لیا۔

بڑے لوگوں کی دنیا کے یہ عجیب وغریب قصّے تارابائی فلیٹ کے مستری (باورچی) حمال اور دوسرے نوکروں سے سنتی اور اس کی آنکھیں اچنبھے سے جھلملاتی رہتی ہیں۔

خورشید عالم بڑے اچھے وائلن نواز بھی تھے، مگر جب سے بیاہ ہوا ہے، بیوی کی محبت میں ایسے پڑے کہ وائلن کو ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ الماس بیگم کو اس ساز سے دلی نفرت ہے۔ خورشید عالم بیوی کے بے حد احسان مند ہیں کیونکہ اس شادی سے ان کی زندگی بدل گئی اور احسان مندی ایسی شے ہے کہ ایک سنگیت کار اپنی سنگیت کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔ خورشید عالم شہر کی ایک خستہ عمارت میں پڑے تھے اور بسوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اب لکھ پتی کی حیثیت سے کمبالا ہل میں فروکش ہیں۔ مرد کے لئے اس کا اقتصادی تحفظ غالباً سب سے بڑی چیز ہے۔

خورشید عالم اب وائلن کبھی نہیں بجائیں گے۔

یہ صرف ڈیڑھ سال پہلے کا ذکر ہے۔ الماس اپنے ملک التجار باپ کی عالی شان کوٹھی میں مالابار ہل پر رہتی تھیں۔ وہ سوشل ورک کر رہی تھیں اور عمر زیادہ ہو جانے کے کارن شادی کی امید سے دست بردار ہو چکی تھیں۔ جب ایک دعوت میں ان کی ملاقات خورشید عالم سے ہوئی اور ان کی جہاں دیدہ خالہ بیگم عثمانی نے ممکنات بھانپ کر اپنے ''جاسوسوں'' کے ذریعہ معلومات فراہم کیں ___ لڑکا یوپی کا ہے۔ یورپ سے لوٹ کر تلاشِ معاش میں سرگرداں ہے، مگر شادی پر تیار نہیں کیونکہ فرانس میں ایک لڑکی چھوڑ آیا ہے اور اُس کی آمد کا منتظر ہے۔ بیگم عثمانی فوراً اپنی مہم پر جُٹ گئیں۔ الماس کے والد نے اپنی ایک فرم میں خورشید عالم کو پندرہ سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ الماس کی والدہ نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا اور الماس سے ملاقاتیں خود بخود شروع ہو گئیں۔ مگر پھر بھی ''لڑکے'' نے ''لڑکی'' کے سلسلے میں کسی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ دفتر سے لوٹ کر بیشتر وقت انہیں الماس کے ہاں گزارنا پڑتا اور اس لڑکی کی سطحی گفتگو سے اکتا کر اس پُر فضا بالکنی میں جا

کھڑے ہوتے جس کا رُخ سمندر کی طرف تھا۔ پھر وہ سوچتے ایک دن ''اُس'' کا جہاز آ کر اس ساحل سے لگے گا اور ''وہ'' اس میں سے اُترے گی۔ اسے ہمراہ ہی آ جانا چاہئے تھا مگر پیرس میں کالج میں اس کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ ''اس'' کا جہاز اس ساحل سے آ لگے گا ___ وہ بالکنی کے جنگلے پر جھکے افق کو تکتے رہتے۔ الماس اندر سے نکل کر شگفتگی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی ''کیا سوچ رہے ہیں؟'' وہ ذرا جھینپ کر مسکرا دیتے۔

رات کے کھانے پر الماس کے والد کے ساتھ ملکی سیاست سے وابستہ ہائی فنانس پر تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد وہ تھکے ہارے اپنی جائے قیام پر پہنچتے اور وائلن نکال کر دھنیں بجانے لگتے جو ''اس'' کی سنگت میں پیرس میں بجایا کرتے تھے۔ وہ دونوں ہر تیسرے دن ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے اور پچھلے خط میں انہوں نے ''اسے'' اطلاع دی تھی کہ انہیں بمبئی ہی میں بڑی عمدہ ملازمت مل گئی ہے۔ اس ملازمت کے ساتھ جو خوفناک شاخسانے بھی تھے اس کا ذکر انہوں نے خط میں نہیں کیا تھا۔

ایک برس گزر گیا مگر انہوں نے الماس سے شادی کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ آخر عثمانی بیگم نے طے کیا کہ خود ہی ان سے صاف صاف بات کر لینا اب عین مناسب ہے۔ مگر تب ہی پرتاپ گڈھ سے تار آیا کہ خورشید عالم کے والد سخت بیمار ہیں اور وہ چھٹی لے کر وطن روانہ ہو گئے۔

ان کو پرتاپ گڈھ گئے چند روز ہی گزرے تھے الماس جواب ان طرف سے نا اُمید ہو چکی تھی ایک شام اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک جرمن پیانسٹ کا کونسرٹ سننے تاج محل گئی۔ کرسٹل روم میں حسبِ معمول بوڑھے پارسیوں اور پارسنوں کا مجمع تھا اور ایک حسین آنکھوں والی پارسی لڑکی کونسرٹ کا پروگرام بانٹتی پھر رہی تھی۔ ایک شناسا خاتون نے الماس کا تعارف اس لڑکی سے کرایا۔ ''مس پیرو جاجہانگیر دستور'' ___ اور خود آگے چلی گئیں۔

الماس نے حسب عادت بڑی ناقدانہ اور تیکھی نظروں سے اس اجنبی لڑکی کا جائزہ لیا۔ لڑکی بے حد حسین تھی۔

''آپ کا نام کیا بتلایا مسز رستم جی نے؟'' الماس نے ذرا مشفقانہ انداز میں سوال کیا۔

''پیروجا دستور۔'' لڑکی نے سادگی سے جواب دیا۔

''میں نے آپ کو پہلے کسی کونسرٹ وغیرہ میں نہیں دیکھا۔''

''میں سات برس بعد پچھلے ہفتے ہی پیرس سے واپس آئی ہوں۔''

''سات برس پیرس میں! تب تو آپ فرنچ خوب فرفر بول لیتی ہوں گی؟'' الماس نے ذرا ناگواری سے کہا۔

''جی ہاں۔'' پیروجا ہنسنے لگی

اب خاص مہمان جرمن پیانسٹ کے ہمراہ لاؤنج کی سمت بڑھ رہے تھے۔ پیروجا الماس سے معذرت چاہ کر ایک انگریز خاتون سے اس پیانسٹ کی موسیقی پر بے حد ٹکنیکل قسم کا تبصرہ کرنے میں منہمک ہوگئی۔ لیکن اسی لاؤنج میں پہنچ کی الماس پھر اس لڑکی سے ٹکرا گئی۔ کمرے میں چائے کی گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔

''آیئے یہاں بیٹھ جائیں؟'' پیروجا نے مسکرا کر الماس سے کہا۔ وہ دونوں دریچے سے لگی ہوئی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔

''آپ تو ویسٹرن میوزک کی ایکسپرٹ معلوم ہوتی ہیں۔ الماس نے ذرا رکھائی سے بات شروع کی کیونکہ وہ خوب صورت اور کم عمر لڑکیوں کو ہرگز برداشت نہ کرسکتی تھی۔

''جی ہاں، میں پیرس میں پیانو کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہی گئی تھی۔''

الماس کے ذہن میں کہیں دور خطرے کی گھنٹی بجی۔ اس نے باہر سمندر کی شفاف اور بیحد نیلی سطح پر نظر ڈال کر دفعتاً بڑے اخلاق اور بے تکلفی سے کہا۔ ''ہاؤ انٹرسٹنگ ___ پیانو تو ہمارے یہاں بھی موجود ہے۔ کسی روز آکر کچھ سُناؤ۔''

''ضرور۔'' پیروجا نے مسرّت سے جواب دیا۔

''سنیچر کے روز کیا پروگرام ہے تمھارا۔ میں اپنے ہاں ایک ہین پارٹی (Hen

Party) کر رہی ہوں، میری سہیلیاں تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''

''آئی وڈ لو ٹو کم ___ تھینک یو؟

''تم رہتی کہاں ہو پیروجا؟''

پیروجا نے تاردیو کی ایک گلی کا پتہ بتایا۔ الماس نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ تاردیو مفلوک الحال پارسیوں کا محلہ ہے۔

''میں اپنے چچا کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے کوئی بھائی بہن بھی نہیں۔ مجھے چچا ہی نے پالا ہے۔ وہ لاولد ہیں چچا ایک بینک میں کلرک ہیں' پیروجا سادگی سے کہتی رہی۔ پھر اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد سمندر کی پُر سکون سطح کو دیکھتے ہوئے اس نے اچانک کہا۔ ''کیسی عجیب بات ہے۔ پچھلے ہفتہ جب میرا جہاز اس ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا تو میں سوچ رہی تھی کہ اتنے عرصے کے بعد اجنبیوں کی طرح بمبئی واپس پہنچ رہی ہوں۔ یہ بڑا کٹھور شہر ہے۔ تم کو معلوم ہی ہوگا الماس! مخلص دوست یہاں بہت مشکل سے ملتے ہیں مگر میری خوش قسمتی دیکھو کہ آج ہی تم سے ملاقات ہوگئی۔

الماس نے دردمندی کے ساتھ سر ہلایا۔ سی لاؤنج میں باتوں کی دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ جاری تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے پوچھا۔ ''تم پیرس کیسے گئیں؟''

''مجھے اسکالر شپ مل گیا تھا۔ وہاں پیانو کی ڈگری لینے کے بعد چند سال تک میوزک کالج میں ریسرچ کرتی رہی۔ میں وہاں بہت خوش تھی۔ مگر میرے چچا چچی یہاں بالکل اکیلے تھے۔ وہ دونوں بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ چچی بیمار تو ضعیف العمری کی وجہ سے بالکل بہری بھی ہوگئی ہیں۔ میں ان کی خاطر واپس آگئی اور اس کے علاوہ......''

''ہلو الماس! تم یہاں بیٹھی ہو! چلو جلدی۔ مسز ملگاؤنکر تم کو بلا رہی ہیں۔ ایک خاتون نے میز کے پاس آ کر کہا۔ پیروجا کی بات ادھوری رہ گئی۔ الماس نے اس سے یہ بات کہتے ہوئے معذرت چاہی کہ وہ سنیچر کو صبح گیارہ بجے اس کے لئے کار بھیج دے گی۔ وہ میز سے اُٹھ کر مہمانوں

کے مجمع میں کھو گئی۔

سنیچر کے روز پیرو جا الماس کے گھر پہنچی جہاں مرغیوں کی پارٹی اپنے عروج پر تھی بیٹلز کے ریکارڈ بج رہے تھے۔ چند لڑکیاں جنھوں نے چند روز پہلے ایک فیشن شو میں حصہ لیا تھا، زور شور سے اس کے واقعات پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ یہ سب لڑکیاں جن کی ماتر بھاشائیں اُردو، ہندی، گجراتی اور مراٹھی تھیں، انگریزی اور صرف انگریزی بول رہی تھیں اور انہوں نے بے حد چُست پتلونیں یعنی ''اسٹرچ پینٹس'' پہن رکھی تھی ___ پیرو جا کو ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ ابھی ہندوستان واپس نہیں آئی ہے۔ اس کا اپنا فرقہ بے حد مغرب پسند تھا مگر برسوں یورپ میں رہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اجنتا کی زندہ تصویروں کی بجائے ان مغربیت زدہ ہندوستانی خواتین کو دیکھ کر اہل یورپ کو سخت افسوس اور مایوسی ہوتی ہے۔ چنانچہ پیرو جا جہانگیر دستور پیرس اور روم میں اپنی ٹھیٹھ ہندوستانی وضع قطع پر بڑی نازاں رہتی تھی۔ بمبئی کی اس نقلی امریکن لڑکیوں سے اکتا کر وہ بالکنی میں جا کھڑی ہوئی جس کے سامنے سمندر تھا اور پہلو میں برج خموشاں کا جنگل نظر آ رہا تھا۔ وہ چونک اٹھی گھنے جنگل کے اوپر کھلی فضاؤں میں چند گدھ اور کوے منڈلا رہے تھے اور چاروں طرف بڑا ڈراونا سناٹا طاری تھا۔ وہ گھبرا کر واپس پہنچی اور زندگی سے گونجتے ہوئے کمرے میں آ کر ایک صوفے پر ٹک گئی۔

کمرے کے ایک کونے میں غالباً بطور آرائش اسٹین وے کا گرینڈ پیانو رکھا ہوا تھا۔ لڑکیاں اب ریڈیو گرام پر بیلی بیلا فونٹے کا پرانا کلپسو ''جمیکا فیرویل'' بجا رہی تھیں۔ مغنّی کی دل کش آواز گٹار کی جان لیوا گونج کمرے میں پھیلنے لگی:

DOWN THE WAY WHERE THE NIGHTS ARE GAY AND THE SUN SHINE DAILY ON THE MOUNTAIN TOP I TOOK A TRIP ON A SAILING SHIP

AND WHEN I REACHED JAMAICA I MADE A STOP BUT I AM SAD TODAY I AM ON MY WAY AND WONT BE BACK FOR MANY A DAYS

I HAD TO LEANE A LITTLE GIRL IN KIGDOM TOWN

الماس چپ چاپ جا کر بالکنی میں کھڑی ہو گئی۔ ریکارڈ ختم ہوا تو اس نے اندر آ کر پیرو جا سے کہا۔ ''ہم لوگ سخت بد مذاق ہیں۔ ایک ماہر پیانسٹ یہاں بیٹھی ہے اور ہم ریکارڈ بجا رہے ہیں۔ چلو بھائی ___ اٹھو ___''

پیرو جا مسکراتی ہوئی پیانو کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''کیا سناؤں؟ میں تو صرف کلاسیکی میوزک ہی بجاتی ہوں۔''

''ہائے ___ پوپ (pop) نہیں؟'' لڑکیوں نے غل مچایا ___ ''اچھا کوئی انڈین فلم سانگ ہی بجاؤ۔''

''فلم سانگ بھی مجھے نہیں آتے ___ مگر ___ مگر ایک غزل یاد ہے ___ جو مجھے ___ جو مجھے ___'' وہ جھینپ کی ٹھٹک گئی۔

''غزل ___ ؟ اوہ آئی لو اُردو پوئٹری ___ '' ایک مسلمان لڑکی نے جس کے والدین اہلِ زبان تھے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا۔

پیرو جا نے پردوں پر انگلیاں پھیریں اور ایک انجانی، مسرور پھریری سی آئی۔

پھر اس نے آہستہ آہستہ ایک دل کش دُھن بجانا شروع کی۔

''گاؤ بھی ساتھ ساتھ'' لڑکیاں چلّائیں۔

''بھئی میں گا نہیں سکتی۔ میرا اُردو تلفظ بہت خطرناک ہے۔''

''اچھا اس کے الفاظ بتا دو ___ ہم لوگ گائیں گے۔''

''وہ کچھ اس طرح ہے___ ''پیروجا نے کہا۔

''تو سامنے ہے اپنے بتلا کہ تو کہاں ہے

کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے''

چند لڑکیوں نے ساتھ ساتھ گانا شروع کردیا۔ نظارہ درمیاں ہے ___ نظارہ درمیاں ہے۔

غزل ختم ہوئی تالیاں بجیں۔

''اب کوئی ویسٹرن چیز بجاؤ___ ''ایک لڑکی نے فرمائش کی۔

''شوپاں کی میڈنز فینسی (Maidens fancy) بجاؤں؟ یہ نغمہ میں اور میرا منگیتر ہمیشہ اکٹھے بجاتے تھے پیرس میں۔ وہ وائلن پر میری سنگت کرتے تھے___''

''تمہارے منگیتر بھی میوزیشین ہیں؟''ایک لڑکی نے پوچھا۔

''پروفیشنل نہیں۔ شوقیہ۔''پیروجا نے جواب دیا اور نغمہ بجانے میں محو ہوگئی۔

اگلے دو ہفتوں میں الماس نے پیرجا سے بڑی گہری دوستی گانٹھ لی۔ اس دوران میں پیروجا کو ایک کانونٹ کالج میں پیانو سکھانے کی نوکری مل چکی تھی جو تعطیلات کے بعد ملنے والی تھی۔ ہفتے میں تین بار ایک امریکن کی دس سالہ لڑکی کو پیانو سکھانے کا ٹیوشن بھی اسے مل گیا تھا۔ امریکن کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور وہ اپنا غم بھلانے کے لئے اپنے بچوں کے ہمراہ بغرض سیاحت ہندوستان آیا تھا اور جوہو میں سن اور سینڈ میں مقیم تھا۔ تاردیو سے جوہو کا سفر خاصا طویل تھا مگر امریکن پیروجا کو اچھی تنخواہ دینے والا تھا اور بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ پیروجا اپنی زندگی سے فی الحال بہت خوش تھی چند روز بعد ''وہ'' اپنے وطن سے واپس آنے والا تھا۔ پیروجا نے اسے بمبئی آتے ہی ملازمت اور ٹیوشن ملنے کی اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ ''اسے'' ایک ''اچانک'' سرپرائز دینا چاہتی تھی۔

ایک روز وہ الماس کے ساتھ اس کی کوٹھی کے باغ میں ٹہل رہی تھی کہ فوارے پر پہنچ کر الماس

نے اس سے دفعتاً سوال کیا۔ ''تم نے وہ غزل کہاں سے سیکھی تھی ___؟''

''اوہ ___ وہ ___؟ پیرس میں!''

''پیرس! ہاؤ انٹرسٹنگ! کس نے سکھائی؟''

''میرے منگیتر نے''

''اوہ پیروجا ___ یو ڈارک ہورس ___! چار سو بیس! مجھ کو بتایا بھی نہیں اب تک!''

''تمہاری ہی کمیونٹی کے ہیں وہ ___''

''اوہ ___ واقعی ___؟'' الماس فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

''میرے باپ دادا دستور تھے، مگر میرے چچا بہت روشن خیال ہیں۔ انہوں نے اجازت دے دی ہے۔''

''کیا نام ہے صاحب زادے کا؟''

''یہ ناموں کا بھی عجیب قصہ تھا۔ خورشید عالم اس کی نرگسی آنکھوں پر عاشق ہوئے تھے۔ جب پیرس کے ہندوستانی سفارت خانے کی ءایک تقریب میں پہلی ملاقات ہوئی اور کسی نے اس کا تعارف ''پیروجا'' کہہ کر ان سے کرایا تو انہوں نے شرارت سے کہا تھا، ''لیکن آپ کا نام نرگس ہونا چاہئے تھا!'' ___ اوہ نرگیش؟ تو میری آنٹی کا نام ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ ___'' خورشید عالم نے ایسی بے تکلفی سے کہا تھا جیسے اسے ہمیشہ سے جانتے ہوں ___ ''نرگیش، کھورشیٹ، پیروجا۔ آپ لوگوں نے حسین ایرانی ناموں کی ریڑھ ماری ہے۔ میں آپ کو فیروزہ پکاروں تو کوئی اعتراض ہے؟'' ___ ''ہرگز نہیں ___'' پیروجا نے ہنس کر جواب دیا تھا ___ اور پھر ایک بار خورشید عالم نے دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ ''یہ تمہاری بہادر آنکھیں ___ ہفت زبان آنکھیں، جگنو ایسی، شہاب ثاقب ایسی، ہیرے جواہرات ایسی، روشن دھوپ اور جھلملاتی بارش ایسی آنکھیں ___ نرگس کے پھول جو تمہاری آنکھوں میں تبدیل ہو گئے۔''

''میں نے پوچھا کیا نام ہے ان صاحب کا؟'' الماس کی تیکھی آواز پر وہ چونکی۔

''کھورشیٹ عالم۔'' اس نے جواب دیا۔ چند لحظوں کے سکوت کے بعد اس نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔ سیاہ ساڑی میں ملبوس، کمر پر ہاتھ رکھے، سیاہ اونٹ کی طرح اس کے سامنے کھڑی الماس اس سے کہہ رہی تھی۔ ''کیسا عجیب اتفاق ہے پیرو جا ڈیر! میرے منگیتر کا نام بھی خورشید عالم ہے وہ بھی وائلن بجاتے ہیں، وہ بھی پیرس سے آئے ہیں اور ان دنوں اپنے والد سے ملنے وطن گئے ہوئے ہیں۔

اگست کے آسمان پر زور سے بجلی چمکی مگر کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کڑکتی ہوئی بجلی آن کر پیرو جا دستور پر گر گئی۔ وہ کچھ دیر تک ساکت بیٹھی رہی پھر اس نے اس عالی شان عمارت پر نظر ڈالی اور اپنے تار دیو کے فلیٹ کا تصور کیا، بجلی پھر چمکی اور مالا بار ہل کے اس منظر کو روشن کر گئی۔ چشم زدن میں ساری بات پیرو جا کی سمجھ میں آ گئی، اور یہ بھی کہ اپنے خطوں میں خورشید عالم نے الماس کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا اور کچھ عرصے سے شادی کے تذکرے کو وہ اپنے خطوط میں کس وجہ سے ٹال رہے تھے۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور اس نے آہستہ سے کہا:

''اچھا بھئی الماس، منگنی مبارک ہو۔ خدا حافظ۔''

''جا رہی ہو پیرو جا؟ ٹھہرو، میری کار تم کو پہنچا آئے گی ___ ڈرائیور ___'' الماس نے سکون کے ساتھ آواز دی۔

''نہیں الماس۔ شکریہ۔'' وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پھاٹک سے نکلی۔ سڑک سے دوسری طرف اسی وقت بس آن کر رکی۔ وہ تیزی سے سڑک پار کر کے بس میں سوار ہو گئی۔

فوارے کے پاس کھڑی الماس پھاٹک کی طرف دیکھتی رہی۔ بارش کی زبردست بوچھار نے پام کے درختوں کو جھکا جھکا دیا۔ وہ جلدی سے قدم اٹھاتی، کیچڑ سے بچتی برساتی کے اندر چلی گئی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز خوشید عالم کا خط الماس کے والد کے نام آیا جس میں انہوں نے

اپنے ابا میاں کی شدید علالت کی وجہ سے رخصت کی میعاد بڑھانے کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے الماس کے والد کو یہ نہیں لکھا کہ اس خبر سے کہ ان کا اکلوتا لڑکا کسی مسلمان رئیس زادی کے بجائے کسی پارسن سے شادی کر رہا ہے ___ ان کے کٹر مذہبی ابا جان صدمے سے جاں بلب ہو چکے ہیں۔ خورشید عالم کے خط سے ظاہر تھا کہ وہ بے حد پریشان ہیں۔ جواب میں الماس نے خود انہیں لکھا:

"آپ جتنے دن چاہیں وہاں رہئے ڈیڈی آپ کو غیر تو نہیں سمجھتے۔ ہم سب آپ کی پریشانی میں شریک ہیں۔ آپ ابا میاں کو علاج کے لئے یہاں کیوں نہیں لے آتے؟"

بر سبیل تذکرہ کل میں سوئمنگ کے لئے سن اینڈ سینڈ گئی تھی۔ وہاں ایک بڑی دل چسپ پارسن مس پیرو جا دستور سے ملاقات ہوئی جو پیانو بجاتی ہے اور پیرس سے آئی ہے اور شاہد کسی امریکن کی گرل فرینڈ ہے اور شاید اسی کے ساتھ سن اینڈ سینڈ میں ٹھہری ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو اس لئے لکھا کہ غالباً آپ بھی کبھی اس سے ملے ہوں پیرس میں۔

اچھا ___ اب آپ ابا میں کو لے کر آجائیے۔ تار دیجئے تاکہ یہاں بریچ کینڈی ہسپتال میں ان کے لئے کمرہ ریزرو کر لیا جائے ___

آپ کی مخلص ___ الماس

شام پڑتے تار دیو کی خستہ حال عمارت کے سامنے ٹیکسی آکر رُکی اور خورشید عالم باہر اترے۔ جیب سے نوٹ بک نکال کر انہیں نے پتے پر نظر ڈالی اور عمارت کے لبِ سڑک برآمدے کی دھنسی ہوئی سیڑھی پر قدم رکھا سامنے ایک دروازے کی چوکھٹ پر چونے سے جو "چوک" صبح بنایا گیا تھا، وہ اب تک موجود تھا۔ اندر نیم تاریک کمرے کے سرے پر کھڑکی میں ایک بوڑھا پارسی صدرا اور میلی سفید پتلون پہنے، سر پر گول ٹوپی اوڑھے، کمر میں بندھی "کستی" کھول کر اس میں گرہیں لگاتے ہوئے زیرِ لب دعائیں پڑھ رہا تھا۔ ایک طرف میلی سی آرام کرسی پڑی تھی۔ وسطی میز پر رنگین موم جامہ بچھا تھا۔ دیوار پر زرتشت کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ کمرے میں ناریل اور

مچھلی کی تیز باس اڈ رہی تھی۔ایک بوڑھی پارسن سرخ جارجٹ کی ساڑی پہنے، سر پر رومال باندھے منڈیا ہلاتی اندر سے نکلی۔

''مس دستور ہیں۔''

''پیروجا؟'' پارسن نے دھندلی آنکھوں سے خورشید عالم کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔''حد ہوگئی ہے سینڈ اینڈ سینڈ۔''

''کیا؟ کیا مس دستور سن اینڈ سینڈ میں منتقل ہوگئی ہیں؟''

بہری پٹ ضعیفہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

''کس کے ___ کس کے ساتھ ___؟'' خورشید عالم نے ہکلا کر پوچھا۔

بوڑھی غراپ سے اندر گئی اور ایک وزیٹنگ کارڈ لاکر خورشید عالم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔کارڈ پر کسی امریکن کا نام درج تھا۔

''تم مسٹر کھورشیٹ عالم ہو؟ پیروجا نے کہا تھا کہ تم آنے والے ہو۔اگر اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آؤ تو میں فوراً اس کو جو ہو فون کردوں۔اور تم کو یہ بتاؤں کہ وہ کہاں گئی ہے!'' اس نے بلاؤز کی جیب سے پچیس پیسے نکالے۔خورشید عالم نے ہکا بکا ہو کر بوڑھی کو دیکھا۔

''آپ کو اس صورت حال پر کوئی اعتراض نہیں؟''

بہری بھنڈ ضعیفہ نے نفی میں سر ہلایا۔''ہم بہت غریب لوگ ہیں مگر اب پیروجا کو ایک امریکن ___'' دفعتہً مسز دستور کو یاد آیا کہ انہوں نے مہمان کو اندر ہی نہیں بلایا ہے اور انہوں نے پیٹھ جھکا کر کہا۔''آؤ اندر آجاؤ''

خورشید عالم مبہوت کھڑے رہے۔پھر تیزی سے پلٹ کر ٹیکسی میں جا بیٹھے۔

''بائی بائی۔''ضعیفہ نے ہاتھ ہلایا۔

بوڑھا پارسی دعا ختم کر کے باہر لپکا مگر ٹیکسی زن سے آگے جا چکی تھی۔

جس روز الماس اور خورشید عالم کی منگنی کی دعوت تھی، ایسی ٹوٹ کر بارش ہوئی کہ جل تھل

ایک ہو گئے۔ ڈنر سے ذرا پہلے بارش تھمی اور خورشید عالم اور الماس کے والد کے دوست ڈاکٹر صدیقی جو حال ہی میں تبدیل ہو کر بمبئی آئے تھے۔ بالکنی میں جا کھڑے ہوئے۔ جس سے کچھ فاصلے پر برج خموشاں کا اندھیرا جنگل بھیگی ہوئی ہوا میں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اندر ڈرائنگ روم میں قہقہے گونج رہے تھے اور گرینڈ پیانو پر رکھے ہوئے نقرئی شمع دان میں موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ بڑا سخت رومنٹک اور پُر کیف وقت تھا۔ اتنے میں گیلری میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایک ملازم نے آکر الماس سے کہا۔ ''خورشید صاحب کے لئے فون آیا ہے۔'' دلہن بنی ہوئی الماس لپک کر فون پر پہنچی۔ ایک مقامی ہسپتال سے ایک نرس پریشان آواز میں دریافت کر رہی تھی۔ ''کیا مسٹر عالم وہاں موجود ہیں؟''

''آپ بتایئے مسٹر عالم سے کیا کام ہے؟'' الماس نے درشتی سے پوچھا۔

''مس پیرو جا دستور ایک مہینے سے یہاں سخت بیمار پڑی ہیں۔ آج ان کی حالت زیادہ ـــــ زیادہ نازک ہوگئی ہے۔ انہوں نے کہلوایا ہے کہ اگر چند منٹ کے لئے مسٹر عالم یہاں آسکیں ـــــ''

''مسٹر عالم یہاں نہیں ہیں۔''

''آر یو شیور؟''

''یس آئی ایم ویری شیور'' الماس نے گرج کر جواب دیا۔ ''کیا آپ سمجھتی ہیں میں جھوٹ بول رہی ہوں؟'' اور کھٹ سے فون بند کر دیا اور ذرا سراسیمگی سے مہمانوں میں آشامل ہوئی۔

دو گھنٹے بعد پھر فون آیا۔

''ڈاکٹر صدیقی آپ کی کال ـــــ'' گیلری میں کسی نے آواز دی۔ ''آپ کو فوراً ہسپتال بلایا گیا ہے۔''

ڈاکٹر صدیقی جلدی سے ٹیلی فون پر گئے۔ پھر انہوں نے الماس کو آواز دی۔ ''بھئی معاف کرنا مجھے، بھاگنا پڑ رہا ہے۔''

الماس دروازے تک آئی۔ ''کل ضرور آیئے گا، ہم لوگ ویک اینڈ کے لئے پونا جارہے ہیں۔''

ضرور ___ ضرور ___ گڈ نائٹ ___ '' ڈاکٹر صدیقی نے کہا اور باہر نکل گئے۔

پریچ کینڈی کے ہسپتال میں صحت یاب ہو کر خورشید عالم کے ابا میاں خوش خوش پرتاب گڈھ واپس جا چکے تھے۔ جب تک کمبالا ہل والا فلیٹ تیار نہیں ہوا جو دلہن کو جہیز میں ملا تھا۔ شادی کے بعد دولھا میاں سسرال ہی میں رہے۔ اکثر صبح کو دفتر جانے سے قبل بالکنی میں جا کھڑے ہوتے۔ نیچے پہاڑ کے گھنے باغ میں سے گزرتی بل کھاتی سڑک برج خموشاں کی طرف جاتی تھی۔ وقتاً فوقتاً سفید براق کپڑوں میں ملبوس پارسی ''نسیار'' سفید رومالوں کے ذریعہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے قطاریں بنائے جنازہ اٹھائے دور پہاڑی پر چڑھتے نظر آتے۔ کوّے اور گدھ درختوں پر منتظر بیٹھے رہتے۔ برج خموشاں کے احاطے کا پھاٹک دور کیمس کارنر پر کھلتا۔ پھاٹک پر ایک جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والا خوفناک بوڑھا پھونس پارسی دربان ساکت بیٹھا رہتا تھا۔ سفید ساریوں اور سفید کپڑوں میں ملبوس سوگوار پارسی، میّت چڑھانے کے بعد سرسبز پہاڑی سے اتر کر اپنی موٹروں میں بیٹھ جاتے۔ پھاٹک کے باہر زندگی کا پُر جوش سمندر اسی طرح ٹھاٹھیں مارتا رہتا۔ مقابل کے عمارت پر ایر انڈیا کے ''مہاراجہ'' کا اشتہار نت نئے پُر لطف الفاظ میں ان زندہ انسانوں کو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ایک سے ایک دل چسپ شہروں تک سفر کرنے کی دعوت میں مصروف رہتا۔

''اس'' نے ایک بار خط میں لکھا تھا۔ ''ذہن کی ہزاروں آنکھیں ہیں۔ دل کی آنکھ صرف ایک لیکن جب محبت ختم ہو جائے تو ساری زندگی ختم ہو جاتی ہے۔''

سمندر کی موج پل کے پل میں فنا ہو گئی۔ آسمان پر سے گزرنے والے بادل فضا میں تحلیل ہو چکے۔ جب وہ مری ہوگی تو کوّوں اور گدھوں نے اس کا کس طرح سواگت کیا ہوگا۔ اس طوفانی رات کو ہسپتال کے وارڈ سے نکل کر اس کی روح جب آسمانوں پر پہنچی ہوگی اور عالمِ بالا کے گھپ

اندھیرے میں کسی دوسری روح نے اس سے ٹکرا کر پوچھا ہوگا۔ ''تم کون ہو؟'' تو اس نے جواب دیا ہوگا۔

''پتہ نہیں ___ میں ہی تو مری ہوں۔''

اب تک اس کی روح کہاں سے کہاں نکل گئی ہوگی۔ مرے ہوئے انسان زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہیں۔

تارابائی اپنی روشن آنکھوں سے صاحب کے گھر کی ہر چیز کو ارمان اور حیرت سے دیکھتی ہے۔ وہ صاحب کو حیرت سے تکا کرتی ہے۔ الماس بیگم اب امید سے ہیں بہت جلد تارابائی کا کام دوگنا بڑھ جائے گا۔

آج صبح آئی اسپیشلسٹ ڈاکٹر صدیقی آئے تھے۔ جب تارابائی ان کے لئے چائے لے کر برآمدے میں گئی تو وہ چونک پڑے اور خوشی سے پوچھا۔ ''ارے تارابائی ___ تم یہاں کام کر رہی ہو؟

''جی داگدر صاحب ___ '' تارابائی نے شرما کر جواب دیا۔

''اب صاف بجھائی دیتا ہے؟''

''جی داگدر صاحب ___ اب سب کچھ بہت صاف بجھائی دیتا ہے۔''

''گڈ ___ پھر وہ مسٹر اور مسز خورشید عالم سے مخاطب ہوئے۔ ''بھئی یہ لڑکی دس سال کی عمر میں اندھی ہوگئی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے اس کا اندھا پن عارضی ثابت ہوا۔ تمہیں یاد ہے الماس تمہاری انگیج مینٹ پارٹی کی رات مجھے ہسپتال بھاگنا پڑا تھا؟ وہاں ایک خاتون مس پیرو جا دستور کا انتقال ہوگیا تھا۔ انہوں نے مرنے سے چند روز قبل اپنی آنکھیں آئی بنک کو ڈونیٹ کرنے کی وصیت کی تھی۔ لہٰذا ان کے مرتے ہی مجھے فوراً بلایا گیا کہ ان کی آنکھوں کے ڈلے نکال لوں۔ بے حد نرگسی آنکھیں تھیں بے چاری کی۔ جانے کون تھی غریب۔ ایک بہری بھنڈیا پارسن پلنگ کے سرہانے کھڑی بُری طرح روئے جا رہی تھی۔ بڑا المناک منظر تھا ___ خیر تو چند روز بعد اس تارا

بائی کا ماموں اسے میرے پاس لایا تھا۔ اسے کسی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ نیا کورنیا لگانے سے اس بچی کی بینائی واپس آسکتی ہے۔ میں نے وہی مس دستور کی آنکھیں ذخیرے میں سے نکال کر ان کا کورنیا اس لڑکی کی آنکھوں میں گرافٹ کر دیا۔ دیکھو کیسی تارا ایسی آنکھیں ہو گئیں اس کی۔ واقعی میڈیکل سائنس آج کل معجزے دکھا رہی ہے۔"

ڈاکٹر صدیقی نے بات ختم کر کے اطمینان سے سگریٹ جلا لیا ہے۔ مگر الماس بیگم کا چہرہ فق ہو گیا ہے۔ خورشید عالم لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھ کر جیسے اندھوں کی طرح ہوا میں کچھ ٹٹولتے اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔ تارا بائی ان کی یہ کیفیت دیکھ کر بھاگی بھاگی اندر جاتی ہے، تو صاحب پلٹ کر باؤلوں کی طرح اسے تکنے لگتے ہیں۔ تارا بائی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ بوکھلائی ہوئی باورچی خانے میں جا کر برتن دھونے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اور برج خموشاں پہ اسی طرح گدھ اور کوے منڈلا رہے ہیں۔

کاگا سب کھائیو چُن چُن کھائیو ماس
دوئی نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

☆☆

احمد ندیم قاسمی

بین

بس کچھ ایسا ہی موسم تھا میری بچی، جب تم سولہ سترہ سال پہلے میری گود میں آئی تھیں۔ بکائن کے اودے اودے پھول اسی طرح مہک رہے تھے اور بیریوں پر گلہریاں، تنے سے چوٹی تک اسی طرح بھاگی پھرتی تھیں، اور ایسی ہوا چل رہی تھی جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی۔ جب تم میری گود میں آئی تھیں تو دیے کی کالی پیلی روشنی میں اُونگھتا ہوا کوٹھا چمکنے سا لگا تھا اور دایہ نے کہا تھا کہ ہائے ری، اس چھوکری کے تو انگ انگ میں جگنو ٹکے ہوئے ہیں!

اس وقت میں نے بھی درد کے خمار میں اپنے جسم کے اس ٹکڑے کو دیکھا تھا اور مجھے تو یاد نہیں پر دایہ نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ میں مسکرا کر، تمہارے چہرے کی دمک میں اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو یوں دیکھنے لگی تھی جیسے کوئی خط پڑھتا ہے۔

اگلی رات جب تمہارے بابا نے موقع پاکر تمہیں دیکھا تھا تو اداس ہو گیا تھا۔ اور میں نے کہا تھا۔ ”تم تو کہتے تھے بیٹا ہو یا بیٹی سب خدا کی دین ہے۔ پھر اب کیوں منہ لٹکا لیا ہے۔“ اور اس نے کہا تھا۔ ”تو نہیں جانتی نا بھولی عورت۔ تو ماں ہے نا۔ تو کیسے جانے کہ خدا اتنی خوبصورت لڑکیاں صرف ایسے بندوں کو دیتا ہے جن سے وہ بہت خفا ہوتا ہے۔“ اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ میں تمہارے بابا کی آنکھیں اس کی کھوپڑی میں سے نکال کر باداموں کی طرح توڑ دوں کیونکہ میری جان، وہ تو تمہیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے چڑیا سانپ کو دیکھتی ہے۔ وہ تمہاری خوبصورتی دیکھ کر ڈر گیا تھا اور پھر اس نے اپنی عمر کے سولہ سترہ سال تو اس سے ڈرتے ڈرتے گزار دیئے۔ وہ اب بھی ڈرا سہا ہوا، باہر گلی میں بچھی ہوئی چٹائیوں پر، لوگوں میں گھرا بیٹھا ہے اور آسمان کو یوں دیکھ رہا ہے

جیسے کوئی اس کی طرف آ رہا ہے۔

تم مجھ پر تو نہیں گئی تھیں میری بچی۔ میں تو گاؤں کی ایک عام سی لڑکی تھی۔ میرا ناک نقشہ بالکل سیدھا سادا تھا۔ ہاں تم اپنے بابا پر گئی تھیں جو بہت خوبصورت تھا۔ وہ تو اب بھی خوبصورت ہے پر اب اس کی خوبصورتی سولہ سترہ سال کی گرد سے اٹ گئی ہے۔ اب بھی اس کی بڑی بڑی چیر ویں۔ بادامی آنکھیں ہیں اور اب بھی اس کے چہرے، اور مونچھوں کے رنگ میں سونا ہے پر جب تم پیدا ہوئی تھیں نا تو وہ بالکل مورت تھا۔ تم آئیں تو وہ ڈر گیا تھا مگر اس ڈر نے اس کی شکل نہیں بدلی۔ بس ذرا سی بجھا دی۔ تمہارے آنے کے بعد میں نے اس کے موتیوں کے سے دانت بہت کم دیکھے۔ اس کے پنکھڑی ہونٹ ہمیشہ یوں بھنچے رہے جیسے کھلے تو کچھ ہو جائے گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ آیا اور اس نے تمہیں دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی بہت بڑے محل کی بنیادیں بیٹھ رہی ہیں۔ وہ یہاں کھڑے کھڑے ہی ایک دم اندر سے بوڑھا ہو گیا جب وہ پلٹا تو میں ڈری کہ وہ گلی تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو جائے گا۔ مگر ابھی میں نے دیوار پر سے جھانکا ہے تو وہ گلی میں بیٹھا ہے اور جمع ہوتے ہوئے لوگوں کو یوں ڈر ڈر کر، چونک چونک کر دیکھ رہا ہے جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔

تم جب تین چار سال کی ہو کر بھاگنے دوڑنے لگیں تو دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ مٹی کا بنا ہوا انسان اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے۔ ایک بار تم گر پڑیں اور تمہارے ماتھے پر چوٹ آئی تو میں تو روتے روتے نڈھال ہو گئی پر تمہارے بابا نے جھک کر کہا تھا۔ ''خدا جو بھی کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ ہماری رانو بیٹی کے ماتھے پر چوٹ کے نشان نے اس خوبصورتی کو داغ دار کر دیا ہے۔'' پر خدا کو تو کچھ اور منظور تھا۔ چوٹ کا نشان تو باقی رہ گیا مگر یہ نشان بالکل نئے نئے چاند کا سا تھا۔ لال لال سا بھی اور سنہرا سنہرا سا بھی، جو اب میری جان، پیلا پیلا سا لگ رہا ہے۔

پھر جب تم پانچ سال کی ہوئیں تو میں نے قرآن شریف پڑھانے کے لئے تمہیں بی بی جی کے پاس بٹھا دیا۔ تب پتہ چلا کہ تمہاری آواز بھی تمہاری طرح خوبصورت ہے۔ بی بی جی کے گھر کی

دیواروں کے اندر سے قرآن شریف پڑھنے والی بچیوں کی آوازیں آتی تھیں تو ان میں سے میری رانو بیٹی کی آواز صاف پہچانی جاتی تھی۔ تمہاری آواز میں چاندی کی کٹوریاں بجتی تھیں۔ ایسی کھنک کہ تم چپ بھی ہو جاتی تھیں تو جب بھی چار طرف سے جھنکار سی اٹھتی رہتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ پہلے تم آیت پڑھتی تھیں اور تمہارے بعد تمہاری ہم سبقوں کی آوازیں آتی تھیں۔ یوں جب تم اکیلی پڑھ رہی ہوتی تھیں تو گلی میں سے گزرنے والوں کے قدم رک جاتے تھے اور چڑیوں کے غول منڈیروں پر اتر آتے تھے۔ ایک بار مزار سائیں دولہے شاہ جی کے مجاور سائیں حضرت شاہ اِدھر سے گزرے تھے اور تمہاری آواز سن کر انہوں نے کہا تھا ___ یہ کون لڑکی ہے جس کی آواز میں ہم فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن رہے ہیں! ___ اور جب تمہیں معلوم ہوا تھا کہ سائیں حضرت شاہ نے تمہارے بارے میں یہ کہا ہے تو تم اتنی خوش ہوئی تھیں کہ رونے لگی تھیں۔

تب یوں ہوا کہ عورتیں پانی سے بھرے ہوئے برتن لاتیں اور تمہاری تلاوت ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتیں۔ تم قرآن پاک بند کر کے اٹھتیں اور طفیل سائیں دولھے شاہ جی کہتی ہوئی ان برتنوں پر ''چھوہ'' کرتیں اور عورتیں یہ پانی اپنے عزیزوں کو پلاتیں تو بیمار اچھے ہو جاتے۔ بُرے نیک ہو جاتے۔ بے نمازی نمازی ہو جاتے!

ان دنوں مجھے یوں لگنے لگا جیسے تم نور کی بنی ہوئی تو خیر ہمیشہ سے ہو پر اب تم بی بی جی کے ہاں سے واپس گھر میں آتیں تو تمہارے چہرے پر میری نظریں نہ جم پاتیں، جیسے سورج پر نظر نہیں جمتی۔

خدا اور رسول ﷺ کے بعد تم سائیں دولھے شاہ جی کا نام جپتی رہتی تھیں۔ اسی لئے تو تمہارا بابا ایک بار تمہیں سائیں دولھے شاہ جی کے مزار پر سلام بھی کرا لایا تھا۔

قرآن شریف تم نے پڑھا میرے جگر کی ٹکڑی کہ اب بھی جب چار طرف سناٹا ہے اور صرف اِدھر اُدھر سے سسکی آواز آ جاتی ہے، میں تمہارے آس پاس، تمہاری ہی آواز میں قرآن شریف کی تلاوت سن رہی ہوں۔ تمہارے ہونٹ تو نہیں ہل رہے، پر میں اپنے دودھ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ

یہ آواز تمہاری ہے۔ زمین پر ایسی نورانی آواز میری رانو کے سوا اور کس کی ہو سکتی ہے۔

ایک دن جب تمہارے چاچا دین محمد کی بیوی اپنے بیٹے کے لئے تمہارا رشتہ پوچھنے آئی تو تب مجھے معلوم ہوا کہ تم شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہو۔ مائیں تو بیٹی کے سر پر چنی لیتے ہی سمجھ جاتی ہیں کہ وقت آ رہا ہے پر تمہارے بارے میں تو میں سوچ ہی نہ سکی۔ تم نے سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔ میں تمہارے بابا سے اپنی اس بے خبری کی بات کی تو وہ بولا ''تو تو سدا کی بے خبری ہے پر میں ایسا بے خبر نہیں ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے لڑکی سے ڈر لگتا ہے اس سے بھی تو بات کرو۔ اس نے تو جیسے اپنا سب کچھ مولا کی راہ میں تج دیا ہے۔''

تب پہلی بار مجھے بھی تم سے خوف آیا۔ میں نے سوچا اگر میں نے تم سے رشتے کی بات کی تو کہیں تم جلال میں نہ آ جاؤ۔ مگر پھر اسی شام کو سائیں حضرت کا ایک خادم آیا اور اس نے بتایا کہ کل سے سائیں دولھے شاہ جی کا عرس ہے جو تین دن تک چلے گا اور سائیں حضرت شاہ نے خواب میں سائیں دولھے شاہ جی کو دیکھا ہے اور یہ فرماتے سنا ہے کہ میری چیلی رانو کو بلا کر تین دن تک اس سے میرے مزار پر قرآن شریف کی تلاوت کراؤ ورنہ سب کو بھسم کر دوں گا۔ تم جانتی تھیں بیٹی کہ سائیں دولھے شاہ جی بڑے جلال والے سائیں تھے۔ زندگی میں جس نے بھی ان کے خلاف کوئی بات کی، اسے بس ایک نظر بھر کر دیکھا اور راکھ کر ڈالا۔ مرنے کے بعد بھی ان کی درگاہ میں یا اس کے آس پاس کوئی برا کام یا بری بات ہو جائے تو ان کا مزار شریف سرہانے کی طرف سے کھل جاتا ہے اور اس میں سے ان کا دست مبارک بلند ہوتا ہے۔ بُرا کام یا بری بات کرنے والا جہاں بھی ہو کھنچا چلا آتا ہے۔ اپنی گردن سائیں جی کے دست مبارک میں دے دیتا ہے اور پھر وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ سائیں جی کا دست مبارک واپس مزار شریف میں چلا جاتا ہے اور مزار شریف کی دراڑیں یوں مل جاتی ہیں جیسے کبھی کھلی ہی نہیں تھیں۔

کس کی مجال تھی کہ سائیں دولھے شاہ جی کا حکم ٹالتا۔ دوسرے دن صبح کو ہم تینوں ایک اونٹ پر کجاوے میں بیٹھے تھے اور درگاہ سائیں دولھے شاہ جی کی طرف جا رہے تھے۔ میں کجاوے کے

ایک طرف تھی اور تم میری جان، دوسری طرف تھیں اور درمیان میں اونٹ کے پالان پر تمہارا بابا بیٹھا تھا۔ اونٹ جونہی اٹھا تھا اور چلنے لگا تھا تو تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی تھی، اور میری پاک اور نیک بچی، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ہمارا اونٹ جہاں سے بھی گزرتا تھا، لوگ دور دور سے کھنچے چلے آئے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور رو رہے تھے اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ رہے تھے اور کجاوے کے اوپر چڑیوں اور ابابیلوں اور کبوتروں کے جھنڈ کے جھنڈ آتے تھے اور غوطہ لگا کر جیسے میری بچی کی آواز کا شربت پی کر ناچتے تیرتے ہوئی دور نکل جاتے تھے اور میں سوچتی تھی کہ یہ ہم گنہگاروں کی کس نیکی کا بدلہ ہے کہ خدا نے ہمیں ایسی بیٹی بخشی ہے جو زمین پر قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہے تو اس کی آواز آسمان تک جاتی ہے۔ آسمان کا خیال مجھے یوں آیا تھا کہ ایک بار تمہارے بابا نے پالان پر سے جھک کر میرے کان میں ہولے سے کہا ___ اوپر دیکھو ___ یہ کیسے نورانی پرندے ہیں جو ہمارے ساتھ ساتھ اڑ رہے ہیں۔ میں نے ان علاقوں میں ایسا پرندہ کبھی نہیں دیکھا کہ ان کے پروں میں ستارے چمکتے ہوں۔ یہ تو آسمانوں سے اتر کر آنے والے فرشتے ہی ہیں ___ اور میری آنکھوں کا نور بچی، میں تمہاری جاہل ماں بھی قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ وہ فرشتے ہی تھے ___ کچھ ایسے جیسے ننھے منے بچوں کے پر لگ گئے ہوں اور وہ ہوا میں ہمکتے پھرتے ہوں ___ وہ میری پہنچی ہوئی بیٹی سے تلاوت سننے آئے تھے۔

پھر جب درگاہ سائیں دولھے شاہ جی کے پاس ہمارا اونٹ بیٹھا تھا تو جیسے تم بھول گئی تھیں کہ تمہارے ساتھ تمہارے ماں باپ بھی ہیں۔ تم مزار شریف کی طرف یوں کھنچی چلی گئی تھیں جیسے سائیں دولھے شاہ جی تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں اپنے گھر لئے جا رہے ہوں۔ مزار شریف کو بوسہ دے کر اور اس کے ایک طرف بیٹھ کر تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی تھی اور تمہاری آواز کی مٹھاس چکھنے کے لئے عرس پر آنے والے لوگ مزار شریف پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ہم دونوں نے مزار شریف کو اپنی پوروں سے چھوا اور پھر اپنی پوریں چوم لیں۔ پھر ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت

میں ان کے زانوؤں کو چھونے اور دستِ مبارک کو چومنے پہنچے تھے اور انہوں نے فرمایا تھا۔ ''اپنی بیٹی کو سائیں جی کے قدموں میں بٹھا کر تم نے اپنے اگلے پچھلے گناہ معاف کرا لئے ہیں۔ تم انشاء اللہ جنتی ہو۔ یہ سن کر خوشی سے ہماری سانسیں پھول گئی تھیں۔ پھر میں نے اندر جا کر بی بیوں کو سلام کیا تھا اور تمہیں ـــــ میری جان ـــــ سائیں دو لھے شاہ جی اور سائیں حضرت شاہ اور ان کے گھرانے کی بی بیوں کی امانت میں دے کر ہم دونوں یہ کہہ کر واپس گاؤں آ گئے تھے کہ عرس کے تین دن گزرنے کے بعد اگلے روز ہم اپنی اس نعمت کو لینے حاضر ہو جائیں گے جو خدا نے اور اس کے حبیب پاک نے ہم غریبوں گنہگاروں کو ہماری کسی سیدھی سادی نیکی سے خوش ہو کر بخشی ہے۔

اے میری بچی، اے میرے جگر کی ٹکڑی، اے میری صاف ستھری رانو بیٹی! پھر جب تین دنوں کے بعد ہم دونوں سائیں دو لھے شاہ جی کے مزار شریف پر گئے تھے تو تم وہیں بیٹھی تھیں جہاں ہم تمہیں بٹھا گئے تھے، مگر کیا یہ تمہی تھیں؟ تمہاری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں پر جمے ہوئے خون کی پپڑیاں تھیں۔ تمہارے بال الجھ رہے تھے۔ چادر تمہارے سر سے اتر گئی تھی مگر اپنے بابا کو دیکھ کر بھی تمہیں اپنا سر ڈھانپنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ تمہارا رنگ مٹی مٹی ہو رہا تھا اور ہمیں دیکھتے ہی تم چلا پڑی تھیں ـــــ ''مجھ سے دور رہو بابا۔ میرے پاس نہ آنا اماں۔ میں اب یہیں رہوں گی۔ میں اس وقت تک یہیں رہوں گی جب تک سائیں دو لھا شاہ جی کا مزار شریف نہیں کھلتا اور اس میں سے ان کا دست مبارک نہیں نکلتا۔ جب تک فیصلہ نہیں ہوتا میں یہیں رہوں گی، جب تک انصاف نہیں ہوگا میں یہیں رہوں گی اور مزار شریف کھلے گا۔ آج نہیں تو کل کھلے گا۔ ایک مہینہ بعد، ایک سال بعد، دو سال بعد سہی، پر مزار شریف ضرور کھلے گا اور دست مبارک ضرور نکلے گا۔ تب میں خود ہی اپنے بابا اور اپنی اماں کے قدموں میں چلی آؤں گی، اور ساری عمر ان کی جوتیاں سیدھی کروں گی اور ان کے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی، پر اب میں نہیں آؤں گی، اب میں نہیں آسکتی۔ میں بندھ گئی ہوں۔ میں مر گئی ہوں۔'' پھر تمہیں ایک دم بہت سا رونا آ گیا مگر تم نے ایک دم اپنے آنسو روک لئے تھے اور تم بھیگی ہوئی آواز میں تلاوت کرنے لگی تھیں۔ آس پاس

کھڑے ہوئے بیسیوں لوگ ہمارے ساتھ زار زار رونے لگے تھے اور کہنے لگے تھے۔ ''اثر ہو گیا ہے۔ دن رات مزار شریف پر رہنے سے اس پر اثر ہو گیا ہے۔''

تمہارے بابا نے فریاد کی تھی۔ ''اثر ہو گیا ہے؟ دن رات قرآن شریف کی تلاوت کرنے والی لڑکی پر کوئی اثر کیسے ہو سکتا ہے اور اگر تم کہتے ہو کہ اثر ہو گیا ہے تو سائیں حضرت شاہ کہاں ہیں؟'' وہ روتا ہوا سائیں حضرت شاہ کی طرف چل پڑا تھا اور بلکتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ مگر ہمیں خادموں نے بتایا تھا کہ سائیں جی تو عرس کے فوراً بعد اے حجرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور کئی دنوں تک وظیفہ فرماتے ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ پھر میں نے اندر بی بیوں کے پاس جانا چاہا تھا مگر بڑے دروازے پر خادماؤں نے بتایا تھا کہ رانو کی حالت سے بی بیاں پہلے ہی بہت پریشان ہیں اور انہیں اور زیادہ پریشان کرنا گناہ ہے۔

ہم پھر لپک کر مزار شریف کی طرف گئے تھے مگر اب کے میری بچی، تم نے ہمیں دیکھا تو تمہیں جلال آ گیا تھا اور تم نے اتنے زور سے چیخ کر کہا تھا کہ ''تم چلے کیوں نہیں گئے۔'' کہ مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ چیخ اس حلق سے نکلی ہے جس نے تلاوت کے سوا کبھی کچھ کیا ہی نہیں۔

ہم اجڑے بچھڑے ماں باپ، مزار شریف سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے تھے اور رو رہے تھے اور لوگ ہمیں روتا دیکھ کر رو رہے تھے کہ سائیں حضرت شاہ کا خاص خادم آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ سائیں جی کو بھی رانو کی اس حالت کا بڑا دکھ تھا اور انہوں نے فرمایا تھا کہ یہ لڑکی اچانک جن بھوت کے قبضے میں چلی گئی ہے اور سائیں حضرت شاہ ایک خاص وظیفہ فرما رہے ہیں کہ یہ جن اترے اور اس امانت کو اس کے ماں باپ تک پہنچایا جائے۔ پھر حکم ہوا تھا کہ تم جاؤ اور رانو کو درگاہ شریف کی نگرانی میں رہنے دو۔

''اب تم جاؤ۔'' ہمارے سروں پر تمہاری آواز آئی تھی اور ہم نے سر اٹھا کر دیکھا تھا کہ تمہاری آنکھیں تالابوں کی طرح بھری ہوئی تھیں۔ ''اب تم جاؤ میرے بابا۔ جاؤ میری اماں۔ اب تم جاؤ۔ مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دستِ مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہو گا۔ فیصلہ ہو جائے تو میں سیدھی

تمہارے پاس پہنچوں گی۔ سائیں دولھے شاہ جی خود مجھے تمہارے پاس چھوڑ جائیں گے۔ اب تم جاؤ۔'' ـــــ یہ کہہ کر تم مزار شریف کی طرف پلٹ گئی تھیں اور تم چلتے ہوئے یوں ڈول رہی تھیں جیسے کٹی ہوئی پتنگ ڈولتی ہے۔

میں تم پر سے صدقے جاؤں، میری بیٹی۔ ہم تمہارے ماں باپ اس کے بعد بھی بار بار تمہارے پاس پہنچے مگر اب تو تم پہچانتی بھی نہیں تھیں۔ ہم تمہیں پکارتے تھے تو تم ہماری طرف یوں خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی تھیں جیسے حیران ہو رہی ہو کہ یہ آواز کدھر سے آئی ہے۔ تمہارا رنگ خاکستری ہو گیا تھا۔ تمہارے ہونٹ اکڑ کر پھٹ گئے تھے۔ تمہارے بالوں میں گرد تھی اور تنکے تھے اور ٹوٹے ہوئے خشک پتے تھے۔ ایک بار جب ہم تمہارے لئے کپڑوں کا نیا جوڑا لے کر گئے، اور ہم نے یہ کپڑے تمہارے سامنے رکھ دیئے تو تم یہ کپڑے ہاتھ میں لے کر اٹھیں اور ایک طرف چل پڑیں۔ تمہارا ایک بھی قدم سیدھا نہیں اٹھتا تھا۔ پھر تم غائب ہو گئی تھیں اور ہم خوش ہوئے تھے کہ تم کہیں کپڑے بدلنے گئی ہو۔ مگر پھر ایک دم ایک طرف سے شور اٹھا تھا تم اسی رفتار سے واپس آ رہی تھیں اور تمہارے پیچھے درگاہ شریف کے چند خادم تھے جنہوں نے بتایا تھا کہ تم نے نئے کپڑوں کا یہ جوڑا درگاہ شریف کے لنگر کی دیگ کے نیچے بھڑکتی آگ میں جھونک دیا تھا۔

تلاوت تو تم اب بھی کر رہی تھیں مگر آواز میں چاندی کی کٹوریاں نہیں بجتی تھیں۔ پھر تم پڑھتے پڑھتے مزار شریف کے سرہانے کے طرف جھک جاتی تھیں جیسے کوئی جھری،، کوئی دراڑ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہو۔ ضرور کھلے گا۔ دست مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہو گا۔ انصاف ضرور ہو گا۔ پھر تم آنکھیں بند کر لیتی تھیں اور تلاوت میں مصروف ہو جاتی تھیں۔

ایک بار ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے اور عرض کیا تھا کہ جن بھوت کلامِ پاک پڑھنے والوں کے پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ دور سے بیٹھے ہنستے رہتے ہیں اور جھومتے رہتے ہیں اور اگر ہماری ہیرا بیٹی پر ایسے کافر جن آ گئے ہیں جو قرآن شریف کی تلاوت کا بھی لحاظ نہیں کرتے، تو یہ آپ کی درگاہ شریف ہی کے جن ہیں۔ آپ کے حکم سے اتر جائیں گے۔ خدا کے

نام پر، رسول پاکؐ کے نام پر، پیرو دستگر کے نام پر، سائیں دولہے کے نام پر ہمارے ساتھ مزار شریف پر چلئے اور یہ جن اتارئے۔ اور سائیں حضرت شاہ نے فرمایا تھا کہ ''ہم جن اتار دیتے۔ مگر تم نے ٹھیک کہا یہ کوئی بڑا کافر جن ہے اور کافر جن ہمارے قبضے میں نہیں ہیں۔ ہم یہاں دعا کر رہے ہیں۔ تم گھر جا کر دعا کرو ہمارا یہ وظیفہ جاری رہے گا۔''

جب ہم ٹوٹے پھوٹے واپس آرہے تھے تو بی بیوں کی ایک بوڑھی خادمہ نے مجھے ایک طرف لے جا کر بتایا تھا کہ عرس کے تیسرے ن سائیں حضرت شاہ مزار کی طرف آئے تھے تو تمہاری بدنصیب بیٹی نے مزار شریف پر سے گول گول لہرے پتھر اٹھا کر جھولی میں بھر لئے تھے اور چیخ چیخ کر کہا تھا کہ سائیں! مزار شریف سے دست مبارک تو جب نکلے گا، نکلے گا۔ اگر تم ایک قدم بھی آگے بڑھے تو سائیں دولہے شاہ جی کے دیئے ہوئے ان پتھروں سے تمہارا ناس کر دوں گی! خادم تمہاری بیٹی کو پکڑ کر مارنے پیٹنے کے لئے آگے بڑھے تھے تو سائیں جی نے انہیں روک کر کہا تھا کہ نادانو، یہ لڑکی نہیں بول رہی ہے اس کے اندر کا فر جن بول رہا ہے۔ جب تک یہ مزار شریف پر قابض ہے ہمیں اور ہمارے سے خاندان کے کسی مرد عورت کو ادھر نہیں آنا چاہئے ورنہ کیا خبر جن کیا کر بیٹھے۔

پھر رات درگاہ شریف کا ایک خادم آیا کہ تمہارے بیٹی تمہیں بلا رہی ہے۔ ہم راتوں رات گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو تم مزار شریف کے پائنتی لیٹی ہوئی تھیں۔ چراغ کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ تمہاری نظر ٹک گئی تھیں اور تمہارے ہونٹ ذرا ذرا سے ہل رہے تھے۔ ظاہر ہے تم اس وقت بھی تلاوت کر رہی تھیں۔ پھر جب میں نے تمہارا سر اپنی گود میں رکھا اور تمہارے بابا نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر رونا شروع کر دیا تو نہایت کمزور آواز میں تم نے کہا تھا۔ ''میری اماں میرے بابا۔ کون جانے مزار شریف کیوں نہیں کھلا انصاف تو نہیں ہوا پر چلو فیصلہ تو ہو گیا۔ چلو میں ہی گنہگار سہی۔ سائیں دولہے شاہ جی آپنے تو بڑا انتظار کرایا۔ اب قیامت کے دن جب ہم سب خدا کے سامنے پیش ہوں گے ___ جب ہم خدا کے سامنے پیش ہوں گے ___ خدا کے سامنے

____ خدا ____!'' اس کے بعد تم چپ ہوگئی تھیں اور تب سے چپ ہو۔

پھر ہم تمہیں یہاں گھر اُٹھا لائے۔ اور جب ابھی ابھی سویرے سائیں حضرت شاہ کا خاص خادم سائیں جی کی طرف سے تمہارے لئے کفن لایا تو تم پر سے اترا ہوا جن جیسے تمہارے بابا پر آ گیا۔ اس نے کفن ہاتھ میں لے لیا اور اسے چولہے میں جھونک دیا جس پر تمہیں غسل دینے کے لئے پانی گرم کیا جا رہا تھا۔

اب میری جگر کی ٹکڑی، میری نیک اور پاک، میری صاف اور ستھری رانو بیٹی! آؤ میں تمہارے ماتھے کے بجھے ہوئے چاند کو چوم لوں۔ دیکھو کہ بکائن کے اودے اودے پھول مہک رہے ہیں اور بیریوں پر گلہریاں تنے سے چوٹی تک بھاگی پھر رہی ہیں۔ اور ایسی ہوا چل رہی ہے جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی، اور چاروں طرف تمہاری تلاوت کی گونج ہے اور سائیں حضرت شاہ کے بھیجے ہوئے کفن کے جلنے کی بو اب تک سارے میں پھیل رہی ہے اور میرے اندر اتنا بہت سا درد جمع ہو گیا ہے جیسے تمہیں جنم دیتے ہوئے جمع ہوا تھا۔

☆☆

انتظار حسین

سفرِ منزلِ شب

اچھا؟...تو؟...تو وہ تو تھا؟

ہاشم حیدر، عبید، حمید چاروں کی نظریں حبیب پر پر جم گئیں۔ ان پر یہ انکشاف بجلی بن کر گرا تھا وہ تو سکتہ میں آ گئے۔ کتنی دیر تک پتھر بنے بیٹھے رہے۔

مگر....حیدر نے زبان کھولی۔ کچھ کہنے لگا تھا۔ کیا کہنے لگا تھا۔ کہتے کہتے جیسے الجھ گیا ہو۔ چپ ہو گیا۔

پھر حمید نے جھرجھری لی۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا''۔ اور اس نے حبیب کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ بولے۔ شاید کھلے کہ وہ کوئی اور تھا۔ وہ نہیں تھا مگر حبیب نے تو جیسے ہونٹ سی لیے تھے۔

حمید نے پھر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ لہجہ میں تھوڑا سا تحمل پیدا کرتے ہوئے بولا تو'' اس سے انکار نہیں کرے گا۔؟'' پھر سب کی متجسس نظریں اس پر جم گئیں۔ شاید اب وہ کچھ بولے گا ۔اپنی صفائی میں کچھ کہے گا۔ مگر ہونٹ سل گئے تھے۔ سلے رہے۔

''تو ہم یہ سمجھیں کہ، آخر عبید نے قطعی لہجہ میں زبان کھولی، 'وہ تو ہی تھا۔'

ذرا جو اس نے جنبش کی ہو۔

رفتہ رفتہ حیرت اور بے یقینی کے لمحے گزر گئے۔ رفتہ رفتہ انھیں یقین آ گیا کہ وہ شخص وہی ہے اور ان کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

چاروں نے اسے خونخوار نظروں سے دیکھا جیسے وہ ان میں سے نہیں ہے وہ جو انھیں میں سے تھا۔ اچانک ان میں سے نہیں رہا تھا۔ کتنی سرعت سے وہ ان کے لیے بیگانہ ہوا۔ کتنی عجلت

سے ساتھ وہ ان سے جدا ہوا ئے۔

پہلے ہی وہ گھٹ چھٹ کر پانچ رہ گئے تھے۔اب چار رہ گئے۔حبیب ان سے کٹ چکا تھا۔ حبیب سے وہ کٹ چکے تھے۔اب وہ ان کے لیے ایک اجنبی تھا۔پہلے بھی تو یہی ہوتا رہا تھا۔ساتھی ان سے کٹتے تھے۔اور اجنبی بنتے گئے بس اچانک کوئی ایک کٹتا اور اچانک اجنبی بن جاتا تھا۔مگر جب پانچ رہ گئے تو یوں نظر آرہا تھا کہ یہ یک جان پانچ قالب ہیں۔کتنے کتنے مشکل مرحلوں میں وہ قدم سے قدم ملا کر چلے تھے۔کتنی دیر، کتنی دور ساتھ چل کر ایک پھر ٹوٹ گیا اور وہ جو سب پختہ دکھائی دیتا تھا۔

''عجیب بات ہے'' حمید بولا'' ہم یہ سمجھتے رہے کہ سب کچھ باہر سے ہو رہا ہے۔یہ پتہ نہیں تھا کہ ہمیں میں سے ایک.....''

''ہاں ہم میں سے ایک'' عبید نے افسوس بھرے لہجے سے کہا'' اور وہ جس پر ہمیں سب سے زیادہ اعتبار تھا۔''

''مگر.....'' حیدر پھر کچھ کہنے لگا تھا۔کتنی دیر بعد اس نے زبان کھولی تھی۔مگر کہتے کہتے پھر رک گیا۔شاید پھر الجھ گیا تھا۔ایسا لگتا تھا کہ اس واقعہ کا سب سے زیادہ اثر اس نے قبول کیا ہے۔

''ہاں واقعی''۔ حمید بولا۔''سب سے زیادہ تو ہم نے اسی پر اعتبار کیا تھا۔''

عبید نے اسے غور سے دیکھا۔''یہ تم اب کہہ رہے ہو۔''

''میں نے کئی موقع پر اشارہ کیا تھا۔مگر کسی نے میری بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔''

''ہم تو اس کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ہم میں سب سے زیادہ جوشیلا تو وہی تھا۔کتنا بے جگرا تھا۔سر دھڑ کی بازی لگانے پر تیار رہتا تھا۔حمید نے یہ بات اس طرح کہی کہ ان کے تصور میں اگلے پچھلے مختلف واقعات گھوم گئے کہ کب کب اس نے جان جوکھوں میں ڈالی تھی۔کب کب ایسے کام اپنے ذمے لیے تھے جن میں ذرا سی چوک اسے موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

مگر ہاشم اس بیان سے ذرا متاثر نہ ہوا۔ بولا ایسے لوگ ایسے ہی جانباز نظر آیا کرتے ہیں۔ رک کر بولا۔ وہ جو اتنا جانباز بنتا تھا اسی سے تو مجھے اور شک ہوا تھا۔''

عبید کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔ انہوں نے ہم پر کتنا اعتبار کیا تھا۔ کتنا بھروسہ تھا انھیں ہم پر۔ اب جب یہ خبر ان تک پہنچے گی تو کیا سوچیں گے .... سمجھیں گے کہ ہم بھی ایسے ہی ہو گے۔''

''میں تو کہتا ہو کہ یہ اچھا ہی ہوا''۔ ہاشم نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

''وہ کیسے؟''

''ایسے کہ ہم جو ایک مشتبہ شخص تھا وہ دفعہ ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک دوسرے پر پورا اعتبار کر سکتے ہیں۔''

''اچھا، اس کے بعد بھی؟'' حیدر کے منہ سے بس بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا۔ وہ کب سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر زبان کھولتے کھولتے رک جاتا کہ بات آتے آتے اس کے لبوں پر الجھ جاتی۔ اب بلا ارادہ اس کے منہ سے ایک جملہ نکل گیا۔ ''تو کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''میں کہتا ہوں اب اس کی زبان کھلنے لگی تھی۔ اس میں اور ہم میں کیا فرق تھا۔ آخر ہم اکٹھے ایک ہی طرح سوچ رہے تھے۔ ایک نہج پر کام کر رہے تھے۔ اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی ہے تو ہم اپنے آپ کو اس سے بری الذمہ کیسے قرار دے سکتے ہیں''

عبید اور حمید اس دلیل سے قائل نظر آ رہے تھے۔ مگر ہاشم نے تاؤ کھایا۔ ''تو ہم پر شک کر رہا ہے۔''

''کم از کم میں اپنے آپ کو شک سے بالاتر قرار نہیں دے سکتا۔''

''بالکل ٹھیک ہے'' ہاشم غصے سے بولا۔ ''تو تو اس کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا تو اس سے بے خبر نہیں تو نہیں ہو سکتا''۔

عبید اور حمید نے چونک کر غور سے حیدر کو دیکھا۔

''چپ کیوں ہوگیا؟'' ہاشم نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

حیدر نے عبید، حمید، ہاشم تینوں کو دیکھا جو اسے شک بھری نظروں سے تک رہے تھے پھر دھیرے سے بولا۔ ''ہوسکتا ہے......شاید میں بھی۔''

''تو؟...تو بھی؟.........'' عبید اور حمید دونوں کے منہ سے ایک ہی وقت میں ایک ہی جملہ بیساختہ نکلا۔

''ہاں شاید میں بھی.........اگر اس نے گڑبڑ کی ہو میں کیسے یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میں اس میں ملوث نہیں تھا۔'' یہ کہتے کہتے اٹھ کھڑا ہوا۔ تینوں نے اسے غور سے دیکھا جب وہ چلنے لگا تو عبید اور حمید پریشان نظر آئے۔

''تو جارہا ہے؟''

''ہاں میرا خیال ہے کہ میرا چلا جانا ہی بہتر ہوگا کہ اس کے نکل جانے کہ بعد میری حیثیت بھی مشتبہ ہوگئی۔''

وہ چلا گیا۔

ایک دفعہ پھر وہ گم سم ہوگئے۔ مگر ہاشم نے جلدی ہی خاموشی کی مہر توڑدی۔ ''تم اپنی وضعداری میں چپ رہتے میں نے اسے EXPOSE کردیا۔''

عبید اور حمید دونوں تذبذب میں تھے۔ عبید چپ رہا۔ حمید سے رہا نہ گیا ''یقین نہیں آتا کہ وہ بھی......''

''اب بھی یقین نہیں آیا۔'' ہاشم تڑخ کر بولا۔ ''اس نے تو خود اعتراف کرلیا۔ اصل میں میں بہت دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بہت اکھڑا اکھڑا تھا اور تم نے یہ غور نہیں کیا کہ اس سارے عرصے میں وہ بولا ہی نہیں تھا۔ ہر بات پیتا چلا جارہا تھا۔ میں نے اسے تاڑ لیا تھا کیسا Corner کیا۔ آخر کو پھٹ پڑا۔''

''اور ہم سے ٹوٹ گیا۔'' عبید نے افسوس بھرے لہجہ میں آہستہ سے کہا۔

''اچھا ہی ہوا۔ ٹکا رہتا تو ہمارے حق میں یہ اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے اس طرح گھیرا کہ اسے اعتراف کرنا پڑ گیا۔ اس کے بعد وہ ٹک کیسے سکتا تھا۔ اچھا ہوا اب ہم محفوظ ہیں۔''

ہاشم رواں تھا۔ عبید اور رحید اس کا منہ تک رہے تھے جیسے اس کی مت ماری گئی ہو ایک کے بعد دوسرا اتنی جلدی وہ کچھ بوکھلا سے گئے تھے۔ ہاشم فاتحانہ شان سے بولے چلا جا رہا تھا ثابت کر رہا تھا کہ وہ دونوں ملے ہوئے تھے۔ 'حیدر مصلحت کے تحت ٹکا رہنا چاہتا تھا۔۔ مگر میں نے اسے expose کر دیا۔ اسے اعتراف کرنا پڑ گیا۔ پھر وہ کیسے ٹک سکتا تھا۔ چلا گیا۔ اچھا ہوا۔ اس کا ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا چلا جانا بہت ہی اچھا ہوا۔''

عبید اور رحید سُنتے جا رہے تھے۔ قائل ہونے لگتے کہ بے یقنی کی ایک لہر آتی اور وہ اکھڑ جاتے ہاشم پھر اسی جوش و خروش سے اپنے استدلال کی تعمیر کھڑی کرتا۔ پھر وہ قائل ہونے لگتے۔ مگر قائل ہوتے ہوتے پھر اکھڑ جاتے۔ وہ بس یقین اور بے یقینی کے بیچ ڈول رہے تھے۔ اسی میں رات ہوگئی۔

''اب سونا چاہیئے''

''ہاں مٹی ڈالو اس پر۔ سوتے ہیں''

اس رات وہ جلدی لیٹے کہ اس واقعہ پر سوچ سوچ کر تھک گئے تھے۔ جلدی لیٹے دیر میں سوئے کہ جانے کتنی رات تک ان کے ذہن اسی ادھیڑ بن میں رہے۔

دیر سے سوئے، جلدی جاگے۔ جاگنے کے ساتھ ایک نئی حیرانی۔ جب وہ سوئے تھے تو تین تھے اور جب صبح جاگے تو دو رہ گئے تھے۔

''وہ کہاں گیا؟'' حمید نے خالی چارپائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون؟''

''ہاشم؟''

''ہاشم''؟ عبید آدھا جاگ رہا تھا، آدھا سو رہا تھا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس چارپائی کو دیکھا جس پر ہاشم

سویا تھا۔تھوڑا چکرایا مگر وہ اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔سادگی سے بولا۔''یہیں کہیں ہوگا۔''

حمید نے چاروں طرف گھوم کر پھر دیکھا۔واپس آیا۔بولا''یہاں کہیں نہیں ہے۔''

عبید نے تامل کیا۔پھر کہا۔''شاید سیر کو نکل گیا ہو۔''

'ہوسکتا ہے،مگر جب کبھی وہ صبح سیر کے لیے اٹھتا تھا تو ہمیں بھی ضرور جھنجھوڑتا تھا۔''

''ممکن ہے یہ سوچ کر کہ پریشانی میں دیر سے سوئے ہیں جگانا مناسب نہ جانا ہو۔کوئی بات نہیں آجائے گا۔''

اس استدلال سے بظاہر وہ دونوں ہی مطمئن ہو گئے تھے۔مگر اندر سے دونوں ہی بے چین تھے کتنی بے کلی کے ساتھ انہوں نے اس کا انتظار کیا ۔وقت گزرتا گیا۔بے کلی بڑھتی گئی اور وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا صبح کا دھندلکا کبھی کا چھنٹ چکا تھا۔دن چڑھ رہا تھا اور گرم ہوتا جارہا تھا۔عبید اور حمید پر وقت جتنا گزرتا جاتا تھا بھاری ہوتا جاتا تھا۔آخر کو حمید سے نہ رہا گیا۔''اب تو بہت دیر ہوگئی۔''

''ہاں! آنا ہوتا تو اب تک آجاتا۔''

۔حمید،عبید کا منہ تکنے لگا۔خیال اس کا بھی یہی تھا۔مگر عبید سے وہ اتنے قطعی لہجے میں جواب توقع نہیں رکھتا تھا۔

''تو کیا......؟

''ہاں!شاید اب وہ نہیں آئے گا۔''

'تو کیا وہ بھی......؟''

''ہاں وہ بھی۔''

پھر دونوں ہی چپ ہوگئے۔چپ بیٹھے رہے۔تذبذب اب تمام ہو چکا تھا اور عبید کو تو بالکل صبر آ گیا تھا ۔خیر اس کے ٹوٹ جانے پر مجھے کوئی تعجب نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''وہ بول رہا تھا۔'' رکا پھر بولا۔''ایسے وقت میں جو شخص بہت بولتا نظر آئے اسے شک کی نظر سے

دیکھنا چاہیئے۔''

اور جو چپ چاپ نظر آئے:

عبید نے تامل کیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔''اسے بھی''

''عجیب بات ہے''۔حمید بڑبڑایا۔

''ہاں عجیب بات ہے۔ مگر شاید اتنی عجیب بات بھی نہیں ہے۔ ایسے میں تو ہر بات ہی سے شک پیدا ہوتا ہے۔'' اور یہ کہتے کہتے کسی کسی گھڑی عبید کے دھیان میں آتا کہ جب ایک دم سے وہ سب ایک دوسرے کے لیے مشکوک ہوگئے تھے۔ کوئی چپ ہو جانے پر مشکوک ٹھہرا، کوئی بول پڑنے پر کسی پر شک کہ خبر سن کر اتنا بو کھلا کیوں گیا۔ کسی پر شک کہ خبر سن کر اسے سانپ کیوں سونگھ گیا کسی کے باخبر ہونے سے شک پیدا ہوا کہ اسے کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ کسی کی بے خبر رہنے نے شک میں ڈالا کہ کہیں وہ جان کر تو بے خبر نہیں بن رہا شک و شبہات کی دھند کتنی پھیلتی کہ دوست دوست کو نہ پہچان پاتا۔ دماغ کے کسی گوشے میں چپکے سے ایک سوال سر اُٹھاتا۔ بات زبان پر آتی اور سرگوشی بن کر کانوں کان پھیلتی چلی جاتی۔

بیٹھے بیٹھے ایک لہر آئی اور عبید اٹھ کر کھڑا ہوا۔ حمید نے سوال بھری نظروں سے اسے دیکھا کون؟... کہاں؟

''یہاں سے نکل چلنا چاہیے ورنہ ممکن ہے کہ ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں۔''

حمید چونک پڑا۔ اس پہلو پر تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بس فوراً اٹھ کر کھڑا ہوا۔

دن بھر چلتے رہے یہ سوچے بغیر کہ کہاں جانا ہے۔ کوئی منزل نظر میں نہیں تھی۔ پھر بھی ایک عجلت میں چلے جا رہے تھے۔ جیسے واقعی کہیں پہنچنا ہے چلے جا رہے تھے یہ دھیان دیے بغیر کہ کتنا چلے ہیں۔ کتنا اور چلنا ہے کتنے سنسان، کتنے آباد رستے قدموں نے ناپے۔ قدموں میں بجلی بھری تھی کہ اسی ایک سی تیزی سے اٹھ رہے تھے اور رستے گرد ہوتے چلے جا رہے تھے۔

''بس اب یہاں ٹھر جائیں۔'' اچانک عبید نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''لیکن......''

عبید نے حمید کی بات کاٹی۔ ’’رات تو یہیں گزارتے ہیں۔ صبح کیا کرنا ہے۔ کدھر جانا ہے۔ یہ سوچیں گے۔‘‘

تو وہ وہاں پسر گئے اور اب انھیں احساس ہوا کہ وہ کتنا تھک گئے ہیں۔ ٹانگیں کتنی اکڑ گئی ہے جیسے یہاں سے اب وہ ایک قدم آگے نہیں اٹھا سکتے۔ حمید نے کمر پیچھے لگائی، ٹانگوں کو سیدھا کیا، پھیلایا۔ بولا۔ ’’آج بہت چلے ہے تھک کر چور ہو گئے ہیں۔‘‘

’’اس سے پہلے تو ہم آرام کرتے تھے۔‘‘ عبید نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

اس فقرے نے عجب اثر کیا۔ دونوں ہی ملول ہو گئے بیتے دنوں کی کلفتیں اور صعوبتیں نظروں میں پھر گئیں۔ کتنے دنوں سے وہ یہ دن کھینچ رہے تھے۔

’’مگر اس سے پہلے ہم اکٹھے چلا کرتے تھے۔‘‘ حمید نے عجب طرح سے کہا کہ بچھڑنے والے دونوں ہی کو ایک دم سے یاد آ گئے۔ وہ بھی جو پہلے بچھڑے تھے، وہ بھی جو اب آکر بچھڑے، کب کس کا ملنا اور بچھڑنا یاد آیا۔ کون کون کس کس موڑ پر بچھڑا۔ کوئی چلتے چلتے بچھڑ گیا اور رہ گیا کسی نے کسی موڑ پر پہنچ کر اپنا اصلی چہرہ دکھایا اور خندق کے اس پار نظر آیا۔ کوئی بیچ مجدھار میں چھوڑ گیا کوئی پانی میں اترنے سے پہلے ہی دوسری طرف بہہ گیا۔ یار حیران کہ کہاں گیا، کدھر نکل گیا، وسوسے، تجسس، چہ میگوئیاں، سرگوشیاں، پھر خبر ملنا کہ وہ عزیز خندق کے اس پار پہنچ گیا۔ اچھا؟ واقعی؟ اول حیران ہونا۔ پھر ایک دوسرے کو قائل کرنا کہ وہ تو تھا ہی اس قماش کا۔ بس اسی طرح کتنے ہمسفر بچھڑ چکے تھے۔ آگے کتنے قریب تھے۔۔ اب کتنے دور ہو چکے تھے۔

حمید نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ اب تو ہم دو ہی رہ گئے ہیں۔‘‘

یہاں یار عبید افسردگی سے بولا۔ پھر کہنے لگا۔ ’’ایسے حالات میں دو کا بچارہ جانا بھی بہت غنیمت نظر آتا ہے۔‘‘

’’مگر کب تک۔‘‘

عبید، حمید کو تکنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ’’ٹھیک کہتے ہو آخر کب تک۔‘‘

پھر آپس میں وہ کوئی بات نہ کر سکے۔ بس جیسے ذہن میں ایک پھانس پڑ گئی ہو۔ کب

تک، آخر کب تک، دیر تک دونوں نہ سو سکے، نہ بات کر سکے پھانس بری طرح پھنسی ہوئی تھی۔

ہاں آخر کب تک؟ دیر تک جاگا کیے اور کروٹیں بدلا کیے۔ مگر نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ مگر وہ نیند کہاں تھی، عبید کو تو بس ایک جھپکی سی آتی تھی۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ یوں ہی اس نے حمید پر نظر ڈالی جو اس کی طرف کروٹ لیے پڑا تھا اور یوں ہی اسے خیال آیا کہ اسے نیند تو آ نہیں رہی مگر کس اطمینان سے سو رہا ہے ۔ اتنے میں حمید نے کروٹ بدلی۔ اس نے پھر حمید پر نظر ڈالی شاید وہ جاگ رہا ہے یا شاید سو رہا ہو اور سوتے سوتے کروٹ بدلی ہو۔ اسنے ایک مرتبہ حمید پر نظر ڈالی۔ غور سے اسے دیکھا یہ جاننے کے لیے وہ واقعی سو گیا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اگر وہ جاگ رہا ہے تو یہ کیوں ظاہر کر رہا ہے کہ وہ سو رہا ہے کیوں؟ اور ایک شک کے ساتھ اس نے پھر حمید کا جائزہ لیا شاید سو ہی رہا ہو۔ میرا یہ محض وہم ہے کہ وہ جاگ رہا ہے۔ لیکن اگر وہ جاگ رہا ہے اور ظاہر کر رہا کہ وہ سو رہا ہے تو۔ یہ تو شک میں ڈالنے والی بات ہے اور اس کے اندر شک تقویت پکڑتا چلا گیا۔ دماغ میں ایک اندیشہ جاگا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ جب صبح میں اٹھوں تو اپنے آپ کو اکیلا پاؤں اس خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ اکیلا رہ جانے کا خیال بھی کتنا خوف بھرا ہوتا ہے۔ اچانک اسے کتنا ڈر لگنے لگا تھا۔ اگر میں اکیلا رہ گیا تو...... نہیں اس نے فوراً ہی اپنے اس خیال کی تردید کی۔ حمید ہاشم نہیں بن سکتا۔ ہاشم کے شروع ہی سے تیور اور قسم کے تھے آدمی وہ اور طرح کا تھا۔ حمید ویسا آدمی نہیں ہے۔ اس نے اپنے آپ پر نفرین کی کہ لے دے کے ایک رفیق رہ گیا ہے اس پر بھی وہ شک کرتا ہے۔ میں بہت کمینہ آدمی ہوں۔ مگر پھر اس نے اپنی کمینگی کے لیے ایک عذر بھی تراش لیا۔ رفیقوں کی دغا نے مجھے شکی مزاج بنا دیا ہے۔

عبید پر پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی کہ حمید نے پھر کروٹ بدل کر پھر اس کی طرف پیٹھ کر لی تھی۔ گمان تو اسے پہلے ہی ہوا تھا اب یقین آچلا تھا کہ حمید سویا نہیں ہے، ظاہر کر رہا ہے کہ سو گیا ہے اس کے ساتھ اسے حمید کا فقرہ یاد آیا۔ ''مگر کب تک؟'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حمید بھی اب ڈانو اڈول ہے۔ اچھا حمید بھی اس خیال کے ساتھ وہ کتنا افسردہ ہو گیا ہے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ

اپنی اس بدگمانی پر قابو پالے کہ حمید اور طرح کا آدمی ہے۔ ہاشم نہیں ہے۔ سچا اور کھرا آدمی ہے یہ تو گویا اپنے وسوسوں کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اپنے وسوسوں کے ساتھ وہ بہت لڑا۔ بہت کشتم کشت ہوئی مگر بے خوابی سے اس کے وسوسے طاقت پکڑتے چلے گئے اور وہ کمزور پڑتا چلا گیا۔

وہ اپنے وسوسوں کے نرغے میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہئے۔ مجھے آج کی رات سونا نہیں چاہئے۔ سویا مویا برابر۔ بے خبری میں تو نہیں مارا جانا چاہئے۔ ہاشم نے آخر ہماری نیند ہی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ نہیں مجھے جاگتے رہنا چاہیے۔

رات بھر جاگتے رہنے کے ساتھ وہ دور دور کی باتیں دھیان میں لایا کوئی نیا سا خیال کوئی عجب سی تجویز، جو بھی اس کے ذہن میں آتا اسے وہ دیر تک پکاتا تھا۔ اس میں تفصیلات کا رنگ بھرتا چلا جاتا۔

اسی عالم میں ایک خیال اسے اور آیا۔ حمید کو کیوں موقع دیا جائے کہ میرے ساتھ وہ کرے جو ہمارے ساتھ ہاشم نے کیا تھا۔ کیوں نہیں خود ہی..... ہاں بالکل جب سب ہی نے یہ کیا ہے تو میں بھی ......اور حبیب تو ہم سب میں سب سے بڑھ کر صاحبِ کردار سمجھا جاتا تھا۔ اگر حبیب یہ کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتا۔ اس خیال کی رو میں وہ بہنے لگا تھا کہ اچانک اس نے اپنے آپ کو تھاما۔ نہیں یار کسی کو تو قائم بھی رہنا چاہیے۔ جیسے اچانک اس کے ایک کے دو ہو گئے۔ ایک دوسرے سے شرمندہ سا تھا۔ غور کرنے لگا کہ بس یونہی مجھے خیال سا آیا تھا اور پھر اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی ایسا خیال مجھے مغلوب نہ کر لے۔

حمید نے ایک مرتبہ پھر کروٹ لی اور پھر اس کے کان کھڑے ہوئے وہ سوتا سا بن گیا دیکھوں تو سہی وہ کرتا کیا ہے۔ دیر تک ایسے پڑا رہا جیسے بے سدھ سو رہا ہے۔ مگر جب حمید نے کوئی کروٹ نہ لی تو اس کی طرف سے بے تعلق ہو کر سوچنے لگا کہ تھوڑا سو لینا چاہیئے پتہ نہیں کل دن کس طرح گزرے اور رات کہاں آئے کم از کم تھوڑی سی نیند تو لے ہی لینی چاہئے اور اس نے اپنے آپ سے پوچھا کہ آخر وہ جاگ کیوں رہا ہے حمید کی نگرانی کرنے کیلیے؟ اور اپنی نگرانی؟ اُسے خیال آیا

کہ ابھی وہ بھی تو ڈانواں ڈول ہو گیا تھا۔ ایسے عالم میں آدمی کو دوسروں سے زیادہ اپنی نگرانی کرنی چاہئیے۔

حمید واقعی جاگ رہا تھا بیچ بیچ میں اس کی آنکھ ضرور لگی۔ مگر صرف آنکھ، دماغ نہیں سو رہا تھا دماغ نہ سوئے تو آنکھ کتنی دیر تک لگی رہ سکتی ہے آنکھ لگی اور کھل گئی۔ بس پھر بار بار کوشش کرتا تھا۔ کہ دماغ سے سارے خیال نکل جائے اور وہ سو جائے کتنی مرتبہ اس کو گمان ہوا کہ اس نے اچھے برے خیالوں کو نکال باہر کیا ہے اب نیند آجائے گی۔ دیر تک ایسے پڑا رہا تھا جیسے بس نیند آنے لگی ہے، آرہی ہے، آگئی ہے۔ مگر پھر پتہ چلتا کہ جنھیں نکال باہر کیا تھا وہ سب پھر اندر گھس آئے ہیں اور دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ پھر کروٹ لیتا۔ جیسے کروٹ لینے سے دماغ سے اچھے برے خیال رخصت ہو جائیں گے اور نیند کیلیے رستہ صاف ہو جائیگا۔

کروٹیں لیتے لیتے اسے یہ احساس ہوا کہ عبید بھی سویا نہیں ہے۔ اچھا میں سمجھ رہا تھا کہ سو گیا ہے۔ جاگ رہا ہے تو ظاہر کیوں نہیں کرتا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مگر اس نے اپنے اس خیال کو زیادہ طول نہیں دیا۔ وہ اس وقت اپنے کسی بھی خیال کو طول دینا نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس وقت سونے کی فکر تھی۔ مگر خیال خود بخود طول پکڑتے چلے جا رہے تھے اور پھر اسے گمان گزرا کہ عبید نہ صرف جاگ رہا ہے بلکہ اس نے کئی بار اس کی طرف غور سے دیکھا ہے۔ پہلے گمان ہوا پھر کروٹ لیتے ہوئے اس نے عبید کی طرف اڑتی سی نظر ڈالی اور پایا کہ واقعی وہ تو اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ کیا میں بھی مشکوک ہو چکا ہوں۔ اس نے خیال کو رفع دفع کرنا چاہا۔ مگر اپنی ہر کروٹ کے ساتھ اس نے محسوس کیا کہ عبید چوکنا ہو گیا ہے۔

حمید نے ایک بار پھر کروٹ لی اور ایک بار پھر اس نے محسوس کیا کہ عبید اس کی کروٹ پر چوکنا ہو گیا ہے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''عبید''۔

عبید یہ ظاہر تو نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے مگر پھر بول ہی پڑا ''ہوں'' اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یار نیند نہیں آرہی ہے پھر تھم کر بولا۔ ''تو سو لیے ہو''

''نہیں'' حمید نے روکھا سا جواب دیا۔

''یار رات بہت لمبی ہوگئی'' عبید نے جماہی لی۔

حمید نے اس کی بات کو نظر انداز کیا اور سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔ ''عبید''

''ہاں کیا بات ہے'' عبید نے غور سے حمید کو دیکھا۔

''تمھیں میرے بارے میں کوئی شک ہے؟''

عبید جیسے چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔ سٹپٹیا۔ پھر سنبھلا۔ آہستہ آہستہ سے بولا۔ ''ہاں'' تمہارے بارے میں بھی اور اپنے بارے میں بھی۔

حمید اس کی صورت تکنے لگا۔ چپ رہا۔ پھر دبے لفظوں میں بولا۔ ''شاید میرا بھی یہی قصہ ہے۔''

☆☆

اوپیندر ناتھ اشک

اجگر

روز کی طرح وہ بڑے نارمل ڈھنگ سے اٹھتا ہے۔ آنکھ کھلنے کے بعد دیر تک چارپائی پر آلکس میں لیٹا رہتا ہے۔ گزشتہ شام کے طوفان بادوباراں کے باعث کھڑکی سے آسمان کا ٹکڑا نیلے بلور سا دکھائی دیتا ہے۔ صبح دھلی اور نکھری ہے اور نہایت پیاری سہانی مسرت آگیں ہوا بہہ رہی ہے۔ بنگلے کے باہر سڑک کے اس پار پیپل کا ایک گھنا چھتنار درخت گویا سامنے کے سارے آسمان کو حلقہ بگوش کیے ہوئے فخر سے جھول رہا ہے۔ رات کی بارش نے اس کے سارے پتے دھو دیے ہیں۔ اس کے عقب میں دودھیا سویرا اگ رہا ہے۔ ہوا کے لمس سے پیپل کا ایک ایک پتہ اس اجالے میں کانپتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ سیمل کی روئی کا تکیہ دوہرا کر کے سر کے نیچے رکھ لیتا ہے اور الساؤ بھاؤ سے ایک ٹک پیپل کے پتوں کو کانپتے دیکھتا ہے پھر وہ الگ الگ دکھائی دینے والے پتوں کو گننے کی بھی کوشش کرتا ہے لیکن اس کام کو یکسر ناممکن اور احمقانہ سمجھ کر دل ہی دل میں ہنس کر چھوڑ دیتا ہے۔

تبھی اخبار والا اس دن کا اخبار پھینک کر جاتا ہے۔ وہ اٹھ کے اخبار پڑھنے لگتا ہے اور جیسا کہ ادھر اس کا معمول ہو گیا ہے وہ اخبار کے کالموں کی تنقید میں دل ہی دل میں ریمارک کستا ہے ____ وزیر اعظم سے لے کر بلدیہ کے اعلیٰ عہدے دار تک ____ سب کی تنقیص کرتا ہے۔ چوتھے صفحے پر اداریہ میں چھپنے والے اہم خصوصی مضامین میں زبان و بیان کی غلطیاں نکالتا ہے اور اخبار کے مالکوں پر ترس کھاتا ہے جنہیں یہ معلوم نہیں کہ اس شہر میں اتنا زبردست صحافی موجود ہے، جس کی قابلیت کا وہ کمبخت کوئی فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے پھر چونکہ ہوائی قلعے بنانا بھی ادھر برسوں سے اس کی عادت میں شامل ہو گیا ہے۔ جب جیسی دھن ہو وہ توسنِ تخیل کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے کبھی عظیم شاعر بنتا ہے کبھی مشہور افسانہ نگار اور کبھی دھاکڑ ایڈیٹر۔ اس لئے اخبار پڑھنا چھوڑ کر وہ

تخلیقات کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اسے ہفتہ دار کے چیف ایڈیٹر کے فرائض سونپ دیئے گئے ہے۔ وہ ان تبدیلیوں کی فہرست مرتب کرتا ہے۔ ان نئے اور نادر کالموں کی ___ جو دوسروں کے مقابلے میں اپنے اخبار میں انٹروڈیوس کرنے والا ہے۔ مضامین کے موضوع کے اعتبار سے مناسب اور قابل مصنفوں کی فہرست وہ بناڈالتا ہے۔۔۔۔۔۔۔

اسے پتہ نہیں چلتا کہ جب اس کی پانچ سالہ بچی دبے پاؤں اٹھ کر چپ چاپ آتی ہے اور اس کی پیٹھ پر چڑھ کر جھولنے لگتی ہے وہ اس تساہل کے تحت دیر تک اس جھلاتا رہتا ہے۔ اس کی توتلی باتیں سنتا رہتا ہے۔ پھر وہ اسے کندھے پر اُٹھائے آنگن میں لاتا ہے اور وہاں اتار کر حوائج ضروری سے فارغ ہونے چلا جاتا ہے۔۔۔۔

تھرمس میں ایک ڈلی برف پڑی ہے۔ بھابی روز کی طرح اس کے لئے مٹھے کا ایک بڑا گلاس بناتی ہے ___ بالکل لوکناتھ حلوائی کی طرح اور اس کی بالائی پر کیوڑہ چھڑک دیتی ہے۔ تیار ہو کر وہ مٹھے کا گلاس پیتا ہے اور سیر ہو کر ایک لمبی ڈکار لیتا ہے پھر وہ بھابی کے بنائے ہوئے پان طشتری سے اٹھا کر ان کی گلوریاں بنا کر منھ میں رکھ لیتا ہے عین وقت پر منی کو تیار کرتی ہوئی ان کی بیوی کہتی ہے ''مجھے امید ہے کہ پرنسپل میری درخواست منظور کرلیں گی'' وہ بغیر اس کی بات پر دھیان دیئے بغیر باہر جا کر پان کی پہلی پیک تھوکتا ہے اور اس سست روی سے اپنے کمرے میں آ کر تخت پر دراز ہو جاتا ہے۔

وہیں لیٹے لیٹے پان کا رس مزے سے پیو لتے ہوئے وہ منی کو کنونٹ جاتے دیکھتا ہے اپنی بیوی کو کالج جاتے دیکھتا ہے۔ بھائی صاحب کو دفتر جاتے دیکھتا ہے پھر مٹھے کی غنودگی اس کی وجہ سے وہ آنکھ بند کر لیتا ہے ___ اچانک بیوی کی بات اس کے دماغ میں گونجتی ہے ___ اس نے درخواست دے رکھی ہے کہ اگر ہوسٹل میں اس کے قیام کا انتظام ہو جائے تو وہ اعزازی وارڈن کی ڈیوٹی دینا منظور کرے گی۔ اسے امید ہے کہ اس کی درخواست قبول کر لی جائے گی ___ ہمیشہ کی طرح جب اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا اور اس کی بیوی گھر چھوڑنے کا اشارہ کرتی ہے تو

اس کے سامنے اپنی ازدواجی زندگی کے شروع کی جھلکیاں آنے لگتی ہیں۔ ادھر کچھ زیادہ ہی آنے لگی ہیں۔ کیونکہ اس کی بیوی نے نوکری کرنے کے بعد نہ صرف کچھ زیادہ رنگ نکال لیا ہے بلکہ وہ گھر چھوڑنے پر بھی مسلسل زور دینے لگی ہے۔

عجیب بات ہے کہ اب وہ اسے کچھ قبول صورت بھی نظر آنے لگی ہے۔ ابھی ابھی وہ اس کے سامنے سے ہوکر کالج گئی ہے۔ روز کی طرح وہ لمحہ بھر اسے دیکھتا رہ گیا ہے۔ گیہواں رنگ قدرے موٹی ناک اوپر کے دانتوں کی قطار ذرا آگے کو نکلے ہوئی سامنے کے دو دانتوں کے بیچ خاص درار اور موٹے موٹے ہونٹ سب کچھ وہی سہاگ رات میں جسے دیکھ کر اسے سولہ برس پہلے بڑی کوفت ہوئی تھی اور وہ گاؤں سے بھاگ آیا تھا اور چیل کے پنجوں سے نکل کر کوے کی چونچ میں پھنسنے والے بے ضرور کیچوے کی طرح بھائی صاحب کے چنگل میں آ پھنسا تھا.........اس کی آنکھوں میں سولہ سال پہلے کی شکل گھوم جاتی ہے۔ پتلا چھریرا بدن گورا چٹا نوکیلا اور انتہائی خوبصورت چہرہ چوڑی پیشانی ستواں ناک نازک ہاتھ پاؤں۔ نہ جانے یونیورسٹی کی کتنی لڑکیاں.........لڑکیاں ہی نہیں لڑکے بھی اس پر مرتے ہیں۔ کبھی جب وہ اپنی سوز اور لوچ بھری آواز میں ہریناں کا گیت گاتا ہے (تو اس کے ایک دوست نے ایسا تسلیم کیا) سننے والوں کے دل دھڑک اٹھتے ہیں ____ اس لوک گیت کی وجہ سے بھائی صاحب سے اس کا تعارف ہوتا ہے.... اسکی آنکھوں میں وہ منظر ایسے آجاتا ہے گویا اس نے اسے کل ہی دیکھا ہو ___ آپ گاؤں سے بھاگا آیا ہے۔ یونیورسٹی میں اس نے ریسرچ میں نام لکھا لیا ہے ہوسٹل میں ایک دوست کے ساتھ ٹھہرا ہے خرچ چلانے کیلیے وہ آکاش وانی میں کچھ پروگرام کرنا چاہتا ہے اور آڈیشن دینے کے لئے ریڈیو اسٹیشن آیا ہے اسٹوڈیو نمبر تین میں مائک کے آگے بیٹھا وہ بھی گانا گا رہا ہے۔ بھائی صاحب ریڈیو ٹاک دینے آئے ہوئے ہیں وہ ٹاک چیمبر کے شیشے سے لگاتار اسے دیکھتے رہتے ہیں۔ دو ایک بار اس کی نگاہیں ان سے ملتی ہیں۔ وہ تقریر ریکارڈ کرا کے اس اسٹوڈیو میں آجاتے ہیں اس کا گانا سنتے ہیں گیت کے درد سے مسحور او مبہوت ہو کر وہ اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں۔

پھر وہ اس کا پتہ پوچھتے ہیں اور اس کے مشاغل وغیرہ کے بارے میں استفسار کرتے ہیں۔ اسے ساتھ لے جا کر اسٹیشن ڈائریکٹر سے ملواتے ہیں وہ بتاتے ہے کہ اسے ادب اور افسانہ نویسی سے رغبت ہے لیکن ابھی وہ ریسرچ کرے گا ڈگری لے کر کہیں ٹیچر ہو جائے گا اور تب زندگی کو ادب کی تخلیق میں صرف کر دے گا۔ اس وقت تو خرچ چلانے کے لئے اسے کام کی تلاش ہے......

وہ اسے اپنے اخبار کیلئے مضامین لکھنے کیلئے کہتے ہیں اور صلاح مشورہ دیتے ہیں کہ جب تک اسے کمرہ نہیں ملتا وہ ان کے بنگلے میں آجائے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ میاں بیوی دو ہی افراد ہیں وہ اسے ایک کمرہ دے دیں گے۔ کھانے پینے کی طرف سے اسے کوئی پریشانی نہیں ہوگی......

اور دوسرے دن وہ ہوسٹل سے اس کا سامان لدوا کر اسے اپنے یہاں لے آتے ہیں۔

وہ ان کی بیوی کو دیکھتا ہے۔ وہ ان سے عمر میں پندرہ بیس سال چھوٹی ہیں ___ گھنگی گوری گدرائی اور سبک ___ وہ اسے اپنی ہم عمر لگتی ہے۔ "یہ اس کھوسٹ کو کہاں سے مل گئی" وہ دل ہی دل میں سوچتا ہے۔ بظاہر وہ اسے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمشکار کرتا ہے۔ بھائی صاحب اس بچوا کے لیے چائے بنانے کو کہتے ہیں اور اس کا کمرہ دکھاتے ہیں۔ تخت پر اس کا بستر بچھوا دیتا ہے۔ الماری میں اس کی کتابیں لگوا دیتے ہیں۔ اور تختی کاغذ ایک طرف میز پر سجا دیتے ہیں۔ خود آرام کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سوٹ کیس اندر بھجوا دیتے ہیں اور پھر جیسے اس کے من کی بات بھانپ کر بتا دیتے ہیں کہ کیسے تحریک آزادی میں حصے لینے اور بار بار جیل جانے میں ان کی جوانی گزر گئی تو انہوں نے طے کیا تھا کہ وہ شادی نہیں کریں گے۔ بقیہ زندگی ملک کی خطر خدمت میں گزار دیں گے........

وہ چاہتے تو منسٹر بن جاتے لیکن انہیں آزاد رہنا پسند ہے اس لئے انہوں نے اخبار کا ایڈیٹر بن کر اپنی آزادی برقرار رکھی۔ تبھی ایک دن صوبے کے وزیر اعلی نے انہیں فون کیا۔ وہ گئے تو انہوں نے اِن کا ہاتھ انکے ہاتھ میں دے دیا ان کے والد مشہور قومی خدمتگار تھے۔ ماں ان کی پہلے وفات پا چکی تھیں۔ اچانک والد کا انتقال ہو گیا وہ وزیر اعلیٰ کے دوست تھے۔ مرتے وقت وہ اپنی لڑکی اور اس کے مستقبل کو وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں سونپ گئے تھے........ بھائی صاحب وزیر اعلیٰ کی بات کیسے

ٹالتے اس لئے انہوں نے شادی کر لی، اولاد نہیں ہے اس کا انہیں رنج ہے۔ اور یہ سب سنا کر اسے یقین دلاتے ہیں کہ وہ آرام سے رہے اس گھر کو اپنا گھر سمجھے...... تبھی چائے آجاتی ہے اور بھائی صاحب اُسے یہ سمجھاتے ہے کہ کیسے اسے اپنا پروگرام بنانا چاہیے۔ ریسرچ کرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اسے نظمیں بلکہ کہانیاں اور ناٹک بھی لکھتے رہنا چاہیے۔ وہ اسے شہر کے ادبی حلقوں میں لے جائیں گے۔ سبھی ادیبوں سے متعارف کرادیں گے۔ اس کی کتابوں کی اشاعت کا انتظام کردیں گے۔ اگر وہ وقت پر شادی کر لیتے تو ان کا لڑکا اس کی عمر کا ہوتا........ اور وہ لمبی سانس بھرتے ہیں......وہ اپنی بیوی سے کہتے ہیں کہ وہ اسے اپنا بچہ ہی سمجھیں اور اس کا خیال رکھیں.......وہ چلے جاتے ہیں اور بھابی بیٹھی اس کے گھر کا حال چال پوچھتی ہیں۔ نہ جانے بھابھی کی موجودگی میں اسے کیسے قرب کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی شادی کا سارا المیہ ان کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

........وہ کروٹ بدلتا ہے۔ ایک کے بعد ایک کئی منظر اس کی بند خواب آلود آنکھوں میں گھوم جاتے ہیں...... بھابھی اسے سامنے بیٹھا کر کھلا رہی ہے........ بھابھی اس کا بستر بچھا رہی ہیں۔ بھابھی اس کے کپڑے دھو رہی ہیں...... بھابھی اس کا کمرہ خود صاف کر رہی ہیں.......وہ پانی مانگتا ہے تو بھابھی دوری دوڑی جا کر پانی کا گلاس لاتی ہیں.......رات کو بڑی پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے جگا کر اسے دودھ کا گلاس پلاتی ہیں۔........وہ ریسرچ کرنا چھوڑ دیتا ہے ___ ''دادو دیال اور ان کی شاعری'' ___ یہ موضوع اُسے نہایت بور لگتا ہے۔ بھابھی کو سناتا ہے وہ انہیں اور بھی بور لگتا ہے۔ وہ نظمیں لکھنے لگتا ہے۔ بھابھی کو سناتا ہے۔ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ بھائی صاحب اسے شہر کے تمام ادیبوں سے متعارف کرا دیتے ہیں۔ وہ ان کی نشستوں میں حصہ لیتا ہے۔ اب بھائی صاحب کے اخبار میں وہ با قاعدہ شہر کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں کالم لکھتا ہے وہ اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں ایک بار فرطِ جوش ومحبت سے اسے اپنی بانہوں میں بھر کر اس کی پیشانی چوم لیتے ہیں.........

بھابھی اس کے بستر پر بیٹھی ہیں۔اس سے فرمائش کرتی ہیں کہ وہ کوئی گیت سنائے۔''یہ کہتے ہیں کہ بچوا اچھا گاتے ہیں۔ہم کو ایک گانا بھی کبھی نہیں سنایا۔'' وہ الا ہنا دیتی ہیں۔وہ نخرا کرتا ہے۔ بھابھی اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر اصرار کرتی ہیں۔آخر وہ شرط رکھتا ہے کہ بھابھی سنائیں گی تو وہ بھی سنائے گا۔بھابھی کہتی ہیں ــــــ ''پہلے ہم نے کہا اس کے لئے پہلے تم سناؤ پھر ہم سنادیں گے۔'' آخر وہ مان جاتا ہے بھابھی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا ہے اور گانا سناتا ہے ۔بھابھی مبہوت اور مسحور ہو کر اس کی پیشانی چوم لیتی ہیں ــــ ''تمہارے گلے میں تو امرت ہے بھیے۔'' وہ کہتی ہیں.....ان کے ہونٹوں میں کچھ ایسی گرمی ہے کہ اس کا رنگ لال ہو جاتا ہے اور اعصاب تن جاتے ہیں وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور بھابھی سے گانا سنانے کی فرمائش کرتا ہے ۔ بھابھی ایک بڑا چلبلا گانا سناتی ہیں۔

کیسی چتر بھوجائی رے

من لاگا دیور سے

جاگ نہ جائے تور بھائی رے

من لاگا دیور سے

اور پورا گانا سنا کر وہ زور سے قہقہہ لگاتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہوتی ہیں انھیں بیٹھنے کو اور ایک گانا سنانے کو کہتا ہے لیکن وہ نہیں بیٹھتیں۔ہنستی ہوئی بھاگ جاتی ہیں۔

اور تبھی جب بڑے آرام سے دن گزر رہا ہوتا ہے اور اور جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں اور کائنات کی چوٹی پر بیٹھا ہوتا ہے کہ وہ حادثہ وقوع پذیر ہوتا ہے جو ہمیشہ اُسے کیچوا سا بنا دیتا ہے۔ ہمیشہ اس کی غنودگی دور کرتا ہے اور جیسے دماغ سے فراموش کر دینے کی تمام کوششوں کے باوجود وہ ان چودہ پندرہ برسوں میں فراموش نہیں کر سکا......وہ بھابھی کے ساتھ لیٹا ہے اور آسودہ ہو کر وہ اسے اپنی بانہوں میں لپٹائے اس سے چمٹی ہوئی ہیں۔دونوں کے کپڑے بے ترتیب ہیں کہ اچانک بھائی صاحب اوپر سے آجاتے ہیں بھابھی فوراً اُٹھتی ہیں ساڑی سے سر اور بدن ڈھکتی

ہوئی وہ کہتی ہیں ''بھیا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''اور چلی جاتی ہیں .....لمحہ بھر وہ حیران اور ساکت سا لیٹا رہتا ہے۔کوئی حرکت نہیں کرتا لیکن بھابھی کی بات سن کر وہ دیوار کی طرف منہ کر لیتا ہے جیسے وہ واقعی بیمار ہوں۔ بھائی صاحب کچھ لمحہ اسے بے ترتیب دھوتی میں جھلکتے گورے بدن کو دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر وہ اس کی چارپائی پر نیم دراز ہو جاتے ہیں۔اس کے بالوں کو اس کے جسم کو سہلاتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ اب کیسی طبیعت ہے بچوا کی۔ وہ اس کا بدن سہلاتے ہوئے اور اس ساتھ لیٹے ہوئے نہ جانے کیا بولے جاتے ہیں اور اپنا جسم اس کے جسم میں گھسائے جاتے ہیں اس کے جی میں آتا ہے کہ پلٹ کر انہیں چارپائی سے نیچے گرا دے۔لیکن احساس جرم سے ایک دم سن ہو کر لیٹا رہتا ہے۔کہیں چپل اٹھا کر اسے پیٹنا شروع کر دیں تو.......اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرے یا سوچے وہ اس کی گدی کانوں کی لو کے نیچے چوم لیتے ہیں اس اپنی بانہوں اور رانوں میں کس لیتے ہیں لیکن وہ دیر نہیں لگاتے دو ایک بار اسے کس کر وہ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں ......اسے عجیب سی چپچپاہٹ کا احساس ہوتا ہیں اور وہ اسے تھپتھپاتے ہوئے الگ ہو جاتے ہیں .....مجبوری میں پلٹ کر وہ رونکھا ہو جاتا ہے......

وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے.......گزشتہ چودہ پندرہ برسوں میں اگر چہ اس واقعہ پر کافی گرد پڑ گئی ہے لیکن جب بھی وہ اسے یاد آتا ہے لمحہ بھر کے لئے وہ اسے لجلجا کیچوا سا بنا جاتا ہے اور بھائی صاحب کے خلاف اس کے دل میں غیض وغضب کا آتش فشاں سا پھٹ پڑتا ہے.....اگر وہ بھابھی کے ساتھ اس حالت میں نہ پکڑ لیا گیا ہوتا تو وہ کیا کبھی جرأت کر سکتے تھے۔اگر چہ یونیورسٹی میں لڑکوں کا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ تختہ مشق رہا ہے لیکن اس نے کسی غنڈے کو اس حد تک بڑھنے نہیں دیا تھا......اس کے سامنے پھر وہی منظر گھوم جاتا ہے اپنے کپڑے درست کر کے بھائی صاحب ایک دم اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔اس کے کپڑے ٹھیک کر دیتے ہیں اسے پیار کرتے ہیں اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس سے معافی مانگتے ہیں اور جیل میں اپنے لمبے برسوں کا حوالہ دیتے ہوئے بڑبڑاتے جاتے ہیں کہ بڑے بڑے لوگوں میں یہ کمزوری ہوتی ہے ___ سیزر اور اینٹنی

جیسے بڑے سپہ سالاروں میں تھی......عام انسانی کمزوری.....وہ گاندھی جی کے پیرو ہیں۔وہ اپنی اس کمزوری پر فتح پانے کی کوشش کریں گے اور یہ جو بھی خطا ان سے سرزد ہوگئی ہے اس کی تلافی کریں گے اور اس وقت گھر نہیں جائیں گے کھانا نہیں کھائیں گے جب تک وہ انہیں معاف نہیں کردے گا......

اور وہ چلے جاتے ہیں

بھائی صاحب کے جاتے ہی بھابھی آجاتی ہیں۔اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا۔انہوں نے کیا کہا وہ ایسے کیوں چلے گئے ہیں۔وہ اس طرح کیوں لیٹا ہے لیکن وہ ہونٹ نہیں کھولتا۔نہایت افسردہ دل گیر اور مجروح چپ چاپ لیٹا رہتا ہے۔

تبھی بھابھی اس کے پاس بیٹھ جاتی ہیں۔اسے تسلی دیتی ہیں کہ ڈر نہیں وہ کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اٹھائیں گے۔وہ ہمت نہیں کرسکتے۔وہ انہیں چھوڑ کر چلی جائیں گی......وہ انہیں کبھی بھی چھوڑ چلی جاتیں لیکن مصیبت کے وقت میں انہوں نے ہاتھ پکڑا تھا۔وہ انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتیں لیکن اس سلسلے میں انہوں نہ کچھ کیا ____ کچھ بھی ____ تو وہ گھر چھوڑ دیں گی۔پھر زندگی بھر انہیں بھیک ہی کیوں نہ مانگنی پڑے......وہ کچھ نہیں کہتا نہ ہاں کرتا ہے نہ ناں۔بس خاموش رہتا ہے ......تب وہ اچانک پوچھتی ہیں کچھ چھیڑا ویڑا نہیں تو انہوں نے.....انہیں کچھ عادت ہے.....کبھی کبھی وہ بہک جاتے ہیں.....وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہیں اور اسے تسلی دیتی ہیں کہ وہ گھبرائے نہیں.....وہ اسے کچھ نہیں کہیں گے کچھ نہیں کریں گے وہ کچھ کرنے لائق ہیں ہی نہیں۔ وہ پھر بھی چپ رہتا ہے۔صرف اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔بھابھی اسے اپنی بانہوں میں لیکر اسے سینے سے لگا لیتی ہیں۔وہ اسے تسلی دیتی ہوئی اسے بار بار چومتی ہیں۔ان کا ہر بوسہ پہلے سے گرم ہونے لگتا ہے۔

"نہیں کچھ نہیں" وہ سر کو ذرا جھٹکا سا دیکر رکھائی سے اتنا ہی کہتا ہے اور اچانک بھابھی کی بانہوں سے نکل کر اچھل کر اٹھتا ہے اور تولیہ لے کر نہانے چلا جاتا ہے۔

نل اونچا ہے۔ وہ اسے پورا کھول کر اس کے نیچے بیٹھ جاتا ہے ___ کیا وہ اسے اسی لئے اپنے گھر لائے تھے...... ایک بے پناہ غصے سے پانی کی دھارے کے نیچے اس کا تن من جل اٹھتا ہے۔ وہ نل بند کر دیتا ہے۔ زور زور سے جسم پر صابن ملتا ہے..... اس کے کانوں میں بھابھی کے الفاظ گونج رہے ہیں۔ ''وہ کچھ نہیں کریں گے۔'' کچھ کرنے لائق وہ ہیں ہی نہیں، وہ زور زور سے ملتا ہے۔ صابن کا جھاگ اس کے گورے جسم کو ڈھک لیتا ہے....... وہ تبھی لجلجا کیچوا بننا شروع کر دیتا ہے اور آہستہ آہستہ برامیل کے جنگلوں کا بوا کنسٹرکٹر ____ سفاک اژدہا بن جاتا ہے جو اپنی گنجلکوں میں شیر تک کو پیس ڈالتا ہے ___ وہ ایک جست میں اپنے شکار کو دھر دبوچتا ہے۔ پلک جھپکتے ہی اس کے جسم کو اپنی کنڈلیوں میں کس لیتا ہے پھر وہ ان گھیروں کو کستا جاتا ہے یہاں تک کے شکار کی ہڈی پسلی تک برابرا ہو جاتی ہیں تب وہ اسے نگل جاتا ہے اس نے شیر ببر کو اپنے جنگل میں لپیٹے ہوئے بوا کنسٹرکٹر کی تصویر دیکھی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس اژدہا کے روپ میں دیکھتا ہے اور اپنی گنجلکوں میں بھائی صاحب کو ان کی ساری زندگی کو جکڑ لیتا ہے۔ اُن کی بیوی کو ان کی دولت، عزت کو ___ اور مزے سے انہیں انچ انچ نگلتا ہے..... وہ پانی کی دھار چھوڑ دیتا ہے اس کے جسم کی کثافت دھل جاتی ہے۔ من کی تکلیف دور ہو جاتی ہے اسے بھائی صاحب کی مجبوری پر ترس تک آجاتا ہے۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اب کبھی اسے کچھ نہیں کہہ پائیں گے کبھی ویسی حالت میں دیکھ لیں تب بھی نہیں...... وہ خوفزدہ ہو گیا تھا..... لیکن اب خوف کی کوئی بات نہیں ..... وہ جکڑ لے گا..... اُنہیں اپنی گرفت میں جکڑ لے گا.... انہیں پیس ڈالے گا..... وہ دیر تک نل کے نیچے بیٹھا نہاتا رہتا ہے۔

بھائی صاحب دو دن گھر نہیں آئے۔ تن من کی شدھی کے لئے ان شن کئے رہتے ہیں تیسرے دن وہ بھابھی کو ساتھ لے کر ان کے دفتر جاتا ہے انہیں گھر لے آتا ہے اور نہایت فراخدلی سے انہیں معاف کر دیتا ہے۔

وہ پھر لیٹ جاتا ہے۔ اس کے دماغ میں اپنی بیوی کی بات کوند جاتی ہے۔'' مجھے وہیں

ہوسٹل میں کوارٹر مل گیا تو میں وہیں رہوں گی۔'' وہ ایک دن کہتی ہے کہ ___ ادھر جب اسے ملازمت ملی ہے اس کے لباس چال ڈھال بول چال میں تبدیلی آگئی ہے... آٹھ برسوں تک وہ بیوی کی خبر تک نہیں لیتا گاؤں جاتا بھی ہے تو اس کے قریب تک نہیں پھٹکتا۔ بھائی صاحب پھر کبھی اسے پریشان نہیں کرتے۔ بہت پیار اس پر آتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر لیتے ہیں۔ اسے ذرا سی تکلیف ذرا سی فکر نہیں ہونے دیتے۔ وہ بھائی صاحب سے روپیہ لے کر گھر تو بھیج دیتا ہے لیکن بیوی کو نہیں بلاتا......اور بھابھی ....وہ اس کی بھابھی ہیں ماں بھی محبوبہ بھی اور بیوی بھی۔ وہ اسے کبھی کبھی کونچتی ہیں اس کی بیوی کی ہمدردی میں بات کرتی ہیں لیکن وہ ٹال جاتا ہے۔ وہ بھی زیادہ زور نہیں دیتیں۔ ہاں اس بات کا خیال رکھتی ہیں کہ ہر مہینہ کچھ روپیہ اور دن تیوہار کو کپڑے لتے وہ اسے بھیجتا رہے..... تبھی پڑوس میں ہر پریت آجاتی ہے۔ وہ سیاست میں ایم۔اے۔ ہے اور کانگریس کی تحریک پر ریسرچ کر رہی ہے اور بھائی صاحب سے مدد لینے آتی ہے.....کبھی جب بھائی صاحب موجود نہیں ہوتے وہ اس کے کمرے میں آبیٹھتی ہے۔ اُس کا کالم سنتی ہے۔ سیاست پر اس سے بحث کرتی ہے۔ اس کی کہانیاں سنتی ہے۔ اسے طعنے دیتی ہے کہ وہ سست رو ہو گیا ہے۔ سال میں تین چار کہانیاں لکھ کر کوئی بڑا ادیب نہیں بن سکتا۔ اسے کالم بند کر دینا چاہیے...اور اپنا وقت کہانیوں اور نظموں کی تخلیق میں صرف کرنا چاہیے.....ان دنوں وہ درحقیقت کئی خوبصورت کہانیاں اور نظمیں لکھتا ہے۔ ہر پریت اس کے زیادہ قریب آجاتی ہے۔ اور ایسے میں اسے بھابھی کی موجودگی کھلنے لگتی ہے۔ لیکن بھابھی اعتراض نہیں کرتیں۔ وہ ان کے سامنے ہر پریت کو اپنی بانہوں میں بھر لیتا ہے۔ وہ مسکراتی رہتی ہیں۔ پیشانی پر شکن تک نہیں آنے دیتیں اسی لگن سے ان دونوں کو چائے پلاتی ہیں۔ ناشتہ کراتی ہیں دونوں سے ہنسی مزاق کرتی ہیں۔ تبھی گاؤں میں ان کے والد بیمار ہو جاتے ہیں بھابھی اصرار کر کے گاؤں جاتی ہیں اور واپسی میں اس کی بیوی کو ساتھ لے آتی ہے۔ اسے شکایت تھی کہ پشپا تعلیم یافتہ نہیں مہذب نہیں پھوہڑ گنوار ہے۔ لیکن پشپا آتی ہے تو بھابھی اپنی ساری توجہ اسے پڑھانے لکھانے اور مہذب بنانے میں صرف کر

دیتی ہیں خود جا کر اسے گرلس کالج میں داخل کرا آتی ہیں۔ پشپا میٹرک کرتی ہے۔ پشپا ایف۔اے کرتی ہے۔ پشپا بی۔اے۔کرتی ہے۔ پشپا۔ بی ٹی۔ کرتی ہے۔ اس دوران ہر پریت اپنے آپ کٹ جاتی ہے۔ منی پیدا ہوتی ہے تب بھی بھابھی اس کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں آنے دیتیں۔ منی کا سارا کام اپنے ذمے لے لیتی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ منی کو ماں کی اور شوہر کو بیوی کی کمی نہیں محسوس ہونے دیتیں۔ پشپا کے لئے بھابھی ماں اور ساس دونوں کے فرائض انجام دیتی ہیں ___ اور اب پشپا اس گھر کو چھوڑ دینا چاہتی ہے.....

وہ پھر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ اسے چائے کی طلب ہوتی ہے وہیں سے وہ بھابھی کو چائے لانے کے لئے کہتا ہے اور دیوار پر لگے شیشے کے سامنے جا کر کھڑا ہوتا ہے.... ہر پریت کے آنے سے اس کے کام میں جو تیزی آ گئی تھی وہ اس کے دور ہٹ جانے سے اپنے آپ کم ہو گئی ہے۔ کالم لکھنا اس نے کب سے چھوڑ دیا ہے۔ لیکن ہر پریت سے جدا ہو جانے پر نہ وہ کہانیاں ہی لکھ پاتا ہے نہ نظمیں۔ اچھی کہانی لکھنے میں جتنی محنت پڑتی ہے وہ اس کے بس کی نہیں رہی۔ شاعری سے اس کا مزاج ہم آہنگ نہیں ہو پاتا۔ صبح وہ دیر تک لیٹا رہتا ہے۔ پھر کافی دیر اخبار پڑھتا ہے۔ اشتہار تک نہیں چھوڑتا۔ پھر حاجات ضروری سے فارغ ہو کر مٹھے کا گلاس پی کر تخت پر دراز ہو جاتا ہے۔ کوئی کتاب اُٹھا لیتا ہے اور اونگھ جاتا ہے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر دو گھنٹہ آرام کرتا ہے۔ شام کو اس کی بچی آ جاتی ہے تو اس کے ساتھ کھیلتا ہے۔ بس رات کو کچھ پڑھ لیتا ہے۔ بچی کو بھائی صاحب نے باقاعدہ گود لے لیا ہے۔ ان دس بارہ برسوں میں اس نے اپنی گنجلک میں انہیں پوری طرح جکڑ لیا ہے اور اطمینان سے اجگر کی طرح پسرا ہوا ہے..... اسے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر اس کے لڑکا ہوتا اور اسے بھائی صاحب گود لیتے تو کتنا اچھا ہوتا..... اس لئے اسے بیوی کا پڑھنا لکھنا برا نہیں لگا۔ وہ بیوی کے ساتھ چلا جائے گا اور منی کو ساتھ لے جائے گا یہ ڈر دکھا کر اس نے اپنے شکنجے کو اس گھر پر اور بھی کس لیا ہے..... وہ اپنے آپ مسکراتا ہے۔ بھابھی کے کوئی لڑکا نہ ہو جائے اس نے اس بات کا کتنا خیال رکھا ہے...... لیکن اس کے اپنے بھی لڑکی ہوئی ___ اور اسے اچھا لگا کہ اس کی بیوی

نے نوکری کر لی... لیکن اس کی بیوی یہاں سے کیوں جانا چاہتی ہے۔ یہاں اسے کیا کمی ہے۔ منی کو کیسے چھوڑ جائے گی۔ وہ خود تو منی کی شادی کی بعد داماد کو بھی گھر میں ہی رکھنے کا پروگرام بنا رہا ہے اور پشپا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلی جانا چاہتی ہے۔ وہ اسی فکر میں ڈوبا ہوا ہے کہ بھابھی چائے لے آتی ہیں ___ ''بھیئے کھانے کا وقت ہو گیا ہے تم نے کہا تو میں چائے لے آئی ہوں۔''

''اچھا بھابھی چائے نہیں پیتے کھانا کھا لیتے ہیں۔''

بھابھی ہنستی ہیں ___ ''نہیں دل ہے تو پی لو۔ ذرا ٹھہر کر کھانا کھا لینا۔''

وہ چائے پیتا ہے اور سوچتا ہے کہ اسے کوئی منفعت بخش کام کرنا چاہیے۔ اس طرح پڑے پڑے تو اس کا جسم ڈھیلا پڑ جائے گا اُسے صبح کچھ ورزش کرنی چاہیے۔ یوگ آسن کرلے تو کیسا رہے.....وہ اٹھ کر الماری سے رشی آشرم ہردوار کی کچھ کتابیں اُٹھا لاتا ہے دیر تک ان کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے لئے کچھ یوگ آسن چنتا ہے۔ وہ صبح جلدی اُٹھے گا مالش کرائے گا۔ کسرت اور یوگ آسن کرے گا اور اس کے جسم میں چیتے کی سی لچک پیدا ہو جائے گی......

بھابھی اس کا کھانا لے آتی ہے۔ کھانا کھا کر وہ پھر اسی تخت پر دراز ہو جاتا ہے اور ایک ضخیم ناول لکھنے کا پروگرام بناتے ہوئے اونگھ جاتا ہے لیکن اُسے خواب میں بھی ناول لکھنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی کیوں کہ اچانک باہر برآمدے میں کئی قدموں کی چاپ سے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے ۔ وہ تو بھول ہی گیا تھا کہ آج ہی تو کوآپریٹو اشاعتی ادارے کو آخری شکل دینے کے لئے نشست رکھی گئی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر آنے والے ادیبوں اور اخبار نویسوں کو خوش آمدید کہتا ہے اور لمحہ بھر کے لئے معافی مانگ کر اندر جاتا ہے۔ ہاتھ منہ دھوتا ہے کپڑے بدل کر بال سنوارتا ہے۔ بھابھی سے کہتا ہے۔ آٹھ دس آدمی آئے ہیں ناشتے اور چائے کا انتظام کر دیں ___ اور کچھ نہیں تو پیکیٹ بسکٹ منگا لیں۔

وہ اندر کمرے میں جانا چاہتا ہے کہ بھائی صاحب آتے ہیں۔ وہ بڑی امنگ میں ہیں۔ ''کوآپریٹو ادارے کی ساری اسکیم بن گئی ہے۔'' وہ اعلان کرتے ہیں ''بس بچوا سن لو اور پاس کر دو''

اوراس کے کندھے پر ہاتھ رکھے واپس کمرے میں آجاتے ہیں۔

دو تین گھنٹے جم کر میٹنگ ہوتی ہے۔ چائے دال سیو اور میٹھے نمکین بسکٹ وغیرہ کا ناشتہ اُڑتا ہے۔ بھائی صاحب سب کو اسکیم سمجھاتے ہیں۔ اس پر بحث مباحثہ اور تنقید و تنقیص ہوتی ہے۔ بیچ بیچ میں وہ بھی پیسے لگاتا ہے۔ آخر کار اسکیم آخری شکل پا جاتی ہیں گیارہ ارکان کی فہرست بنتی ہے۔ وہ سکریٹری چنا جاتا ہے۔ طے یہ ہوتا ہے کہ سب ارکان ایک ایک ہزار روپیہ ڈالیں کچھ سرپرست رکن بنائے جائیں جو دو دو حصہ لیں۔ جتنا روپیہ جمع ہو اس کا دس گنا سرکار سے لیا جائے۔ ایک پریس لگا لیا جائے۔ ایک ہفتہ وار نکالا جائے اور ساتھ میں کتابوں کی اشاعت کی جائے۔ سرپرست رکن بنانے ادارے کو رجسٹر کرانے اور سرکار سے روپیہ لینے کا تمام ذمہ بھائی صاحب اپنے سر لیتے ہیں اور جب دو گھنٹے تک بحث و مباحثے کے بعد ساری اسکیم طے ہو جاتی ہے تو بھائی صاحب سب کو لے کر چل دیتے ہیں۔

وہ برآمدے میں جا کر انہیں رخصت کر کے لوٹتا ہے تو اس کا دل بے حد خوش ہے۔ ضخیم ناول اس کے دماغ سے یکسر عنقا ہو چکا ہے اس کے بدلے میں پریس اور ہفتہ وار اور بینک بیلینس اور چیک بکیں اور چار چار ہندسوں کے چیک آجاتے ہیں اور وہ بڑے مسرت بھرے احساس سے ٹھمکتا ہوا اندر جاتا ہے۔

اچانک اُسے ایک دھکا سا لگتا ہے وہ آسمان سے زمین پر آجاتا ہے۔ اس کی بیوی جو اس دوران کالج سے آچکی ہے گھر کے دھلے کپڑے تہہ کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہی ہے۔ اس کا شوہر منہ بائے اس کی جانب تاک رہا ہے لیکن وہ اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتی اور رُستے ہوئے چہرے سے بدستور کپڑے تہا۔ اور انہیں سوٹ کیس میں قرینے سے رکھے جاتی ہے۔

چوکھٹ پر کھڑے لمحہ بھر کو اس کی نگاہیں گویا اپنی بیوی کے چہرے پر نکیں کے ذرہ بھر تھکن کا احساس نہیں۔ گالوں پر ہلکا سا پاؤڈر ہونٹوں پر سرخی آنکھوں میں سرمے کی بارک سی لکیر چوڑی پیشانی پر بڑی سی بندیا نئے طرز کا جوڑا اور چہرے پر کچھ عجیب سا دبدبہ اور نکھار ـــــ یہ وہ

چہرہ نہیں جسے سہاگ رات میں دیکھ کر اسے گھٹن کا احساس ہوا تھا۔ یہ تو اپنے محبوب سے ملنے کو بے چین کسی محبوبہ کا چہرہ ہے.....اور وہ اچانک پھٹ پڑتا ہے۔

''کہاں کی تیاری ہو رہی ہے پشپا جی۔''

پشپا بدستور کپڑے تہائے جاتی ہے۔ شوہر کے سوال کو یکسر ان سنا کر دیتی ہے۔ آنکھ تک اُٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھتی۔ اس کا تمام جوش بیوی کی اس بے اعتنائی سے ہوا ہو جاتا ہے اور اس کے لہجے میں قدرے درشتی آجاتی ہے ''پشپا جی میں نے آپ سے کچھ عرض کیا ہے۔''

اچانک پشپا جی جھکے جھکے آنکھیں اٹھاتی ہیں۔ نہ جانے ان آنکھوں میں کیا ہے خوشامد منت ضد قدرے بے باکی ــــ وہ صرف اتنا کہتی ہے ــــ ''میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔'' اور نظریں جھکا کر وہ بڑی خودداری کے احساس سے پھر کپڑے تہانے لگتی ہے۔

آگے بڑھ کر وہ ہلکے سے بیوی کی پیٹھ تھپتھپاتا ہے۔ ''کیا بات ہے۔''

''میں نے آپ سے آج صبح ہی کہہ دیا تھا کہ اگر مجھے ہوسٹل میں جگہ مل گئی تو میں چلی جاؤں گی۔''

بیوی کہتی ہے ''پرنسپل نے میری درخواست منظور رلی ہے۔ اُنہوں نے مجھے آنریری وارڈن مقرر کر دیا ہے اور وہیں ہوسٹل میں ایک کوارٹر میں رہنے کی سہولت دے دی ہے۔''

لیکن.....لیکن.......وہاں فیملی نہیں رہ سکتی ہے۔''

''رہ سکتی ہے''۔

''میں وہاں لڑکیوں کے ہوسٹل میں نہیں رہ سکتا۔''

''آپ کوئی دوسرا گھر کرائے پر لے لیں گے تو میں ہوسٹل چھوڑ کر آجاؤں گی۔'' لمحہ بھر سناٹا چھایا رہتا ہے۔

''منی.....''

لیکن منی کے بارے میں وہ کیا کہنا چاہتا ہے وہ طے نہیں کر پاتا اور سوال ہوا میں لٹکا

رہتا ہے۔

بیوی لمحہ بھر کو رکتی ہے کہ وہ اپنا جملہ پورا کرے۔ پھر وہ کہتی ہے ''منی کو میں ساتھ لے جاؤں گی۔'' آپ فکر نہ کیجیے۔

''منی کو بھابھی نہیں چھوڑیں گی۔'' اور وہ قدرے بے تکے پن سے ہنستا ہے۔

بیوی اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ صرف سر کو کسی قدر ٹیڑھا کر کے اور آنکھیں ذرا ترپر کر اس کی طرف دیکھتی ہے اس کے تیوروں سے ایسا لگتا ہے گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہو ____ ''وہ کون ہوتی ہے منی کو رکھنے والی۔''

اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے بے انتہا ضبط سے وہ پوچھتا ہے ''کیا پھر کسی نے کچھ کہہ دیا ہے۔''

اس کی بیوی چپ رہتی ہے۔

وہ لہجے کو اور بھی ملائم بنا کر پوچھتا ہے۔ ''کسی نے پھر کچھ کہا ہے؟''

بیوی خاموش رہتی ہے۔

''کیا پھر کہا راجو کی ماں نے کہ بھائی صاحب اور میرے خاندان میں کچھ فرق ہے یا بھابھی نے پہلے مجھے گود لے رکھا ہے اور منی کو لے لیا ہے۔'' اور وہ بے شرمی سے ہنستا ہے۔

بیوی بدستور خاموش رہتی ہے۔

''ارے کچھ تو بولو بھائی۔''

وہ پھٹ پڑتی ہے۔

''میں نے ہوسٹل میں رہنے کی بات کی تو ہر پریت بولی ____ بھابھی بھائی صاحب سے پوچھ لیا ہے۔ وہ کبھی اس گھر کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ نہیں جائیں گے۔ وہاں سب کو غش آنے لگیں گے۔''

وہ اپنے کو اور نہیں روک پاتا

''اس سالی ہر پریت کا کیا ہے۔ یہاں بھائی صاحب سے تھیسس میں مدد لینے کے بہانے آنے لگی تھی ''بھابھی بھابھی کرتے اس کی زبان نہ تھکتی تھی۔ مجھ پر ڈورے ڈالتی تھی یہیں تخت پر بچھ بچھ جاتی تھی۔ (دل میں وہ کہتا ہے ___ اس کی وجہ سے تم یہاں آئی ہو میری جان) میں نے لفٹ نہیں دی تو لگی بکنے.....اور تم اتنی بھولی ہو کہ.....''

بیوی تیکھے پن سے کہتی ہے ''ہر پریت ہی کی بات نہیں کون ہے جو آپکے سمبندھوں کو نہیں جانتا۔ سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں اور میں کیا اندھی ہوں۔ بہری ہوں کیا کچھ دیکھتی نہیں سنتی نہیں ......گاؤں سے آنے کی وجہ سے پہلے دو چار سال کچھ شک بھی رہا ہو.....لیکن .....آپ ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر کہئے لوگ کیا غلط کہتے ہیں۔''

''لوگ سالے جلتے ہیں۔''

''کاہے سے جلتے ہیں۔'' بیوی بھڑ پڑتی ہے۔ ''جلنے کو ہے کیا.....کوئی بڑی نوکری پالی ہے کوئی بڑا کاروبار جمالیا ہے کوئی بلڈنگ کھڑی کر لی ہے کوئی مہان گرنتھ لکھ ڈالا ہے.....''

اسے بے حد غصہ آتا ہے لیکن اس پر قابو پا کر وہ ہنستے ہوئے نہایت پر یقین لہجے میں کہتا ہے ___ ''سب ہوگا ___ سب ہوگا، آج کو آپریٹیو ادارے کی وہ اسکیم بنائی ہے کہ پریس ہفتہ دار پبلی کیشن ساتھ ساتھ ہوگا۔ پھر بلڈنگ بھی کھڑی ہوگی کار بھی آئے گی اور ایک نہیں کئی ناول چھپیں گے.......آج ہی میں نے اپنے ذہن میں ایک عظیم ناول کا خاکہ بنایا ہے.....''

بیوی طنز سے ہنستی ہے۔ ''جب سے میں آئی ہوں کتنی اسکیمیں نہیں بنیں کتنے ناول آپ نے نہیں سوچے جب جب یہاں سے جانے کی بات اٹھی ہے کوئی بڑی اسکیم بن گئی ہے اور آپ سنہرے خواب دیکھنے لگے ہیں ......برسوں سے بے کار دوسروں کی روٹیوں پر جی رہے ہیں .....لوگ جلتے نہیں.......لوگ ہنستے ہیں......مزاق اڑاتے ہیں.....''

وہ لمحہ بھر کو رکتی نہیں پھر اسی رو میں کہے جاتی ہے۔ ''میرا جی چاہتا ہے نگنا۔ میرا دم یہاں گھٹتا ہے۔ میری حیثیت اس گھر میں کیا ہے میں یہاں کون ہوں....آپ کی بیوی لیکن آپ تو کچھ کماتے

نہیں اگر آپ کی حیثیت ایک رکھیل کی ہے تو میری اس سے گئی گزری ہے اس لئے میں نے نوکری کر لی ہے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ نہیں رہ سکتی....''

وہ اس کے لہجے میں درد کو پہچانتا ہے۔ اس کی آواز میں پھسپھساہٹ اور خوشامد کا عنصر غالب ہو جاتا ہے۔

''تم بے کار اتنا سوچتی ہو۔ فالتو لوگوں کی بات سنتی ہو۔''

''کاش میرے کان نہ ہوتے آنکھیں نہ ہوتیں۔ کاش میں اتنا نہ پڑھتی کاش میرا دماغ اتنا حساس نہ ہوتا۔ تب شاید میں آرام سے رہ لیتی۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں میں بہت سوچتی ہوں مجھے اپنی نہیں بھابھی کی مجبوری پر افسوس ہوتا ہے۔ لیکن آپ .....آپ...... مالک نہ ہوتے ہوئے بھی مالکوں سے اوپر ہیں...... مگر میں کیا کہوں میں کون ہوں میری کیا حیثیت ہے.....؟

اس کی آواز دبی ہوئی چیخ کی حد تک بلند ہو گئی ہے۔ لیکن اب اس میں غصہ نہیں ہے منت ہے سماجت ہے۔ سمجھانے کی یاس آمیز کوشش ہے۔

وہ لہجے کو اور بھی ملائم بنا لیتا ہے۔ ''تم بے کار پریشان ہوتی ہو۔ بھابھی نے منی کو کتنی محبت اور شفقت دی ہے۔ تمہیں پڑھایا لکھایا اور اس لائق بنایا ہے......''

بیوی خاموش رہتی ہے۔

''تمہیں نہیں معلوم بھابھی ہی تمہیں یہاں لائی ہیں''

''میں جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کیوں لائی ہیں اور کیوں میرے اسکول جانے پر اتنا زور دیتی ہیں۔''

''کیا تمہارے دل میں ذرا بھی محبت کا جذبہ نہیں'' اس کے لہجے میں چڑچڑاہٹ ہے۔ ''پچھلی مرتبہ جب تم نے منی کو ساتھ لے کر گاؤں چلے جانے کی بات کی تھی تو بھابھی کو دورہ پڑ گیا تھا۔''

''میں جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں تو بھائی صاحب کو بھی

پڑنے لگے گا۔"

اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ گرج اٹھتا ہے "کیا بکتی ہو چار حرف کیا پڑھ گئیں، اپنی اوقات بھی بھول گئی ہو۔"

"اوقات" وہ جیسے سمجھانے کی کوشش چھوڑ دیتی ہے اس کے لہجے میں ملائمت غائب ہو جتای ہے۔ درشتی اُبھر آتی ہے اور اس لفظ کو اس کے منہ پر پھینکتے ہوئے جب وہ آنکھ اُٹھاتی ہے تو اس میں شعلے لپکتے ہیں اور وہ چوٹ کھائی شیرنی کی طرح بپھر جاتی ہے۔ "میری اوقات تو آپ کے ساتھ ہے۔ جب آپ کی کوئی اوقات نہیں تو میری کیا ہوتی......"

وہ لمحہ بھر چپ رہتی ہے۔ شوہر کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے کی طرف دوڑ پڑتا ہے لیکن وہ ذرا نہیں گھبراتی۔ تلخ و ترش لہجے میں کہتی ہے "آپ نے کبھی واقعی ہم لوگوں کی اوقات پر غور کیا ہے......اپنی میری اور اس بچی کی اوقات کے بارے میں سوچا ہے......کیا آپ واقعی نہیں جانتے کہ لوگ کیا کہتے ہیں؟"

وہ جواب کے لئے رکتی ہے۔ شوہر کا چہرہ غیض و غضب کے مارے لمحہ بہ لمحہ سرخ ہوتا جا رہا ہے ___ لیکن بیوی کے سامنے جیسے وہ غصے سے لال چہرہ نہیں ہے ایک بے جان پژمردہ چہرہ ہے۔

"لوگ سالے تو خدا کو بھی گالیاں دیتے ہیں۔" وہ چلائے جاتا ہے۔

لیکن اس کے لہجے میں بیوی کو سمجھانے کا انداز بھی ہے "لوگوں کی بات سنیں تو قدم چلنا مشکل ہو جائے۔ پھر تمہارے لوگوں میں سب سے آگے وہ راجو کی ماں ہے۔ نہایت ناکامیاب شخص کی غیر مطمئن بیوی راجو کا باپ میرے ہی ساتھ پڑھتا تھا۔ کیا کر لیا اس نے سالے اسکولوں کالجوں اور سرکاری دفتروں میں سڑتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں اور خوشامد کرتے ہیں اور یہاں کسی سالے کی نوکری نہیں کرتے کسی کی دھونس نہیں برداشت کرتے۔ مست الست رہتے ہیں۔"

"اسی کا تو دکھ ہے" آپ بھی اگر دوسروں کی طرح کام کرتے......لیکن جیسے گھریلو عورت

کے مقابلے میں رکھیل آرام سے رہتی ہے آپ......"

اس کا ضبط جواب دے جاتا ہے۔ زناٹے کا ایک تھپڑ وہ اپنی بیوی کو جڑ دیتا ہے۔

"ٹانگیں توڑ دوں گا اگر راجو کی ماں یا ہر پریت ور پریت کے یہاں گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں سنیں یا مجھے سنائیں......میں کسی سالے کی پروا نہیں کرتا۔ تم کو ہوسٹل میں رہنا ہے تو ابھی چلی جاؤ میں بھائی صاحب کا رکھیل ہوں تمہارے باپ کا تو نہیں۔"

اور وہ زور زور سے چلانے لگتا ہے۔

بھائی صاحب اخبار نویسوں کے ساتھ جا چکے ہیں بھابھی باورچی خانے میں بیٹھی شام کے کھانے کا انتظام کر رہی ہیں۔ چلاہٹ سن کر دوڑی آتی ہیں۔ لیکن انہیں دائیں ہاتھ سے پرے دھکیلتے اور راستے میں پڑے پیڑھے کو زور سے ٹھوکر لگاتا ہوا وہ گھر سے نکل جاتا ہے اور تیز تیز قدموں سے چل دیتا ہے......رکھیل........یہ لفظ اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح چوٹ کرتا ہے......وہ اور تیز چلنے لگتا ہے........رکھیل......پر اس کے دماغ پر چوٹ پڑتی ہے......اس کے قدم اور تیز ہو جاتے ہیں.....

........وہ بنگلے سے بہت دور نکل آیا ہے ___ اس تیز رفتاری سے ___ لیکن نہ اس کے قدموں میں تھکاوٹ ہے۔ اور نہ پنڈلیوں میں درد ___ بار بار وہی لفظ اس کے کچو کے لگاتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی نے اس کی زندگی کا تمام جھوٹ اسکے سامنے افشا کر دیا ہے۔ وہ رکھیل ہی تو ہے۔ بالکل بے جان کیچوا اور وہ اپنے آپ کو بھیانک اجگر سمجھتا ہے۔ بوا کنسٹرکٹر ___ وہ اجگر بھی ہے تو ملوک داس والا اجگر ہے۔ جو چاکری نہیں کرتا اور رام بھروسے سویا رہتا ہے.....اسے بھائی صاحب پر غصہ آتا ہے جس نے ایک بار اُسے اپنے چنگل میں جکڑ لیا تو نکلنے نہیں دیا......اس کی آنکھوں میں بھابھی کے قرب میں گزارے گئے وہ لمحات گزر جاتے ہیں......وہ گورا گدرایا جسم وہ چھوٹی سی تھوڑی وہ بھرے بھرے پستان اور ریشمی رانیں گرم رسیلے ہونٹ اور گہری نشیلی آنکھیں ......اور وہ پیار......جنگل کی آگ سا جلتا جلاتا اور سمیٹتا اور وہ شفقت ___ وسیع نیلی جھیل سی گہری

ٹھنڈی اور خنک......ایک کے بعد ایک گنجلک مضبوط سے مضبوط تر سنگین اور آہنی اور کبھی نہ ٹوٹنے والی......وہ بوا کنسٹرکٹر یا بھابھی..... بھابھی ہے.... بھابھی بوا کنسٹرکٹر ہے اور وہ اس کی گرفت میں بے طرح جکڑا ہوا ایک یکسر مجبور بے جان بے ضرر جانور ہے ___ وہ نامرد ہے۔ بالکل نامرد۔ مرد ہوتا تو کب کا اس کی کنڈلی توڑ کر نکل جاتا......اسے اپنی بیوی پر غصہ آتا ہے......وہ اسے ایک دم گھس اور پھوہڑ سمجھتا آیا ہے۔ وہ کتنی زیرک ہے ان سب سے انتہائی نفرت کرتے ہوئے بھی وہ عقلمندی اور ہوشیاری سے اس گرفت سے نکلنے کے منصوبہ بناتی رہی ہے۔ اور اس کی اتنی ہمت ہوگئی ہے کہ جنہوں نے اسے اتنی محبت اور شفقت دی اتنی تندہی سے پڑھایا لکھایا انہیں ہیچ اور پوچ سمجھے اور اسے ___ جو اس کا شوہر ہے ___ رکھیل ہے......اس نے اس کا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا .....تصور ہی تصور میں وہ ہاتھوں میں اس کی گردن دبوچ کر زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کے سینے پر چڑھ کر اس کا گلا گھونٹتا ہوا اس کا سر بار بار زمین پر پٹختا ہے......تبھی دور سے گاڑی کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے اور وہ اپنے آپ میں آجاتا ہے۔ دلی کو جانے والی گاڑی کا وقت ہے۔ اچانک اس کے جی میں آتا ہے کہ وہ گاڑی کے آگے کود جائے۔ اس بے کار ناکام زندگی کے چنگل سے ہمیشہ کے لئے نجات پا جائے۔ تبھی اس گدھی کو پتہ چلے گا کہ اس کا شوہر نامرد ہے۔ محض ایک بات کے لئے وہ زندگی کو تنکے کی طرح اُٹھا کر الگ پھینک سکتا ہے۔ جائے وہ ہوسٹل میں شوق سے رہے ساری زندگی وہیں گزارے۔.....اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور گاڑی کے آگے کود جانے کا ___ بیوی سے اس طرح انتقام لینے کا مصمم ارادہ اس کے دل میں زور پکڑ لیتا ہے۔ وہ آزاد ہونا چاہتی ہے۔ ہو جائے آزاد۔ وہ اسے زندگی بھر کے لئے آزاد کر دے گا......اور وہ دوڑنے لگتا ہے۔

اگرچہ گاڑی کی گڑگڑاہٹ سن کر دھوتی کو کمر میں کھونس کر وہ ایک اندھے جوش میں سرپٹ بھاگنے لگا تھا۔ لیکن جب ٹنکی کے موڑ پر اسے سامنے ریل کا پھاٹک دکھائی دیتا ہے اور انجن کی سیٹی سنائی دیتی ہے تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا ہے اس کی رفتار قدرے ماند پڑ جاتی ہے۔ وہ بھاگے

جاتا ہے لیکن اُسے لگتا ہے کہ جیسے اس کی پنڈلیاں پگھلی جارہی ہیں۔ وہ پھاٹک سے چند قدم ادھر ہوتا ہے کہ اس کے سامنے سے انجن دھڑ دھڑاتا ہوا گزر جاتا ہے۔ اور پھاٹک تک اس کے پہنچتے آدھی گاڑی نکل جاتی ہے۔ ایک ڈبے پر اسے لال پٹی پر دلی لکھا دکھائی دیتا ہے لیکن دوسرے الفاظ وہ نہیں پڑھ پاتا۔ تبھی ایک ڈبے کے کھلے دروازے میں کوئی شریر لڑکا اس کی طرف مٹھی بندھا ہاتھ نہایت بھدے اشارے میں جھلاتا گزر جاتا ہے۔

وہ پھاٹک پر کہنی ٹیک لیتا ہے اور خواب کی سی کیفیت میں گاڑی کو گزرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اچانک پہیوں کے نیچے اسے اپنے کٹے ہوئے اعضا تڑپتے چھٹپٹاتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کٹا ہوا سر کبھی تڑپتا ہاتھ کبھی رہ رہ کر پھڑکتا گھٹنا ___ ہر ڈبے کے بعد اسے دونوں ریلیں دکھائی دیتی ہیں اور ان پر چھٹپٹاتے اپنے اعضا اور لہو سے بھری ریل کی پٹریاں اور پتھر..... کہ گاڑی گزر جاتی ہے۔ پھاٹک اُٹھتا ہے وہ کہنی ہٹالیتا ہے۔ غروب ہوتے آفتاب کی دھوپ میں پٹریاں اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ اور پھر پوں پوں کرتی بسیں اور ادھر اُدھر سے بھاگتے رکشے اس جگہ کو گھیر لیتے ہیں۔

وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں بُری طرح کانپ رہی ہیں۔ فٹ پاتھ اور نالے کے درمیان گھاس کی لمبی پٹی ہے جس پر نالے کے پار بنگلے میں لگے سائے دار گل مہر کا سایہ پڑ رہا ہے وہ بڑھ کر وہاں بیٹھ جاتا ہے۔ گھاس نم ہے دھوتی کے نیچے اس کے چوتڑ گیلے ہو جاتے ہیں۔ وہ پروا نہیں کرتا اس کی نگاہ اپنی گوری پنڈلیوں پر جاتی ہیں وہاں بھورے بھورے باریک رونگٹے کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ دھوتی کو نیچے کر لیتا ہے اور نم گھاس پر لیٹ جاتا ہے...... گل مہر کا آدھا درخت لال سیندوری کلیوں اور غنچوں سے لدا ہنس رہا ہے اور آدھا ویران اور اداس گویا اپنے نصف حصے سے بے نیاز ہے۔ ایک طرف طائرانہ نگاہ اس پر ڈال کر وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے..... دیکھتا ہے کہ وہ بھاگا جارہا ہے اور پھاٹک کے برابر سے نکل کر انجن کے آگے کود جاتا ہے۔ انجن کے آگے لگا لوہے کا جالی دار گارڈ اُسے اٹھا کر وہ آگے

پھینک دیتا ہے۔اور گاڑی اس کے اوپر سے ہوکر گزر جاتی ہے.....

پہلی مرتبہ وہ دیکھتا ہے اس کی دھوتی کیچڑ میں پھنس گئی ہے وہ دور تک گھسٹتا ہوا کٹتا ہے۔وہ طرح طرح سے اپنی موت دیکھتا ہے۔اسے اس میں کچھ عجیب لذت سی ہے۔وہ آنکھیں کھول کر دیتا ہے اور اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے......وہ اٹھ کر چل دینا چاہتا ہے.......لیکن اسے بے حد تھکن محسوس ہوتی ہے وہ پھر لیٹ جاتا ہے۔آنکھیں بند کرلیتا ہے.....اس بار وہ دیکھتا ہے کہ وہ ریل کی پٹری پر گردن ٹکائے لیٹا ہے اور کسی دھیمی فلم کی رفتار سے انجن اس کی طرف بڑھا آرہا ہے وہ چاہنے کے باوجود اُٹھ نہیں پاتا۔چیخنا چاہتا ہے۔چیخ نہیں پاتا کچھ عجب سے سحر میں گرفتار انجن کو انچ انچ اپنی طرف سرکتے دیکھ رہا ہے۔وہ ایک خاموش چیخ مارتا ہے اور آنکھیں کھول دیتا ہے۔۔کھلی آنکھوں بھی وہ لمحہ بھر گاڑی کو اپنے اوپر سے گزرتے دیکھتا ہے۔وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔اس کا جسم پسینے سے شرابور ہے۔دل بُری طرح دھڑک رہا ہے۔وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔سڑک ویران ہے ۔پھاٹک کھلا ہے اور کسی گاڑی کے آنے کا امکان نہیں ہے۔

عجیب بات ہے کہ اپنی موت کے اتنے مناظر دیکھتے ہوئے بھی اسے ایک بار بھی بیوی بچی بھائی صاحب یا بھابھی کا خیال نہیں آیا لیکن جب وہ اٹھ کر بیٹھتا ہے تو وہ سب باری باری اسکے سامنے آنے لگتے ہیں.....وہ دیکھتا ہے کہ بھائی صاحب اخبار نویسوں کو چھوڑ کر واپس آتے ہیں۔ بھابھی بتاتی ہیں کہ بچو الڑ کر غصے میں گھر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔بھائی صاحب الٹے پاؤں گھر سے نکلتے ہیں اور اسے ڈھونڈ نے کے لئے چل پڑتے ہیں.....گھر جائے یا نہ جائے وہ اسی پس و پیش میں کھڑا ہے کہ بھائی صاحب اسے ڈھونڈتے ہوئے پریشان حال ادھر آنکلتے ہیں۔اچانک اُسے وہاں دیکھ کر مسرت سے بڑھ کر اُسے گلے سے لگا لیتے ہیں اور پیار سے بار بار چومے جاتے ہیں.....پھر وہ دیکھتا ہے کہ ___ نہیں وہ تو اسے ڈھونڈتے ہوئے نہ جانے کہاں نکل جاتے ہیں۔وہ ہی خود گھر پہنچتا ہیں۔اس کی بیوی اور بچی باہر سیڑھیوں پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ بیوی نے ہوسٹل جانے کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا ہے۔برآمدے میں اس کے قدم رکھتے

ہی دونوں اس سے لپٹ کر رونے لگتی ہیں ......پھر وہ دیکھتا ہے کہ نہیں وہ ہوسٹل چلی گئی ہے بچی کو بھی ساتھ لے گئی ہے۔صرف بھابھی اُداس اور مغموم سیڑھیوں پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہیں ......وہ خاموشی سے ان کے پاس سے گزر کر اندر جا کر چارپائی پر ڈھے جاتا ہے۔بھابھی اس کے پیچھے پیچھے آتی ہیں۔اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کے بال سہلاتی ہیں۔اسے تسلی دیتی ہیں کہ اس کے بیوی بچی واپس آجائیں گی جیسے بھی ہوگا بھائی صاحب انہیں جا کر لے آئیں گے ......اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے اور بھابھی کو بتا دیتا ہے کہ کیسے وہ گاڑی سے کٹنے سے بال بال بچ گیا ہے ۔بھابھی کانپ اٹھتی ہیں اور اسے باہوں میں بھر کر سینے سے لگا لیتی ہیں اسے محسوس ہوتا ہے کہ بھابھی کا سینہ کچھ ڈھلک آیا ہے۔لیکن اسے بڑی راحت ملتی ہے وہ اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے اور نہایت اطمینان سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اچانک وہ مطمئن ہو کر اُٹھتا ہے دھوتی کی لانگ ڈھیلی ہو کر نیچے لٹک آئی ہے غیر شعوری طور پر جیسے کہ اس کی عادت ہے وہ بائیں پیر سے اسے اوپر اچھال کر پیچھے کھونس لیتا ہے اور آہستہ آہستہ گھر کی طرف واپس چل پڑتا ہے......

☆☆

رام لعل

پکھیرو

کسی سے ایک عرصے کے بعد اچانک مل جانے سے اچنبھا تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن ایوا براؤن سے چونکہ پھر کبھی ملنے کا امکان نہیں تھا اس لئے ہندوستان سے ہزاروں کلومیٹر دور اسٹاک ہوم کی ایک مضافاتی لائبریری میں اُسے دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔

یہ واقعہ ۴ ستمبر ۱۹۸۵ء کا ہے۔ اس سے میری ملاقات ۱۳ سال پہلے ایک ٹورسٹ لاج میں ہوئی تھی۔ اب وہ سگتونا کیون کی پبلک لائبریری میں کتابوں کے ایک ریک کے پاس فرش پر پیروں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کے پاس سے گزرتے وقت میں نے اُس کے طرف خاص دھیان نہیں دیا۔ اس لئے کے وہ پشت سے سوئیڈن کی ان ہزاروں گوری چٹی لڑکیوں جیسی ہی نظر آتی تھی جن کے سنہرے یا ریتیلے بال اگر باب‌ڈ نہیں ہوتے تو ان کی پیٹھ یا گردن کے آس پاس یقیناً جھول رہے ہوتے ہیں۔

اچانک کچھ میگزین اوپر کے خانے سے پھسل کر ایوا براؤن کے اوپر آ گرے تو وہ بوکھلا کر چیخ اٹھی اور میں جاتے جاتے پلٹ کر بھاگتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ اس کی مدد کے لئے میں نے فرش پر بکھرے ہوئے میگزین اُٹھانا چاہا تو ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

حافظے کے کمپیوٹر ماضی و حال کی کئی مسافتیں آناً فاناً طے کر کے جب ساکت ہو گئے تو ہم بے اختیار ہنس پڑے۔ میں نے بڑی بے تکلفی سے اسے اس کے نک نیم سے ہی مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ـــــ ’’تم ایوا ٹوئنٹی تھری ہونا؟‘‘

اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ـــــ ’’بے شک ایوا ٹوئنٹی تھری۔ اور مجھے وہ ملاقات بھی اچھی طرح یاد ہے جب انڈیا میں میرے ٹریولنگ چیک گم ہو گئے تھے۔ لیکن افسوس

تمہارا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ شاید تم!''

پھر وہ شرمندہ سی ہو کر ہنس پڑی ___ ''آئی ایم سو ساری! اوہ، میری یادداشت کتنی کمزور ہونے لگی ہے۔ اگر چہ بڑھاپا ابھی بہت دور ہے مجھ سے! کیا یہ صحیح نہیں ہے؟''

میں نے اس کے طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ اب پچیس چھبیس سال کی سرخ و سفید اور شاداب لڑکی نہیں رہ گئی تھی۔ جیسا کہ میں اُسے پہلی بار اپنے ملک میں دیکھ چکا تھا۔ لیکن چالیس سال کے قریب پہنچ کر بھی وہ ایک تندرست دل کش شخصیت تھی اور مجھے یک بیک یہ بھی یاد آیا کہ وہ سوئیڈش نہیں تھی بلکہ وہ پیرس میں اپنے بیکر ماں باپ کے یہاں پیدا ہوئی تھی جو اپنی مادری زبان فرانسیسی تو بڑے فرّاٹے سے بولتی ہی تھی لیکن اس کی انگریزی خاصی کمزور تھی۔ اسے بعض معلومات میں نے اس کے عالمی زبانوں کی ایک کام چلاؤ جیبی ڈکشنری کی مدد سے بہم پہنچائی تھیں اور وہ جے شنکر کو شے شنکر کہا کرتی تھی۔ اُس کے اس غلط تلفظ کے لئے اُس کا مذاق بھی اُڑاتا تھا لیکن کوشش کرنے کے باوجود ''ج'' کی صحیح آواز اُس کے حلق سے نہیں نکل پاتی تھی۔

میں نے اسے اپنے نام کا پہلا حرف بتایا تو اُسے میرا پورا نام فوراً یاد آ گیا۔ پھر وہ میرے ہاتھوں سے اُٹھائے ہوئے میگزین لے لے کر انہیں اُن کی مخصوص جگہوں پر رکھتی ہوئی بولی۔ ''رام! اس کام سے نپٹ لوں تو تم مجھے ریستوراں میں لے چلو بہت ہی قریب ہے پوسٹ آفس اور بینک کے بیچ میں۔ اگر چہ بہت بھرا رہتا ہے لیکن ہم اپنی اپنی بیئر اٹھا کر باہر بینچ پر جا بیٹھیں گے۔ تمہیں کہیں اور تو نہیں جانا؟ ساری، میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گئی، تم مجھے کتنا وقت دے سکو گے؟''

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ اپنے کام سے فراغت پا گئی۔ اپنے پرس میں سے ایک کاغذ کا ایک رومال نکال کر ناک کی نمی پونچھتی ہوئی بولی۔ ''چلو میں تمہارے بارے میں بہت سی باتیں پوچھوں گی۔''

ریستوراں میں واقعی بہت بھیڑ تھی جیسا کہ اُس نے کہا تھا اور ہم سڑک کے کنارے ہی ایک

بینچ پر جا بیٹھے جس کے ایک کونے پر سُرخ چہرہ اور گہرے سیاہ بالوں والی ایک بلغارین جیسی عورت اپنے بچوں کو آئس کریم کھلا رہی تھی۔

میں نے کہا___ ایوا ٹوئنٹی تھری، میں یہاں اپنے کتاب کے پبلشر کے دعوت پر آیا ہوں۔ اُس کی تعارفی تقریب کی تاریخ ابھی مقرر نہیں کی گئی ہے اس لئے کئی روز اور قیام کر سکتا ہوں۔ لیکن تم سے یہاں مل جانے کی تو قطعاً کوئی امید نہیں ہو سکتی تھی۔''

''اِس دنیا میں اب سب کچھ ممکن ہے کیوں کہ یہ بہت چھوٹی ہو گئی ہے۔''

اُس نے میری مسرت و حیرت کی ملی جلی کیفیت کو بالکل نظر انداز کر دیا جس سے ابھی تک میں مغلوب تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ، تم مجھے ابھی تک ایوا ٹوئنٹی تھری کہنے پر کیوں مصر ہو؟ مجھے خوب یاد ہے میں شملا والا لاج کے ۲۳ نمبر کے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ تم بھی پاس پڑوس کے کسی کمرے میں رُکے ہوئے تھے۔ ہاں، یاد آ گیا، میں ہی اپنے چیک چوری ہو جانے کی بعد رو رو کر اس بات کو کوستی تھی کہ میرا روم نمبر ۲۳ ہی بڑا منحوس ہے۔ اور تم نے میرا غم غلط کرنے کے لئے یہ نام مجھے دیا تھا۔ خیر، میں واقعی کچھ خوش ہو گئی تھی۔ مجھے یاد ہے تم نے تھوڑا سا قرض بھی مجھے دیا تھا جس کی بدولت میں نئی دہلی پہنچ سکی تھی لیکن اب اس واقعے کی میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ ایسا ہو بھی کیوں؟ ہم دوسری باتیں کریں۔''

اس واقعے کی اب سچ مچ کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی جے شنکر نام کے جس لڑکے کے ساتھ اُسنے پہلی بار چرس کے سٹے لگائے تھے وہی اس کے پرس میں سے پانچ سو ڈالروں کا سفری چیک اُڑا کر غائب ہو گیا تھا۔ ایوا نے اپنے ملک کے بینک کو ٹیلیکس بھجوا کر نئی دہلی کے فرانسیسی سفارت خانے کی معرفت ایک ڈرافٹ منگوالیا تھا۔ اور دہلی پہنچتے ہی مجھ سے ادھار لی ہوئی رقم مجھے منی آرڈر سے لوٹا دی تھی۔ دو اجنبیوں کی اتنی سی ملاقات کی اگر کوئی اہمیت ہو سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ ہم نے ایک دوسرے کو یاد رکھا تھا اور اب ہم پھر سے ساتھ ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''لیکن تم یہاں کیسے، کیا اپنا ملک چھوڑ چکی ہو؟''

''نہیں نہیں میں اپنے پیارے ملک کو خیر آباد کیسے کہہ سکتی ہوں! مر نہیں جاؤں گی؟ پیرس تو میرا محبوب ہے۔ بعض تو اُسے دیکھے بغیر ہی اُس پر فدا ہو جاتے ہیں۔ بس تعریف ہی سن کر۔ میری رگ رگ میں اُسی کا خون دوڑ رہا ہے بھئی۔ یہ بات الگ ہے کہ میں اُسے چاہنے کے باوجود اُس سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ اسے آپ میری انفرادی یا انسانی فطرت کا نام دے سکتے ہیں۔ میں اپنے اندر کی اس شدید خواہش کو بھی نہیں دبا سکتی کہ دیس بدیس بھٹکتی پھروں۔ دنیا بھر کے لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور سمجھنے کی کوشش کروں۔ اُسے آپ میرا جنون کہہ سکتے ہیں لیکن میں جہاں جہاں گئی ہوں ایک نئے ایڈونچر کا احساس ہوا ہے مجھے۔ سب جگہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ سب جگہ بُرے لوگ بھی نہیں ہیں۔ میرے ملک میں بھی ایسا ملا جلا ہجوم ہے۔ لیکن جیسے موقعے مجھے مغرب میں رہ کر کام کرنے کے مل جاتے ہیں ویسے مشرقی ملکوں میں نصیب نہیں ہوتے مجھے معلوم ہے یہ بہت ہی پسماندہ ملک ہیں وہ اپنے کروڑوں لوگوں کو ملازمتیں نہیں دے سکتے تو ہم جیسے سفری پرندوں کو کیوں کر دیں گے؟ اور وہ بھی عارضی! کیوں دیں؟ اس بات مجھے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بس یوں ہی کہہ گئی ہوں۔ بُرا مت ماننا۔ میں مشرق سے کئی دوسری وجہوں سے بھی پیار کرتی ہوں۔''

''اچھا یہ بتاؤ، تم یہاں کتنے دنوں کے لئے اور ہو؟ کوئی جاب وغیرہ کر رہی ہو؟''

''فی الحال میرے پاس ایک مہینے کے لئے کام ہے'' سوشل ڈپارٹمنٹ کی ایک لڑکی چھٹی پر ہے اُسی کی جگہ کام کرتے ہوئے دو مہینے تو بیت ہی چکے ہیں، اچھا تم بتاؤ، تمہارا قیام کہاں ہے؟ وہاں کا فون نمبر دے سکتے ہو؟ کیا میں تمہیں فون کر سکوں گی؟ میرا نمبر تو تم نوٹ کر ہی لو۔ یہ میرے بوائے فرینڈ کا ہے۔ اُسی کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ آج کل وہ ایک جزیرے پر اپنی ماں کے پاس گیا ہوا ہے۔ بیچاری بوڑھی پچھلی سردیوں میں برف پر پھسل گئی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ پلاسٹر میں ہے۔ کل فریڈی کا فون آیا تھا۔ اگلے ہفتے لوٹنے کی کوشش کرے گا۔ جب اُس کی ماں کے اپاہج لوگوں

کے ہسپتال میں رہنے کے کاغذات مکمل ہو جائیں گے۔ خیر، اب تم میرا ساتھ دو تو ہم ذرا ایک اسٹور سے بھی ہو لیں۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں خریدنا ہیں مجھے کیا تم میری مدد نہیں کرو گے رام؟''

وہ جلدی جلدی باتیں کرنے کی عادی تھی جو بے حد من لبھاونی بھی تھیں۔ اس کی شخصیت کا ایک گن یہ بھی تھا کہ دوسروں کو اس کی مدد کرنے کے لئے فوراً اپنے بس میں کر لیتی تھی۔ یوں بھی میں کچھ دیر اُس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ کئی روز کے بعد اپنے میز بانوں کے کونٹی ہاؤس سے نکلنے کا ایک سنہرا موقع مل گیا تھا اور اتفاق سے باہر آتے ہی ایوا براؤن سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ بھی میری رفاقت سے بور نہیں ہو رہی تھی۔ اسی لئے جب وہ اسٹور سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پلاسٹک کے پھولے ہوئے تھیلے اُٹھائے بس میں سوار ہونے کے لئے جلدی جلدی سڑک کی طرف چل دی تو میں کھلے آسمان کے نیچے اسی کے بارے میں ایک بینچ پر بیٹھا سوچتا سا رہ گیا۔ شملہ سے روانہ ہونے سے پہلے اُس نے مجھے ہندوستان کے کچھ قابل دید مقامات کے بارے میں پوچھا تھا ،اور میں نے اُسے بہار میں واقع نالندہ کے کھنڈرات اور مہاراشٹر کی اجنتا اور ایلورا کی صدیوں پُرانی گپھاؤں کے بارے میں نہ صرف تفصیل سے بتایا تھا بلکہ اس کی ڈائری میں اُن جگہوں تک پہنچنے کے لئے ریل اور سڑک کے راستے تک بنا کر دے دیئے تھے۔ اچانک ٹرین حرکت میں آ گئی اور وہ بڑبڑا کر ویٹنگ روم سے بھاگی بھاگی اپنے کمپارٹمنٹ تک پہنچی تھی۔ اسی گھبراہٹ اپنی ڈائری بھی اٹھانا بھول گئی تھی جسے میں نے گاڑی چھوٹ جانے کے بعد دیکھا۔ میں نے اُس میں سے اُس کا پتہ تلاش کرنا چاہا لیکن اُس نے تو کسی جگہ اپنا نام تک نہیں لکھا تھا۔ بیشتر صفحات پر فرانسیسی زبان میں ہی بہت کچھ لکھا تھا۔ کسی کسی جگہ اُس نے خاکے بھی بنا رکھے تھے۔ ایک جگہ بیچ کے دو صفحات پر پھیلا ہوا پینو راما بنایا گیا تھا جس میں انسانی کھوپڑیاں مندر بدھ کی مورتی، میز پر شراب کے بوتلیں اور گلاس بے چہرہ لوگوں کے ہجوم اور ہاتھی اور گھوڑے اور مزاروں کے علاوہ دو انسانی اسکیچ بھی شامل تھے جن میں ایک تو اُس کا اپنا تھا۔ کھلے کھلے جھولتے ہوئے بال اور حیرت زدہ آنکھیں۔ دوسرا اسکیچ شاید اُس کے کسی ہم سفر بوائے فرینڈ کا ہو گا۔ جس کے چہرے پر صرف

داڑھی تھی مونچھیں نہیں تھیں ۔ بہت عرصہ بعد ایک فرینچ جاننے والے سے میں اُس کی ڈائری پڑھوا سکا تو پتا چلا کہ وہ یوروپ کے باہر ترکی، کویت، افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور نیپال تک میں گھوم آئی تھی۔ اُس کے تاثرات پڑھ کر مجھے ایک حساس مغربی لڑکی کا ذہن سمجھنے میں بڑی مدد ملی جو آرٹسٹ ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھی۔

ایک آدمی دیکھا جو پہاڑ جیسا ہے   تبھی ہزاروں میل دور سے وہ پھر پکارتا ہے
اُسے نام لے لے کر پکارتا ہے   اسے اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہے
اُسے یقین ہے اُس کی آواز سُن سکتی ہے   اُداس ہے اُس کے بنا
لیکن وہ اپنی آزادی برقرار رکھنے کی بھی خواہش مند لیلٹس کی مانند ہے۔
اگرچہ اُس کا دل بھرا ہوا ہے لیکن وہ کھوکھلا ہے وہ بھی آزادی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

استنبول پہنچنے کے لئے پہلے تو ایک کشتی میں لفٹ ملی پھر ایک لاری میں جگہ مل گئی۔ انٹرنیشنل تجارتی میلے کی وجہ سے کسی ہوٹل میں جگہ پانا مشکل ہو گیا، آخر ایک وکٹورین سرائے نما ہوٹل میں خود کو دھانسا پڑا سیلوں کے پردے گہرے رنگ کے تھے۔ اور لمبے لمبے صوفے آمنے سامنے کی قطاروں میں رکھے ہوئے۔ کرائے میں بریک فاسٹ شامل تھا۔ کھانے اور ڈرنکس کے لئے خرچہ الگ دینا پڑتا تھا۔ شاور گرم اور بیڈ آرام دہ۔ مٹر گشتی کرنے مارکیٹ میں نکلی تو ترکی کا بازار دیکھتے ہی اُس پر عاشق ہو گئی۔ تنگ و تاریک گلیاں، جوتے مرمت کرنے والے موچی، سیامی بلیاں، سمندر کا دلکش ساحل۔ واپس آتے ہی ٹوٹ کر سو گئی۔

''اگلے روز ایک بس سے سفر، جو پہلے تو ایک غلط سڑک پر پڑ گئی، پھر لوٹ کر صحیح سمت میں روانہ ہوئی میرے دو ہم سفر فرانسیسی تھے، جیکب اور سوزا۔ وہ کویت جا رہے تھے۔ لاری کا ڈرائیور انگریزی میں فرانسیسیوں کو کوس رہا تھا جب اسے معلوم ہوا ہم فرانسیسی ہیں تو معذرت خواہ ہونے لگا۔ میں نے غصے سے کہا، تمہاری یہ معذرت میں قبول نہیں کروں گی۔ تمہیں کسی وجہ سے واقعی کوئی

دکھ پہنچا ہوگا اس کے بعد ہم دوست بن گئے۔ اُس سے میں نے ایک دیسی سگریٹ بھی قبول کی۔

''قصبے کی ایک خاص گلی، ڈھلوان پر بنی ہوئی دکانیں، طرح طرح کا سامان، پلاسٹک کے جوتے، ٹوپیاں پلیٹیں، پھل، کیا میں مکمل طور پر آزاد فرد ہوں؟ شاید نہیں۔ کم سے کم ان معنوں میں ہرگز نہیں جن معنوں میں بدھ یا صوفی ہوسکتا ہے۔ اعترافِ جرم اکثر بنیادی اسباب کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے۔ مثلاً سیکس کی ارج (urge) سے کسی دوسری جانب موڑ کر ایک جواز پیدا کر لیا جاتا ہے ماحولیاتی اسباب کے محرکات کو واضح طور پر سب لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ اُن کی حقیقی نوعیت کیا ہے! زیادہ تر لوگوں کے بھیجے میں ایک پُراسرار قسم کا منصف موجود ہوتا ہے جو خود اپنی شب خونی حرکات کی وجہ سے ایک کنفیوژن میں مبتلا رہتا ہے۔

''بنارس کے گھاٹ پر ایک عورت گنگا میں پتھر کی ایک چھوٹی سی مورتی نہلانے کے لئے آئی ہے۔ اوپر حد تک نیلا آسمان محیط ہے۔ اُس سے میں مورتی کے بارے میں پوچھتی ہوں۔ وہ دونوں بازوں پھیلا کر اپنی زبان میں کچھ کہتی ہے میں کچھ بھی نہیں سمجھ پاتی۔ یاتریوں کے پیروں کے ساتھ گنگا کا پانی سیڑھیوں تک آیا ہوا ہے۔ بھاری بھاری کولہوں والی عورتیں بار بار ڈبکیاں لگاتی ہیں۔ پانی کی لہریں چکر کھا کھا کر سیڑھیاں چڑھنے لگتی ہیں۔ ان کے کالے پیلے اور لال رنگ کے لباسوں میں گھیرے دار اسکرٹ (پیٹی کوٹ) بلاوز شامل ہیں جن پر بیل بوٹے کاڑھے گئے ہیں۔ یہ کام مغرب پر سبقت لئے ہوئے ہے۔ اُن کی گہری سیاہ آنکھیں دھوپ میں چمک چمک اُٹھتی ہیں۔ اُن کے کالے کالے بھیگے ہوئے لمبے لمبے گیسو اُن کے کاندھوں اور گردن کے آس پاس بکھر بکھر جاتے ہیں۔

ایک بھیڑ بھاڑ والی پتلی گلی، لکڑی کے بے شمار کھوکھے، کالے فریم کی ہزار ہا سائیکلیں اور رکشے، لکڑی اور پتھر کی بنی شوا اور گوتم کی مورتیاں برائے فروخت۔ ایک بچہ سیڑھیوں والی گلی میں کھیل رہا ہے۔ اس کا جنم بھی شاید انہی سیڑھیوں پر ہوا ہوگا۔ کچھ لوگ رام نام ست ہے کہتے ہوئے قریب سے گزرے۔ اُن کے کاندھوں پر سادہ کپڑے میں لپٹی ہوئی ارتھی ہے جس پر گیندے کے

پھول پڑے ہیں۔کوئی ماتم نہیں۔کسی اور دکھ کا اظہار نہیں،موت اسی سکے کا دوسرا رُخ ہے۔مرگھٹ پر مردے کو ایک چتا پر رکھ دیا جاتا ہے پھر آگ لگادی جاتی ہے بچے وہاں بھی کھیل رہے ہیں۔گاڑھے دھوئیں میں انسانی چربی جلنے کی تیز بو شامل ہوگئی جو آگ کی لپٹوں میں سے نکل نکل کر آسمان کی طرف جا رہا ہے۔

''ایسا لگتا ہے، میں نے پچیس سال کی عمر میں اپنی آدھی زندگی گذار لی ہے اگر چہ اجتماعی زندگی پورے جوش وخروش سے میرے سامنے بہہ رہی ہے۔مختلف مذہبی احکامات کے بیچ میں سے ہو کر، جن کا کوئی باہمی تعلق بھی ضروری ہے۔یہاں انسان کی ایگو اپنی مناسب جگہ پر ہے۔ایک طرف اسٹوپا ہے، بہت اونچا ہے۔اس کے پاس پورے احترام کے ساتھ جاؤ کیا ہم اُن کی دنیا کو ٹھیک طرح سمجھ سکتے ہیں؟ کیا ہم پوری دنیا کو سمجھ سکتے ہیں؟ جس کے ساتھ ہم وابستہ ہیں اور وابستہ نہیں بھی ہیں۔خدا ایک چیچک زدہ چہرے کی آنکھوں میں بھی چمک رہا ہے۔یہاں حسن کی تجارتی سطح پر کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔کھال کی گہرائی تک بھی اتری ہوئی نہیں محسوس ہوتی لیکن یہ اپنا راستہ خود بناتی ہوئی چل رہی ہیں، دکھ کا احساس یہاں سب کو ہے لیکن اُسے بڑے صبر و وقار کے ساتھ برداشت کرلیا جاتا ہے۔ایک محدود زندگی، ایک محدود موت، حیات بعد از مرگ جس کے بارے میں مغرب کا بھی ایک نقطۂ نظر ہے، یہاں دکھ کا احساس اتنا سکوت آمیز کیوں ہے؟ شاید اسی وجہ سے اتنی آسانی سے قابلِ برداشت بن جاتا ہے (جیسے یہ بھی خدا کے ہی منصوبے میں شامل ہو) ہزاروں خیالات کی تکرار ہوتی ہے جس طرح دھوپ کی کرنیں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی رہتی ہیں۔ان میں گرد وغبار کے طوفان بھی اُٹھ اُٹھ کر شامل ہوتے رہتے ہیں جن کا رنگ سنہرا ہوتا ہے اور کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہے۔بے شمار مکانوں اور تنگ و تاریک گلیوں کے اوپر بھی وہی آسمان چمک رہا ہے۔اوپر اُٹھیں تو یہ سب نیچے اور پیچھے رہ جاتا ہے اور ہم ہر طرف پھیلے حسن کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔جہاں دیو قامت پہاڑ ہیں۔اور ایک دوسرے کے قریب قریب اور کھڑے اور برف پوش۔

میرے سامنے پھولوں کی ایک دکان ہے پیلے پیلے پھولوں سے بھری ہوئی۔ یہ پیلے پھول انسان کی بنیادی ایمانداری جیسے نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے ہندوستانی پھل، انگور کے گچھے، یہاں بھی یہ رس سے بھرے ہوئے ہیں۔ بلکہ ہماری دنیا سے کچھ زیادہ ہی۔

''نمستے''

''ہیلو ہیلو''

''بائی بائی''

اور ایک پُر امید مہین آواز ___ پیسہ، پیسہ، پیسہ، پیسہ! ایک ایسی گردان جس کے سامنے سپر ڈالتے ہی بنتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے قطار در قطار، ان کی معصوم پھیلی پھیلی آنکھیں، ان کے سیاہ جسموں پر جڑی ہوئے بے شمار آنکھیں۔

''آج تڑکے اُٹھ کر پورے دن کو اُگتے دیکھا۔ ایک اوسط دن کی روئیداد۔ نیپال کی ہپّی کاٹج میں بارہ بجے جاگی۔ کپڑے دھوئے، پنیر ٹماٹر آملیٹ ٹوسٹ اور شہد اور کافی کے ساتھ ناشتہ، تین روپے پچاس پیسے میں، ڈاک خانے میں جاکر معلوم کیا ڈیڈی کا خط آیا ہوا رکھا تھا۔ چلتے چلتے ایک ملک بار کے سامنے پھر رُک گئی۔ دودھ کا ایک گلاس پیا۔ دوسو گرام پنیر بھی کھایا۔ وہیں جارج اور مونیک بھی مل گئے جو پشوپتی ناتھ مندر جارہے تھے۔ وہاں سے لوٹے تو لیف اور دوسرے لوگ مل گئے۔ وہ سب محل دیکھنے جارہے تھے۔

''دو لیمو خریدے، دو پہاڑوں کے پیچھے سورج کو غروب ہوتے دیکھا۔ اچھا لگا۔ کاٹیج میں واپسی ٹورسٹوں کے ساتھ گپ شپ۔ پھر چائے خانے میں۔ ٹوسٹ، شہد اور چائے۔ بستر لپیٹ کر لیف کے ساتھ پھر چائے خانے میں۔ اُسے وہیں چھوڑ دیا اور ان ایڈن (INN EDEN) گئی۔ لیکن وہ دن بھر کے لئے بند تھی اپنی چوڑی پچیس روپیوں میں بیچ دی۔ گلیوں میں بے مقصد گھومتی پھری۔ اچانک ایک سنگتری رنگ کی بشرٹ بھی سو روپے میں دے دی۔ اس کے بعد مندر کی طرف۔ وہاں لیف مل گیا۔ ہم دونوں پہلے ہنگری آئی (HUNGRY

(EYE) گئے۔ وہاں سے میں اکیلی ڈریگون (DRAGON) پہنچی چاؤمن، ٹماٹو سوس، پنیر، ٹوسٹ اور موسیقی بھی سنی۔ پھر باہر آ کر کچھ بسکٹ خریدے۔ رات کافی سرد تھی۔ کافی دیر بھی ہو گئی تھی۔

میں روز ہی مرتی ہوں اور پھر پیدا ہو جاتی ہوں۔ تجسیم کے ایک نئے شعور کے ساتھ، پرانے جسم کو خیر باد کہہ کر نئے جسم میں داخل ہو جاتی ہوں۔ ہندوستان میں زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ کیا انشورنس کا محکمہ معاوضہ ادا کرے گا؟ جب اسے لکھا جائے گا، ڈیر سر، میری ایک ٹانگ بنارس میں ایک بھینس نے اپنے بائیں سینگ کے ساتھ بالکل کچل دی تھی۔ جواب آ جائے گا، آپ کو زحمت اٹھانا پڑی اس کے لیے دلی معذرت، یہ عجیب دنیا ہے جہاں سانولے رنگ والے لوگ بنا ٹائر ٹیوب کے بھی رکشا دوڑاتے لے جاتے ہیں۔ اور گرد آلود بارش میں بھیگتے بھی جاتے ہیں اور جہاں ایسے خطوط اپنے افسر کے سامنے، ٹائپ کر کے پیش کرنے کا کوئی رواج نہیں جس کے بائیں طرف پونے دو انچ کا حاشیہ بھی چھوڑا جاتا ہو۔ کیا انہیں معلوم ہے اسی کرۂ ارض پر ان کی جیسی ایک اور دنیا بھی بستی ہے جہاں لوگ زیادہ آزاد ہیں اور ساٹھ سے دو سوڈالر تک دے کر پوری شان سے بیڈ پر سوتے ہیں؟ یہاں تو بس بھیڑ ہے اور گائیں ہیں اور بے پناہ شور ہے جوان کے اوپر سے رات کی ہوا کی طرح گزر جاتا ہے۔ عام آدمی کی ہیئت اسی قسم کی ہے کہ وہ ہر بات کو بھگوان کی مرضی سمجھ کر بڑی خاموشی سے قبول کر لیتا ہے۔

''لندن کا پل گر رہا ہے۔ اب تک ایک دوسرا پل قریب ہی میں بنا دیا جانا چاہئے تھا تا کہ ندی بہتی رہے۔ شوا کے مندر کے پاس سے ہو کر۔ بہت سے بندر اچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ لال رنگ کی بسیں مسافروں سے بھری ہوئی ہیں، میم صاحب، یو لائیک جائے؟ یو کم ان مائی نائس ریستوراں، یو، ہیو گڈ، فوڈ ہیر MEM SAAB YOU LIKE? YOU COMEIN/ NICE RESTAURANT, YOU HAVE GOOD FOOD HERE, اور آگے کسی گلی میں کوئی میرے ساتھ ساتھ چلتا ہوا سرگوشی کرنے لگتا

ہے، یو وانٹ چینج منی؟ YOU WANT CHANGE MONY? یہ لوگ شکاگو کے گینگسٹروں (GANGESTERS) والے لہجے میں کیوں پوچھتے جب کہ انگریزی بول سکتے ہیں؟ اور آگے کسی گلی میں بلیک مارکیٹ ہے۔ جیسی کابل میں تھی۔ جیسے یہ سب ایک ضابطے کے مطابق کیا جارہا ہو، لیکن یہ جگہیں مویشیوں کا میلہ کیوں معلوم ہوتی ہیں؟ بیچوں بیچ ایک چوکی دار کو میدان، آس پاس بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے کوچوکور کمرے اور مسکراتے ہوئے چہرے، نو ناٹ ٹوڈے، تھینک یو، (NO, NOT TODAY, THANK YOU) رکشے پاس سے گذر جاتے ہیں اور اور اکثر ٹریفک بند ہو جاتا ہے۔

اپنے ماضی سے کٹ جانا کیسا لگتا ہے؟۔ اس زندگی کے مقابلے میں جونز: یک بھی ہے اور بھلی لگ رہی ہے۔ حال مجھے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور ختم کر دینا چاہتا ہے۔ میں ہرمنٹ میں مرتی ہوں ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی ہوں نیچے کی ایک اور گلی میں بھیڑ کے ساتھ بہہ نکلتی ہوں۔ اس کا گلی کا اپنا مالک ردم (RHYTHEM) ہے۔ اپنا راگ جو میں سن سکتی ہوں۔ بار بار ہارن کی پوں پوں سننا اور دکانداروں کی حرکتوں سے لطف اندوز ہونا۔

’’ بریک فاسٹ ۶۰/، رکشا ۵۰/، بمبئی کا ٹکٹ ۲۵/-، بریڈ ۰/۶۰، مونگ پھلی ۰/۳۵، سنترے ۱/-، بسکٹ ۰/۴۰، چائے ۰/۲۵، سگریٹ ۰/۴۰، (۵۰-۳۰) ناریل ۰/۳۰، دیسی کھانا ۱/۵۰، کافی ۰/۶۰، ٹوسٹ ۰/۳۰ (۲۰-۷)

’’ میں انّ پورنا نہیں جا سکی۔ جب پندرہ سال کی تھی تب سے اس کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس پہاڑ کے بارے میں کتابوں میں پڑھا کرتی تھی اور اس کے دشوار گزار راستوں کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ وہاں جو بھی پہنچ سکا، لوٹ کر اس نے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا۔ اکثر من گھڑت کہانیاں۔ مجھے اپنے کیمون کی لائبریری سے دستیاب ہونے والی وہ ساری کتابیں اب تک یاد ہیں۔ آج میں نے شمال مشرق کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ سیکڑوں میل دور تک، کہیں پر نیلا کہرا چھایا ہوا تھا جس کے پیچھے انّ پورنا اوجھل تھا پھر بھی اتنا ہی کافی لگا۔ بار بار اچھلتی کودتی لاری

میں بیٹھ کر اسے پورے سکون سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا جو ہزار فٹ اونچا اور دوسو میل دور تھا نیچے بہت گھنا جنگل تھا۔ اونچے اونچے ایستادہ صنوبر کے پیڑوں سے بھرا ہوا۔ کہیں کہیں میدان بھی تھے۔ جن میں اونچے اونچے گنے اُگے ہوئے تھے۔ ان پر کتنی بار برفیلی چٹانیں پھسل پھسل کر گری ہوں گی، انہوں نے کتنی بار برف باری دیکھی ہوگی! اتنی اونچائی پر بھی یہ ہریالی کتنی مثالی لگتی ہے، جھاڑیاں، جھنڈ کے جھنڈ بناتی ہوئی۔ بیچ در بیچ راستوں سے ہوتے ہوئے اچانک دھوپ میں پہونچ جاتے ہیں۔ کہیں نیپال ہی ایک ایسا ملک ہے جسے صرف جانا جاسکتا ہے میں یہاں پیدل چلنے کی کتنی آرزو مند ہوں! ہفتہ بھر شاید ایک دو مہینوں تک ایسا کرسکتی ہوں۔ ان وادیوں سے ہوکر پہاڑ تک پہنچنے کے لیے پھر واپس آؤں گی''۔

ایک صفحے پر اسکینڈے نیوین زبان میں کچھ لکھا تھا۔ بعض الفاظ نارویجین اور سوئڈش بھی لگے۔ شاید وہاں کی زبانیں سیکھنے کی کوشش بھی کرتی رہی ہے۔ ہندی اور اردو میں بھی یہ مشق کرتی رہی ہے۔ سلام علیکم، سلام، نمستے، تھینک یو، مہربانی، اچھا ہے حقہ، بس نو، ٹنڈی (ٹھنڈی گرم الف، ب، پ، ت، ٹ، ج، چ، ح، خ۔

''استنبول سے ٹرین ایزے رم سے لوکل بس۔ پانچ پونڈ میں سستا پڑے گا یہ سفر۔ وہاں سے آگری (کوراقوم) رات شاید ہیں گزارنی ہوگی۔

''آگری، ڈوگو بیاضوت، وہاں سے بارڈر کی جانب تبریز کے لیے بس۔ بس یا گاڑی سے تہران۔ مشہد کے لیے ٹرین۔ کوئی بھی براہ راست سواری ہرات، قندھار کے لیے۔

''خریدنا ہیں۔ (یاداشت) موم بتیاں، پوسٹ کارڈ، سلک، المونیم کا گلاس اور خطوط لکھنا ہیں۔ ممی ڈیڈی کو، پپ اور مائیک اور مریم کو۔

''پشاور سٹی اسٹیشن پر لوگ بہت خوبصورت لگے۔''

ایوا براؤن نے مجھے ایک ہفتے کے بعد فون کیا۔ بولی ___ ''آج کہیں چلنے کا پروگرام بناؤ

رام۔ میں بے حد تنہا محسوس کر رہی ہوں۔ فریڈی نے اپنی چھٹی بڑھالی ہے، اس کے اپاہج ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ وہ اُس کی تدفین کے انتظامات میں مصروف ہے۔ مجھے بھی بلایا ہے۔ لیکن میں نے اُس کے پاس جانے سے معذرت کرلی ہے۔ میں ایسے غمزدہ ماحول میں کیوں جاؤں؟ تم آجاؤ تو ہم کسی پب میں جا بیٹھیں گے۔ باتیں کریں گے۔ میں خوش ہونا چاہتی ہوں۔ سچ! تم دیکھنا، تم دیکھنا، تھوڑی دیر کے بعد میں کھلکھلا کر ہنس پڑوں گی۔ میرے قہقہے کہیں بند ہوگئے ہیں جیسے تم میری مدد کرسکتے ہو۔ اگر چہ تم خود ایک ایسے ملک کے رہنے والے ہو جہاں قنوطیت بھی ایک قدر سمجھی جاتی ہے لیکن میں تم سے مل کر مشرق کی بہت سی اچھی باتوں کو پھر سے یاد کرسکوں گی۔ تم آرہے ہونا؟"

میں نے اُسے بتایا____ "آج تو میرا دن بھر سونے کا پروگرام ہے۔ رات دیر تک لکھتا رہا۔ میں نے اپنے میزبان سے کہہ دیا تھا کہ باہر سے تالا لگا کر کام پر جائیں وہ میرے لیے شاید ناشتہ بنا کر ٹیبل پر رکھ گئے ہیں۔ بہت سے پھل اور جام اور بریڈ بھی موجود ہے۔ اور پھر ٹی وی بھی ہے اور کچھ کلاسیک فلموں کے کیسٹ بھی ہیں۔ پورے دن کا پروگرام طے ہے۔ اب میں کیا کرسکتا ہوں چاہو تو فون پر ہی میرے ساتھ باتیں کیے جاؤ، نہیں، میں اپنی میزبان کو فون نہیں کروں گا۔ وہ فوراً واپس نہیں آسکے گی۔ صرف میرے لیے باہر کا دروازہ کھولنے کے لیے نہیں۔ وہ شام کو ایک پڑوسن نرس کے ساتھ اُس کی گاڑی میں لوٹتی ہے یا کسی کسی دن لوکل ٹرین سے اسٹیشن تک آجاتی ہے۔ جہاں اس کا شوہر اپنے اسکول سے لوٹ کر پہلے سے گاڑی لیے موجود ہوتا ہے۔ یعنی کبھی کبھار ساتھ ساتھ بھی لوٹتے ہیں۔ آج میں کسی طرح گھر سے نہیں نکل سکتا۔ تم سمجھ گئی ہونا؟ پھر کسی دن مل لیں گے مجھے معاف بھر کردو کہ تمہیں مایوس کر رہا ہوں۔ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

دو روز کے بعد میں نے اُسے فون کیا تو اُس نے مجھے فوراً بلالیا۔ جہاں وہ اَپ لینڈز و یزبلی کمیون کے ایک سوشل ڈیپارٹمنٹ میں عارضی طور پر ایک جاب کر رہی تھی۔ جس وقت وہاں پہنچا، وہ ایک وین سے فوڈ کی ٹرالی اتروا رہی تھی۔ اگر چہ یہی وقت میرے لیے مصروف ترین ہوتا ہے

لیکن تمہارے ساتھ ساتھ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دیکھوں گی، مجھے کام کرتا ہوا دیکھ کر تم کچھ خوشی محسوس کرتے ہو۔"

مغربی یورپ کی ایک عورت کو اُس کے وطن سے دور ایک نورڈک ملک میں شوقیہ مہم کے طور پر کام کرتے ہوئے دیکھنا ایک اچھا موقع تھا۔ شاید اس نے خود ہی میری بے پناہ دلچسپی کا اندازہ کر لیا تھا۔ دو تین کلومیٹر کے دائرے میں اس نے صبح کے چند گھنٹوں کے لیے چار بوڑھوں کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے بوڑھے لوگوں کے گھر میں رہنا پسند نہیں کیا تھا۔ ان کے اپنے اپنے مکان تھے، ان کے بچے ان سب سے الگ رہتے تھے۔ اپنا ناشتہ، کھانا بنانا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ گھر کی صفائی وغیرہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے ایوا کو ان کی ہر خدمت بڑی لگن کے ساتھ کرتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے ان کے بستروں کی چادریں اور دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے بدلے، ان کے کپڑوں کو پریس کیا، اُن کے لیے تھوڑی باغبانی کی، جس جس طرح وہ ہدایت دیتے رہے۔ اُن کی ڈاک لے کر قریب کے ایک ڈاک خانے میں گئی اور اُن کی آئی ڈاک اٹھالانے کے علاوہ اُن کے چیک بھی کیش کرا کے لا دیئے۔ ان کے بجلی اور پانی کے بل بھی جمع کر آئی۔ ایک بوڑھا کچھ رومانی ہوا اٹھا تو اس کے لیے میوزک کا کیسٹ لگا کر اس کے ساتھ ڈانس کیا اور گانا بھی گایا۔

ان سب کاموں سے فراغت پا کر وہ مجھے ایک لائبریری کے اندر بنے ہوئے چھوٹے سے ریستوراں میں لے گئی، وہاں ہم نے اپنے اپنے پیسوں سے لنچ خریدا۔ لنچ کے دوران اُس نے مجھے بتایا ــــــ "یہ جاب میں جس لڑکی کی جگہ پر کر رہی تھی وہ کل واپس آ رہی ہے مجھے اطلاع دے دی گئی ہے۔ لیکن سوچ سوچ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ میں ان معذور لوگوں کی خدمت سے محروم ہو جاؤں گی۔ اُن کے ساتھ میں نے کئی دن گزارے ہیں۔ وہ بھی مجھ سے مانوس ہو گئے ہیں۔ مگر اُنہیں میں نے نہیں بتایا کہ میں کل سے انہیں نظر نہیں آؤں گی۔ ہو سکتا ہے یہ خبر سُن کر کسی کا دل ٹوٹ جاتا۔ وہ مر بھی سکتا تھا لیکن اب کیا ہو گا؟"

''کس کا؟___ تمہارا؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا میری طرف ایک ٹک دیکھنے لگی۔ اُس کی خوبصورت نیلی آنکھیں لمحہ بہ لمحہ آنسوؤں سے لبریز ہوتی گئیں۔ اُس نے اچانک تھوڑی اُوپر اٹھالی۔ تاکہ آنسوؤں کو بہنے سے روک سکے۔ پھر اچانک اپنے جھولتے ہوئے سنہرے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں لیکر سر کے عین وسط میں ایک حسین گولے کی شکل میں لپیٹ دیا۔ پرس میں سے دو ہیئر پن نکال کر انہیں بالوں کے اندر یہاں وہاں ٹھونس دیا اور بولی ''مجھے اب کوئی نئی جاب تلاش کرنی ہوگی۔ فریڈی کے لوٹنے سے پہلے پہلے میں بیکار نہیں بیٹھی رہ سکتی۔ تمہارے جانے کے بعد میں اطمینان سے ادھر کے سارے اخبار دیکھوں گی۔ شاید کوئی ایسی جگہ خالی ہو جہاں میں کام کرنا پسند کرسکوں۔''

ایک دن میں روسی ایئر لائنز کے دفتر سے نکلا تو سڑک کی دوسری اُور کے فٹ پاتھ پر اچانک ایوا جاتی ہوئی دکھائی دے گئی۔ ہم کئی روز سے ایک دوسرے کو فون بھی نہیں کر سکے تھے۔ میں نے اُسے پکارا تو وہ حیران سی ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر مجھے دیکھ لیا تو خوش ہوکر بلانے لگی وہ اس الجھن میں بھی نظر نہیں آئی کہ سڑک پار کر کے میرے پاس کیونکر پہنچے ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ تیز رفتار کاروں کا ایک دریا سا بہتا ہوا جا رہا تھا۔ اُسے وہیں رُکے رہنے کا اشارہ کر کے میں نے اگلے سگنل تک کا ایک لمبا چکر کاٹا۔ اِس کے پاس پہنچا تو وہ بڑی بیتابی سے میرے ساتھ لپٹ گئی اور بولی___ ''ہئی رام، تم خوب مل گئے۔ میں تو ساری امید کھو چکی تھی کیونکہ کل ہی مشرقی جرمنی جا رہی ہوں اچھا سنو، یہیں کہیں تھوڑی دیر کے لیے نہ بیٹھ جائیں؟ میرے پاس وقت کم ہے۔''

ایک پب میں بیٹھتے ہی میں نے اس سے کہا___ ''آج واقعی الوداعی ملاقات ہے۔ وہ بھی اتفاق سے ہوگئی ہے۔ دو روز کے بعد میں ماسکو جا رہا ہوں۔ تم کیا پیوگی؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔ آج تم میرے لئے بیئر خریدو۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اور میں یاد رکھوں گی۔'' وہ میرے ہاتھ سے روپے لیکر بجلی کی سرعت کے ساتھ کاؤنٹر پر گئی اور دو ٹن اُٹھا کر لوٹ آئی۔

''جانتے ہو، میں جلدی نہ کرتی تو ایک لمبی کیو میں لگ جانا پڑ جاتا۔ میں نے کئی لوگوں کو ایک ساتھ اندر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا، خیر یہ بتاؤ کیا تم بھی میری طرح خوش ہونا کہ ایک بار پھر بچھڑنے سے پہلے ہم مل گئے؟''

''تمہیں یہاں کوئی جاب نہیں ملی۔''

''ملی۔ملی کیوں نہیں! جاب ہی کے سلسلے میں تو ساس نٹز جا رہی ہوں۔لیکن فیری سے۔ قریباً تیس پناہ گزینوں کے ساتھ جن کے کاغذات تریلی بورگ سے مشرقی جرمنی کو بھجوائے جا چکے ہیں۔انہیں لوگوں کو اسکارٹ کرنا ہے مجھے۔وہاں سے انہیں مڈل ایسٹ بھجوایا جائے گا، جس راستے سے وہ آئے تھے۔وہ سب سب کے سب ترک ہیں۔فرانسیسی بولنے والے ترک۔اُن میں کچھ عورتیں اور بچے بھی ہیں۔برسوں پہلے اٹلی کے راستے سوئٹزرلینڈ میں داخل ہوئے تھے۔بتاتے ہیں ان کے پہلے قافلے میں ۶۸۰ لوگ تھے۔کچھ چوری چھپے انگلینڈ اور دوسرے ملکوں میں چلے گئے جنہیں ہمارے ملک میں شہریت دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔یہاں سوئیڈن میں رہ جانے کے لئے وہ پانچ سال سے جدو جہد کر رہے تھے۔اُن کے ساتھ پاکستانی ،ہندوستانی، بنگلہ دیشی، سری لنکن اور کچھ گریک بھی تھے۔وہ عارضی طور پر قبول کئے گئے ہیں۔روٹی روزی کمانے کے لئے گذارا الاؤنس کے علاوہ کچھ کام بھی دے دیا جاتا ہے،فرانسیسی بولنے والوں کی میں مترجم ہوں۔نسلی امتیاز کا شکار بھی ہوتے ہیں یہ لوگ۔کوکلس کلان KUKALUX KLANاور اسکن ہیڈز (SKIN HEADS) نام کی دو تنظیمیں ہیں جو انہیں پریشان رکھتی ہیں۔''ان کے دروازوں پر نیگرو گو ہوم NIGGER GO HOME لکھ دیا جاتا ہے سڑکوں پر تنہا پا کر ان کی مار پیٹ بھی کر دی جاتی ہے۔لیکن مقامی لوگ ان کا ساتھ نہیں دیتے۔وہ بالکل غیر جانب دار رہتے ہیں۔لیکن غیر جانبدار رہنے سے نسلی منافرت کا حل نہیں نکلتا۔خانہ بربادوں کا فائدہ ہی کیا ملتا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔''

وہ لگاتار بولتی جا رہی تھی۔ایک عجیب سے جوش سے۔اس وقت اُس کے چہرے پر جو

کیفیت تھی اُسے سادہ سے سادہ الفاظ میں، حیرت ناک ہی کہہ کر بیان کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو اُس نے مجھے روک دیا۔ ''سنو، سنو رام، ایک سویڈش لڑکی کا قصہ سنو، کیا نام تھا اُس کا! ہاں ارنے، اس نے اریٹیریا کے ایک باشندے نوروابوالقادر کے ساتھ شادی کر لی۔ مقصد یہ تھا کہ اِسی بہانے اُسے شہریت کے حقوق دلا دے۔ ایک دن اُسے گھمالانے کے لئے شہر لے گئی لیکن راستے میں دونوں پر اچانک حملہ ہوا۔ دونوں زخمی ہو گئے کبھی کبھی یہ خانماں برباد لوگ بھی غضب ناک ہو اُٹھتے ہیں۔ مقابلہ آرائی کرتے ہیں۔ اس کا سبب ان کی اندرونی بیزاری اور افسردگی ہوتی ہے۔ غیر یقینی زندگی بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔ ایک بیس برس کے پناہ گزیں کا بھی قصہ سنو۔ وہ جس فیکٹری میں لگایا گیا تھا وہاں کام کرتے ہوئے اُس کی عینک ٹوٹ گئی۔ بے چارہ پھر سے عینک بنوانے کے لیے ڈیڑھ کرونے کہاں سے لاتا۔ فیکٹری کے مالک اس طرح کے نقصان کا معاوضہ دینے کا پابند ہوتے ہیں۔ لیکن اُس نے مقررہ معیاد کے اندر مالکوں کو اطلاع نہیں دی۔ اس لیے اس کی درخواست رد کر دی گئی۔ اس کا کیس میں نے ہاتھوں میں لیا۔ تب بھی اس کو کچھ نہ مل سکا۔ میں اُس کے پاس یہ خبر لے کر پہنچی تو وہ غصّے سے پاگل ہوا تھا۔ بجائے اس کے وہ میری کوششوں کا شکریہ ادا کرتا اس نے مجھ پر ہی حملہ کر دیا۔ تم جانتے ہو، ایک عورت پر حملہ کس قسم کا ہو سکتا ہے۔ اُس نے مجھے بالکل نوچ ڈالا۔ یہ میری بہت بڑی توہین تھی۔ یہاں کے قانون کے مطابق اس کی سزا بہت بڑی ہے لیکن میں نے نہ تو پولیس کو بتایا نہ ہی اخبار والوں کو بھنک دی۔ بس اسے مجبور کیا کہ مجھ سے معافی مانگے۔ اُس نے پُر سکون ہو کر معافی مانگ لی۔ میں نے اپنی جیب سے ہی اُس کے لیے نئی عینک بنوا دی ہے۔ اِس وقت وہی لے کر آ رہی ہوں میرے پرس میں ہے۔ لیکن کل کے قافلے کے ساتھ اسے واپس بھیجا جا رہا ہے۔ جرمنی کے راستے ایک نامعلوم منزل کی طرف۔''

ایوا براؤن کی آنکھوں میں اب ایک سکون تھا۔ حیرت ناک قسم کا ٹھہراؤ۔ وہ پلک تک جھپکے بنا میری طرف کئی لمحوں تک دیکھتی رہی۔ اب اس کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ موجود نہیں تھی جو کچھ دیر

پہلے مجھے دیکھتے ہی کھل گئی تھی۔

اچانک وہ گھڑی دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی ____ ''اب جاؤں گی فوراً۔ پھر مل سکیں گے یا نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے؟ مل گئے تو حیران مت ہونا نہیں تو غم بھی مت کرنا۔''

''سنو ایوا، کئی سال پہلے تم نے ایک ڈائری لکھی تھی۔ اسے تم شملہ کے ویٹنگ روم میں بھول گئی تھیں یاد ہے! وہ انڈیا میں میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے۔ تم اپنا پتہ لکھا تو میں واپس کردوں گا۔''

''ہٹاؤ اب میں نے ایسی ڈائری کئی بار لکھی ہے اور کہیں نہ کہیں چھوڑ دی ہے۔ اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے؟ میرا تعلق صرف اتنا ہے کہ کچھ لکھ کر من کا بوجھ ہلکا کرسکوں۔ بس اچھا، گڈ بائی۔''

یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

☆☆

ممتاز مفتی

جھکی جھکی آنکھیں

عذرا اُن عورتوں میں سے ہے جن سے وصال میں بھی تکمیلِ حصول کی آرزو میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے جو دالخراش حقائق سے دور کسی رنگین دنیا میں رہتی ہیں۔ یُوں تو ہر عورت کی دنیا حقائق سے بے نیاز ہے مگر عذرا میں یہ خصوصیت نمایاں ہے۔

عذرا کو بار بار دیکھ کر بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس لحاظ سے حسین ہے۔ کتابی چہرہ، حسّاس ناک، مسکین سے ہونٹ، حیران موٹی موٹی آنکھیں اور گداز جسم۔ اس کی حیران خوابیدہ آنکھیں جو اس کی قوت تکلّم کا بیشتر حصّہ سلب کر چکی ہیں۔ نہ جانے کونسی دنیا میں رہتی ہیں۔ بہر صورت وہ اس مختصر مکان میں جہاں وہ اس کا خاوند اور ساس رہتے ہیں رہتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی کمر کا وہ ہلکا سا خم جس کی وجہ سے اس کی گردن ذرا بائیں طرف مڑی رہتی ہے۔ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ کسی وقت مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہی خم اس کی جاذبیّت کا راز ہے۔ جب بھی عذرا کچھ بُن رہی ہو یا پڑھ رہی ہو اور جھکی جھکی آنکھوں سے باتیں کرے تو تمہارے دل میں ایک لطیف احساس پیدا ہوگا کہ بیشک زندگی بسر کرنے کے قابل ہے اور مل بیٹھنے میں ضرور راحت ہے۔ لیکن اگر وہ آنکھیں اُٹھا کر تمہاری طرف نظر بھر کر دیکھ لے تو...... میں نہیں کہہ سکتا کہ تم کیا محسوس کرو گے۔ اُس وقت مجھے تو ایسا محسو ہوتا ہے عذرا مجھ سے کوسوں دُور ہے، یقین نہیں پڑتا کہ وہ ہے بھی یا نہیں زندگی حقیقت ہے یا محض خواب! اس وقت چراغ مدھم پڑ جاتے ہیں اور دنیا گھوم جاتی ہیں۔

کوئی دس بارہ مہینے ہوئے ہوں گے، جب وہ یہیں اسکول میں دسویں جماعت میں پڑھا کرتی تھی۔ مگر ان دنوں اس کے انداز میں یہ بات نہ تھی۔ حیرانیاں تو اُس کی نگاہ میں چھٹ پنے ہی سے تھیں۔ شاید اس لیے کہ بچپن سے ہی وہ سوتیلی ماں کے پاس رہتی تھی مگر شادی کے بعد اُس

کی نگاہیں اور بھی حیران ہوگئیں اور اب وہ ترنم سے بھیگ چکی ہیں۔ اس کی گردن کا جھکاؤ کچھ اور جھک گیا ہے اور اُس کی پلکیں کسی خوابوں کی بستی کو ڈھانپے رکھتی ہیں۔ ان دنوں جب وہ اسکول سے لوٹا کرتی تھی تو اس کے انداز میں ''بیگانہ روی'' پیدا کرنے کی کوشش عیاں ہوتی مگر کبھی کبھار کوئی دبی ہوئی مسرت چھلک ہی پڑتی۔ چلتے چلتے ٹھٹھک جاتی یا آنکھ میں ہلکا سا تبسم لہرا جاتا جس سے صاف ظاہر ہوتا کہ اس کو زندگی سے دلچسپیاں محسوس ہورہی ہیں۔ وہ اپنے اندر میں ایسی بیگانہ روی پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی، جو والدین کے نقطۂ نظر سے ہر شریف بچی میں ہونی چاہئے۔ خدا جانے والدین اپنے بچوں میں بیداری دیکھنے کے کیوں متحمل نہیں ہوسکتے۔ اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے ننھی کلیوں کی طرح سوئے سوئے ہی رہیں اور یونہی سوئے سوئے ہی مرجھا جائیں۔ اس لئے وہ ان میں بیداری نہ پیدا کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیتے ہیں اور جو پیدا ہوجاتی ہے اسے نہ دیکھنے کا۔ عذرا کے والدین موخرالذکر قسم کے آدمی تھے۔ گھر میں کھانے پینے کے لئے کافی تھا۔ اور جمع کرنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔ بیویوں کے معاملے میں وہ اپنے آپ کو بہت بدنصیب سمجھتے تھے۔ انہیں گلہ تھا کہ ان کی بیویوں کو شادی کے فوراً بعد ہی عام ہوجانے کی قبیح عادت ہے۔ ان کی خواہش تھی کے ایسی بیوی ملے جو گونا گوں ہو اور ان کا ایمان تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی اسے ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس لئے وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ ان کے خیال میں بیوی کا یوں عام ہوجانا اس کی بدمزاقی کی دلیل ہے۔ اور وہ اپنے خیال کو اکثر ظاہر کیا کرتے تھے۔

انجینئر صاحب کی بیوی کو دیکھئے، اُس کی آنکھوں میں بیسیوں نگاہیں ہیں........ایک سے ایک نئی۔ کبھی وہ اداسی میں تو کبھی وہ سرخی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ کبھی ''ہم تمہیں جانتے ہی نہیں'' اور کبھی ''اب کہئے مزاج کیسے ہیں۔'' کی سی نگاہیں اور پھر ان کا تو رنگ بھی ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ کبھی گلابی کبھی گہری گہری گدری گدری، میلی میلی یہ جو پڑوس میں مسز ملک ہے نہ دیکھنے کے انداز سے دیکھنے میں آگے سے کس قدر ملکہ ہے۔ اس کے بھرے ہوئے جسم میں کس قدر پیچ وخم مضطرب رہتے ہیں۔

ایک وہ عذرا کی ماں تھیں کہ بیٹھ جاتی تو گھٹنوں اٹھنا محال ہو جاتا۔ بس دن بھر آلو ہی چھیلتی رہتی تھی۔ اور پھر وہ زمرّد تھی۔ کہ ایک مرتبہ ساڑھی کے لئے بگڑ بیٹھی تو ہفتوں سوچ کر بیٹھی رہی اور کچھ کہہ دیا تو ایک عرصہ تک چہرہ کی زردی کے سوا گھر میں کچھ نظر نہ آیا۔"

عذرا کی ماں کے بعد انہوں نے زہرہ سے شادی کی تھی مگر وہ بھی چند سالوں کے بعد لقمہٗ اجل ہوگئی۔ خیر اس بات سے ان کی زندگی میں کوئی خاص فرق پیدا نہ ہوا۔ چونکہ شادی کے چند ماہ بعد ہی انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ زہرہ میں وہ بات نہیں۔ اب گھر میں ان کی بوڑھی ملازمہ حشمت اور عذرا کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خود تو عام طور پر باہر بیٹھک میں بیٹھے رہتے یا کبھی اندر آتے تو عذرا کو کوئی نصیحت کرنے کے لیے کہتے۔

"خدارا دوپٹہ سنبھالو بیٹیوں کو یوں ننگے سر بیٹھنا زیب نہیں دیتا۔"

"حشمت وہ کھڑکی کیوں کھلی ہے۔ بند کرواُسے دیکھو تو عذرا بیٹھی ہے اور گلی میں لوگ آتے جاتے ہیں۔"

عذرا تم یہ مسز ملک ولک کے یہاں مت جایا کرو۔ لڑکیاں اپنے گھر بیٹھی اچھی لگتی ہیں۔"

ان نصیحتوں کے باوجود انہوں نے کبھی آنکھ بھر کر اُس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ بیٹی جوان ہو جائے تو جانے کیوں اسے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انہیں کبھی عذرا کی شادی کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ نہ ہی انہوں نے کبھی اسے بیٹی کہہ کر بلایا تھا۔ کیوں کہ گو وہ چالیس برس کے تھے لیکن ______ ابھی جوان ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے دوست اور احباب انہیں زینتِ محفل سمجھتے تھے۔ باہر دیوان خانے میں جمگھٹا رہتا تھا۔ اور قہقہوں سے در و دیوار گونجتے تھے۔

ایک روز صبح سویرے جو عذرا اسکول جانے کی تیاری کر رہی تھی اور اپنی محبوب نیلی ساڑھی پہنے بال بنا رہی تھی تو معمول کے خلاف اس کے والد اندر آ کر نہایت خشمگیں انداز میں کہنے لگے۔

"عذرا۔ آج سے تم اسکول نہ جایا کرو۔ بس زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔"

''مگر ابا امتحان۔'' عذرا نے اپنے آپ کو جھنجوڑ کر پوچھا۔ اس کا چہرہ حیرانی اور خوف سے بدنما ہو رہا تھا۔

''مگر وگر کوئی نہیں۔'' انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ ''امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔''

ایک ساعت کے لئے عذرا کی آنکھیں اُٹھیں اور شعلہ کی طرح چمکیں مگر والد جا چکے تھے۔ حشمت نے ان آنکھوں کو دیکھا اور محسوس کیا جیسے کائنات کا ذرہ ذرہ تھرا رہا ہو۔ پھر وہ جھک گئیں۔ دو موٹے موٹے آنسوں رخساروں سے ڈھلک کر ساڑھی میں جذب ہو گئے۔ پھر وہ نگاہیں حیران ہوتی گئیں۔ اپنے ماحول سے سمٹ کر اپنے آپ میں جذب ہوتی گئیں۔ اس دن سے عذرا کو ٹھٹکتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا، اور اسے بیگانہ روی پیدا کرنے کی شاید ضرورت ہی نہ رہی۔ شام کو وہ کوٹھے پر چلی جاتی اور گھنٹوں کھیتوں کی طرف نگاہیں جمائے ہوئے کھوئی ہوئی سی کھڑی رہتی۔ حتیٰ کہ پندرہ دنوں کے اندر اندر اس کے والد نے نذر سے نکاح پڑھوا کر اسے رخصت کر دیا۔ غالباً اس لئے کہ عذرا کی بیداری کا زمانہ اس قدر مختصر تھا کہ آیا اور چلا گیا۔ وہ اس قدر گہرا اثر چھوڑ گیا جس طرح کسی ویران وادی میں کسی آوارہ طائر کی لرزتی ہوئی تان چند ایک ساعت کے لئے ان خاموش مہیب چٹانوں میں ابھر ابھر کر خاموشیوں کے مسکن کو اور بھی خاموش اور بھیانک تر چھوڑ جاتی ہے۔

اس جھٹ پٹ پر خلقِ خدا کے ماتھے پر شکن پیدا ہونی ہی تھی۔ چہ میگوئیاں ہوئیں۔ دبی دبی آوازیں اٹھیں۔ مگر آوازہ کسنے کی نوبت نہ پہنچی۔ ایک تو محلے والیوں کو عذرا سے کوئی گلہ نہ تھا اور عذرا کوئی اس قدر حسین یا شوخ یا طرحدار نہیں سمجھی جاتی تھے کہ محلے والیاں اس سے کینہ دوزی کرتیں۔ دوسرے اُنھیں عذرا کے والد سے بھی کوئی رنجش نہ تھی کہ انہیں نشر کرتیں۔ بلکہ وہ تو ان کی نکتہ رس نگاہوں سے واقف ہونے کے علاوہ ان کی نگاہوں کی قدردان تھیں۔ چند ایک مثلاً انجینیر کی بیوی اور مسز ملک جنہیں آوازہ کسنے میں ملکہ تھا۔ ان کا تو یہ گلہ تھا کہ نہ ڈھول ڈھمکا نہ چھم چھم نہ تاک نہ جھانک نہ تُو تُو میں مَیں۔ یہ بھی کیا شادی ہوئی۔ کئی ایک کو تو مدّت سے عذرا کی شادی کی تقریب

سعید کا انتظار تھا کہ شادی ہو اور مہمان بن کر جائیں۔ حنا مالیدہ ہاتھ ہوں، جھلملاتی ہوئی ساڑیاں ہوں، کاجل رسی، بندیاں چمکیں۔ پلیٹوں سے چوڑیاں بجیں، پان بنائے جائیں اور اس افراتفری میں اچانک کوئی آ نکلے تو گھونگٹ نکالنا تو کیا دوپٹہ سنبھالنا بھی مشکل ہو جائے۔ کوئی گستاخ لٹ جھٹک کر مُنہ پر آ گرے اور ناک میں دم کر دے یا پتلی پتلی نظریں چھن چھن کر پڑیں۔ سفید سفید باہیں گھونگھٹ سے نکل کر کچھ دیں کچھ لیں۔ یعنی ایسی شادی ہو کہ نام رہ جائے بلکہ چرچا ہو۔

آخر خلقِ خدا خلق ہی ہے اور بات سے بات نکل ہی جاتی ہے۔ کسی نے کہا "کسی سے آنکھ لڑ گئی ہو گی" کوئی بولی۔ "ایلو بی بی وہ تو اس کے ابا نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ دفتر سے آ رہے تھے۔ باغ میں وہ اسے پہلو میں لیے بیٹھا تھا۔ توبہ کیسا زمانہ آیا ہے۔" غرضیکہ کئی باتیں نکلیں۔ بلکہ کون سی بات تھی جو رہ گئی۔ مگر دبی دبی باتیں اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔ لوگوں کے لیے بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر شادی عذرا کے لیے بات ہی بات رہ گئی اور وہ خود آئی گئی ہو گئی۔

اس بیچاری کا یہی قصور تھا کہ اسکول جاتے ہوئے تانگے میں یوں آنکھیں جھکائے ہوئے بیٹھی رہتی کہ مرمریں بت کا شبہ ہوتا اگر کسی شوخ چشم کے دل میں اس بات کو دیکھ ایک مصوّر بیدار ہو جائے اور اسے اس بت میں محو کر دے، تو عذرا کا اس میں کیا قصور؟ ہاں اسکول کی ویران سی سڑک پر ہوا کھانے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔

پُوری تفصیلات سے تو مجھے واقفیت نہیں۔ ہاں سلیم کا اونچا قد اور فراخ شانے اور اس کا انداز بے نیازی اس امر کا شاہد ہے کہ اسے تانک جھانک سے کوئی دلچسپی نہیں نہ وہ خود ساختہ مصیبت مول لینے کا عادی ہے۔ غرضیکہ وہ ان نوجوانوں میں سے نہیں جو کسی کے تصور میں اوندھے پڑے رہنے، آہیں بھرنے اور شعر پڑھنے کی دلچسپ کیفیت میں مبتلا رہنے کے مشاق ہیں۔ چند دن تو صبح چھ بجے وہ روز اس سڑک پر اپنے سائیکل پر سوار گھومتا رہا۔ پھر ایک روز جب چھٹی کے وقت عذرا اسکول کے پھاٹک کے قریب کھڑی اپنے تانگے کی راہ دیکھ رہی تھی تو سلیم آ کر اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر اُسے ایک طرف لے گیا اور اسے شانوں سے پکڑ کر پوچھنے لگا۔ "تم کون ہو؟"

تمہارے کیا نام ہے؟‘‘ ....تم بولتی کیوں نہیں۔‘‘ .....’’اچھا‘‘۔اس نے عذرا سے جھنجوڑ کر کہا۔ ’’تم چاہے کوئی بھی ہو تم میری ہو۔اور تمہیں اب مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔‘‘ اور پیشتر اس کے کہ عذرا سمجھتی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔یا اسے کیا کرنا چاہیے۔سلیم جا چکا تھا۔پھر اُسے یاد نہیں کہ اس روز تانگے والے نے دیر سے آنے کے لیے کیا عذر پیش کیا تھا یا کس راستے سے وہ آئے تھے یا راستے میں پھاٹک پر کتنی دیر انتظار کرنا پڑا تھا یا ٹھہرنا پڑا بھی تھا یا نہیں۔اس روز اس کی آنکھیں تبسّم سے آشنا ہوئی تھیں اور اس کی چال نے ٹھمکنا سیکھا تھا۔اسے اس واقعے کی حقیت پر اعتبار نہ آتا تھا۔مگر اس کے بلوریں شانوں پر دو تین نیلے نیلے داغ کسی دلچسپ گرفت کے شاہد تھے اور اس کے شانوں پر لذیذ سا درد ہو رہا تھا۔

اس روز وہ اپنے طوطے سولی سے کہہ رہی تھی۔’’سولی چاہے تم کوئی بھی ہو تم میرے ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا کوئی بھی نہیں۔‘‘ وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔پھر اس مصنوعی سنجیدگی نے شاید اسے گدگدایا۔وہ ہنس پڑی۔’’کیوں سولی ہے نا۔‘‘

اس کے بعد ان کی دو چار سرسری ملاقاتیں ہوئی ہوں گی اور دو چار خطوط آئے ہوں گے اور بس سلیم ہمیشہ کے لیے اس کے لیے چند ایک دل کی پر کیف دھڑکنیں اور ہاتھوں، شانوں اور کمر پر چند ایک لطیف دباؤ اور دِل اور سینے کی چند مبہم تھرتھریوں کے سوا اور کچھ نہ رہا تھا۔جس قدر یہ نقوش منتشر اور موہوم سے تھے۔شاید اُس کے دل میں اُن کے متعلق خیالات اُسی قدر گہرے اور مضبوط تھے۔

گاڑی میں عذرا ساس کے ہمراہ ایک درمیانے درجے کے ڈبے میں بیٹھی تھی وہ جا رہے تھے۔مگر اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ نذر کے ساتھ جا رہی ہے۔اُس کا دِل کہہ رہا تھا۔’’یہ کیسے ہو سکتا ہے۔‘‘ وہ سمجھتی تھی کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے جیسے قدرت اُسے چھیڑنے کے لیے مذاق کر رہی ہو کہ وہ ابھی جاگ پڑے گی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔خواب نہیں تو اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔ایسی بات کیسے ممکن تھی۔

باہر کھیتوں میں گرمی سے جھلسا ہوا پھیکا سبزہ لہرا رہا تھا اور سبز ہونے کے باوجود آنکھوں میں چبھتا تھا۔ ان کھیتوں کے وسیع پھیلاؤ میں یہاں وہاں بجلی کے ہیبت ناک دیونما کھمبے گرد سے اَٹے ہوئے کسانوں میں یوں معلوم ہوتے تھے جیسے ٹھینگنوں میں کوئی ''گلیور'' کھڑا ہو۔ سورج چمک چمک کر تھک چکا تھا اور اس کی کرنیں زرد پڑ گئی تھیں۔ دُور کہیں کہیں افق پر کوئی میلا سا ٹیلا ان جھلسے ہوئے میدانوں کے تسلسل میں دھندلے خواب کی طرح آتا اور گزر جاتا۔ عذرا اپنی خوابوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے اس ٹیلے پر سلیم اسے بلا رہا تھا جیسے دُور سے سڑک پر جو لاری جا رہی ہے اس میں سلیم بیٹھا ہے۔ پھر اس کے شانے کوئی نامعلوم گرفت محسوس کرتے اور وہ سنتی۔ ''تم میری ہو، اب تمہیں مجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔'' اور وہ ٹھٹک کر بیدار ہو جاتی۔ اور دیکھتی کہ نذر کی ماں اور سولی اسی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں مگر دونوں کی نگاہوں میں ایک دنیائے اختلاف تھی ماں کی آنکھوں میں تجسس اور تشویش کو اس کی مسکراہٹیں چھپا نہ سکتی تھیں۔۔ اس کے برعکس سولی کی آنکھیں پُرنم معلوم ہوتی تھیں۔ غالباً وہ دونوں عذرا کے دِل کی کیفیت سے واقف تھے مگر دونوں کی نگاہوں میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ''سولی بے زبان ہو کر بھی سمجھتا ہے۔'' اس وقت غالباً پہلی مرتبہ اس کے دل میں سولی کو آزاد کرنے کی خواہش محسوس ہُوئی۔ نہ جانے کتنی بہاریں اس نے اس پنجرے میں گزاری ہیں۔ کیا اس کے دل میں بھی اڑنے کی آرزو باقی ہے؟ کیا اُس کے دل میں بھی کسی زمانے کی یاد اٹھتی ہے؟'' پھر اُس نے سنا کہ ماں کچھ کہہ رہی تھی۔ گاڑی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ ماں پوچھ رہی تھی۔۔ ''بیٹی عذرا نذر پوچھتا ہے کہ کچھ پیو گی؟...... دیکھو نا کس قدر گرمی ہے...... تمہیں ضرور پیاس لگی ہو گی۔ کیوں بیٹی؟'' اُس کی آواز میں منت تھی۔ عذرا نے کنکھیوں سے دیکھا۔ کھڑکی میں کوئی کھڑا تھا۔ اُسے کنکھیوں سے بھی ادھر دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ پھر اس نے ایسے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے شانوں سے پکڑ کر اس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا ہو......''

اُس نے سنا جیسے میلوں دُور کوئی کہہ رہا ہو۔ ''نہیں اماں تم کہو تو۔ دیکھو کس قدر گرمی ہے۔

اس بھدّی آواز میں کس قدر اداسی تھی۔ ہاں اگر سلیم اُس سے پوچھتا۔ اگر وہ سلیم کے گھر جا رہی ہوتی۔ مگر سلیم، سلیم جانے کہاں ہوگا۔ جانے اُسے حالات کا پتہ بھی تھا یا نہیں۔ شاید اپنی بیچاری عذرا کو بھول ہی چکا ہو۔ شاید اُن رنگین باتوں سے صرف مذاق مقصود ہو یا وقت کٹی۔ مگر اُس کے دل کی گہرائیوں میں کوئی کہہ رہا تھا۔ ''نہیں نہیں یہ الزام ہے۔ سلیم ایسا نہیں کرسکتا۔ اس کی باتیں حقیقت سے لبریز ہیں۔ اس کے دل میں یقین سا ہو جاتا۔ ''وہ آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔ وہ دنیا کا ذرّہ ذرّہ چھان مارے گا۔ شاید اسی گاڑی میں ہو۔......'' کہیں وہ بیمار نہ ہو۔'' وہ ایک جھرجھری محسوس کرتی۔ ''نہیں وہ بیمار نہیں، بس نہیں۔'' عذرا اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹیک دیتی اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ چوکھٹ نہیں۔ وہ سلیم کے شانے ہیں۔ وہ سمٹ کر ان شانوں پر جھک جاتی۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ اب مجھ کو تم سے کوئی بھی چھین نہیں سکتا......کوئی بھی نہیں۔

ساس نے اُسے کمرے میں ایک فراخ پلنگ پر بٹھا دیا۔ کمرے میں دھندلی روشنی تھی۔ تمام مکان سنسان محسوس ہوتا تھا۔ دو چار عورتیں عذرا کو دیکھنے آئیں مگر چند منٹ ٹھہر کر چلی گئیں۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی ویران جنگل کے کھنڈر میں بھوت چل پھر رہے ہوں۔ اس رات لیمپ روشن نہیں معلوم ہوتے تھے اور اندھیرا بالکل ہی اندھیرا تھا۔ اس کی جھکی جھکی آنکھوں کے سامنے سلیم کھڑا تھا وہ محسوس کر رہی تھی جیسے سلیم انتظار میں بیٹھی ہو۔

دُور ہوا درختوں میں ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ سامنے کھڑکی کے شیشے سے ایک اداس کالا درخت نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا جھوم جھوم کر منڈلا رہا تھا۔ لیمپ کے شعلے میں سلیم کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کی جھریاں تھیں۔

عذرا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اضطراب سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے سلیم کی آواز ابھی تک اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کیسا حسین خواب تھا۔ اُس نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کرلیں وہ اس خواب سے بیدار ہونا نہیں چاہتی تھی مگر بند ہونے کے علاوہ اس کی آنکھ میں نیند کا نشان بھی نہ تھا۔ یک لخت باہر سڑک کسی تانگے والے کی ''پہاڑی'' کی

تان اُس کے کان میں پڑی۔ تانگے کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ عذرا کے لیے پہاڑی کی تان سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔ اُس کے سامنے اسکول والی سڑک لہرا گئی۔ جب وہ آزاد تھی۔ جب وہ تانگے پر آیا جایا کرتی تھی۔ جب پہلی مرتبہ اُس نے سلیم کی حیران اور مخمور آنکھ دیکھی تھی۔ سلیم کی پہلی ٹکٹکی.......

اس کے بند بند میں درد ہو رہا تھا۔ سولی کی چیخ سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ بے چارہ سولی بھی اس چاردیواری میں قید محسوس کر رہا تھا کمرے کی دوسری طرف کپڑے کی کرسی میں نذر سویا ہُوا تھا۔ جیسے وہ عذرا کی طرف دیکھتا ہوا سو گیا ہو۔ چہرے پر ایک تبسم سا تھا۔ جیسے کوئی خواب میں گدگدا رہا ہو۔ باہر فضا میں دھیمی رو پہلی روشنی پھیل رہی تھی۔

ساتھ والے کمرے سے کھڑکھڑاہٹ سی سنائی دی۔ عذرا سمٹ کر چارپائی کے کونے پر ہو بیٹھی۔ ''نذر! نذر'' ! نذر کی ماں بلا رہی تھی۔ نذر لپک کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے چہرے پر اضطراب چھا گیا۔ اُس نے آنکھیں ملیں اور چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں عذرا پر آ کر رکیں۔ پھر اُس کے مُنہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے کوئی کسی لطیف خواب کو حقیقت کے لباس میں دیکھ کر کھل جائے۔

''آیا اماں۔'' کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

اگلے روز دن بھر عورتیں آتی جاتی رہیں۔ ہر کسی کو عذرا کے دیکھنے کا شوق تھا ادھیڑ عمر کی عورتیں جن کے لیے جوانی کے دن چند ایک دھندلے نقوش اور بیگانہ سے احساس تھے۔ عذرا کو اس انداز سے دیکھتیں جیسے کوئی اپنی گزری ہوئی دلچسپیوں کو خواب میں دیکھ کر مسکرا دیتا ہے مگر کوئی دبی ہوئی آہ اس مسکراہٹ کو اداس بنا دیتی وہ شوق سے آتیں مگر کھوئے ہوئے انداز سے لوٹتیں جس طرح کوئی اپنی گزشتہ زندگی کے کسی رنگین واقعے کو یاد کر کے اپنی کھوئی جوانیوں پر کسک سی محسوس کرتا ہے اور اپنے گرد ایک اُداس اور لٹی ہوئی دنیا پاتا ہے۔ دو ایک جوانی سے سرشار لڑکیاں بھی آئیں۔ لچکتی ہوئی منکتی ہوئی۔ مسکراتی ہوئی۔ ''ہم جانتے ہیں'' کی سی مسکراہٹیں ''بس یہ ظاہر داری رہنے

دو''.....ابھی تو اس نگری کی دہلیز پر بیٹھی ہو۔'' کی سی نگاہیں اُچھالتی ہُوئیں۔ بنتی سنورتی ٹہلتی ہوئی۔ مگر عذرا اپنی نگری میں گم صم تھی۔ لیکن جب کوئی نووارد اُس کا مُنہ دیکھنے کے لیے اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ چونک پڑتی پھر اسے یاد آتا کہ وہ کہاں ہے اور کون ہے اور اس کا چہرہ شرم سے تمتما اٹھتا یا کبھی رسولی کی چیخ اس کے لٹے ہوئے۔ خوابوں کو بیدار کر دیتی اور احساس ہوتا کہ وہاں صرف سولی ہی ایک ایسا متنفس ہے جو اس کے دِل کے کیفیت سے واقف ہے۔

سولی اپنے پنجرے میں یوں مضطرب تھا جیسے اسے سرِ نو قید کیا گیا ہو۔ وہ چاروں طرف دیکھ دیکھ کر پھڑ پھڑاتا اور ان دیواروں کی اجنبیت محسوس کر کے بار بار چیختا۔

شام کے وقت نذر نے سولی کا پنجرہ عذرا کے پلنگ کے قریب رکھ دیا۔ سولی نے عذرا کو دیکھ کر چیخنا بند کر دیا۔ اپنی گردن موڑ کر اپنے بازوؤں پر رکھ دی اور عذرا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ گیا۔ عذرا نے سولی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھ میں چمک آ گئی۔ صِرف سولی ہی اُس کا رازدان تھا، جس سے وہ سلیم کی باتیں کر سکتی تھی۔

نذر عذر کے پاس آ بیٹھا۔ اُس کی آنکھوں میں محبت کی جھلک تھی۔ ''تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا! عذرا کچھ تو کھاؤ۔ امّاں نے تمہاری اتنی منّتیں کی ہیں۔'' اُس نے دھمی منّت بھری آواز میں کہا۔ ''یہ تمہارا اپنا گھر ہے عذرا......تم اس کے مالکہ ہو۔ اُس کے حلق جذبات کی بھیڑ سے رک رہا تھا۔ اُس نے اپنے بھدّے سے ہاتھوں میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''عذرا! عذرا تم چپ کیوں ہو؟'' اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اُس کی زبان کہنے والی زبان نہ تھی مگر اُس کا ہاتھ خاموش اور مدھم زبان سے اپنا مفہوم ادا کر رہا تھا۔ اُس وقت وہ بھدّا گرم ہاتھ قوّتِ گویائی سے زیادہ متکلم تھا۔ عذرا نے وہ پیغام کانوں سے نہیں بلکہ جسم کے بند بند میں سُنا اس کی تمام قوّت شل ہو گئی۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا لینا چاہتی تھی مگر وہ اپنے جسم پر قادر نہ تھی۔ کوئی نامعلوم طاقت اُس کی مرضی کے خلاف اسے اپنا آپ حوالہ کر دینے پر مجبور کر رہی تھی۔ کوئی نامعلوم دلفریب لوری اُس کے جسم کو تھپک تھپک کر سُلا رہی تھی۔ صِرف دماغ کا کوئی نحیف حصّہ جسم کی اس غدّاری اور اپنی بے بسی پر پیچ و خم کھا رہا تھا۔

جس طرح ڈراؤنا خواب دیکھ کر کوئی چیخ چلا کر جاگ اٹھنا چاہتا ہے مگر جاگ نہیں سکتا۔ اسی طرح عذرا بُت سی بنی بیٹھی تھی۔ اُس میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی قدرت نہ تھی۔ اُس نے ایک مخمور دھند لکے میں نذر کا ہاتھ دیکھا۔ سلیم کا ہاتھ بھی اسی طرح بڑا اور گرم سا تھا۔ ہاں سلیم کا ہاتھ شوخ تھا۔ بلا کا شوخ......اُس کے دل میں خوامخواہ آرزو پیدا ہوگئی کہ وہ بھدّا ہاتھ متحرک ہو جائے۔ اس کی اپنی تمام قوت شوخی زندگی اس گھڑی کے لیے اس بڑے بھدّے ہاتھ اور ان مضبوط بانہوں میں منتقل ہو جائے۔ اس کا جسم اس بھدّے ہاتھ کے لیے منتظر تھا۔ بے تاب تھا اور نقار خانے میں طوطی تھے......اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔۔ سلیم کا ہاتھ اس کے جسم سے مس ہو رہا تھا۔ اس کی بند آنکھوں کے سامنے سلیم آ کھڑا ہوا......تم ہو سلیم!......مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔'' اس کے شانے جھک گئے۔ سر جھک گیا اور سلیم کے شانوں پر ٹک گیا۔ سلیم کی دو مضبوط باہیں اُس کے گرد آ پڑیں.........وہ سلیم کے پاس تھی۔

نذر کسی دفتر میں کلرک تھا۔ اس کے والد نذر کے لیے ایک معمولی سا مکان اور چند واجب الادا رقمیں چھوڑ مرے تھے۔ وہ عذرا کے والد کے بہت گہرے دوست تھے۔ نذر نے کچھ عرصے پہلے کہیں اتفاقاً عذرا کو دیکھ لیا تھا عذرا کی نیچی نگاہوں اور اک اُلٹی ہوئی لٹ نے اسے کئی دن پریشان رکھا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ عذرا کو اپنے خوابوں میں جگہ دینا اپنا شیرازۂ ہستی پریشان کرنا ہے۔ مرحوم دوست کے قلاش لڑکے کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ جب اُس نے اپنی ماں سے سُنا کے عذرا کے والد رضامند ہیں بلکہ جلد نکاح کرنے پر رضامند ہیں تو اسے یقین نہ آتا تھا۔ اب بھی وہ کبھی کبھی سمجھتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور وہ ابھی جاگ اُٹھے گا اور اسے احساس ہوگا کہ ایک غریب کلرک کو ایسی مدہوش کن نیندیں ان لامتناہی فاصلوں کے سامنے کس قدر مہنگی پڑتی ہیں۔ مگر شاید یہ بھی فطرت کی ستم ظریفی تھی کہ عذرا سریحاً اُس کی خواہشات میں جو صرف ضروریاتِ زندگی تک محدود تھیں۔ ساڑیاں جھلملانے لگیں۔ پھول مہک اُٹھے اور طلائی چوڑیاں نغمہ زن ہوگئی......عذرا کے لیے حسین نازک چپل ہو......عذرا کے لیے قدِ آدم آئینہ ہو......عذرا کے لیے شربتی ریشم ہو۔ عذرا کے لیے.....عذرا اس کی خواہشات میں

بھنور بن کر آئی تھی۔

اُس نے ایک چھوٹا سا پرانا ٹائپ رائٹر خرید لیا۔ تاکہ فرصت کے وقت ٹائپ کر کے اپنی آمدنی بڑھائے۔ یہ سب اس کے دل کی گہرائیوں میں ہوا اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ ان گہرائیوں میں کیا ہو رہا ہے۔ اور اس کی خاموشی ایک حسرت بھری تشویش ہے۔

عذرا کو پہلی مرتبہ ساڑی میں دیکھ کر نذر کی آنکھ میں ایک مخمور چمک آ گئی۔ بوڑھی ماں نے جھکی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کی تبسم کو محسوس کیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے غسل خانے یا کسی جگہ کوئی ضروری کام بلا رہا ہو۔ اُس کی آنکھوں نے چاروں طرف دیکھا پھر وہ نذر کی جرابوں میں آن ٹھہریں۔ ''بیٹا یہ جُرابیں مجھے دے دو'' اُس نے کہا۔ ''دیکھو کیسی میلی ہو رہی ہیں، لاؤ میں انہیں دھو دوں۔''

نذر نے چونک کر اپنی نگاہوں کو عذرا کی نیلی ساڑی سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں اماں یہ تو اچھی بھلی ہیں۔ ابھی پرسوں ہی پہنی تھیں؟

''نہیں بیٹا۔'' ماں نے اسرار سے کہا۔ ''کیا ہرج ہے؟''

جرابیں لے کر ماں چلی گئی۔ کچھ دُور تک نذر اُس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر عذرا کی طرف مڑ کر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''عذرا یہ نیلی ساڑھی تمہیں بہت زیب دیتی ہے۔ میری طرف دیکھو نا عذرا۔''

نذر نے اپنے ہاتھ سے عذرا کا مُنہ اپنی طرف پھیر دیا، عذرا نے آنکھیں جھکا لیں۔ ''ہاں۔'' اُس کے دل کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا۔ اُن کو بھی نیلی ساڑھی بہت پسند تھی۔ اس روز پارک میں شوق سے دیکھتے رہے تھے۔ کس قدر پیار بھری نگاہیں تھیں۔ کس قدر پیاری آواز تھی۔ عذرا، نیلی ساڑھی کیسی زیب دیتی ہے۔ اور کس پیار اور منت سے انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ عذرا وعدہ کرو تم ہمیشہ نیلی ساڑھی پہنا کرو گی۔ میرے لیے، میری خوشی کے لیے، زندگی کے لیے، اور وعدہ لے کر کس قدر خوشی کا اظہار کیا تھا کیسی دیوانگی سے جھومے تھے.......

اُس نے اپنے ہاتھ پر دباؤ سا محسوس کیا۔ سوئی کی چیخ نے اُسے بیدار کر دیا۔ اُس نے اپنا ہاتھ آہستہ

سے چھڑا لیا اور اُٹھ کر سولی کے قریب جا بیٹھی۔ وہ سولی سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ پوچھنا چاہتی تھی ”تم میرے ہونا سولی؟ وہ محسوس کر رہی تھی کہ صرف سولی ہی ایک ہستی ہے۔ جس سے بات کرنے کے لیے بولنے کی نہیں۔

اُنہیں نیلی پسند تھی نا سولی؟ وہ مجھے نیلی کہا کرتے تھے۔ تم اس نیلی کو جانتے ہونا؟ اس میں ان کے ہاتھوں کو لو ہے۔ ان کے پیار کی سلوٹیں ہیں۔ ان پھولوں کا رس ہے جو وہ میرے لیے توڑ کے لایا کرتے تھے۔ کیوں سولی۔ تم جانتے ہونا؟...... مگر تم نہیں جانتے۔ تم نے اُنہیں کبھی نہیں دیکھا۔ تم صرف سمجھتے ہو۔ اور سولی ان کے ترستے ہاتھ، بڑے بڑے پیارے پیارے بے تکلف ہاتھ اور چھیڑ دینے والی شوخ بانہیں اس کے کندھوں کے گزشتہ دباؤ تازہ ہو رہے تھے۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور اندر جا کر چارپائی پر لیٹ گئی اُس کی نیم وا آنکھوں نے اس مختصر کمرے کو اپنے دامن سے جھٹک دیا.....

یُوں ہی تو رہنے کو عذرا اس مکان میں رہتی تھی مگر اس کی نیم وا آنکھوں کو وہ چار دیواری قید نہ کر سکی۔ یا شاید اس چار دیواری کی وجہ سے ہی وہ نیم وا آنکھیں دُور بین ہو گئیں۔ وہ اپنے دِل کی دُنیا ان نیچی نگاہوں کی جھکی ہوئی مژگاں پر اٹھائے پھرتی اور شاید جھکی ہوئی ہونے کی وجہ سے ہی ان نگاہوں نے نذر کی دُنیا بدل ڈالی۔ گو نذر انِ کھوئی کھوئی نگاہوں کو دیکھ کر جیتا تھا مگر کبھی کبھی ان نگاہوں کی وسعتوں کو محسوس کر کے اسے شاید ڈر محسوس ہوتا مگر شاید وہ ہلکا ڈر ان نگاہوں کو نذر کے لیے اور بھی جاذب بنا رہا تھا عذرا جب کبھی اپنے دل کی دنیا سے چونک پڑتی اور دیکھتی کہ نذر اُس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے تو وہ آنکھوں کو جھکا لیتی۔ وہ ایک تبسم نذر کے لیے پیامِ حیات بن جاتا۔ وہ اس حیا سے لبریز تبسم کے لیے اپنی زندگی، اپنا آپ سبھی کچھ دے دینے کے لیے ہی تیار تھا۔ پھر اُس کی نذر نیلی ساڑھی پر پڑ جاتی اور وہ محسوس کرتا کہ وہ دن بدن پہننے کے ناقابل ہو رہی ہے۔ اس میں وہ چمک نہ رہی تھی• وہ سوچتا دیکھو کتنی جگہوں سے پھٹ رہی ہے، بوسیدہ ہو چکی ہے چمک نہیں، پھر بھی عذرا اُسے میرے لیے پہنے پھرتی ہے۔ اس لیے کہ میں اسے نیلی ساڑی میں دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ صرف میری خوشی کے لیے۔ حالانکہ اُس کے پاس سُرخ ساڑھی بھی تو ہے

بلکہ سُرخ ساڑھی تو اور بھی قیمتی ہے۔ کتنی پیاری ہے وہ۔ عورت کو خاوند کی خوشی زیبائش سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے.....ہندوستانی عورتیں.....وفا کی دیویاں.....

مگر یہ ساڑھی تو اَب پہننے کے قابل نہیں۔ گوندرام کہہ رہا تھا۔ ایسی ساڑی چالیس روپے کو ملے گی۔ چالیس روپے! ساڑھیاں بھی کس قدر مہنگی پڑتی ہیں.....اُس کے مُنہ سے بے ساختہ آہ نکل جاتی اور پھر وہ کمر جھکا کر اپنے ٹائپ رائٹر کے سامنے جا بیٹھتا۔ اُس کے صبح و شام چالیس روپے کی آرزو میں بسر ہو رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا جب چالیس روپے لے کر وہ ساڑھی لائے گا۔ عذرا دیکھے گی۔ خوشی بھری، تعجب بھری، محبت بھری نگاہ، اُس لحہ بھر کی نگاہ حاصل کرنے کے لیے وہ عمر بھر محنت کرنے کے لیے تیار رہتا۔

عذرا اُس کے پاس بیٹھی رہتی۔ مگر اُس نے کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نذر کو نہ دیکھا تھا بلکہ وہ نذر کے وجود یا موجودگی کے احساس سے قطعی بیگانہ تھی۔ وہ اُس کے چہرے کی بناوٹ سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھی صرف اس کی پیشانی اور دانت دیکھتی، باقی خط و خال کو اپنی نگاہوں میں اٹکنے نہ دیتی۔ شاید اس لیے کہ نذر کی پیشانی اور دانتوں میں کچھ سلیم کی سی جھلک تھی۔ وہ دونوں اکثر ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہتے مگر پاس بیٹھنے کے باوجود ایک دوسرے سے کوسوں دُور تھے.....دن بھر سولی سے باتیں کرتی رہتی اور پھر سلیم کے پاس پہنچنے کے لیے اسے صرف آنکھیں جھکانے کی ضرورت تھی۔

ایک روز دوپہر کے وقت جو عذرا ماں کے پاس بیٹھی کچھ بُن رہی تھی۔ ایک اجنبی عورت آ کر ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر ماں جب اندر نماز پڑھنے کے لیے گئی تو عورت نے عذرا کا ہاتھ پکڑ کر اس میں لپٹا ہوا کاغذ کا گولہ رکھ دیا اور اُس کی مٹھی بند کر دی۔ اُس نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔ "یہ انہوں نے دیا ہے وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔"

پہلے تو عذرا حیرانی سے اس کے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی پھر اُس نے اپنی مٹھی کھول کر دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا ہوا لفافہ تھا اس نے لفافے کو غور سے دیکھا۔ اُس کی سمجھ میں

نہ آتا تھا کہ کون آئے ہوئے تھے اور وہ بڑھیا کون تھی۔ اس کی طبیعت میں تشویش اور ڈر پیدا ہو گیا، مگر وہ عورت جا چکی تھی۔

غالباً وہ اپنے خیالی سلیم سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی اور اپنی دنیائے تصور میں اس قدر کھو چکی تھی کہ اسے کسی جیتے جاگتے سلیم کا انتظار نہ تھا۔ خیال تک بھی نہ رہا تھا۔ شاید اگر سلیم بذاتِ خود اس وقت اس کے سامنے آ موجود ہوتا تو اُسے بیگانہ محسوس ہوتا۔ بہر صورت اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ لفافہ کس کا تھا اس کے دل میں اس لفافے کو کھولنے کی ہمت نہ پڑی تھی، اور سخت پریشانی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اس کاغذ کے گولے کو پھر سے اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ اُٹھ بیٹھی اندر چلی گئی۔ پھر باورچی خانے میں گئی صحن میں آئی ..... اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے یا کس لیے یہاں وہاں گھوم رہی ہے۔ جس طرح طوفان آنے سے پہلے کسی ویران ساحل پر کسی نامعلوم آنے والے ڈر کو محسوس کرتے ہوئے پرندے ان کالی اداس چٹانوں پر دیوانہ وار منڈلاتے ہیں۔

وہ اپنی مٹھی میں اس کاغذ کے گولے کو بھینچ بھینچ کر ناپید کر دے اور اپنی دنیا کو محفوظ کر لے ..... کمرہ گھوم رہا تھا ..... اس نے اپنے آپ کو ٹرنک کے اوپر بیٹھے ہوئے پایا۔ ٹرنک کھلا تھا۔ وہ لپٹا ہوا لفافہ اُس کی گود میں پڑا تھا۔ اُس نے کھوئے ہوئے انداز سے اُسے پھاڑ کر کھولا ..... اُس کی آنکھوں تلے الفاظ ناچ رہے تھے۔ دل دھڑک رہا تھا۔ نگاہیں تیزی سے لفظوں پر سے پھسل رہی تھیں۔ جیسے وہ مضمون کے سحر سے بچنا چاہتی ہو۔ اُس نے صرف یہی سمجھا کہ وہ آئے ہوئے ہیں اور اُس کو ساتھ لے جانے پر مُصر ہیں۔ اُس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہو بس مجھے اسی کا ڈر تھا اور یہی ہو کر رہا۔ وہ بھاگی پھر رہی تھی مگر خط کا مضمون اُس کا پیچھا کر رہا تھا اور بُوند بُوند اُس کے دل کی گہرائیوں میں ٹپک رہا تھا۔ اس پر غلبہ پا رہا تھا۔ آخر وہ پلنگ پر لیٹ گئی اور ایک ایک سطر اُس کے سامنے ناچ گئی ..... جانا! چلے جانا ..... اُس کا دِل کانپ اٹھا ..... دماغ میں خلا سا پھیل گیا۔ ماحول میں کوئی مفہوم نہ رہا ..... اس وقت کائنات اُس کے لیے ایک بے معنی پھیلاؤ تھی۔

رات کو وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس رات سلیم کی بجائے کئی اور خوفناک شکلیں اُس کے خوابوں میں گھس آئی تھیں۔ بھدے بھدے ہاتھوں اور سفید سفید دانتوں والی ڈراؤنی۔ نذر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اُس نے دونوں ہاتھوں سے عذرا کو تھام لیا۔ ''کیا ہے عذرا!'' اُس کا چہرہ فکر اور خوف سے بھیانک ہو رہا تھا۔ ''آج تمہیں کیا ہوا ہے۔ تم بیمار تو نہیں۔'' عذرا کو ایسا محسوس ہوا جیسے میلوں دُور کوئی کچھ کہہ رہا ہو۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا اُس کی یادداشت صاف ہو رہی تھی۔ ''..... ہاں۔ وہ عورت ..... دوپہر ..... وہ خط ..... اُن کا خط..... سلیم کا ..... وہ یہاں آئے ہوئے ہیں ..... وہ مجھے لے جانا چاہتے ہیں۔'' اُس نے جھرجھری لی۔

نذر کسی سے خدا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ عذرا نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کا سَر کسی کے شانوں پر جا ٹکا۔ آج پہلے دِن عذرا کا سر سلیم کے شانوں پر نہ تھا۔ جانے تکیے پر تھا یا پتھر پر ..... مگر نذر کے شانوں پر عذرا سر تھا۔ اور عذرا کے بالوں کی دھیمی دھیمی خوشبو نذر کو فکر مند اور پریشان کر رہی تھی۔

عذرا کا دل کئی ایک خواہشات میں جھول رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خواہشات ایک دوسرے سے جھگڑ رہی تھیں۔ ایک حصّہ سولی شکل میں کہہ رہا تھا تم ان کی ہو عذرا۔ اور اب اُن سے تم کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ ایک فراخ پیشانی اور سفید سفید دانت کہہ رہے تھے۔ ''عذرا تم بیمار تو نہیں۔ تمھیں کیا ہوا ہے عذرا؟ دو بھدے ہاتھ کہہ رہے تھے۔ ''تم آنکھیں جھکا لو۔ عذرا تمہاری دنیا تو ہمارے پاس ہے۔'' سامنے سلیم کھڑا ہے تھا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنس رہا تھا۔ ڈراؤنی ہنسی۔ پیاری ہنسی.....''

شام کو وہ سولی سے کہہ رہی تھی۔ ''سوتی تم اکیلے رہ سکو گے؟ اگر میں چلی جاؤں تو مجھے یاد کرو گے؟ مجھے بُرا تو نہیں کہو گے۔ وہ درخت جو میرے کمرے کی کھڑکی سے باہر دکھائی دیتا ہے۔ کیوں سولی میں اُن کے ساتھ چلی جاؤں؟ دنیا کیا کہے گی؟ ابا جان کیا کہیں گے؟ سولی!! تم تو جانتے ہو۔ تم تو سمجھتے ہونا!''

شام کو اُس نے نیلی ساڑھی کو لپیٹ کر ایک پارسل بنالیا۔ اور اُسے میز پر رکھ دیا۔ اُس کا دل ہلکا سا درد محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ جلدی اپنے کمرے میں جا لیٹی، اُس روز وہ سوچنا نہیں چاہتی

تھی۔ وہ سوچنے سے ڈرتی تھی۔ اُس نے ایک پرانا رسالہ اٹھالیا۔ پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر الفاظ اُس کی آنکھوں تلے ناچ رہے تھے۔ صفحات کبھی سفید ہو جاتے اور کبھی الفاظ ایک دوسرے سے ٹکرا کر گھوم جاتے ..... اُس نے باہر پاؤں کی چاپ سنی۔ اُس روز اُس کی قوتِ سامعہ بہت تیز ہو رہی تھی۔ اُس نے نذر کو ماں کے کمرے میں جاتے ہوئی سُنا۔ اُس کے پاؤں کی آہٹ بتا رہی تھی کہ نذر کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ عذرا کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ کھڑکی باہر سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے بوڑھا شیشم کا درخت تھا۔ سلیم آج وہاں آنے والا تھا۔ وہ اس بات کو بھول نہیں سکتی تھی۔ اُس کی نظر بار بار کھڑکی سے باہر درخت پر جا جمتی۔ اس وقت کھڑکی بند تھی۔ مگر شیشے میں صاف نظر آرہا تھا۔ باہر سڑک پر کبھی کبھی کوئی راہ گیر گزرتا تو اُس کے پاؤں کی چاپ صاف سنائی دیتی۔ خاموشی چھا جاتی۔ شیشم کا درخت متانت سے کھڑا تھا۔ عذرا یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ درخت اُس کے ہر راز سے واقف ہو۔ صحن والی کھڑکی میں سولی کا پنجرا تھا۔ سولی دو روز سے خاموش بیٹھا تھا۔ اُس نے باتیں کرنی چھوڑ دی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سولی تمام دنیا سے بیزار ہو چکا ہو۔ پھر عذرا کی نگاہ میز پر پڑی۔ نیلی ساڑھی والے پارسل کو دیکھ کر عذرا لپک کر اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے پارسل اٹھایا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اُسے کہاں رکھے۔ دروازے کے قریب جا کر اُس نے سُنا، ماں بیٹا باتیں کر رہے تھے۔

''تم نے تو اپنا آپ تباہ کر لیا ہے۔ صبح تمام کام۔ دن رات کام۔ ہر وقت کی ٹِک ٹِک ..... ایک ساڑھی کے لیے اپنا آپ حلال کر دینا۔''

''نہیں اماں یہ نہ کہو۔'' نذر بار بار کھانس رہا تھا۔ ''جب سے وہ آئی ہے، ہم نے اُس کو دیا ہی کیا ہے۔ مگر اماں وہ ایسی اچھی ہے کہ کبھی گلہ تک نہیں کیا۔ میں اُسے دے ہی کیا سکتا ہوں۔ تنخواہ میں بمشکل گزارہ ہوتا ہے۔''

''مگر بیٹا اُس کے پاس اور بھی تو ساڑھیاں ہیں۔ وہ کیوں نہیں پہن لیتی۔ پھر وہ نیلی ساڑھی کے لیے کیوں اس قدر مصر ہے، میں تو نہیں سمجھتی ..... ہمارے زمانے میں .....''

''اماں تم بھولتی ہو۔اُس نے تو مجھ سے نہیں کہا ..... مگر یہ تو معمولی بخار ہے تم فکر نہ کرو۔''

نذر آیا اور آتے ہی لیٹ گیا۔اسے تیز بخار تھا۔عذرا کھڑکی کے سامنے چُپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔اُس کی خاموشی کسی گہری دلی کشمکش کی چغلی کھا رہی تھی۔اُس کے بھنچے ہوئے ہونٹ کسی چھپے ہوئی ہنگامے کا حال کہہ رہے تھے۔

''تم سو جاؤ عذرا۔'' نذر نے دھیمی آواز میں کہا۔''تم کیوں میرے لیے بے آرام ہو، میری فکر نہ کرو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ بخار کی شدت میں وہ وہ کہہ رہا تھا جو اس نے کبھی نہ کہا تھا۔ جو وہ کبھی کہہ نہ سکا تھا۔اُس نے اپنے ہاتھ میں عذرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔''تم نہ ہوتیں عذرا تو میری زندگی میں یہ بات نہ ہوتی۔تم میری زندگی ہو..... میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی دکھ نہیں رہتا۔'' اُس نے اضطراب سے دو ایک کروٹیں بدلیں۔پھر وہ عذرا کے پاؤں کے قریب ہو گیا۔اُس قرب پر وہ خوشی محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی بچہ بڑے پیارے کھلونے سے کھیلتا ہے۔ عذرا بُت بنی بیٹھی تھی۔شاید وہ اس کی باتیں نہیں سن رہی تھی یا نہ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔پھر یکلخت اس نے اپنے پاؤں پر دو گرم ہونٹوں کو مس کرتے ہوئے محسوس کیا وہ چونک اٹھی، کانپ اٹھی۔اُس کی نگاہیں جھک کر نذر پر جم گئیں۔آج پہلی مرتبہ اُس نے نذر کو نگاہ بھر کر دیکھا اور پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ نذر کے پاس ہے۔

نذر تمام رات بخار سے بے چین رہا وہ بار بار بڑبڑا اٹھتا۔''چالیس روپے۔نیلی چالیس روپے۔'' وہ اکثر عذرا عذرا چیخ کر اُٹھ بیٹھتا۔پھر وہ عذرا کی طرف دیکھ کر کہتا۔''تم میرے پاس ہونا عذرا..... ہاں ..... تم میرے پاس ہو۔'' پھر وہ آرام سے لیٹ جاتا۔''تم آرام کرو عذرا۔تم اب سو جاؤ..... تم بیمار ہو جاؤ گی۔میری فکر نہ کرو۔میں اب اچھا ہوں۔'' اس وقت عذرا کی آنکھیں کھڑکی سے ہٹ جاتیں، اور وہ کسی الجھاؤ میں پڑ جاتی۔اُس کا سر گھوم رہا تھا۔اُس کا حلق خشک تھا۔وہ سوچ بچار کے نا قابل تھی باہر چاند کی چاندنی میں شیشم کا درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا۔اور کوئی دھندلی سی شکل اُس کے نیچے کھڑی نظر آ رہی تھی۔عذرا بڑبڑا رہی تھی وہ آئے

ہیں۔ ہاں!'' عذرا کا جی چاہتا تھا کہ سلیم سے جا ملے۔ کوئی اس کا دامن پکڑ لیتا۔ عذرا اُٹھ بیٹھی۔ اُسے پتہ نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ یا کیا کرنا چاہتی ہے۔ باہر ہوا زور سے چل رہی تھی اور درختوں کی ٹہنیاں لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ عذرا نے کانپتے ہوئی ہاتھوں سے اپنی نیلی ساڑھی اُٹھا لی، نذر بڑبڑا اٹھا۔ ''نیلی نیلی چالیس روپے۔'' عذرا ڈر گئی۔ اُس کا سرا نگارے کی طرح گرم گرم محسوس ہو رہا تھا۔ سولی نے چیخ ماری۔ دردناک چیخ۔ عذرا نے اُسے دیکھا۔ غریب سولی اپنے پنجرے میں یوں پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے وہ عذرا سے کچھ کہنے کے لیے مضطرب ہو۔ میز پر پنسل پڑی تھی۔ دفعتاً عذرا نے وہ پنسل پکڑ لی۔ وہ پارسل پر لکھ رہی تھی۔ ''میں نہیں آسکتی۔'' اُس نے پنسل اپنے آپ سے چھین کر پھینک دی۔ اس ڈر کے مارے کہ وہ لکھا ہوا کاٹ نہ دے۔ اُس نے کھڑکی کھولی اور باہر دیکھے بغیر ہی وہ پاسل سڑک پر پھینک کر جھٹ دروازہ بند کر لیا جیسے وہ کھڑکی کے کھلے رہنے سے ڈر رہی ہو۔ وہ دھندلی سی شکل آگے بڑھی۔ عذرا پیچھے ہٹ گئی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بھینچ کر بند کر لیں۔ اور اپنے کانوں میں اُنگلیاں دے دیں۔ اُس کے کانوں میں ایک شورِ محشر سنائی دے رہا تھا..... کچھ دیر کے بعد اس نے دیکھا کوئی پارسل ہاتھ میں پکڑے جا رہا تھا..... وہ چیخ کر اُسے بلا لینا چاہتی تھی..... اُس نے اپنے دل میں دستک کی آواز سُنی اور دھم سے کرسی میں گر گئی۔ ''یہ میں نے کیا کر دیا، یہ میں نے کیا کر دیا۔ اُس کے دل سے دیوانہ وار آوازیں آ رہی تھیں۔ اُس کی آنکھ سے آنسو گر رہے تھے..... بے اختیار اُس کے منہ سے چیخ ہچکی کی شکل میں نکل گئی۔

نذر اٹھ بیٹھا ..... کیوں عذرا ..... کیوں ..... ہیں ..... تم روتی ہو؟ تم کیوں روتی رہی ہو۔ عذرا میں یہاں ہوں میں تمہیں چھوڑ نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارا ہوں۔ عذرا تم فکر نہ کرو۔ سو جاؤ۔ نذر نے عذرا کا سر اپنے شانوں پر رکھ لیا۔ عذرا کی ہچکیاں رُکتی نہ تھیں۔ ''میں نے کیا کر دیا، میں نے کیا کر دیا، سلیم تم نہ جاؤ! سلیم! سلیم! اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ سلیم سامنے کھڑا تھا۔ پھر اس کا سر سلیم کے شانوں پر جھک گیا۔ سلیم مجھے تم سے کوئی جُدا نہیں کر سکتا.....''

پھر اُس نے سُنا جیسے میلوں دُور کوئی کہہ رہا تھا۔ ''عذرا میری وفا کی دیوی۔''

☆☆

جوگندر پال

بو

ڈاکٹر سرد پ کے چپراسی چرنجی نے اپنی محتاط نظروں سے ڈاکٹر کے دفتر کے دروازے کے طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے سر سے گاندھی ٹوپی اتارنے لگا۔ اس کے سر سے ایک دم سوسو کے کئی نوٹ فرش پر آگرے اور وہ وہ گھبرا کر انہیں تیز تیز سمیٹنے لگا۔

اسی اثنا میں ایک بوڑھا بے تحاشہ کمرے میں داخل ہوا۔ ''ڈاکٹر جی۔! ڈاک!''

''ارے باہر جاؤ!'' چرنجی گھبرا کر فرش سے اٹھا اور بوڑھے کو دروازے کے باہر دھکیلنے لگا۔ ''ہر کوئی بے دھڑک اندر آدھمکتا ہے بولتا ہوں کسی کو بلا اجازت اندر مت آنے دیا کریں۔'' اس کی حیدر آبادی، کر کے' کی منطق سے ڈاکٹر سرد پ اس قدر مرعوب تھا کہ لہجے میں تاثر پیدا کرنے کی خواہش سے اس کے منہ سے بھی اس لئے، کی بجائے بے اختیار 'کر کے' ہی نکل جاتا۔

چرنجی نے دروازہ بھیڑ کر اندر سے چٹخنی چڑھالی اور نوٹ گننے لگا۔ '' ایک 'دو' تین ــــــ چودہ۔'' وہ پھر فرش پر جھک گیا۔ ''ایک اور کہاں گیا؟

ڈاکٹر سروپ اس کے گنجے سر پر چپکے ہوئے ایک نوٹ کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ '' ہمارے سر پر تو گندے بال اگتے ہیں مگر معلوم نہیں کیا سوچتے رہتے ہو جب بھی ٹوپی اُٹھاتے ہو تمہارے سر پر بڑے بڑے نوٹوں کا جھنڈ کا جھنڈ اُگا ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر کو یاد آیا کہ آج اسے اپنے ڈینڈرف کی دوا لے کر گھر جانا ہے۔ اس کی بیوی نے کہا تھا تمہارے گندے بالوں کی بو سے کھایا پیا منہ کی طرف پلٹ آتا ہے۔

چرنجی نے نوٹ کو اپنے گنجے سر سے اکھاڑنے کے انداز میں ہاتھ میں لیا اور ایک دفعہ پھر نوٹوں کو گن کر ڈاکٹر سروپ کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ''پندرہ ہیں، صاحب۔''

''صرف پندرہ؟''

ڈاکٹر کے ماتھے پر تیوری دیکھ کر چرنجی نے کہا۔ ''دو ہزار کا ہفتہ طے کر گیا تھا صاحب مگر چکتائی پر حرام کی اولاد کہنے لگا، اس موسم میں برف بیچے زمین پر کہاں ملتی ہے؟ اسے آسمان سے کھود کر لانا پڑتا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ برف میں تھوڑا کم کمالے۔ اور بھی تو بیسیوں آئٹم ہیں۔''

''کر کے میں نے بولا تھا صاحب، ٹھیکے کو دو حصوں میں بانٹ دیجئے اور گنگو سے بھی معاملہ کر لیجیے وہ بڑا ایمان دار آدمی ہے۔''

''اس دیال کے بچے کو بھی تو تم ہی لائے تھے۔''

''لایا تو میں ہی تھا مگر کیا بولنا، آج کل سبھی اپنے دھرم ایمان کو بیچے ہوئے ہیں۔ اب اگلے چار ہفتے پندرہ سو پر ہی چلنے دیجئے۔ وہ بولتا ہے چار ہفتوں کے بعد موسم کھل جائے گا، پھر وہ پورے دو ہزار دینا شرو کر دے گا۔''

ڈاکٹر نے پانچ نوٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈیڑھ سو تمہارا، اور ڈیڑھ سو کیئر ٹیکر کا باقی کے دو سو بڑے بابو کو دے دو۔''

''ٹھیک ہے صاحب۔'' چرنجی نے نوٹوں کو پھر ٹوپی کے نیچے رکھ لیا اور جانے کے لئے دروازے کی طرف مڑا، مگر دو قدم چل کر رک گیا۔ ''کیئر ٹیکر صاحب نے کہا تھا صاحب 'میرے چپراسی کے لئے بھی ایک سو لایا کرو۔''

ڈاکٹر سروپ نے اسے قریب آنے کا اشارہ کر کے ایک سو کا ایک اور نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''کر کے دیال سے کم سے کم سولہ سو ہی وصول کر لیتے۔''

چرنجی نے نوٹ کو ویسے ہی اپنی ٹوپی کے نیچے جمالیا۔ ''آج کل آپ جیسے رحم دل افسر کہاں

ملتے ہیں صاحب آپ تو اپنی ساری پر جا کے کھیون ہار ہیں۔''

چرنجی کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے آدھا اُٹھ کر پتلون کی پچھلی جیب سے اس کے دیے ہوئے نوٹ نکالے اور یونہی ان پر اپنی نگاہ ٹکالی اور ریز رو بینک آف انڈیا کے گورنر کی طرف سے ادائگی کے وعدے کی تحریر پڑھنے لگا ـــــــ سرکار جو وعدہ کرتی ہے اسے ہمیشہ پورا کرتی ہے لیکن لوگوں کا یہ حال ہے کہ کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ـــــــ پورے پانچ سو کم ڈاکٹر کو دیال پر ابھی تک بہت غصہ آرہا تھا ـــــــ خیر اُسے معلوم ہو جائے گا سرکاری معاملوں میں زبان سے پھرنا اتنا آسان نہیں ـــــــ اس نے نوٹوں کی تہہ جما کر انہیں پھر جیب میں رکھ لیا اور سوچنے لگا کہ ڈائرکٹر چھ سو سے کم میں نہیں ٹلے گا۔ سارا کام ہم لوگ کرتے ہیں اور وہ بڈھا مفت میں سب سے بڑا حصہ اڑا لے جاتا ہے۔ سالا اکیلا آدمی ہے، اتنے پیسوں سے کرتا کیا ہے؟ آج شام کو گھر لوٹتے ہوئے میں اسکاچ کی بوتل لے جاؤں گا اور سوڈا بھی۔ اسکاچ میں پانی ملانے سے تو بہتر ہے کہ صرف پانی ہی پی لیا جائے۔

''مگر پیاس تو پانی سے ہی بجھتی ہے۔'' اس کی بیوی روشنی اپنی شوہر کی شراب کی لت سے چڑی رہتی تھی۔

''ہاں، مگر جن کی پیاس پہلے ہی مری پڑی ہو انہیں تو اسے زندہ کرنا ہوتا ہے۔'' روشنی سے جھگڑتے ہوئے اس کا دماغ روشن ہو جاتا۔

''ارے او سروپ تمہارے بیوی ہے، پھول سی بچی ہے ہم سے تمہاری پیاس زندہ کیوں نہیں ہوتی؟'' پھر ناری کو یکلخت اپنی بے بسی پر غصہ آنے لگتا۔'' تم ـــــــ تم مُردوں کے ڈاکٹر ہو سروپ، تم کیا جانو، کسی بے کل روح کی بچی کھچی سانسیں اکٹھی کر کے اسے اپنے پیروں پر کیسے کھڑا کیا جا سکتا ہے؟''

جب ڈاکٹر سروپ کو پیشہ درانہ اہل ۔ کے باعث ٹرانسفر پر سرکاری اسپتالوں کی زنجیر اس مردہ خانے کا انچارج بنایا گیا تھا وہ بہت تلملایا تھا کہ اتنے سالوں کے تجربے کے باوجود اسے موت کی

سندیں لکھنے اور مردوں کی دیکھ بھال پر مامور کر دیا گیا ہے۔

''دل چھوٹا مت کرو ڈاکٹر۔'' اس کے ایک سینئر شریک کار نے اسے تسلی دینے کے لئے سمجھایا تھا۔ سرکاری ڈاکٹر یہاں ہو یا وہاں' ایک ہی بات ہے۔ وہاں وہ مریض کو موت کی راہ پر ڈالتا ہے اور یہاں مریض اس راہ پر چلتے ہوئے اس کے پاس آ پہنچتا ہے۔'' اس نہ ہنستے ہوئے ڈاکٹر سردپ کی پیٹھ تھپکی تھی۔ ''بڑے آرام وہ ٹھکانے پر آ لگے ہو۔ اب چین کی بانسری بجاؤ۔''

ڈاکٹر سردپ نے واقعی چین کی بانسری بجاتے ہوئے ہی یہ سارے سال بتا دیے تھے۔ بہت ہونے پر بھی اس کے چارج میں بیس سے زیادہ مردے نہ ہوتے ان میں سے بیشتر لا وارث ہوتے۔ ڈاکٹر اپنے دفتر سے باہر چوبیس گھنٹے کا نوٹس لگانے کے بعد لا وارث مُردوں کو سرکاری تجربہ گاہوں میں کام میں آنے کے لئے بھیج دیتا۔ مردوں کی دیکھ بھال کرتے کرتے وہ زندوں کا علاج کرنا بھول ہی گیا تھا۔ سرکاری رجسٹر میں 'نارمل' کا اندراج کر کے وہ دراصل اس امر کی تصدیق کرتا تھا کہ 'مریض' قطعی طور پر مر چکا ہے۔ ایک دفعہ چرنجی اپنی بیماری کے باعث چھٹی کی درخواست لے کر آیا تو ڈاکٹر سردپ نے اس سے کہا۔'' اِدھر آؤ، تمہاری نبض دیکھوں۔'' اور نبض پر انگلی رکھے چند لمحات وہ اسے نہایت متانت سے محسوس کرتا رہا اور پھر بولا۔'' تمہیں کوئی تکلیف نہیں، جاؤ کام کرو۔''

''مگر صاحب ____''

''کہہ دیا ہے نا' جاؤ، تمہاری نبض بالکل بند ہے۔''

چرنجی کا یہ حال تھا کہ ہنستے ہنستے وہ اپنی بیماری بھول گیا تھا اور ڈاکٹر سردپ کو غصہ آ رہا تھا کہ یہ بدتمیز اس طرح ہنس کیوں رہا ہے۔

چرنجی کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔

''ایک بات کہوں صاحب؟'' ایک دن وہ ڈاکٹر سے کہنے لگا۔'' اگر کبھی اچانک میرا دم نکل جائے تو مجھے کہیں ڈاکٹری تجربوں کے لئے مت بھیجئے۔''

''کیوں؟''

آپ تو جانتے ہیں صاحب، میڈیکل کالجوں کے لونڈے چنگوں بھلوں کو کس طرح لوٹا تے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے گوشت کی گٹھڑیوں میں ٹوٹی پھوٹی ہڈیاں سی ہوئی ہیں۔''

''اب بھی تو تم ایسے ہی دکھتے ہو۔''

چپڑاسی نے سر جھکانے کے لئے اپنی ٹوپی اتاری تو اس کے گنجے سر سے دس کا نوٹ نیچے آگرا۔

''یہ نوٹ کہاں سے مارا ہے؟''

''آپ سے کیا پردہ' صاحب گنگو ٹھیکیدار آیا ہوا تھا۔ انعام دے گیا ہے۔ آپ کو سلام بولنے کو کہہ گیا ہے۔''

''اس سے کہو، صرف سلام بول دینے سے کام نہیں بنتا۔''

''بڑا دلدار سیٹھ ہے صاحب آپ اس کی طرف ایک بار نظر بھر کے دیکھیں گے تو وہ اپنے آپ کو بیچ کر بھی آپ کی خدمت کرتا رہے گا۔''

ڈاکٹر سروپ نے خود کو پھر یاد دلایا کہ آج اسکاچ اور سوڈا لے کر جاؤں گا۔

''آج پھر؟''

پچھلے ہفتے تو اس کی بیوی نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالیا تھا اور پھر بلڈ پریشر سے بستر پر چت ہوگئی تھی اور کھلی آنکھوں سے بے ہوش پڑی تھی۔ اس نے انجانے میں اس کی آنکھیں بند جر کر دی تھیں اور اس کے دل کی دھڑکن محسوس کر کے ایک دم خوف سے پیچھے ہٹ گیا تھا کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر سروپ نے اچانک سر اٹھایا اور دیکھا کہ کوئی شخص اس کے دفتر کے دروازے کے عین وسط میں اڑا اڑا سا کھڑا اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے تو ڈاکٹر نے اسے باہر انتظار کرنے کو کہا اور پھر آنکھیں جھپک کر حیرت اور ہیبت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا ــــــ یہ

کیسے ہوسکتا ہے؟

''میں اپنے بھائی کو لینے آیا ہوں۔'' وہ شخص دو چار قدم آفس کے اندر چلا آیا۔

''میں اُسے دیکھ آیا ہوں شاید وہ وہی تھا۔''

''او____ہ____ہ____!'' ڈاکٹر نے ڈھیلا ہو کر کھلی سانس لی۔'' مجھے خیال گزرا تھا تمہارا بھائی خود آپ ہی مردہ خانے سے اٹھ کر چلا آیا ہے۔ پرسوں شام کو اسے یہاں بھیجا گیا تھا۔''

''ہم جڑواں بھائی ہیں۔'' اس شخص نے گریاں سی آواز میں ڈاکٹر کو بتایا۔

ڈاکٹر اپنے حواس پر قابو پانے کیلئے ہنسنے لگا۔'' میں تو ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ مانو ایک مردے نے دوسرے پر آنکھیں گاڑی رکھی ہوں۔'' ڈاکٹر نے اسے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔'' بیٹھ جاؤ۔'' وہ ابھی تک اپنی واردات کے طلسم میں گرفتار تھا۔'' مردے بھی ضرور کہیں نہ کہیں ہماری طرح بس جاتے ہوں گے۔ ٹھہرو، بولو نہیں____ کیا پتہ، کیا پتہ، ہم بھی مردے ہوں۔ میں نے کہیں پڑھ رکھا ہے کہ ہر شخص دراصل اپنی موت سے پہلے ہی مر چکا ہوتا ہے۔ نامعلوم، کب سے____؟'' وہ گویا اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا تھا۔'' مجھے بڑی دُھندلی سی یاد آرہی ہے، میں نے بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی تھی اور پھر مجھے مردہ خانے میں بھیج دیا گیا تھا، پچھلے پندرہ سال سے میں یہاں گل سڑ رہا ہوں۔'' اس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر بتایا اس اجنبی کے سامنے کیا رونا رونے لگے ہو۔ نیور مائینڈ! وہ سر جھٹک کے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔'' میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

'میں اپنے بھائی کی لاش لینے آیا ہوں۔''

اب تک ڈاکٹر سرد پ اپنے معول پر آچکا تھا۔

''لاشیں یونہی ہر آتے جاتے کے حوالے نہیں کی جاتیں۔ پہلے ہمارے آفس کا ایک فارم بھر و نہیں، دو____ سمجھے! کسی مجسٹریٹ کا تصدیق شدہ حلف نامہ لاؤ اور ایک اعلان نامہ، جس پر دو گواہوں کے دستخط ہوں اور ان دو میں سے ایک کو ہمارے دفتر کا کوئی آدمی بخوبی جانتا

ہو ـــــ جاؤاب!''

نو وارد پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کہاں جاؤں؟''

''کہیں بھی، میں کیا بتاؤ،''

''فارم، اعلان نامہ ـــــ ''

ساتھ کے دفتر میں بڑے بابو سے ملو وہ تمہیں سمجھا دے گا۔''

وہ شخص جانے کے لئے اٹھنے لگا تو ڈاکٹر سروپ کو شاید اس پر ترس آ گیا۔'' بیٹھ جاؤ۔ مردے کے مندرجات میرے رجسٹر میں نوٹ کروا کے جاؤ'' اس نے ایک رجسٹر کھول لیا۔ ''نام؟''

''امریک سنگھ۔''

''امریک سنگھ کس کا نام ہے تمہارا یا اس کا؟''

''میرا۔''

''ارے بھائی، اس کا نام بتاؤ جسے تم لینے آئے ہو؟''

''کشن سنگھ۔''

''عمر؟''

''میری عمر پینتیس برس ہے۔''

''مجھے تمہاری عمر سے کیا غرض؟ لاش کی عمر بتاؤ؟''

''ہم جڑواں بھائی ہیں۔''

''تو میں کیا کروں؟ لاش کی عمر بتاؤ۔ اور اس کا پتہ؟''

امریک سنگھ چڑ گیا۔'' میں کیا پتہ بتاؤں؟ وہ تو آپ کے پاس ہی گل سڑ رہی ہے۔''

ڈاکٹر بھی چڑ گیا۔'' گل سڑ نہیں رہی۔ ایئر کنڈیشنڈ ڈارمیٹری میں ہے اور وہاں برف میں رکھی ہے۔''

''میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ ایئر کنڈیشنر کام نہیں کر رہا اور جتنی بھی تھوڑی سی برف تھی، وہ

پگھل چکی تھی۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' ڈاکٹر سروپ نے گھنٹی بجائی جسے سن کر چرنجی دوڑتا ہوا آپہنچا۔

ڈاکٹر نے بُو سونگھنے کے لئے ناک سے ایک لمبی سانس لی۔'' کیا تمہیں بُو آ رہی ہے چرنجی؟''

چرنجی نے بھی اسی کے مانند اپنی ناک کو پھر پھرایا۔

''ہاں بُو تو آ رہی ہے صاحب۔''

''تو میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ بڑے بابو سے کہو ایئر کنڈیشن والے کو فوراً بلائے نہیں تو لاشیں بُو کی تاب نہ لا کر اُدھر سے ادھر آ نکلیں گی۔ کیئر ٹیکر سے بھی میرے پاس آنے کو کہو۔ جاؤ!''

چرنجی اپنی ٹوپی اتارنے کے لئے سر کی طرف ہاتھ اٹھانے لگا تو ڈاکٹر سروپ نے چوکنا ہو کر اس کو روک دیا۔ ''نہیں، سر کو ڈھنپا رہنے دو۔'' پھر وہ امریک سنگھ سے مخاطب ہوا۔

''تم بھی بڑے بابو سے مل کر فارم وارم بھر کے اپنی لاش اٹھوالو۔''

''میری لاش؟''

''تو کیا میری؟ ____ جاؤ اٹھوالو۔''

''کسے اٹھواؤں؟ سبھی کے سبھی تو پھول کر ایک جیسے دکھ رہے ہیں۔''

''مگر تم نے بتایا ہے، تم اسے دیکھ آئے ہو۔''

''ہاں، ایک پر مجھے گمان تو ہوا تھا، پر ہوسکتا ہے وہ کوئی اور ہو۔''

''تو کیا ہوا؟ سبھی تمہارے بھائی ہیں۔''

''مگر مجھے صرف اپنے بھائی کو لے کر جانا ہے۔''

''تمہارا بھائی اب رہ ہی کہاں گیا ہے؟

''مگر ____''

''ڈاکٹر صاحب کی جان کیوں کھا رہے ہو، بھائی؟'' چرنجی نے اپنے افسر کی مدد کے لئے مداخلت کی'' کر کے بولتا ہوں صاحب، ہرایرے غیرے کو اندر مت آنے دیا کریں۔'' پھر وہ

امریک سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھانے لگا۔ ''اپنے بھائی کو تو تم ہی نے پہچاننا ہے ہم نے تو نہیں۔''

ڈاکٹر سروپ اپنے غصے پر قابو پانے کے لئے سگریٹ سلگانے لگا۔ ''کیا زمانہ آ گیا ہے بھائی اپنے بھائی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔''

کشن سنگھ منہ لٹکا کر چڑنجی کیس اتھ باہر جانے لگا تو ڈاکٹر سروپ کو پھر اس پر ترس آنے لگا۔ ''ٹھہرو، گھبراؤ نہیں کوشش کروگے تو پہچان لوگے۔'' سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر اسے خواہش ہونے لگی کہ بے چارے کی مزید مدد کی جائے۔ ''اگر تمہیں کوئی ایسا گواہ نہ ملے جسے ہم جانتے ہوں تو ہمارے اس چپراسی کو ہی اپنا گواہ بنالو____ اور سنو، تمہارے حلف نامہ پر بھی بڑا بابو کسی نوٹری سے دستخط کروالے گا۔''

''تھینک یو ڈاکٹر صاحب۔''

''کوئی بات نہیں۔'' ڈاکٹر سروپ نے مسکراتے ہوئے سوچا کہ بڑا بابو اور چڑنجی اس سے پچاس روپے تو اینٹھ ہی لیں گے، جن میں سے بیس اپنے لئے کھرے ہو جائیں گے۔

اس نے ستور مسکراتے ہوئے اپنے سامنے رکھے کورے کاغذ پر آج کی ٹوٹل آمدنی کے ہند سے لکھے ہیں____ ۲۰+۴۰۰____

چڑنجی اور امریک سنگھ اس کے کمرے سے باہر ہو لیے اور اس نے لاشوں کی بو سونگھنے کے لئے پھر اپنی ناک کو اوپر اٹھا کر ایک بڑی لمبی سانس اور بڑبڑایا۔ ''بُو پہلے سے بڑھ گئی ہے۔'' اس قسم کی بُو محسوس کر کے وہ بڑا بے چین ہو جاتا۔ اوّل تو وہ مُردوں کی ڈارمیسٹری کا رُخ ہی نہ کرتا، یا پھر اُدھر جانا بیحد ضروری ہو جاتا تو ہدایت بھیج کر بلڈنگ کے اس ونگ میں خوب دوائیاں چھڑ کوالیتا اور اکثر وہاں کیئر ٹیکر کے دفتر میں ہی کام نمٹا کر لوٹ آتا۔ پچھلے ہفتے اس کے ڈائرکٹر نے اسے اطلاع دی تھی کہ آئندہ سال سے ہر لاش کے بستر پر ایک فریز رفٹ کرنے کی تجویز منظور ہوگئی ہے۔

''وہ ٹھیک ہے سر'' اس نے جواب دیا تھا۔ ''مگر اتنے سے پاور میں اب ہماری مشینوں کے

تار پھٹ جاتے ہیں۔اس وقت کیا بنے گا؟‘‘

اس کے افسر نے اسے متنبہ کرنے کے لہجے میں کہا تھا۔’’تم ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھتے ہو ینگ مین، آگے کی طرف دیکھا کرو۔‘‘

سالا حرامی! آپ خود تو آگے کی طرف دیکھتا ہے نہ پیچھے کی طرف، بس جہاں بھی دیکھیں، ہم ہی دیکھیں ____ ڈاکٹر سروپ کو خیال آیا کہ آج ابھی تک مُردوں کی کل تعداد چیک نہیں کی۔ اس نے سگریٹ بجھا کر متعلقہ رجسٹر اپنے آگے کھول اور کاغذ مردے گننے لگا‘ _ایک دو، تین ____ آٹھ __ سولہ ___ اٹھارہ اور یہ انیس۔‘‘ پھر اس نے کیئرٹیکر کے بھرے ہوئے کالم پر نگاہ دوڑائی تاکہ ایکچولز بھی دیکھ لے ____ اٹھارہ ____ !ارے ایک کم کیسے ہوگا ____ ؟اس نے گھنٹی بجائی اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا اور کوئی نہ آیا تو پھر رجسٹر پر جھک گیا ____ ایک‘ دو ____ انیس !ایک مردہ کہاں غائب ہوگیا ____ ، کہیں واقعی وہ وہی تو نہ تھا۔اسے کشن سنگھ کا خیال آیا اور وہ بدحواس سی ہنسی ہنس دیا۔ایک بار پھر اس نے رجسٹر پر نگاہ جمالی ____ ایک دو‘ تین ____

’’آپ نے گھنٹی بجائی ہے صاحب؟‘‘ چرنجی نے کمرے میں داخل ہوکر پوچھا اور اس کے پیچھے ایک اور آدمی داخل ہوا‘‘ آپ نے یاد کیا ہے؟‘‘

ڈاکٹر سروپ نے نئے آدمی کو گھور کر دیکھا۔’’تم کون ہو،‘‘

’’میں کیئرٹیکر صاحب کا نیا چپڑاسی ہوں صاحب‘ راجو‘‘

’’ارے ہاں‘ تم ہی تو ہو۔میں تمہیں پہچان ہی نہیں پایا۔‘‘ ڈاکٹر نے اسکے منہ کی طرف اشارہ کیا۔’’تم نے یہ پھنسیوں کا نقاب جو چڑھا رکھا ہے۔‘‘

’’علاج کروا رہا ہوں صاحب۔‘‘

’’سوچ سوچ کر کپا بنے ہوے ہو۔کیا تمہیں اپنے آپ سے بو نہیں آتی؟‘‘

’’کا کروں صاحب۔‘‘

''برف۔منہ پر برف رکھا کروں۔'' ڈاکٹر نے اچانک اپنے نتھنوں کو پھڑکتا ہوا محسوس کیا
''پھر وہی بُو!'' اس نے نتھنوں کے راستے سانس لیں۔''ہاں بو تو آ رہی ہے۔''

''کیئر ٹیکر کہاں ہے؟'' ڈاکٹر کو یاد آیا کہ کیئر ٹیکر نے تو آج اپنے دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت لے رکھی ہیں۔''کیا تمہارا ایئر کنڈیشنر چل رہا ہے؟''

''میں اتنا بھاگیہ شالی کہاں ہوں صاحب؟'' راجو احمقوں کی طرح کھی کھی کرنے لگا۔''یہ نعمت تو مُردوں کو ہی نصیب ہیں۔''

راجو کی بات ڈاکٹر کی دل کو جا لگی۔ہاں اس دنیا کی عجیب ریت ہے۔یہ نعمت صرف انہیں نصیب ہے جو اس کی زندگی بخش ٹھنڈک میں بھی بے جان پڑے رہتے ہیں ____ ابھی تک کھی کھی کیے جا رہے ہو۔میری بات کا سیدھا جواب دو ____''

''کر کے بولتا ہوں افسر کے سامنے زیادہ عقل مت بگھارو۔'' چپڑ نجی نے اپنی ٹوپی اتارنا چاہی لیکن ڈاکٹر کی نظر میں ڈانٹ محسوس کر کے اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

ڈاکٹر سروپ کو یکبارگی یاد آیا کے ایک مردے کا حساب جڑ پا رہا۔اس نے چپڑ نجی کو حکم دیا کہ وہ بڑے بابو کو بلائے' لیکن پھر اسے جھٹ ہی روک لیا ____ ''اس نے راجو سے مردوں کی تعداد کے بارے میں استفسار کیا اور راجو نے اسے فوراً جواب دیا ____ ''پورے اٹھارا ہے صاحب۔''

''کیا تمہیں یقین ہے' اٹھارہ ہیں؟''

''میرا اور کام ہی کیا ہے صاحب؟ دروازے پر بیٹھا انہیں ہی بار بار گنتا رہتا ہوں۔
اب تو اس کی عادت ہو گئی ہے صاحب' جدھر بھی چند لوگ اکٹھے دکھ جائیں' انہیں گننا شروع کر دیتا ہوں۔''

''دیکھو راجو۔'' ڈاکٹر سروپ نے اچانک کچھ فیصلہ کر کے اپنا منہ بڑا پکا کر لیا۔''اب میں تم سے صاف صاف پوچھ رہا ہوں' اگر تم لوگوں سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو بتا دو میں تمہیں بچا لوں گا۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا' صاحب۔''

''تمہاری سمجھ میں اتنا تو آ رہا ہے کہ ایک مردہ کالے دھندے میں ہزار پندرہ سو پر اٹھتا ہے۔اگر تم نے گول

مال نہیں کیا تو ایک مردہ کہاں گیا؟ سرکار تو اس کی جگہ مجھے لٹا کر حساب پورا کرے گی۔ تمہارا کیا جائے گا؟''

''نہیں صاحب۔'' ڈاکٹر کے چہیتے چرنجی نے مداخلت کی۔ ''میں راجو کی طرف سے آگ میں ہاتھ ڈال کر کہہ سکتا ہوں، وہ ایسا آدمی نہیں۔''

''تو پھر مُردہ کہاں گیا؟ جیسے بھی ہو مجھے اسی وقت اپنا مردہ چاہیے۔'' ڈاکٹر نے ایک بار اور رجسٹر پر اپنی پریشان نگاہ دوڑائی اور ایک خانے میں اس کی آنکھیں لٹک گئیں اور وہ مسرت سے اچھل پڑا۔ ''مل گیا ــــــ یہ دیکھو، بڑے بابو نے یہاں ایک ہی مردے کی تفصیلات غلطی سے دوبار درج کردی ہیں۔ مُردے اٹھارہ ہی میں ــــــ! جاؤ، بڑے بابو کو بلاؤ۔'' مگر اس کا جی متلانے لگا۔ ''نہیں رہنے دو ــــ کیا تمہیں بو محسوس نہیں ہو رہی ہے؟'' اسے نامعلوم کیا سوجھی ہے کہ وہ اپنا ہی بدن سونگھنے لگا ہے۔

''نہیں، صاحب، اس وقت تو نہیں ہو رہی ہے۔''

لاشوں کے پاس بیٹھ کر تمہاری ناک ٹھیک طرح کام نہیں کرتی۔ میں نے تم سے پوچھا تھا، مردہ خانے کا ایئر کنڈیشنر چل رہا ہے یا بند پڑا ہے۔''

''دس پندرہ منٹ بند رہا صاحب، پھر آپ ہی آپ چلنے لگا۔''

''یہاں سب ہی کچھ آپ ہی آپ چلے تو چلے تم سب لوگ نا اہل ہو۔ اگر میں تمہاری حفاظت نہ کروں تو تم سبھوں کو دو دن میں جوتے مار مار کے یہاں سے نکال دیا جائے۔''

''کر کے ہی تو سب آپ کے نام کی مالا جپتے ہیں صاحب۔''

''مگر کچھ کام بھی کیا کرو۔ کیا وہ حرامی کا پلا پوری برف بھیج رہا ہے؟''

''نہیں، صاحب، پہلے سے آدھی بھی نہیں بھیج رہا۔''

ڈاکٹر اپنی پتلون کی پچھلی جیب کی طرف ہاتھ لے گیا اور دانت پیس کر بولا۔ ''اس سے طے تو یہ ہوا تھا کہ لکھت سے آدھی ضرور بھیجے گا۔ چلو، کم سے کم ایک تہائی ہی بھیج دے مگر بے ایمان سارے وعدے بھول گیا ہے۔'' وہ اپنا بلڈ پریشر بڑھتا ہوا محسوس کر کے سگریٹ سلگانے لگا۔ ''گنگو ٹھیکیدار کو کہلوا بھیجو چرنجی، وہ مجھے

فوراً ملے۔"

چرنجی بغلیں بجانے لگا۔ "میں آج ہی اس کے پاس چلا جاؤں گا صاحب۔"

اسی اثنا میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو ڈارلنگ۔" ڈاکٹر کی بیوی کا ٹیلیفون تھا۔ "کیا؟ فرج میں برف نہیں بن پا رہی؟ بُو___؟___ کیوں___؟ ہاں مشین ہی بگڑ گئی ہو تو بُو آئے گی ہی۔"

☆☆

رضیہ سجاد ظہیر

کچھ تو کہیے

جاوید نے حسب دستور سائکل ایک جھٹکے کے ساتھ برآمدے میں چڑھائی دھڑام سے دروازہ کھولا۔ اندر والے برآمدے میں چائے میز پر لگی تھی اس پر ایک نظر ڈالی اور ہاتھ دھونے لگا۔

شوہر کے آنے کی آہٹ پاکر یاسمین ہاتھ میں نمک پاروں کی بھری ہوئی پلیٹ لیے نکلی جاوید بیوی کو دیکھتے ہی بولا ''یسی بھئی ساڑھے تین بجے سے میچ ہے اور تین بج رہے ہیں، میرے کپڑے نکال دیجیے۔''

یاسمین آہستہ سے بولی ''ہاں نکال دیئے ہیں ____''

جاوید اپنے میچ کے چکر میں اس قدر مصروف تھا کہ اسے نہ تو یاسمین کے چہرے پر بدلتے ہوئے جذبات نظر آئے نہ لہجے کی افسردگی کا احساس ہوا، کھٹاک سے کرسی کھینچ کر وہ چائے پر ڈٹ گیا۔ ____

جاوید باہر نکلا تو یاسمین دروازہ بند کر رہی تھی کہ اسے دور سے پروین آتی ہوئی دکھائی دی، پروین کو آتے دیکھ کر یاسمین کو نہ جانے کیوں ایک دم سے وہ دن یاد آئے جب وہ پروین کے برابر تھی کیا امنگوں کا زمانہ تھا۔ آئینہ دیکھنے کے کچھ معنی تھے، پھولوں میں رنگینی ایک بات تھی خوشبو میں ایک کیفیت تھی؟ قدم قدم پر زندگی اور نئی اور بہاراں لگتی تھی، پھر انعام کی صورت اس کی نظروں میں پھرنے لگی انعام جو اس کو چاہتا تھا، اسے پیار کرتا تھا، اسے اپنے گھر کی رانی بنانے کی تمنا رکھتا تھا ____ اب وہ نہ جانے کہاں ہوگا، اتنے برس ہوئے جب معلوم ہوا تھا کہ کلکتہ میں ہے کسی فرم میں ہے اور شادی نہیں کی ہے۔ شعر بہت اچھے کہتا ہے۔ شعر تو وہ جب بھی بہت اچھے کہتا تھا ____ وہ کیا کہا تھا اس نے........ پروین نے دور سے ہی آواز دی ''ہلو امی'' اور پھر دوڑتی ہوئی

آکر اسے لپٹ گئی۔" امی ____ ذرا تکلیف کرکے ہمارا گلابی جوڑا استری کردیجئے ____ وہ اختری کی سالگرہ ہے ____ ہم اسے پریزنٹ تو وہ دے دیں گے عطرعنا کی شیشی جو...." عطرحنا کے ذکر پر یاسمیں کو اپنی شادی کا شروع زمانہ یاد آگیا ____ کبھی کبھی انسان کو نہ جانے کیا ہوجاتا ہے کہ یادیں آتی ہی چلی جاتی ہیں ____ جب بھی باہر جانا ہوتا تو جاوید یاسمین کے کپڑے خود انتخاب کرتا، جاوید کے دفتر سے آنے کا وقت ہوتا تو یاسمین خاص اہتمام سے تیار رہتی ____ پروین اور اصغر جب تک چھوٹے رہے تو وہ بھی اپنی امی کے تیار ہونے کا انتظار کرتے رہتے اور پھر اسے آنکھیں پھاڑے دیکھا کرتے ____ اصغر کے خیال پر اس کو یاد آیا کہ کل ہی اس کا خط علی گڑھ سے آیا تھا جس میں ایک بات بار بار دوہرائی گئی تھی "میرے یگرم کپڑے سب ٹھیک کردیجئے گا۔

ڈیبیٹ میں کانپور جارہا ہوں، واپسی میں لکھنؤ سے ہوتا ہوا آؤں گا۔"

یاسمیں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اب زندگی کتنی عجیب ہوگئی تھی کئی سال سے اس نے اچھے کپڑے پہننے چھوڑ دیئے تھے، کہتی تو وہ یہی تھی اب میں کیا پہنوں پروین پہنے گی لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ کس کو دکھانے کے لئے پہنتی، جاوید اب اس سے فرمائش ہی نہیں کرتا تھا کہ یہ پہنو وہ پہنو ____ وہ خود سے جاوید کے لئے بن سنور کر کیوں اپنی ناک نیچی کرتی۔ آخر کہہ کے تو کسی سے محبت نہیں کی جاسکتی۔ جاوید تو فٹ بال اور ریسرچ میں مصروف رہتا تھا۔ اور اصغر اور پروین ہر وقت اپنی پڑھائی اور اپنے دوستوں میں لگے رہتے تھے۔ ویسے تو لگتا تھا کہ گھر میں ہر شخص کو اس کی ضرورت ہے لیکن اس کی ذات جیسے ویٹنگ روم بن گئی تھی کہ سب ہی گاڑیاں ٹھہرتی تھیں پر اپنا وقت ختم کرکے چلی جاتی تھیں ____ سب ہی مسافر اترتے تھے پر اپنے اپنے رستے نکل لیتے تھے ____ بیٹا بیٹی شوہر سب اس کے محتاج تھے مگر اپنی ضرورت کے لئے اپنے آرام کے لئے ____ اس کی ذات سے پیار کرنے والا اس کے دکھ درد کو محسوس کرنے والا کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا ____ اسنے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری ____ اور پروین کا گلابی جوڑا نکالنے لگی۔ پروین کے

جانے کے بعد وہ اصغر کے گرم موزے رفو کرنے بیٹھ ہی رہی تھی کہ دستک ہوئی ''محمود ____ دیکھ دروازے پر کون ہے۔ کہہ دینا صاحب نہیں ہیں۔''

محمود ایک پرچہ لئے ہوئے واپس آیا اور یاسمین کی طرف بڑھتا ہوا بولا ''بیگم صاحب کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔''

پرچے پر نظر پڑی تو رفو کی سوئی یاسمین کی انگلی میں دھنستے دھنستے رہ گئی! اسے یوں لگا کہ سترہ سال کسی کونے میں جا چھپے اور پرانا زمانہ خزاں کے کسی سوکھے پتے کی طرح کہیں سے اڑتا ہوا یکا یک اسکے قدموں پر آ گرا ____ اس کے سامنے حروف اور الفاظ ناچ رہے تھے ''انعام الرحمٰن ____ کلکتہ۔''

وہ اٹھی بہکتے قدموں اور دھڑکتے دل سے کھڑکی کی آڑ سے باہر نظر ڈالی ____ ہاں انعام ہی تھا، وہی لمبا قد گھونگھریالے بال البتہ ان میں کافی سفیدی آ گئی تھی ____ ویسی ہی نیلی ٹائی اور فاختئی سوٹ ہاتھ میں اسی ادا سے سگریٹ دبا، دوسرا ہاتھ اسی طرح پتلون کی جیب میں پڑا۔

یاسمین نے دروازہ کھولا اور بغیر انعام کی طرف دیکھے مڑ کر اندر چلنے لگی، وہ پیچھے پیچھے آیا میز پر لگے چائے کے برتنوں کو دیکھ کر بولا ''واہ بھئی بڑے موقع سے آئے ہم ____ تم چائے پی چکیں۔''

یاسمین نے کرسی کا ہتھہ پکڑا، آہستہ سے بہکتے ہوئے الفاظ میں بولی ''تم پیو گے۔''

''ضرور ____ لیکن یہاں نہیں ____ تم...... اگر تیار ہو جاؤ تو کہیں چلیں۔''

پھر آہستہ سے بولا ''کوئی گلابی ساری ہو تو پہننا۔''

یاسمین کو عجیب لگا ____ مدتوں کے بعد کسی نے اس سے کہا کہ ایسے رنگ کے کپڑے پہنو ____

جاوید میچ جیت کر آیا ____ داخل ہوتے ہی آواز دی۔

''سیمیں'' ____ خالی گھر میں ایک گونج سنائی دی سیمیں ____ ''

کمرے میں چاروں طرف سناٹا چھایا تھا اور ایسے آثار نمایاں تھے کہ یاسمین جلدی میں تیار ہو کر کہیں گئی ہے ____ سینٹ کی ہلکی سی خوشبو فضا میں رچی تھی، تکیہ پر پڑی ہوئی کنگھی میں دو چار بال الجھے ہوئے تھے، پلنگ کے نیچے جوتے کا ڈبہ اوندھا پڑا تھا جس کے معنی تھے کہ وہ نئی سینڈل پہن کر گئی ہے ____ چھوٹی میز پر وہ ڈبہ کھلا پڑا تھا ____ جس میں یاسمین اپنے بندے اور ہار رکھتی تھی مدتوں بعد نظر آیا یہ کہ ایک عرصہ سے یاسمین نے زیور پہننا چھوڑ دیا تھا، نہ کپڑوں ہی کا کوئی خاص خیال کرتی تھی ____ اور اگر یاسمین کا جو دل تو نہ چاہتا تھا کہ جاوید کے لئے خوبصورت کپڑے پہنے، زیور پہنے، بنے سنورے پھر جاوید کیوں اس سے کہہ کر بھرم کھوتا؟ آخر کہہ کے تو کسی سے محبت نہیں کروائی جا سکتی، وہ کیوں اپنی ناک نیچی کرتا؟ ____ اس نے ایک سگریٹ نکال کر منہ میں لگایا اور اس طرح ماچس جلائی جیسے اپنے آپ کو اور اس سارے گھر کو پھونک کر رکھ دے گا ____ جلتی دیا سلائی سگرٹ تک پہنچا ہی چاہتی تھی کہ صدر دروازہ کھلا، یاسمین کی ہنسی کی آواز آئی، پھر خدا حافظ سنائی دیا، بھاری قدموں کے واپس لوٹنے کی آہٹ آئی اور یکا یک یاسمین اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی ____ وہ جیسے حیران رہ گیا ____ سترہ سال پہلے کی یاسمین پھر زندہ ہو گئی تھی! گلابی ساڑی، بالوں میں پھول گلے اور کان میں زیور، پاؤں میں نئی سینڈل اور پھر وہ یکا یک ہنس پڑی ____ سترہ سال پہلے کی ہنسی جاوید کے کانوں میں گونجنے لگی ____ مدتوں بعد سنائی دی یہ ہنسی!

''کیا دیکھ رہے ہو بھئی'' یاسمین ذرا جھینپ کر بولی ____ ''دیکھتا ہوں کہ...... تم ایک دم سے اتنی اچھی کیسے لگنے لگیں'' ____ یاسمین چپ رہی! جاوید نے کرسی پر پہلو بدلا آہستہ سے بولا تمہیں یاد ہے شادی کے دوسرے دن بڑی باجی والی دعوت میں تم نے گلابی ساری پہنی تھی ____ اس دن بھی یہ رنگ تم پر بہت اچھا لگ رہا تھا اور آج بھی......''

یاسمین مسکرائی اور گردن آگے بڑھا کر بہت دھیمے سے شکایتی لہجے میں بولی لیکن اس دن اور آج کے دن کے بیچ میں تم نے کیوں نہیں سوچا کہ مجھ پر گلابی رنگ اچھا لگتا ہے۔''

جیلانی بانو

ظلِ سبحانی

سا ــــــ رے ــــــ! گا ــــــ ما ــــــ پا ــــــ دھا ــــــ نی

ظلِ سبحانی بھیرویں کے سروں پر پلکیں جھپکانے لگے۔

محل کا بوڑھا موسیقار آج اپنے حجرے کے بجائے ظلِ سبحانی کی خواب گاہ کے نیچے بیٹھا گیا تھا۔ تاکہ پو پھٹنے سے پہلے ظل سبحانی کو جگا سکے۔

ہوا یوں اس لیے کہ کل دربار عام کا اعلان ہوتے ہی سارے ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ دربار عام کے جھروکے سے نظر آنے والے در و بام کو خوبصورت بنانے کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ بعض اونچے مکانوں کو چند گھنٹوں میں گرا دینا پڑا۔ تاکہ ظلِ سبحانی سورج کے حسن کو کسی رُکاوٹ کے بغیر دیکھ سکیں۔ سڑکوں اور بدصورت بلڈنگوں پر رنگ کیا گیا۔ محل کے سامنے سے گزرنے والی ٹریفک کو کنڑول کرنے کے لئے پولیس کے خصوصی دستے ساری رات انتظامات میں مصروف رہے۔

پھر جب زلفِ شب کمر تک پہنچتی تو بوڑھے موسیقار کی آواز محل کے اندھیرے میں ایک ننھے سے ستارے کی طرح لو دینے لگی۔

سا ــــــ رے ــــــ! گا ــــــ ما ــــــ پا ــــــ دھا ــــــ نی

بھیرویں کے سات کومل سُر مل کر ایک سُر ساگر بنے اور سارے محل میں بہنے لگے۔ سروں کا یہ سمپورن سنگار روپ اندھیرے میں پھیلنے لگا تو گہری تاریکی میں لپٹا ہوا سورج بھی جیسے بے کل اٹھا اور ظلِ سبحانی نے اپنے پاس لیٹی ہوئی عورت کو لات مارنے کے بعد سونے کے نقشین چھپر کھٹ سے نیچے دھکیلا اور زور سے ڈانٹا ــــــ

''یہ کیسا شور ہے ــــــ؟''

''ظلِ سبحانی، آج حضور کے حکم کے مطابق محل کا موسیقار عالی جاہ کو صبح کا راگ گا کر جگا رہا ہے تا کہ عالی جاہ نکلتے سورج کا خوبصورت نظارہ کر سکیں۔'' ایک غلام نے ڈر کے مارے کانپتے ہوئے عرض کیا۔

''تو کیا سورج نکل گیا ——؟'' انھوں نے غصہ میں ریشمی تکیے کو پیٹ ڈالا۔

''جی —— جی حضور —— بس اب نکلنا ہی چاہتا ہے۔''

اصل بات یہ تھی کہ ابھی سورج محل سے بہت دور تھا۔ مگر بوڑھے موسیقار کی آواز نے چاروں طرف ایک جوت سی جگا دی تھی۔

سا —— رے —— ! گا —— ما —— پا —— دھا —— نی

''نہیں —— جب تک ہم اسے دیکھنے کے لیے تیار نہ ہو جائیں سورج نہیں نکل سکتا۔''

''جو حکم عالی جاہ''۔ وزیر اعظم دونوں ہاتھوں سے ڈھیلی ڈھالی پتلون کو اوپر سرکا کے سامنے کی طرف جھکے اور پھر الٹے پیروں ہوم منسٹر کے پاس دوڑے ——

''سرکار کا حکم ہے کہ جب تک وہ تیار نہ ہو جائیں آج سورج نہ نکلے۔''

''ہائیں —— ! یہ کیسے ہوسکتا ہے ——؟ ہوم منسٹر نے اپنی گنجی چندیا ہاتھ پھیر کر کہا —— اور پھر وہ کچھ سوچ کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے کلچرل افیرز سے منسٹر ملنے۔

''بھئی یہ چاند، سورج، ستارے تو سب کلچرل افیرز کی منسٹری کے تحت آتے ہیں نا ——؟

''چاند، سوج، ستارے ——؟ ہائے اللہ، یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ——؟'' کلچرل افیرز کی منسٹر ایک خاتون تھیں، جو دن رات اپنی منسٹری میں مصروف رہتیں۔ یعنی آئینے کے سامنے بیٹھی اپنی بھنویں، پلکیں اور زُلفیں سنوارا کرتی تھیں۔

''ہاں ہاں، بالکل ہیں۔'' ہوم منسٹر نے غصے سے پاؤں پٹک کر کہا ——

''چاند، سورج، ستارے، یہ سب اسٹیج کے ڈراموں اور کلچرل پروگراموں ہی میں تو کام آتے ہیں نا، تو بس، ظلِ سبحانی کا حکم ہے کہ آج جب تک وہ تیار نہ ہو جائیں سورج نہ نکلے۔''

''اوئی اللہ'' کلچرل افیرز کی منسٹر نے کمر پر ہاتھ رکھا اُنگلی ناک پر ٹکائی۔ ''نکلتے سورج کو میں کیسے روکوں گی جی ـــــ؟''

''مت روکو ـــــ اپنی منسٹری سے بھی ہاتھ دھولو۔'' سورج کی باگ ڈور کلچرل افیرز کی منسٹر کو سونپ کر وہ دوڑے دوسرے انتظامات کی دیکھ بھال کرنے۔

''اے ہے۔ اب کیا کروں'' شریمتی منسٹر نے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچا اور پھر اُنہیں ایک ترکیب سوجھی۔ ابھی فلم ڈویژن والوں کو فون کروں گی کہ نکلتے سورج کی ایک فلم لا کر محل کے سامنے دکھائیں۔ اب وہ کچھ اطمینان کے ساتھ آئینے کے سامنے بیٹھ کر لپ اسٹک کا شیڈ انتخاب کرنے لگیں۔ اتنی دیر میں دھیمے دھیمے بھیرویں کے سُر ظلِ سُبحانی کو دس نوکروں کی مدد سے تیار کروا کے جھروکے تک لے آئے تھے۔ خواب گاہ سے جھروکے تک تمام راستے کو سُرخ گلابوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ جھروکے کے بیچ میں سونے کے فریم والی سرخ مخمل کی کرسی بچھی تھی۔ آس پاس فرانسیسی عطر میں ڈوبے ہوئے مورچھل ہاتھوں میں اٹھائے دو خوبصورت خادمائیں پتھر کی مورت بنی کھڑی تھیں۔

درِ تانا دیرے نادیم دیم تانہ نا

یالائی یالائی یالوم تانا دیرے نا

موسیقار اب جیسے اُجالے کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ بہلاوے دے رہا تھا۔
بجلی کی طرح کبھی ادھر چمکتا، کبھی اُدھر دمکتا ـــــ

''ملاحظہ فرمایئے عالی جاہ۔ یہ کرنوں کا راجہ اب اُجالے کے رتھ پر سوار ہولے ہولے ہماری طرف بڑھ رہا ہے ـــــ شاعر ایک کونے میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور اپنی رنگین بیانی سے اس منظر کو اور خوبصورت بنانے کی کوشش کر رہا تھا ـــــ ڈگمگاتے قدموں اور کانپتے ہاتھوں سے، کئی خاموں کی مدد سے ظلِ سبحانی مسند پر جلوہ نشین ہو گئے۔''

''یہ۔ یہ سورج کدھر سے نکل رہا ہے ـــــ؟'' رات کی سرشاری کے کڑوے ذائقے اور

تھکا دینے والی رنگینیوں کی وجہ سے اُن کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں قابو میں نہ تھے۔

''جی ـــــ جی سرکار ـــــ وہ ـــــ وہ ـــــ وزیرِ اعظم نے گھبرا کے مدد کے لیے ہوم منسٹر کی طرف دیکھا۔ ہوم منسٹر بھی نہیں جانتے تھے کہ سورج کس طرح سے نکلتا ہے۔ اس لیے انھوں نے فوراً اربن ڈیولپ منٹ کے ڈائرکٹر کو ٹھوکا دیا اور اس نے جلدی جلدی شہر کا نقشہ سامنے پھیلا کر ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''مشرق سے عالی جاہ۔''

''مہ۔ مہ۔ مشرق سے ـــــ ظلِ سُبحانی نے گرج کر پوچھا۔

''مہ۔ مہ۔ مشرق سے کیوں ـــــ ! ہمارے ملک کا سورج مشرق میں کیوں جاتا ہے ـــــ ؟ اُدھر تو ہمارے دشمن کا علاقہ ہے۔''

''عالی جاہ، اس وقت اپنا چہرۂ مبارک سورج کی طرف رکھیں۔ ملاحظہ فرمایئے کہ نور کی ایک چادر سی آسمان پر لہراتی ہوئی نظر آنے لگی ہے۔ سورج تو حضور روز مشرق ہی سے نکلتا ہے اور مغرب ہی میں ڈوبتا ہے۔''

دِرتا نا دیرے نا دیم تا نہ نا

موسیقار کی آواز سے جیسے نور کی پھوار سی برس رہی تھی۔

''مہ۔ مہ۔ مغرب میں ڈوبتا ہے۔ ـــــ ؟ روزانہ یعنی کہ یورپ میں......؟ ظلِ سُبحانی نے بوجھل آنکھیں کھول کر ہکلاتے ہوئے شاعر سے پوچھا۔

''مغرب کی بے حیائی اور بے دینی دیکھنے کے لیے سورج روز رات کو وہاں رنگ رلیاں منانے جاتا ہے ـــــ ؟

''ہو منسٹر ـــــ ؟''

ہوم منسٹر تھر تھر کانپتے ہوئے، اپنی گنجی چندیا کو سامنے جھکائے، ہاتھ جوڑے آگے بڑھے۔

''ہوم منسٹر ـــــ آج سے ہمارے ملک کا سورج نہ تو مشرق سے نکلے گا اور نہ مغرب میں

ڈوبے گا ـــــ کیا سمجھے ـــــ؟''

''جی ـــــ جی سمجھ گیا جہاں پناہ'' ـــــ وزیرِ اعظم نے جلدی جلدی اس فرمانِ مبارک کو سنہرے فریم والے قرطاس پر سونے کے قلم سے لکھ لیا۔

''ہاں، ہابدولت اپنی سلطنت میں بے دینی اور بداخلاقی پھیلتے نہیں دیکھ سکتے۔'' انہوں نے تمام درباریوں کو داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اُن کے پیچھے وزیرِ اعظم، وزیرِ دفاع، ہوم منسٹر، کوتوال شہر اور دوسرے تمام وزیر ہاتھ باندھے، سر جھکائے کھڑے تھے کہ کیا پتہ اس وقت کس کی طلبی ہو جائے۔ وہ سب دل ہی دل میں شاعر کو کوس رہے تھے جس نے آج کی رات ان سب پر نیند حرام کر دی تھی۔

''اب دیکھیے حضور۔'' شاعر نے بے حد جوش میں تڑپ کر کہا۔

''اسی منظر کے لیے ایک شاعر نے کہا ہے۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

شاعر نے ہاتھ اُٹھا کر جھومتے ہوئے شعر سنایا۔

''یہ یہ کس کا شعر ہے ـــــ؟ ظلِ سُبحانی اُچھل پڑے۔ ''نعوذ باللہ'' یعنی اگر رسول نہ ہوتے تو ایک پیالی کافی سے کام چل جاتا اس ملعون شاعر کا ـــــ؟ کون ہے وہ دہریہ ـــــ اُسے ہمارے سامنے لاکر سو کوڑے مارے جائیں، تاکہ پھر کبھی ایسی کفر کی باتیں نہ بک سکے۔''

''جی مناسب ہے علی جاہ۔'' ہوم منسٹر حسب عادت سر پر پیر رکھ کے اس شاعر کو پکڑنے کے لیے بھاگے۔

اب ظلِ سُبحانی نے آنکھیں چندھیا کر سامنے کی طرف دیکھا تو دور آسمان پر سفید پرندوں کی قطاریں اڑتی نظر آئیں۔

''یہ۔ یہ پرندے کہاں جا رہے ہیں ـــــ؟'' انہوں نے پستول سے فائر کرنے کے انداز

میں وزیراعظم کی طرف ہاتھ اُٹھا کر پوچھا۔

''جی ظلِ سُبحانی، یہ تو آوارہ پنچھی ہیں۔صبح سویرے دانے دُنکے کی تلاش میں اُدھر سرحد کے پار جنگلوں کی طرح جارہے ہیں شاید۔'' وزیراعظم نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون توند پر سرکا کے دانت نکوسے۔

''کیا ——— کیا ہمارے ملک میں اناج کا قحط ہے جو یہ پرندے سرحد کی طرف جاتے ہیں! اس سے ہمارے ملک کی بدنامی ہوگی ——— وزیراعظم! کل سے سرحد کی طرف اُڑنے والے تمام پرندوں کو ہلاک کردیا جائے۔''

''جی بہت اچھا جہاں پناہ'' وزیراعظم نے ڈھیلی ڈھالی پتلون کو توند پر سرکا کر جلدی جلدی فرمان مبارک کو سنہرے فریم والے قرطاس پر سونے کے قلم سے لکھتے ہوئے کہا ——— ؟

''عالی جاہ، اب ملاحظہ فرمایئے اس منظر کو، یہ جو بادلوں کے پیچھے سے سنہری، روپہلی کرنیں آسمان پر ——— ؟''

لیکن دوربین کو آنکھوں پر فوکس کرنے کے بعد ظلِ سبحانی کو سنہری روپہلی کرنیں تو نیچے سڑک پر بکھری نظر آئیں۔ چالیس پچاس لڑکیاں رنگین تتلیوں کی طرح چہلیں کرتی، کہیں اکٹھی جارہی تھیں۔

''وہ ——— وہ ——— ؟'' ظلِ سُبحانی نے اپنے رعشہ سے کانپتے ہاتھ کو اوپر اُٹھایا۔

''جی ——— وہ اُدھر دور یونیورسٹی کیمپس ہے عالی جاہ۔لڑکیاں ہاسٹل سے نکل کر صبح سویرے چہل قدمی کرنے جارہی ہیں۔'' ہوم منسٹر نے جلدی سے آگے بڑھ کر ہانپتے ہوئے کہا۔

''اتنی بہت سی لڑکیاں ——— ؟ ظلِ سُبحانی نے تھوک نگل کر اس طرف گھورتے ہوتے کہا۔ ان کے ماں باپ پر ان کی شادی کا کتنا بوجھ ہوگا ——— !

ہم اپنی رعایا پر اتنا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتے۔''

''جی ——— جی ظلِ سُبحانی، میں ان سب لڑکیوں کو آج ہی حرم مبارک میں پہنچا دینے کا

انتظام کر دوں گا۔'' ـــــ اور وزیر اعظم نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون کو توند پر سرکا کے جلدی جلدی سنہرے فریم والی قرطاس پر سونے کے قلم سے لکھ لیا ـــــ

جاگا کرنوں والا، چاروں اور ہوا اُجیارا

بوڑھا موسیقار اب راگ کی سرشاری میں وہاں تک پہنچ گیا تھا، جہاں فضا میں ہر طرف نور ہی نور تھا، رنگ ہی رنگ بکھر رہے تھے۔

''اُف، کتنا خوبصورت منظر ہے۔'' شاعر اس خوبصورتی کو دیکھ کر مچل رہا تھا۔

''عالی جاہ! یہی وہ وقت ہے جس کی تعریف میں گیت کار، موسیقار اور مصور ـــــ''

''ہاں بہت اچھا ہے، مابدولت نے پسند فرمایا۔'' اور انہوں نے دوربین سے اپنا چہرہ ہٹا کر آنکھیں چندھیا کر، دور کسی طرف دیکھا۔

''وہ۔ وہ دور کیا بلڈنگ ہے۔؟

''وہ سفید سی اونچی بلڈنگ جہاں پناہ!'' وزیر دفاع نے بڑی مسرت سے سامنے کی طرف جھک کر کہا ـــــ '' وہ اس خادم کے بیٹے کا مکان ہے حضور۔ آپ کا وہ غلام اس ملک کا بہت مشہور آرکیٹیکٹ ہے۔ اُس نے اپنا مکان بڑی محنت سے بنایا ہے۔''

''اچھا! مابدولت وہ مکان ملاحظہ فرمائیں گے۔'' ظلِ سُبحانی نے یوں وزیر دفاع کی طرف دیکھا جیسے خلعت سے نواز رہے ہوں۔

''زہے نصیب عالی جاہ۔ جب ارشاد عالی ہو سواری مبارک غریب خانے پر جلوہ افروز ہو۔'' وزیر دفاع نے جھک کر سات بار سلام عرض کرتے ہوئے کہا۔

''مگر مابدولت، اُس پھٹیچر سے آرکیٹیکٹ کے مکان میں نہیں جائیں گے۔ پہلے وہ مکان ہماری ملکیت میں داخل کیا جائے۔''

''ذرہ نوازی ہے سرکار۔'' وزیر دفاع نے اب کی بار چودہ سلام کیے اور جلدی جلد وزیر اعظم نے سنہرے فریم والے قرطاس پر سونے کے قلم سے ـــــ''

''یہ کس کی آواز ہے۔شاید کوئی فریادی ہم سے انصاف مانگنے آیا ہے۔''

ظلِ سُبحانی نے چونک کر نیچے کی طرف دیکھا۔ایک بھکاری لڑکا اپنی ٹوٹی ہوئی رکابی بجاتا ہوا گا رہا تھا

اللہ دلوائے گا سو دیوے گا مولا کا پیارا کوئی دیوے گا

''یہ تو کوئی بھکاری ہے عالی جاہ، صبح سویرے اللہ میاں سے اپنا رزق مانگنے نکلا ہے۔'' ہوم منسٹر نے اپنی گنجی چندیا سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں یہ لڑکا باغیوں کے گروہ سے معلوم ہوتا ہے۔'' ظلِ سُبحانی نے بڑے مفکرانہ انداز میں آہستہ سے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ کچھ لوگ ملک میں ہمارے خلاف اللہ میاں سے سازش کر رہے ہیں۔وزیر اعظم! ان تمام بھکاریوں کو پکڑ کر عمر قید کی سزا دو، جو ہماری بجائے ڈائریکٹ اللہ میاں سے اپنا رزق مانگتے ہیں۔''

''جی مناسب ہے بندہ پرور۔'' وزیر اعظم نے ڈھیلی ڈھالی پتلون اوپر سرکا کر جلدی جلدی سنہرے فریم والے قرطاس پر ــــــ

اب موسیقار نے اندھیرے کو مکمل شکست دے دی تھی اور کرنوں والے دیوتا نے چاروں اور اُجالے کی پچکاریاں سی چھوڑنا شروع کر دی تھیں۔

ظلِ سُبحانی اب تکیے سے ٹیک لگائے، بڑے مدبرانہ اور مفکرانہ انداز میں داڑھی کھجانے لگے۔ پھر کسی خیال کے آتے ہی وہ چونک پڑے اور سونے چاندی کے نقش و نگار والی کرسی کے ہتھے پر ہاتھ مار کر فرمایا۔

''وزیر اعظم ہمارے ملک میں کسی کے ساتھ ناانصافی تو نہیں ہو رہی ہے! کوئی ظالم ہماری رعایا کو پریشان تو نہیں کر رہا ہے؟''

''بالکل نہیں عالی جاہ۔'' تمام درباریوں نے ظلِ سبحانی کی طرف جھک کر بہ آواز بلند کورس لگایا۔ظلِ سُبحانی یہ سُن کر مسکرائے اور ادھر اُدھر دیکھ کر فرمایا

''یہ۔ یہ گرمی سی کیوں ہونے لگی اس وقت ____؟''

یہ سنتے ہی مورچھل ہاتھ میں تھامنے والی پتھر کی مورتوں میں حرکت ہوئی اور اُن کے ہاتھ آہستہ آہستہ مورچھل ہلانے لگے۔

''عالی جاہ اگر آج نکلتے سورج کا حسن ملاحظہ فرما لیتے تو اچھا تھا۔ کیونکہ اب دھوپ تیزی سے آرہی ہے۔'' شاعر نے بڑی بے بسی سے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا

''اچھا اب یہ گستاخ سورج ہمارے سامنے تیزی دکھا رہا ہے! اچانک ظلِ سُبحانی چلانے لگے۔

''وزیر اعظم ____! سورج کو ابھی شوٹ کر دو ہمارے سامنے۔ اور اس احمق شاعر کا سر بھی قلم کر دو جس نے ہمیں اس خودسر سورج کو دکھانے کی زحمت دی آج ____''

ڈھیلی ڈھالی پتلون کو توند پر سرکا کے وزیر اعظم نے فوراً دو فائر کیے۔ دھائیں۔ دھائیں۔''

اچانک سارے ملک میں اندھیرا چھا گیا۔ کیونکہ دوسرے فائد کے وقت بندوق کی زد میں سورج کے بجائے بھیرویں کے وہ سُر آگئے تھے جو روزانہ آکاش اور پاتال کی گہرائیوں سے اُجالے کو کھوج نکالتے تھے۔

☆☆

مسعود مفتی

محدب شیشہ

ذکوٰۃ کا مہینہ تھا۔ قصبے کی مسجد میں مولوی صاحب جمعہ کا وعظ کر رہے تھے۔

''یتیم، مسکین اور بیوائیں عرش کا سہارا ہیں۔ اُن کے آنسو پونچھو۔ اُن کے سر پر ہاتھ دھرو۔ اپنی کمائی میں سے اُن کو حصہ دو......''

سامنے نمازیوں کی قطاریں خاموشی میں غرق تھیں۔ کچھ دیوار یا کھمبے کے سہارے اونگھتے ہوئے کچھ پنکھے کی ڈنڈی یا کھڑے گھٹنے پسینہ بھرا سر ٹکائے ہوئے۔ کچھ کھلی آنکھوں سے سوئے ہوئے۔ حافظ عمر دراز کی آنکھیں بند تھیں دماغ سویا ہوا تھا۔ ہونٹ باہم چپکے ہوئے تھے، لیکن ہاتھ جاگ رہے تھے، جو بڑی تیزی سے تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے۔ مسلسل جاگنے والوں میں بشیر سبزی فروش کے دماغ میں منڈی کے بھاؤ کھد بد مچا رہے تھے۔ ڈاک خانے کے بابو کے ذہن میں تنخواہ اور اخراجات باہم کشتی لڑ رہے تھے اور لاریوں کے اڈے والے منشی کے دماغ میں صبح آٹھ بجے کی لاری میں گزرنے والی عورت کا خوبصورت چہرہ گھوم رہا تھا۔ مگر ماسٹر برکت علی گردن اٹھائے وعظ کا ایک ایک حرف غور سے سن رہا تھا اور جب مولوی صاحب نے منبر سے کچھ آگے جھک کر کہا۔

''بیوہ کی ایک آہ سات آسمانوں میں سوراخ کر دیتی ہے۔ ایسی بیوہ کی ایک دفعہ مدد کرنے والے کو ستر ہزار نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے۔'' تو ماسٹر برکت علی کا سارا جسم ایک دم کانپ اُٹھا اور پگڑی سر پر جماتے ہوئے وہ بلند آواز میں پکارا۔

''بخشنا میرے مولا۔''

ماسٹر برکت علی قصبے کے اُن چند لوگوں میں سے تھا، جو خواہش سے نہیں بلکہ محض اتفاق سے

میٹرک پاس کر لیتے ہیں۔ اس قصبے میں سرکاری تعلیمی سرگرمیاں چار جماعتوں کے بعد ختم ہو جاتی تھیں۔ اور چیچک زدہ چہرے کی طرح پرائمری اسکول اپنی بوسیدہ چھتوں کے نیچے سے دن بھر پہاڑی کے الاپ براڈ کاسٹ کیا کرتا۔ اس اسکول میں چند سال زبردستی گزارنے کے بعد گاؤں کے بچے یا تو ڈھیلی دھوتیاں اور گومڑی سی پگڑیاں باندھ کر لٹھ لیے مویشی ہنکاتے رہتے۔ یا گھر کے دروازے کی چوکھٹ پر تھالی میں چھوٹی سی دوکان سجا کر قسمت آزمائی کرنے کے بعد کھیتوں میں دھکیل دیئے جاتے اور یا کوئی بھولا بھٹکا انگریزی کا قاعدہ اٹھا کر فالتو وقت میں ماسٹر برکت علی کے پاس آ بیٹھتا۔ پہلے قاعدے کے کونے مڑتے۔ پھر اُوپر والا صفحہ رنگ بدلتے حروف کو چھپا لیتا۔ اور ایک روز وہ غائب ہو جاتا تو اگلے صفحہ پر منازل طے کرنے لگتا۔ جس دن سارا قاعدہ غائب ہو جاتا تو طالب علم کو اگلی جماعت میں چڑھا دیا جاتا۔ جہاں پھر ایک موٹا قاعدہ خریدا جاتا۔ چار پانچ قاعدوں پر طبع آزمائی کرنے کے بعد طالب علم چونگی کا محرر یا ڈپو کا ملازم یا عرضی نویس بننے کے قابل ہو جاتا۔ ماسٹر برکت علی کا مکان کے باہر والے کمرے کے دروازے پر پہلے چاک سے اور پھر کوئلے سے ''انگریزی کالج'' لکھا ہوا تھا حالانکہ وہاں الف سے آم بے سے بلی بھی اتنی ہی شدت سے پڑھا جاتا تھا۔ جتنا سی۔ اے ٹی کیٹ۔ درجن بھر کے قریب طالب علم یہاں ہمیشہ رہتے تھے اور جب چھٹیوں میں شہر جا کر پڑھنے والے طالب علم گاؤں آتے تو والدین کو بھی عارضی طور پر ماسٹر برکت علی کا شاگرد بنا دیتے تھے تاکہ اُن کی کمزور انگلش درست ہو سکے۔ فیس اور شاگردانہ خدمات سے اُس کا گزارہ اچھا چل جاتا تھا۔

ماسٹر برکت علی چھریرے جسم کا لمبا آدمی تھا۔ عمر چھتیس سال۔ لمبوترا سا دبلا چہرہ جس کے رخساروں کی جگہ دو نمایاں گڈھے قبل از وقت آنے والی جھریوں کو ہضم کر رہے تھے۔ اونچی شفاف پیشانی کے نیچے دو ذہین آنکھیں۔ شفقت بھری مسکراہٹ سے لبریز رہتی تھیں۔ آنکھوں کے باہر کونوں میں سورج کی شعاعوں کی مانند باریک سلوٹیں تھیں جو ہنستے وقت بڑی نمایاں ہو جاتی تھیں۔ سیدھی ستواں ناک، پتلے ہونٹ اور بشاش چہرہ۔ سر پر خاکی کلاہ کے گرد سفید ململ کی پگڑی،

جس کا شملہ کلف کی مقدار کے مطابق رکوع وسجود کرتا رہتا تھا۔ دھاری دار قمیص اور ڈھیلی سی شلوار کے نیچے ڈھول سے اٹے ہوئے بوٹ جن کے کھلے ہوئے جبڑوں کو تہوار کے موقع پر تسمے سمیٹ لیتے۔ جو چند دنوں بعد اپنی موت آپ مرجاتے اور پھر برساتی مینڈکوں کی طرح اگلے تہوار کو دوبارہ جنم لیتے۔

ماسٹر برکت علی لائق تو اتنا ہی تھا۔ جتنا الماری میں گردجمی کتابوں کے ڈھیر والا آدمی ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کی شرافت اور نیکی کا قصبہ بھر مداح تھا۔ وہ زندگی کی سیدھی سڑک پر چلتا آیا تھا۔ جس میں کبھی موڑ آیا تھا نہ کھڈ۔ جس کے قریب نہ کبھی رومان کے چشمے پھوٹے نہ جذبات کی دھوپ چھاؤں نے کبھی آنکھ مچولی کھیلی۔ نہ کبھی حالات کی کنکریاں چبھیں، نہ قسمت نے روڑے اٹکائے۔ ایک دفعہ شادی ہوئی تھی تو سات سال تک جیسے سفر بھول سا گیا تھا۔ بیوی بے اولاد مرگئی، تو چندروز کا ستانا سمجھ کر پھر سے زندگی کی ڈگر پر چل پڑا تھا۔ جب سے اس نے قصص الانبیا میں پڑھا تھا کہ قیامت کے روز بخشش کا سب سے آسان طریقہ خدا کے بندوں کی خدمت کرنا ہے، اُس روز سے اس نے عہد کرلیا تھا کہ اپنی زندگی اسکول کے لیے خصوصاً اور خدمت خلق کے لیے عموماً وقف کردیگا۔ تاکہ لوگوں کو سدھار سکے۔ اس لیے بیوی کی وفات کے سات سال بعد بھی اپنے آپ کو دوبارہ شادی پر آمادہ نہ کرسکا تھا۔ کیونکہ بیوی اس کے عہد میں حائل ہوتی۔ اس کے بعد تو وہ گھڑی کا پرزہ بن گیا تھا۔ زندگی ایک معمول کے مطابق گزر رہی تھی جیسے گاڑی اپنی پٹڑی سے بال برابر بھی ادھر اُدھر نہیں ہٹتی۔ روزانہ سب کی خیر صلا پوچھتا۔ بغیر تسموں کے بوٹ اتار کر شلوار گھٹنوں تک الٹالیتا اور خدمت خلق کے جذبے سے مجبور ہوکر کنوئیں کی چرخی پکڑ کر پانی بھرنے لگتا۔ گاؤں کی عورتوں کو ماسٹر کی شرافت پر پورا بھروسہ تھا۔ اسی لیے وہ بغیر کسی تکلیف کے پانی بھروالیتیں۔ وہ ڈول انڈیلتے وقت سوال جواب بھی کرتا تھا۔

''کیوں جیناں۔ اب تو تمہارا گھر والا اس کلموہی کے گھر نہیں جاتا۔ میں نے سمجھایا تو بہت ہی تھا۔''

''نہیں بھائی اللہ تیرا بھلا کرے۔ میرا تو تو نے گھر بچالیا۔ جیناں گھڑا جمائے مجسم انکسار بن

جاتی۔''

''اب خرچہ نہ دے تو مجھے بتانا۔ لے اٹھا اپنا گھڑا۔'' اور وہ ڈول کا باقی پانی اپنے پاؤں جوڑ کر اُن پر ڈال دیتا۔

''ماسی، شیرو نے شہر سے کوئی خط لکھا یا نہیں؟ وہ ایک پاؤں سے دوسرے کی میل رگڑتا ہوا پوچھتا۔اور ماسی گھڑا اچھولتا چھوڑ کر ہاتھ ملنے لگتی۔

''نہ بچہ کوئی نہیں۔''

''فکر نہ کر۔میں اگلے مہینے شہر جاؤں گا تو اچھی خبر لوں گا اس کی۔''

''اے بھلا ہو تیرا۔میرے لال۔ضرور جانا اور اس سے کہ......'' اور گھڑا ابھر جاتا لیکن ماسی کے پیغامات جاری رہتے۔حتیٰ کہ شادو اُس کا گھڑا ہٹا کر اپنا جما دیتی۔ماسٹر برکت علی خاموشی سے پانی بھر دیتا۔وہ جوان لڑکیوں سے بات چیت کا زیادہ قائل نہ تھا۔لیکن جب گاگر اُٹھا کر اُس سر پر رکھتا تو اجنبیت مٹانے کے ایک آدھ بات کر لیتا۔

''شادو بہن اب تو شرفو کا نا سیٹیاں نہیں بجاتا۔''

اور شادو گاگر کے گلے میں ہاتھ ڈالتی ہوئی پلو منہ پر رکھ لیتی۔''نہیں ویر جی تم نے اسے بالکل سیدھا کر دیا ہے۔''

اور ماسٹر برکت علی ان لوگوں کو بے نقط سنا ڈالتا جو گاؤں کی عورتوں کو ماں بہن نہ سمجھتے۔اور پھر آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر پکار اٹھتا۔''بخشنا میرے مولا۔سب کی حیا قائم رکھ۔'' عورتیں پانی لے جاتیں تو وہ لنگوٹ پہن کر نہانے لگتا۔اور صابن ملتے ملتے گنگناتا۔''میرے مولا بلا لو مدینے مجھے۔'' آٹے کی چکی پر بیٹھ کر سارا دن گپ لگانے والے چند مفت خورے بھی عین اسی وقت نہانے آن ٹپکتے۔تاکہ ماسٹر برکت علی کے صابن اور تیل سے فائدہ اٹھا سکیں۔نہانے کے بعد ماسٹر برکت علی گڑھے صاف کر کے پانی سے بھر دیتا تاکہ پرندے پانی پی سکیں اور خود واپس چلا جاتا۔

واپسی پر ماسٹر برکت علی راستے میں گھروں کو کبھی نہ بھولتا۔ بابا جلال سے اس کی بواسیر کے بارے میں ضرور پوچھتا۔ تیسرے چوتھے روز جیواں دائی کو اس کے لڑکوں کے نام چٹھی لکھ دیتا۔ منگنی شدہ لڑکیوں کے والدین سے گاہے بگاہے پوچھتا کہ لڑکی کے جہیز کے سلسلے میں اگر مدد کی ضرورت ہو تو اسے بتائیں۔ کنواری لڑکیوں کے والدین کو وہ تسلیاں دیتا کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے رشتوں کی فکر نہ کریں۔ سردیوں میں رنگو کے دادا کے لیے کبھی کبھار چائے کا بنڈل ہی لے جاتا، تا کہ اس کی گرمی کا سامان رہے۔ کبھی کسی جگہ سر پھٹول ہو جاتا تو اپنا فرض سمجھ کر صلح کرا دیتا۔ چونکہ گذشتہ برسوں میں اکثر گھروں کا ایک آدھ بچہ اُس کا شاگرد تھا۔ اس لیے استاد کا روایتی احترام اس کی دخل اندازی کو ہمیشہ خوش آمدید میں تبدیل کر دیتا۔

اپنے اسکول میں ماسٹر برکت علی شاگردوں کا بہت خیال رکھتا، ہر ماہ فیس دینے کا وقت آتا تو وہ دو ایک شاگردوں کا بہت خیال رکھتا۔ روپے واپس دے دیتا۔ جا بیٹے جا۔ مجھ سے کیا پردہ۔ میں جانتا ہوں پچھلے مہینے تمہارا خرچ تنگ رہا، بچیوں سے البتہ فیس کبھی نہیں لی جاتی۔ کیونکہ لڑکی کسی ایک کی نہیں سارے گاؤں کی لڑکی ہوتی ہے۔

جمعہ کے روز بیواؤں سے متعلق مولوی صاحب کا وعظ سن کر ماسٹر برکت علی نکلا تو وہ اپنی غفلت پر استغفار پڑھ رہا تھا کہ زندگی کے اتنے سال ہاتھ سے نکل گئے۔ لیکن وہ کسی دکھیا بیوہ کا مداوا نہ بن سکا۔ برخلاف اس کے نہ معلوم اس نے کتنی بیوہ عورتوں کا دل دکھایا ہوگا۔ اس نے دل کو تسلی دینے کے لیے سوچا کہ پیشتر ازیں اُسے خدا کے نزدیک بیوہ کے درجہ کا بھی تو علم نہ تھا۔ اور وہ سر جھٹک کر پکار اٹھا۔

''توبہ اللہ میرے توبہ مجھے بخشنا'' اور پھر تھکی چال سے آگے چلتا گیا۔

گلی کے موڑ پر چند آوارہ بچے ایک کتے کی دم میں رسی باندھے تالیاں پیٹ رہے تھے، ماسٹر برکت علی نے اُنہیں ڈانٹا، کتے کو چھڑایا۔ اور جس لڑکے کے ہاتھ میں رسی تھی اسے کان سے پکڑ کر رے چلانے لگا۔ لڑکا ایک ہاتھ سے کان چھڑانے کی کوشش میں ساتھ ساتھ اُچکتا چلا آ رہا تھا۔

''کیوں بے کس کا لڑکا ہے تو۔''

''سی......روئی......جی نوراں کا''لڑکا کان کے درد میں مبالغہ کرتا بولا۔

''نوراں؟ کون سی نوراں؟......کہاں رہتے ہو تم؟''

'اوئی مر گیا......جی......اوئی......وہ ٹیلے پر''اس کی آنکھ بند ہوئی جا رہی تھی۔

اور ماسٹر برکت علی کو خیال آیا کہ وہی نوراں ہے جس کا خاوند پچھلے سال ہیضہ سے مر گیا تھا۔ ماسٹر برکت علی اُس کے حالات سے بے خبر تھا۔ پھر بھی اُسے اتنا معلوم تھا کہ موت کے وقت متوفی کے جاننے والے نوراں کی غربت کا ذکر بڑے ہمدردانہ انداز میں کیا کرتے تھے۔

''کیا نام ہے تیرا؟''

''جی! غفورا''۔ ماسٹر برکت علی نے اُس کا کان چھوڑ دیا۔ اور سوال کرنے لگا۔ اُسے معلوم ہوا کہ غفورا کوئی کام نہیں کرتا۔ بلکہ گلیوں میں آوارہ پھرتا رہتا ہے۔ اور اس کی ماں محنت مزدوری کر کے گزارہ چلاتی ہے۔ ماسٹر برکت علی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ گھنٹہ بھر پہلے کا سنا ہوا وعظ اُس کے کانوں میں گونجنے لگا۔ بیوہ کی مدد کا بہترین طریقہ اُس کے آوارہ بچے کو سدھارنا تھا۔ اُس نے بڑے پیار سے بچے کو ساتھ آنے کو کہا اور گھر چلا۔

''لے غفورے پڑھ تو بھلا کیا لکھا ہے۔ میرے دروازے پر''

غفورے نے شرما کر سر جھکا لیا۔

''جی میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔''

''اچھا۔ اچھا کوئی بات نہیں۔''

ماسٹر برکت علی خندہ پیشانی سے درگزر کرتا ہوا بولا۔

کمرے میں جا کر اس نے بلیک بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر اردو کے لفظ لکھے ہوئے تھے۔ لیکن غفورا وہ بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ماسٹر نے ہنس کر ایک ہلکی سی چپت اس کے گال پر لگائی اور سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ ''نالائق دس برس کی عمر میں اتنا بھی نہیں پڑھ سکتا'' پھر اس نے چاولوں کی

میٹھی پٹی اسے کھانے کو دی۔ اور جب لڑکا کچھ گھل مِل گیا تو ماسٹر برکت علی نے اپنے باورچی خانے میں جاکر مونگ کی دال کا لفافہ خالی کیا اور پھاڑ کر ایک قائدے کا جز دان بنا ڈالا۔

''آ غفورے تجھے تصویریں دکھاؤں۔'' غفورا اب کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ شوق سے ماسٹر کے قریب آن بیٹھا اور ماسٹر برکت علی اُسے آم۔ بلی، گدھے اور لنگور کی تصویریں دکھانے لگا۔

''یہ تصویریں لو گے۔'' اس نے پیار سے پوچھا۔ غفورے کی شرارتی ہنسی میں خواہش کروٹیں لے رہی تھی۔

''یہ لو......شاباش'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔''

یہ گھر لے جاؤ۔

کل پھر آنا۔ یہاں اسکول میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ جب یہ قاعدہ پڑھ چکو گے تو تمہیں اور قاعدہ دوں گا۔ جس میں اس سے بھی اچھی تصویریں ہوں گی۔ شاباش اب سیدھے گھر جاؤ۔ کل پھر آنا۔''

غفورے نے شیشے کے آبگینے کی طرح قاعدہ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر سینے سے چپکا لیا اور باہر نکل کر بھاگ اُٹھا۔ ماسٹر برکت علی دروازے میں کھڑا ہو کر مسکرا مسکرا کر دیکھتا رہا۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو واپس مڑتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ ''بخشنا مجھے میرے مولا۔ میری یہ خدمت قبول کر۔''

دوسرے روز ماسٹر برکت علی لڑکوں کو پڑھا رہا تھا تو غفورے نے گلی میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے تین چار مرتبہ خواہش مندانہ اندر جھانکا۔ لیکن جب ماسٹر برکت علی نے پیار سے بلایا تو بھاگ گیا۔

اس کے بعد دو دن تک غفورا نظر نہ آیا۔ ماسٹر برکت علی کو ایسا معلوم ہوا جیسے پل صراط سے گزرتے گزرتے اس سے جنت کا پاسپورٹ چھین کر ایک دم دوزخ میں دھکا دیا گیا ہو۔

''ارے بشیرے۔ جا ذرا غفورے ٹیلے والے کو بلا لا۔ اسکول بند ہونے پر اُس نے کہا۔ تھوڑی

دیر بعد بشیرا غفورے کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا وہاں لایا اور جب ماسٹر نے اُسے چمکارا تو وہ شرماتا لجاتا، جھجکتا اندر آ گیا۔ ماسٹر برکت علی نے اُسے اپنے داہنے بازو میں سمیٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور تھوڑی انگلی سے اٹھاتے ہوئے بولا۔

''غفورے بچے تو آیا نہیں میرے پا؟''

غفورا شرما کر اِدھر اُدھر منہ پھیرنے لگا۔ مگر جب ماسٹر نے بہت اصرار کیا تو کہنے لگا۔ ''بے بے کہتی تھی مت جایا کرو۔ ہمارے پاس فیس اور کتابوں کے پیسے نہیں ہیں۔''

''توبہ اللہ توبہ'' پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھ کر وہ رُندھے ہوئے گلے سے بولا۔ اور دروازہ میں جا کر زور سے ناک صاف کرنے لگا۔

ایک رومال میں تھوڑے ستو اور گڑ لے کر ماسٹر برکت علی نے غفورے کو اُنگلی سے لگایا۔ اور نوراں کے گھر کی طرف چل دیا۔ ماسٹر کو گھر میں آتا دیکھ کر نوراں کا منہ ایک دم کھلا رہ گیا۔ جیسے چیونٹی کے گھر ہاتھی آ جائے۔ ماسٹر برکت علی کہتا ہی رہا کہ کھڑے کھڑے بات کر لوں گا، لیکن نوراں نے چھپا چھپ چارپائی پر سے سرسوں کا ساگ جھاڑ گیا۔ اور دھوبی کا دھلا ہوا کھیس بچھا کر خود ذرا فاصلے پر سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ دوپٹے کا پلو منہ میں پکڑ کر آدھا چہرہ اور ایک آنکھ ڈھک لی۔

دیکھو بہن جی۔'' ماسٹر برکت علی نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔'' میں یہ نہیں پوچھنے آیا کہ غفورے کو سکول کیوں نہیں بھیجا۔ بلکہ یہ کہنا آیا ہوں کہ غفورا میرے سگے بھانجے کی طرح ہے۔ فیس کتابوں ور ہر ضرورت کا میں خود ذمہ دار ہوں۔ اس کا ابا ہوتا تو بات اور تھی۔''

ابا کا نام آتے ہی نوراں کے نتھنے پھڑک اٹھے۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آنسو پوچھنے میں پردہ ختم ہو گیا وہ خود تو چلا گیا مجھے ان مصیبتوں کے لیے چھوڑ گیا۔'' اس کی آنکھوں میں جھڑی بند گئی۔''

''اللہ کی حکمت تو سمجھ میں نہیں آتی بی بی۔ لیکن تم کیوں فکر کرتی ہو۔ لڑکی کا تو سارا گاؤں ہی میکہ ہوتا ہے۔ ہم کس لیے بیٹھے ہیں۔ غفورے کا ابا اللہ بخشے میرا بھی جاننے والا تھا۔''

اور پھر نوراں خاوند کی موت، موت کے بعد عزیزوں کا برتاؤ اور موت سے چند روز پہلے کی

باتیں آنسوؤں کے اور ہچکیوں کے گھونٹ لے کر سناتی رہی اور ماسٹر برکت علی خدا رسول، حدیث، حکایتوں اور کہاتوں سے اس کو تسلیاں دیتا رہا، بالآخر جب وہ اُٹھا تو نوراں مسرور تھی کہ خدا نے ایک فرشتہ اس کی مدد کو بھیج دیا ہے اور ماسٹر برکت علی مسرور تھا کہ اُس بیوہ کی مدد کرنے سے اُسکی عاقبت سدھر جائے گی۔ غفورے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہوئے اس نے ایک ٹہوکا دیا۔ اور پھر سیدھا مسجد میں جا کر سجدہ میں گر پڑا۔ اور رو رو کر خدا سے التجا کرتا رہا کہ وہ اُسے اُن کی سرپرستی میں ثابت قدم رکھے اور اس کے عوض روزِ قیامت کو بخش دے۔

چند ماہ کے عرصہ میں غفورا ماسٹر برکت علی کا شاگرد خاص بن گیا۔ چاک کا ڈبہ اور جھاڑن اس کی تحویل میں رہتا۔ ٹاٹ بچھانے، گننے لپیٹنے اور بورڈ صاف کرنے کا ذمہ دار تھا۔ طالب علموں کے لیے پانی کا گھڑا بھرنا اس کا فرض تھا، ماسٹر برکت علی کو پیاس لگتی تو وہ غفورے کو آواز دیتا۔ کنوئیں کے ٹھنڈے پانی سے حقہ تازہ کرنے اور چلم بھرنے کا حق صرف غفورے کو حاصل تھا۔ وہ خود بھی بہت سمجھدار اور باتمیز بچہ بن گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ الف آم۔ بے بلی۔ سے بڑھ کر وہ دوروٹی لائی ہے۔ کس نے کھائی ہے تک پہنچ چکا تھا۔ سیاہی میں لتھڑی ہوئی انگلیوں سے تختی پر سو تک گنتی بھی لکھ لیتا تھا۔ اور ٹین کی چیچک زدہ سلیٹ پر تھوک رگڑنے کے بعد بڑی بڑی رقوم جمع بھی کر لیتا تھا۔ ماسٹر کے گھر کے اندر والے آلے میں اس کے لیے چاولوں کی پٹی، ہمیشہ پڑی رہتی تھی۔ دوپہر کا کھانا وہ ماسٹر کے ساتھ کھاتا اور جب ماسٹر بال کٹواتا تو غفورے کے سر پر بھی چٹیل میدان بن جاتا۔ جس پر وہ آم کی گھٹلی رگڑ کر خوب چمکا لیتا۔

اپنے گھر میں غفورا کافی سکھی تھا کیونکہ ہر مہینے ماسٹر برکت علی فیس اکٹھی ہوتے ہی شام کو چپکے سے جا کر نوراں کو کچھ روپے دے آتا فصل کے موقع پر جب لوگ دانے وغیرہ اسے لا کے دیتے تو کئی روز تک غفورا چھوٹے چھوٹے تھیلے بھر کر لے جاتا رہتا۔ تہوار کے موقع پر غفورے کو نئے کپڑے ملتے اور نوراں کے یہاں گڑ شکر، چنے اور دالوں کی پوٹلیاں پہنچ جاتیں۔ ماسٹر برکت علی بھی گاہے گاہے نوراں کے گھر جا کر روزمرہ کے حالات سنوارتا رہتا اور نوراں پُرنم آنکھوں سے

دعائیں دیتی دیتی بچھ جاتی۔ ماسٹر برکت اس کے گھر سے نکلتا تو پکار اٹھتا۔

''بخشنا مجھے میرے مولا۔''

اب ماسٹر برکت علی کو نماز میں زیادہ مزہ آنے لگا تھا۔ صبح کھڑکی میں بیٹھ کر وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تو جھوم جھوم جاتا۔ وعظ میں مولوی صاحب اگر روزِ حشر اور اگلے جہان کا ذکر کرتے یا سزا اور جزاء کے متعلق خدا اور بندے کا خود ساختہ مکالمہ پیش کرتے تو ایک اطمینان بخش مسکراہٹ ماسٹر کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی۔ جیسے کوئی بیوپاری مال کی قیمت پیشگی ادا کرنے کے بعد مطمئن سا نظر آئے۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ شادی بالکل نہیں کرے گا بلکہ اخراجات میں سے چار پانچ سال بچت کرنے کے بعد وہ حج کو جائے گا اور اس عزم کو تازہ رکھنے کے لیے اس نے اپنے کمرے میں رسول کریم کے روضۂ مبارک کی خوبصورت سی تصویر لگا دی۔ جسے دیکھ کر وہ اپنے پروگرام کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگا کرتا ساتھ ہی ساتھ بچت کرنے کے لیے وہ اپنے رہن سہن میں بھی انتہائی کفایت شعار ہو گیا۔

ایک روز ماسٹر برکت علی شام کے وقت نوراں کے گھر سے نکلا تو گلی میں کوئی زور سے کھنکارا۔ ماسٹر نے مڑ کر دیکھا تو شرفو کانا سامنے بیری کے درخت کے نیچے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''سلاما لیکم! ماسٹر جی۔''

اس کی آواز میں شرارت ہمک رہی تھی۔

''وعلیکم السلام! سنا بھئی شرفو کیا ہو رہا ہے۔''

ماسٹر صاحب نے خوش خلقی سے کام لیا۔

بس بادشاہو۔ مولا کی دنیا کا رنگ دیکھ رہا ہوں۔ اس نے طنز آمیز لہجے میں کہا اور ماسٹر برکت علی کچھ نہ سمجھتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی چلبلی طبیعت سے لطف اندوز ہوتا چلا آیا۔

چند روز بعد ماسٹر برکت علی شہر جانے کے لیے لاری کے اڈے پر پہنچا تو وہاں منشی کے پاس شرفو کانا، وغیرہ بیٹھے تھے دور سے ماسٹر کو آتے دیکھ کر انہوں نے ایک دوسرے کو کہنیاں ماریں اور شرفو

کانا تالی بجا کر گانے لگا۔ یاریاں لائیاں نیں۔ اسی توڑ نبھاؤ گے۔ ماسٹر برکت علی کے پہنچتے پہنچتے بس آ گئی اور وہ جلدی سے ٹکٹ خریدتے ہوئے اس کی طرف لپکا۔ عجلت میں اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے منشی نے کوئی بات زیرِ لب کہی اور باقی سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ وہ مڑا لیکن کنڈکٹر بولا۔

''شتابی، شتابی آ وٗ'' ماسٹر جی دیر ہو رہی ہے؟

اور وہ لپک کر بس میں جا چڑھا۔

اگلے دن شہر سے واپس آتے ہوئے وہ بازار سے گزرا تو بشیر سبزی فروش کی دوکان پر بلو کھڑا مولیاں کھا رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ کوئی بات بشیر کے کان میں کہی اور وہ دونوں غور سے ماسٹر کی طرف دیکھنے لگے۔

جمعہ کے روز ماسٹر برکت علی نہا دھو کر مسجد کی طرف چلا۔ راستے میں آٹے کی چکی پر شرفو کانا اپنے بے فکر دوستوں کے چکر میں لہک لہک کر گا رہا تھا۔ اور باقی سب تالیوں پر تالیاں بجا رہے تھے۔ ماسٹر کو دیکھ کر بالکل خاموشی چھا گئی۔ وہ اسے معمول کے مطابق احترام سمجھتا ہوا تمکنت سے آگے گزر گیا۔ لیکن ابھی دس قدم ہی گیا ہو گا کہ شرفو کانا سینے پر ہاتھ رکھ کر چلایا۔ ''ہائے میرا دل گیا'' کسی نے منہ میں انگلی ڈال کر زور سے سیٹی بجائی۔ کوئی زبردستی مصنوعی کھانسی کھانسا اور کوئی پکارا۔ ہائے میرے رانجھے۔'' اور پھر ایک طویل قہقہہ برس پڑا۔ ماسٹر برکت علی اسے لڑکوں کا باہمی مذاق اور پھکڑ پن سمجھتے ہوئے آگے نکل گیا۔

دو تین روز گزر گئے۔ ماسٹر برکت علی چارپائی پر لیٹا حقے کے کش لگا رہا تھا اتنے میں غفورا روتا روتا سکول واپس آ پہنچا۔

''مجھے شرفو نے مارا ہے۔''

وہ ہچکیاں لیتا ہوا بولا۔

''ارے!'' ماسٹر برکت علی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کیوں مارا، میرے بچے کو اُن نے؟'' اور اسے پاس بیٹھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''وہ کہتا تھا......اوں......اوں......تلاشی دو۔''

''تلاشی؟'' ماسٹر حیران رہ گیا۔

''کیسی تلاشی؟''

''ہاں......کھول کھول......وہ کہتا تھا تیرے ماسٹر نے......اوں......تیری ماں کے نام پیغام کا رقعہ بھیجا ہوگا۔!!''

ماسٹر برکت علی ایسے تڑپا گویا اس کا ہاتھ بجلی پر جا پڑا ہے۔ اور پھر وہ ایک دم سن سا ہو کر رہ گیا پتھر کے بُت کی طرح وہ چارپائی پر سیدھا بیٹھ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھیں ایسے پھیل گئیں جیسے جنگل کا ایک وحشی شیش محل میں آن پہنچا ہو۔ اور ان آنکھوں سے اُس نے شرفو اکانا کی گذشتہ دنوں کی مسکراہٹ کو ایک نئے انداز میں دیکھا۔ اور پھر اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپا ہوا ذلت اور بدنامی کا ایک سیلاب پھنکارا اور غفورے کو گھسیٹتا ہوا بازار کی طرف لپکا جہاں شرفو دہی والی کی دوکان پر لسی پی رہا تھا۔

''کیوں شرفو تو نے اس بچے سے کیا کہا ہے۔'' بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

شرفو کی آنکھ بھی پھڑک اٹھی اس نے معنی خیز نظروں سے دوکان دار کی طرف دیکھا اور پھر بے شرمی سے ہنس پڑا'' ہی ہی ہی۔ ماسٹر جی کیوں فکر کرتے ہو تم۔ وہ تو ذرا شغل کیا تھا۔ تم اپنا کام جاری رکھو، مولا نے مال دیا ہے......خوب عیش کرو۔ ہاہاہا!!!

وہ ہنسنے لگا لیکن قہقہہ ختم ہونے سے پہلے ہی ماسٹر برکت علی گھونسوں اور پتھروں سے اس پر ٹوٹ پڑا۔ حرامزادے، جھوٹے، کذاب، کمینے، لفنگے، بے ایمان، وہ بارود کی طرح پھٹ پڑا۔ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

دہی والا دوکان دار تھڑے سے نیچے کود پڑا۔ دوسرے دوکان دار ترازو ہاتھ میں لیے گردنیں کھینچ کر دیکھنے لگے۔ راہ گیر اور گاہک اِدھر اُدھر سے بھاگ کر اکٹھے ہونے لگے۔ اور دونوں کو کھینچ

کر علاحدہ کیا۔ شرفو کانا نہایت غلیظ گالیاں بکتا ہوا بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماسٹر برکت علی ہمک ہمک کر آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اور بار بار کہہ رہا تھا کہ:

''مجھے فتنہ پرداز کو مزہ چکھانے دو۔''

ماسٹر برکت علی کا احترام لوگوں میں دلوں میں کھبا ہوا تھا۔ لڑائی کی وجہ معلوم کیے بغیر انہوں نے شرفو کانا پر لعن طعن شروع کر دیا۔ جس نے ماسٹر برکت علی جیسے شریف آدمی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ کسی نے پوچھا ''بات کیا ہوئی'' تو ماسٹر پھر آپے سے باہر ہو گیا۔ یہ کمینہ مجھ پر بہتان تراشتا ہے میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔''

''منہ دھو کر آؤ ماسٹر، شرفو ڈھیلے لہجے میں بولا۔ ''آیا مجھے ٹھیک کرنے والا۔ میں بہتان باندھتا ہوں یا تیری قلعی کھولتا ہوں'' اور پھر شرفو نے گندی گندی گالیاں دیتے ہوئے۔ اپنی ایک آنکھ نچا نچا کر بلند آواز میں لوگوں کو بتایا کہ ماسٹر برکت علی نے چھپ کر نوراں سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں وہ شرفو کو دبانا چاہتا ہے تاکہ بات باہر نہ نکلے۔

لوگ اک دم خاموش ہو گئے چند ایک نے فوراً یقین کر لیا۔ چند ایک ماسٹر برکت علی کے متعلق اس قسم کی چیز سوچنے تک کو گناہ سمجھتے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس کی تائید یا تردید کیے بغیر اس الزام میں دلچسپی لینے لگے۔

''یہ سب بکواس ہے۔'' ماسٹر برکت علی چلایا۔ مجمع ایک دم ہوش میں آ گیا۔ بھنبھناہٹ کی ایک لہر اٹھنے لگی۔

''ماسٹر برکت علی ایسا آدمی نہیں شرفو۔'' ڈاک خانے کے بابو نے کہا۔ ''جیسا تمہارا اپنا دماغ ہے۔ ویسا ہی دوسروں کے متعلق سوچتے ہو۔''

''حد ہو گئی بابو جی۔'' شرفو تڑپ کر بولا۔ ''میرے ساتھ ابھی چلو مسجد میں قرآن اٹھانے کو تیار ہوں کہ میں خود نوراں اور ماسٹر برکت علی کو بغل گیر ہوتے دیکھا ہے۔'' وہ اپنی بات اوپر رکھنے کے لیے جھوٹی قسم پر اتر آیا۔

قسم کا دعویٰ سن کر کئی اور لوگ شرفو کی بات پر ایمان لے آئے۔ ماسٹر برکت علی گولی کی طرح لپکا۔ لیکن لوگوں نے اسے ہٹالیا۔ اور پھر دو چار آدمی پکڑ کر اسے گھر کی طرف لے چلے۔ سارا راستہ ماسٹر برکت علی انہیں یقین دلاتا رہا کہ شرفو بالکل جھوٹ بولتا ہے۔ اور وہ بھی ماسٹر کے ساتھ متفق تھے۔ گھر جا کر ماسٹر چارپائی پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ شام تک شرفو کو ہر طرف سے لعن طعن ہو جائے گی۔ اور لوگ ماسٹر کی نیت جانتے ہوئے اس پر شبہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ شرفو کا نا تین سال جیل میں کاٹ آیا تھا۔ اور ایسے آدمی کی بات ماسٹر برکت علی کے مقابلے میں کہاں مانی جائے گی۔ اس نے کروٹ بدل کر بظاہر بڑے اطمینان سے سونے کی کوشش کی۔

ماسٹر برکت علی تو واپس آ گیا تھا۔ لیکن اس انکشاف کی نوعیت نے ایک گوند کی طرح لوگوں کو بازار کے فرش پر چپکائے رکھا۔ اکثر لوگ ماسٹر کی نیکی پر شبہ نہیں کرتے تھے، چند ایک کہتے تھے کہ شرفو کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ شرفو نے محض ایک بات کی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ کسی نے کہا کہ ماسٹر برکت علی فصل کے موقع پر نوراں کو دانے بھجواتا ہے۔ تو آخری گروہ کے چند لوگ شرفو کی بات پر ایمان لے آئے۔ کوئی بولا ''سنا ہے ماسٹر برکت علی نوراں کو ماہوار بھی کچھ دیتا ہے۔'' تو چند اور لوگ بھی ماسٹر کو شرفو کے زاویے سے دیکھنے لگے۔

ہر گھڑی گزرنے پر ماسٹر کے حامیوں میں کمی ہوتی گئی۔ کیونکہ باہم تبادلہ خیال سے یہ ثابت ہو گیا کہ ماسٹر برکت علی دانے، فیس اور دوسری چیزیں نوراں کو بھجواتا ہے۔ ماہوار روپے دیتا ہے۔ اور اس کے بچے کو اسکول میں لاڈ سے رکھتا ہے۔ رائے عامہ یا تو ہلتی ہی نہیں۔ لیکن جب ہلتی ہے تو چھلانگیں مارتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ ثبوت مضبوط سیڑھیاں تھیں جن پر چڑھ کر کئی لوگوں کے تخیل سے نوراں کے گھر میں سارے کمروں کو ماسٹر برکت علی کے دیئے ہوئے دانوں سے بھرے دیکھا۔ کئی ایک کو الہامی انداز میں پتہ چل گیا تھا کہ فلاں وقت ماسٹر برکت علی فلاں سمت کس مقصد سے جا رہا تھا۔ اکثر لوگوں پر فوراً واضح ہو گیا کہ برکت علی کی کفایت شعاری کی اصل وجہ کیا ہے۔ ماسٹر کے شادی نہ کرنے کا راز بھی سمجھ میں آ گیا۔ کیونکہ بشیر گھوسی کا خیال تھا کہ جس آدمی کو

پینے کو دودھ مل جائے۔ اسے بھینس پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور منفی جنسی اقدار کے محدب شیشے میں سے جب لوگوں نے عادتاً جھانکا۔ تو یہ ثبوت ہر لحظہ بڑے ہی بڑے ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ اصل ماسٹر برکت علی ان کے نیچے دب گیا۔

شام تک بازار میں یہ موضوع زیرِ بحث رہا۔ لاریوں کے اڈے پر چکی والے کے ترازو کے پاس دہی والے کی دوکان کے سامنے ٹوٹے ہوئے بنچوں پر...... چوراہے میں بوہڑ کے درخت تلے چلتے ملاقاتیوں نے تازہ ترین اطلاعات کا تبالہ کیا...... خاوندوں نے بچوں کی غیر موجودگی میں اپنی بیویوں کو بتایا...... بیوی نے ساگ چیرتے ہوئے اپنی سہیلیوں سے کہا...... دوسرے دن بھنگنیں ایک گھر والوں کی رائے دوسرے گھر لے گئیں...... کنواری لڑکیوں نے دبی گھٹی ہنسی اور آنکھوں کے اشاروں سے تبصرے کیے...... جوان لڑکوں کے تخیل نے ماسٹر اور نوراں کے تعلقات کے پردے پر پوری فلم دیکھ ڈالی...... بوڑھوں نے توبہ اور استغفار کے ساتھ اس قصہ میں مرتب قیامت کے آثار دیکھے اور گھر جا کر اپنی جوان اولاوں کو کڑی نظر سے گھورا۔

ماسٹر برکت علی اپنے کمرے کا دروازہ کھولے چارپائی پر لیٹا حقہ پیتا رہا۔ اِکا دُکا لوگ ادھر سے گزرتے۔ مسٹر برکت علی الف سے بے تک سارا قصہ سنا کر اپنی معصومیت ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ لوگ کوئی فیصلہ دیئے بغیر کھسکنے کی کوشش کرتے۔

دوسرے دن مدرسے میں چھٹی تھی۔ ماسٹر برکت علی بازار میں نکلا۔ وہ لوگوں کے پاس جا جا کر اپنی بے گناہی کا یقین دلاتا۔ لوگ خاموشی سے سنتے رہتے۔ کوئی ہوں ہاں کر دیتا۔ لیکن زیادہ تسلی نہ دیتے۔ ماسٹر زیادہ جوشیلا ہوتا گیا۔ اس کے دلائل میں سرسری پیدا ہوتی گئی۔ اور آواز بلند ہوتی گئی۔ وہ ایک گروہ سے ہٹ کر دوسرے گروہ کے پاس جاتا لیکن وہ بات کرتا تو لوگ زیرِ لب مسکرانے لگتے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے اور لاتعلق سے ہو کے اِدھر اُدھر کھسکنے کی کوشش کرتے۔

ماسٹر برکت علی بڑا حیران ہوا۔ بالآخر کسی نے اسے بتایا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔

کبھی اتنی شدت سے اپنے آپ کو معصوم ظاہر کر رہا ہے۔ ماسٹر برکت علی کا خون کھولنے لگا۔ لیکن ماتھے پر ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ چکی کے پاس لوگوں کا گروہ کھڑا تھا۔ اُس نے وہاں جا کر نہایت جوش سے کہنا شروع کیا کہ شرفو فتنہ پرداز ہے۔ وہ خود بالکل معصوم ہے۔ نوراں سے اس کا تعلق نہیں۔ کبھی کبھار اسے بیوہ سمجھ کر اور خدا کا حکم جان کر وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ لیکن لوگ اس دلیل پر ہنسنے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ہٹو کے دیئے۔ اور معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

ماسٹر برکت علی کی رگ رگ صدمے سے نڈھال ہو گئی۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں کی فضا میں اس قسم کی بدنامی اس کی قطرہ قطرہ جوڑی ہوئی عزت کو ایک ہی دفعہ مٹا دے گی۔ گھر جا کر وہ چادر میں منہ لپیٹ کر باقی سارا دن اور ساری رات بھنتے ہوئے کباب کی طرح کروٹیں لیتا رہا۔

صبح مسجد میں جب جماعت کھڑی ہونے لگی تو امام صاحب نے ماسٹر برکت علی کے بجائے ایک دوسرے آدمی سے کہا۔ ''چلو شاہ جی تکبیر پڑھو۔'' اور وہ تکبیر پڑھنے لگا۔ ماسٹر کا نماز میں بھی دل نہ لگا۔ وہ جلدی لوٹ آیا۔ واپسی پر جب قرآن کی تلاوت کرنے لگا تو حروف اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ پھر غائب ہو جاتے اور آواز ٹوٹ جاتی اور پڑھتے پڑھتے اسے یک لخت محسوس ہوتا کہ اس کا دھیان قرآن کی سطروں کے بجائے پرسوں والے واقعہ میں جکڑا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب سکول کھلا تو صرف لڑکے حاضر تھے۔ بچیاں سب غائب تھیں وہ اسے اتفاق سمجھ کر خاموش ہو رہا۔

رات کو عشاء کی نماز میں سنتے پڑھتے وقت اس نے دیکھا اس کے دونوں طرف دو گز جگہ خالی ہے اور لوگ پرے ہٹ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔

صبح مسواک کرتے وقت اس نے گزرنے والی ایک بوڑھی سے پوچھا۔ ماسی کدھر چلی سویرے سویرے۔'' تو ماسی جواب دیئے بغیر کندھا دبائے آتے کو چلی گئی۔ وہ کنویں پر گیا تو ماسی آدھا بھرا گھڑا اٹھا کر کھسک گئی۔ شادو اپنی گاگر وہیں چھوڑ کر کہیں ٹل گئی۔ لیکن جب ماسٹر زبردستی جیناں کا گھڑا بھرنے لگا تو وہ نیچی نگاہ کیے خاموشی سے ایک طرف کھڑی رہی پھر گھڑا اُٹھا کر ایک

طرف چپکے سے چل دی۔ اور ماسٹر برکت علی نے دیکھا تھوڑی دور جا کر بوہڑ کی درخت کی اوٹ میں ا
س نے پانی زمین پر انڈیل دیا اور خالی گھڑا اٹھائے واپس چلی گئی۔

گھر کی طرف واپسی پر ماسٹر نے دور سے دیکھا کہ رنگو کا دادا دہلیز پر بیٹھا سوٹی پی رہا تھا۔ لیکن جب وہ قدرے نزدیک پہنچا تو بوڑھا انجان بن کر اندر چلا گیا۔

راستے میں اس نے دو ایک راہ گیروں سے بات کی تو وہ گفتگو بڑھانے کی بجائے ختم کرنے کی کوشش کرتے اور پھر جلدی سے کھسک جاتے۔ دن چڑھا تو سکول میں صرف چند شاگرد آئے انہوں نے بتایا کہ باقی سب کو والدین نے اسکول جانے سے منع کر دیا ہے۔

ماسٹر برکت علی کمرے کا دروازہ بند کر کے چارپائی پر منہ لپیٹ کر پڑا رہا۔ اس کے کان جلتے رہے دماغ میں چکیاں چلتی رہیں۔ پپوٹے پھڑکتے رہے۔ دل ڈوبتا رہا۔ ماتھا کبھی بھٹی بن جاتا کبھی برف کی سل۔

ظہر کی نماز کے بعد اس نے مولوی صاحب سے فریاد کی اور بتایا کہ وہ بالکل نیک نیتی سے اُن کے فرمان کے مطابق ایک بیوہ سمجھ کر نوراں کی مدد کرتا رہا۔ وہ بار بار کہتا رہا، ''مولوی صاحب میں بالکل بے قصور ہوں''۔ مولوی صاحب لاتعلق سے ہو کر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ اور پھر واپس مڑتے ہوئے کہنے لگے۔ ''نیت کا حال تو قادر مطلق ہی جانتا ہے۔ لیکن جب سب لوگ ایک بات کہہ رہے ہیں تو کچھ بات تو ہوگی۔''

اور مسٹر برکت علی کو ایسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے رگ و پے سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ پڑے گا۔ لیکن اس کی آنکھیں خشک ہی رہیں۔ اور بجائے آنسوؤں کے اُن میں انگارے دہکنے لگے۔ کنپٹیوں پر جیسے کسی نے دھما دھم ہتھوڑے مارنے شروع کر دیئے۔ بڑی آہستگی سے وہ اپنے جسم کو گھسیٹ کر اٹھا۔ ہاتھوں سے ٹٹول کر جوتی اٹھائی اور ہارے ہوئے جواری کی طرح تھکے تھکے قدموں سے واپس چلا آیا۔ اس کے جسم کا سارا رس جیسے نچڑ سا گیا ہو۔

ماسٹر برکت علی بند کمرے میں چارپائی پر لوٹتا رہا۔ کبھی پاوں اٹھا کر دھما دھم ادوائن پر مارنے لگتا۔ کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا۔ لیکن گلی میں

کسی کے آنے کی آواز سن کر منہ چھپانے کو واپس بھاگتا۔ وہ کافی دیر رسول اکرم کے روضۂ مبارک کی تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ آہستہ آہستہ کانپنے لگی۔ کمرے کی دیواریں ہولے ہولے گھوم سی گئیں اور پھر ماسٹر برکت علی ایک دم بلک بلک کر رو دیا۔

شام کے وقت ماسٹر برکت علی کو بڑے زور کا بخار آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس پر ہذیان کی کیفت طاری ہوگئی۔

اسی شام نوراں نے فیصلہ کیا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر چلی جائے گی۔ کیونکہ اسے مزدوری ملنا بند ہوگئی تھی اور تمام گھروں نے اس کے داخلے کی ممانعت کردی تھی۔ وہ جہاں جاتی عورتیں اشاروں میں باتیں کرتیں اور ان کی چبھتی ہوئی نظریں اس کے جسم کو چھید ڈالتیں۔ دوسرے دن صبح سویرے جب وہ گاؤں سے نکلنے لگی تو اس نے سوچا ماسٹر برکت علی سے ملتی چلے۔ اس کے مکان پر پہنچ کر غفورے نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کتاب کے ورق کی طرح آسانی سے کھل گیا۔ نوراں غفورا اندر چلے گئے۔

اندر کمرے میں صبح کا دھندلکا چھایا ہوگا تھا۔ اس روشن اندھیرے میں نوراں نے دیکھا کہ چارئی پر ماسٹر برکت علی مرا پڑا تھا۔

چند ماہ بعد زکوٰۃ کا مہینہ پھر آ گیا۔ مولوی صاحب مسجد میں کھڑے وعظ کر رہے تھے۔ ''دکھیا اور بے سہارا بیوہ کی ایک آہ ساتویں آسمان میں سوراخ کر دیتی ہے۔ ایسی بیوہ کی مدد کرنے والا سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ اگر دین و دنیا کی عزت چاہے تو بیواؤں کی مدد کرو......''

☆☆

بلونت سنگھ

کٹھن ڈگریا

رکھی چند دُکان سے واپس آرہا تھا۔ صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت کوئی مزے دار بات سوچ رہا ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ چلتے چلتے جب اسے سگریٹ جلانے کی خواہش محسوس ہوئی تو اسے خیال آیا کہ ماچس تو دکان ہی پر رہ گئی ہے۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ اب وہ گھر کے قریب پہنچ چکا ہے۔ وہ اپنی دُھن میں اس قدر مگن تھا کہ اسے سگریٹ منہ سے نکالنے کا خیال تک نہ آیا۔ کسی راہ گیر کی نظر اس کے ڈھیلے ہونٹوں میں پھنسے ہوئے سگریٹ پر جا پڑتی تو وہ بے اختیار مسکرا دیتا۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ خود بخود مسکرائے جا رہا تھا۔ کبھی سر کو حرکت دینے لگتا۔ کبھی زیرِ لب کچھ کہنے لگا۔ وہ بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔ لیکن وہ پاگل نہیں تھا۔ چونتیس پینتیس برس کے قریب عمر، صورت بھی بری نہیں تھی۔ صحت بھی کافی اچھی تھی۔ تین بچوں کا باپ تھا۔ اعلیٰ پیمانے پر ریڈیو کی دوکان چلا رہا تھا۔ گیارہ بجے دوکان پر جاتا۔ اس کا معاون پہلے ہی سے موجود ہوتا تھا۔ ایک سے دو بجے تک لنچ کے لئے دوکان پر جاتا۔ اس کا معاون پہلے سے موجود ہوتا تھا۔ ایک سے دو بجے تک لنچ کے لئے دوکان بند کر دی جاتی۔ شام کے پانچ بجے کے قریب وہ گھر چلا آتا۔ البتہ دوکان سات بجے تک کھلی رہتی۔ آج کاروبار کے سلسلے میں ایک شخص کو ملنے کے لئے اُسے دہلی جانا تھا۔ اس نے اپنی بیوی شانتا کو سامان تیار کرنے کے لئے بھی کہہ دیا تھا۔ لیکن اچانک دوکان پر اُسے تار ملا کہ کل وہ شخص خود لاہور پہنچ رہا ہے۔ چلو سفر کی مصیبت سے جان چھوٹی۔ لیکن آج شام کا پروگرام کیا ہو؟ یہ سوال خواہ مخواہ اس کے ذہن پر اُبھر آیا اور وہ لمحوں تک بے سبب اس فکر میں غلطاں رہا اور پھر دل کی پکار خود بخود واضح ہوگئی کہ یہ شام اپنے دوست بیج ناتھ

کے ہاں گزاری جائے بلکہ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا جائے۔

کچھ روز سے بیج ناتھ کی بیوی کامنی اس کے لئے خاص کشش کا باعث بنی ہوئی تھی۔ یہ بات اخلاق سے گری ہوئی ضرور تھی لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ جوانی کے زمانے میں وہ حد سے زیادہ شرمیلا بنا رہا۔ زندگی کا سنہرا زمانہ کسی سے محبت کی پینگیں بڑھائے بغیر گزر گیا۔ جب شادی ہوئی تو چند سال تک وہ بیوی کا دیوانہ سا رہا۔ مگر رفتہ رفتہ بیوی میں کوئی کشش باقی نہ رہی۔ جب کبھی بیوی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی تو بس ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی۔ وہاں انکار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اپنی بیوی بے رس معلوم ہونے لگی۔ اس نے بازار کا رُخ کیا۔ وہاں دلال یہی کہتا کہ بس صاحب ہفتے بھر ہی سے بازار میں بیٹھنے لگی ہے۔ پہلے پہل تو یہ خیال ہی کچھ کم لذت انگیز نہیں تھا لیکن جب دلالوں کے ہتھکنڈوں کا علم ہوا تو طبیعت بُجھ گئی۔ دنیا کا دھندا تو چلتا رہا لیکن محبت کی پیاس کے مارے دل میں ہر دم کانٹا سا کھٹکنے لگا۔

گذشتہ دنوں اتوار کے روز وہ اپنے مکان کے سامنے چبوترے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس نے بیج ناتھ کو کامنی کے ہمراہ اپنے قریب آتے دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہونے پر بیج ناتھ نے کہا۔ ”ہم اجنبی ہیں۔ مکان کی تلاش کر رہے ہیں۔ کیا آپ ہماری مدد کرسکیں گے۔؟

یہ اُن کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے مکان دلوا دیا۔ اگرچہ اُن کے مکانوں کے درمیان میں کم فاصلہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود دونوں گھرانوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ ایک دوسرے کے ہاں جانا تقریبات میں شرکت کرنا کبھی کبھار تفریح کی غرض سے شہر سے باہر چلے جانا اُن کے معمول میں داخل ہو گیا تھا۔

ایسے موقعوں پر کامنی اس کی طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھ لیتی۔ پہلی مرتبہ تو اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سمجھا کہ اس کی نگاہوں نے دھوکا کھایا ہے۔ لیکن جب دبی دبی مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہونے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ ایک دوسرے سے محبت بھی کرسکیں گے۔ کبھی کبھی اس کا دل لعن طعن بھی کرتا لیکن پھر وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر ڈھارس دے لیتا کہ کامنی کی ہی طرف

سے تو آغاز ہوا ہے۔ کبھی سوچتا، معمولی دل لگی ہی تو ہے، ذرا کی ذرا چُہل ہو جاتی ہے۔ دل بہلا رہتا ہے اس میں قباحت کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ لیکن یہ سب ظاہر داریاں تھیں کیونکہ دل کی گہرائیوں میں وہ اچھی طرح محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے کامنی سے محبت ہوگئی ہے۔

راستہ چلتے چلتے وہ کامنی کی بابت سوچ رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اسے چھوا تک نہیں۔ شاید آج کوئی اہم واقعہ پیش آئے۔ ممکن ہے کہ وہ اس پہلی محبوبہ کے بہت قریب پہنچ جائے۔ اب وہ اپنی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ جیا پنواڑی کی دوکان اس کے مکان کے قریب ہی تھی۔ دوکان کے قریب سے ہوکر گزرتے وقت سلگتی رسی دیکھ کر اسے سگریٹ سلگانے کا خیال آیا۔ اگر کوئی دوست اسے ملنے کے لئے آتا تو گھر والوں کو خبر ہو یا نہ ہو لیکن جیا ضرور اس بات کا خیال رکھتا تھا چنانچہ سگریٹ سلگا کر اس نے جیا سے پوچھا ''کیوں بے جئے مجھے کوئی شخص ملنے کے لئے تو نہیں آیا تھا؟

اس وقت جیا نسوار سونگھ رہا تھا۔ چھینک آنے ہی کو تھی۔ اس لیے منہ سے جواب نہ دے سکا۔ کبھی اثبات میں سر ہلاتا کبھی نفی میں آخر معلوم ہوا کہ کوئی شخص نہیں آیا تھا۔ اس نے سگریٹ کا کش کھینچا اور گھر کی طرف بڑھا۔ دروازے کے آگے جو تین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں، ان کی دو اینٹیں اکھڑ گئی تھیں، ہر دم اُن پر سے پھسلنے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اسے کئی مرتبہ خیال آیا کہ ان کی مرمت کروادی جائے لیکن لاپروائی میں یہ کام پورا نہ ہوسکا۔

گھر کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ شانتا بڑے آئینے کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی ہے۔ معلوم ہوتا تھا، ابھی ابھی نہا کر آئی ہے اس وقت خاصی پیاری دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے دوست کہا کرتے۔ ''یار تر تمہاری عورت تو بہت حسین ہے۔ پھر بازاروں میں ادھر اُدھر دھکے کھاتے کیوں پھرتے ہو؟''

شانتا نے بال ایک ہاتھ سے گھما کر آگے لائے اور ان پر کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ ''جی میں نے آپ کا سامان تیار کر دیا ہے۔''

''بھئی آج تو میں نہیں جاؤں گا۔''

''کیوں؟'' شانتا نے تعجب سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

جس شخص سے ملنا تھا وہ خود کل یہاں آ رہا ہے نل بند تو نہیں ہوا؟ ذرا نہا لوں۔''

وہ غسل خانے میں چلا گیا اور وہاں ''کا کروں تُو سے الفت ہوگئی...... ہوگئی۔'' گاتا رہا جب کپڑے پہن چکا تو بیوی نے پوچھا۔اب کھانا کھا کر ہی باہر جائیے گا۔''

''نہیں بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ایک شخص سے ملنا ہے۔کھانا باہر ہی کھاؤں گا۔انتظار میں مت بیٹھی رہنا۔''

حالانکہ اس کی بیوی کو اس پر کسی قسم کا شک نہیں تھا لیکن اس نے بیج ناتھ کے گھر کا نام جان بوجھ کر نہیں لیا آخر کیا فائدہ؟ عورتیں وہمی تو ہوتی ہی ہیں۔آئینے کے سامنے کھڑے اس نے اپنی صورت کا جائزہ لیا اور اس نے خود ہی فیصلہ لیا کہ اس کی صورت بیج ناتھ سے کہیں بہتر ہے اور اگر کامنی اسے اپنے شوہر پر ترجیح دیتی ہے تو اسے اس کی خوش ذوقی کا ثبوت سمجھنا چاہئے۔

خوب بن سنور کر اس نے اپنے آپ پر آخری نگاہ ڈالی۔کوٹ کی اوپر والی جیب میں رنگین رومال ٹھکانے سے رکھا رخساروں پر ہاتھ پھیر کر ان کی ہمواری کا جائزہ لیا۔ٹائی کی گرہ درست کی۔ پتلون کی کریز پہلو بدل بدل کر دیکھی، ہیٹ پر جمی ہوئی گرد کی باریک تہہ چٹکی بجا بجا کر صاف کی۔ چاندی کا سگریٹ کیس جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے ایک نظر بیوی کی طرف دیکھا۔آج وہ واقعی حسین دکھائی دے رہی تھی۔دونوں لڑکے نانا کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ان کی غیر موجودگی میں بیوی کو پیار کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔لیکن وہ جلدی میں تھا اس لیے چھڑی گھماتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ایک لمحے کے لئے اسے خیال آیا کہ اگر وہ سگریٹ کیس میں عبداللہ کے سگریٹ رکھ لیتا تو بہتر ہوتا۔وہ ''عبداللہ'' سگریٹوں کا بڑا مداح تھا اور انہیں خصوصاً اس وقت پیتا تھا جب وہ خوش ہو۔اب سگریٹ لینے کے لیئے واپس جانے میں اس نے بدشگونی سمجھی۔اس لئے کوئے یار ہی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اس کا دل مسرور تھا۔قدم بڑے بانکپن سے اُٹھ رہے تھے۔اِرد گرد کی چیزیں اُجلی اور نئی سی

دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے ہر چیز نے نیا جنم لیا ہو۔ اس میں چمک تھی اور حرکات سے چلبلا پن عیاں تھا۔ اپنی بیوی اور گھر سے دور وہ اپنے آپ کو آزاد پرندے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ وہ کالج کے اس چھوکرے کے مانند دکھائی دے رہا تھا جو گھر سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہو اور اب والدین کے روپے سے عشق لڑا رہا ہو۔ محض عورت کی حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی وہ تو محبت کا بھوکا تھا، درد عشق کا خواہاں تھا۔ اصل چیز تو وہ جذبہ یگانگی تھا جو وہ کمو کے لئے محسوس کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کامنی کو پیار سے کموّ کہا کاتا تھا۔ اس کی یہی ایک تمنا تھی کہ اگر ان کی محبت پروان چڑھے اور دونوں کے دھڑکتے ہوئے سینے کسی روز مل جائیں تو وہ اسے پیاری کمو کہہ کر بلائے۔ کبھی کبھی جب تصورات کے طلسم سے نکلتا تو سوچتا کیا معلوم اس کے نصیب میں حسین کامنی کی محض مسکراہٹ ہی لکھی ہو؟''

آخر شام کے دھندلے میں جب بیج ناتھ کا بلا پلستر کی اینٹوں کا بنا ہوا مکان نظر آنے لگا تو اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ یہاں تک وہ ایک مبہم لیکن مسحور کن جذبے کے تحت چلا آیا تھا۔ لیکن اب وہ سوچنے لگا کہ اسے ان کے گھر میں کس انداز سے داخل ہونا چاہیے؟ اس مسئلے کے کئی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ان معاملات پر زیادہ تجویزیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ہر حرکت بے تکلفانہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ وہ بڑی بے تکلفی سے اُن کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

بڑے کمرے سے میاں بیوی کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رکھی دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ بیج ناتھ پاؤں پھیلائے کرسی کے بازو گیر بیٹھا تھا۔ اس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاید وہ باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کامنی اس کی قمیص میں بٹن ٹانک رہی تھی اور وہ گا رہا تھا۔ بیوی بگڑ رہی تھی۔ ''اب ذرا گانا بند کیجئے نا۔ سوئی چھاتی میں اتر جائے گی تو پھر نہ کہیئے گا۔

شوہر مسخرے پن سے بولا ''تم سے نہیں کہیں گے تو کس سے کہیں گے مائی ڈارلنگ! اور ہمارا کون ہے۔'' اور پھر وہ نہایت بھونڈے انداز میں نتھنے پھلا پھلا کر شکستہ بانس کی سی آواز میں ایک

فرسودہ سا گانا گانے لگا۔

تیرا کون ہے۔

کسے کرتا تو پیار پیار۔

''تیرا کون ہے...... تیرا کون ہے...... ہاں تیرا کون ہے۔''

اُدھر میاں بیوی میں یہ چُہلیں ہو رہی تھیں۔ ادھر چھ ماہ کا بچہ پالنے میں پڑا رو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بیج ناتھ اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ جوں جوں بیوی اس کی حرکت سے چڑتی توں توں وہ اُسے اور زیادہ پریشان کیے جاتا۔ وہ جھنجھلا کر کہتی ''اب مٹکنا بند کیجئے، منا رو رہا ہے۔''

رکھی رام دو قدم آگے بڑھا اور اس نے کھانس کر انہیں اپنی آمد سے مطلع کیا۔ بیج ناتھ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پہلے تو حیران رہ گیا۔ پھر چلایا۔ ''ہلو ہلو! یار! میرا خیال تھا، اب تک تم گاڑی میں بیٹھے ہو گے۔''

رکھی نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں بھئی، دہلی جانے کا پروگرام منسوخ ہو گیا ہے۔ کرپا رام سے ملنا تھا۔ اس کا تار آ گیا ہے کہ کل وہ خود لاہور پہنچ رہا ہے۔''

اتنے میں کامنی نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کے نمستے کر دی۔ ''جی نمستے!''

اُن نے بڑی معصومیت اور اخلاق سے جواب دیا۔

منا رو رہا تھا۔ کامنی اسے پیار سے پالنے میں سے اٹھا کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔

''منا کیوں رو رہا ہے؟ ہمارا منا کیوں رو رہا ہے؟ نا نا...... کیوں جی آپ کی منی بھی رو رہی تھی؟''

''جی نہیں۔'' رکھی نے جواب دیا۔ ''ہماری منی تو سوئی پڑی تھی۔ آج کل ہمارے گھر میں بچوں کا شور بہت کم ہوتا ہے۔ گوشی اور جیو دونوں نانا کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ بچے ہیں نا نئی جگہ ان کا دل بھی بہلا ہوا ہے۔ گھر میں بچاری منی ہے، سو چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔''

نا جی نا۔ ہمارا منا بھی تو نہیں روتا۔'' کامنی نے بچے کو پچکارتے ہوئے کہا ''آج تو اس کے بابو جی نے اُسے رُلا رُلا کر ہلکان کر دیا ہے۔ میں اُن کے بٹن ٹانک رہی تھی اور یہ ہل ہل کر گائے

جاتے تھے۔منا جاگ اٹھا اور رونے لگا۔''

جب وہ باتیں کر رہی تھی تو راکھی اس کے لچکیلے جسم اور تیزی سے ہلتے ہوئے ہونٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔اس وقت سج دھج کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا لیکن معمولی گھریلو لباس میں بھی وہ کس قدر حسین دکھائی دے رہی تھی۔اور پھر دفعتاً جو اسے کچھ خیال آیا تو بیج ناتھ سے مخاطب ہو کر بولا۔''یار معلوم ہوتا ہے کہ تم باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔میں تو یوں ہی ادھر چلا آیا۔اگر تم کسی کام سے جا رہے تھے تو چلو۔''

''نہیں یار بیٹھو، باتیں کریں۔''

''نہیں بھئی، مجھ سے یہ نہ ہوگا۔''

کامنی نے بچے کو گود میں جھلاتے ہوئے کہا۔ی''آج ان کی دعوت ہے کہیں۔''

''واقعی، بھئی واہ۔اب تو میں تمہارا راستہ نہیں روکنا چاہتا۔ضرور جاؤ، تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

نہیں، اب میں نہیں جاؤں گا۔تم اتنی دور سے آئے ہو، اب تو مل کر باتیں کریں گے اور ہاں، جیلانی کے ہاں برج کھیلنے کیوں نہ چلیں؟''

لیکن رکھی کو اپنی حرکت بہت نامناسب معلوم ہو رہی تھی۔''بیج بھائی اپنا پروگرام خراب مت کرو۔میں تو یوں ہی چلا آیا تھا۔بس اب سیر کرتے ہوئے گھر چلا جاؤں گا۔یہ ذرا بدتمیزی کی بات ہے کہ میری وجہ سے تمہارا میزبان پریشان ہو اور پھر ہم دونوں میں تکلف بھی تو نہ ہونا چاہئے۔''

بیج ناتھ چند لمحوں تک چپ رہا۔پھر بولا۔اتنی دور سے آئے ہو۔ہم دونوں کا وقت خوب کٹ سکتا ہے۔ہاں یار، ایک اور بات سوجھی ہے مجھے، تم یہیں بیٹھو اور میں ذرا کھانا کھا کر زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے اندر واپس آ جاؤں گا۔میری واپسی تک تم کھانا بھی یہیں کھا لو گے اور پھر ہم جیلانی کے ہاں چلیں گے۔بڑا مزے کا شخص ہے، گپ بھی اڑے گی اور برج بھی کھلے گی۔''

رکھی کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ رہا۔ایک گھنٹے کے لیے وہ اور کامنی تنہا رہ جائیں گے۔گودی

کامنا تو سو ہی جائے گا اس سے بڑا چار سالہ لڑکا بھی سلایا جا سکے گا۔ اس نے تیزی سے اچٹتی ہوئی نگاہ کامنی پر ڈالی۔ گونا گوں جذبات کے ہجوم میں وہ کچھ نہ بول سکا۔ بیج ناتھ کہتا چلا گیا۔ ''کہو یار کیسی رہی؟ بھئی کہیں جانا نہیں۔ تمہیں میرے سر کی قسم! میں بہت دور نہیں جا رہا ہوں یہی اپنے ڈاکٹر شرما کے ہاں تو دعوت ہے۔ تم شاید نہیں جانتے انہیں۔ تمہارے راستے ہی میں تو مکان پڑتا ہے۔ اچھا تو وعدہ کرو، تم نہیں جاؤں گے۔ یہ نہ ہو میں بھاگم بھاگ واپس پہنچوں اور تم غائب ہو جاؤ۔ بس آج شاندار پروگرام رہے گا۔ راکھی چپ کھڑا رہا۔ بھلا وہ کہاں جا سکتا تھا؟ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ تقدیر بھی اس قدر اچھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک موہوم سی امید پر یہاں آیا تھا۔ ادھر بھگوان نے بھگت کی پرارتھنا قبول کر یک خود اپنے ہاتھ سے اس کے راستے کا کانٹا صاف کر دیا تھا۔

''لو یہ ہے سگریٹ اور یہ رہا دیکلی۔ کمو انہیں روٹی کھلا دینا۔ ذرا خیال رکھنا، بھاگ نہ جائیں کہیں۔ میں چٹکی بجاتے میں آیا۔''

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی پتلون کے بٹن لگانے لگا۔ برش سے بال ہموار کیے، ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے اگلا پلو نیچے اوپر کیا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر والے دروازے کی طرف بڑھا۔ کامنی پکار کر بولی۔ ''ہائے کیسے بھاگے جا رہے ہیں۔ گھر سے باہر جانا ہو تو پاؤں زمین پر لگتے ہی نہیں، اب جلدی لوٹ آیئے گا۔''

''ہاں بھئی، لوٹ آؤں گا۔ لوگ ہمارا ایندھن اٹھا اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس کی فکر کیا کرو۔ ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لو۔ اچھا یار میں چلا۔''

ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے کامنی بیٹھک کی کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر شوہر سے آنکھیں چار ہوئیں شوہر نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے ہلا دیا۔ وہ وہاں چپ کھڑی اسے گلی کے نکڑ سے غائب ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس اثناء میں رکھی بھی چپکے سے دیوار سے لگ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک کامنی سنسان گلی کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر اسکا ہاتھ اوپر اٹھ کر بجلی کے بٹن کی طرف بڑھا اور دوسرے لمحے میں بجلی کا بلب بجھ گیا۔ اور فرش پر بچھی ہوئی دری پر

کھڑکی میں سے آتی ہوئی چاندنی پھیل گئی۔

رکھی نے بازو بڑھایا جو کامنی کے پیٹ سے ہوتا ہوا اس کے گوشت سے بھرپور کولھوں پر جا کر ٹک گیا۔ کامنی کی کمر ذرا سی لرزش کے بعد ساکن ہوگئی۔ وہ اور قریب ہو کر اس کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ ان دونوں کی آنکھیں چار نہیں ہوئیں۔ لیکن کامنی کی کمر نے ہلکی سی لرزش کے بعد سکون اختیار کر کے گویا اس کے سوال کا جواب اثبات میں دیا تھا۔

وہ خاموش کھڑی تھی۔ دو ایک مرتبہ رکھی کے لبوں سے نکلتی ہوئی دردِ محبت میں ڈوبی ہوئی نہایات مدھم سی آواز سنائی دی۔ ''کمو کمو''

''بی بی جی! بی بی جی!!'' بڑے لڑکے کی پکار سنائی دی۔

وہ بلند آواز میں بولی۔ ''آئی بیٹا! آئی، بیٹھے رہو ہیں۔'' رکھی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ ذرا پرے سرک گئی۔ ''سنو کمو سنو'' اس کی آواز بری طرح لرز رہی تھی۔

کامنی دو قدم پرے دیوار سے پیٹھ لگائے دونوں ہتھیلیاں دیوار پر ٹکائے سر نیہوڑائے کھڑی تھی۔ کمرے کی فضا خوابناک تھی، ہر طرف سُرمئی غبار سا چھایا ہوا تھا۔ کامنی کی مدھم شبیہہ حسین مجسمے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ صرف اس کی چھاتیوں کے زیر و بم سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بے جان مورت نہیں ہے۔ ''کمو! سنو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''میں تم سے محبت کرتا ہوں! کیسے فرسودہ الفاظ تھے؟ جنہیں اس نے بیسیوں مرتبہ کتابوں میں پڑھا تھا، فلم کے پردے پر سُنا تھا لیکن آج وہ یہ فقرہ اس طرح ادا کر رہا تھا جیسے یہ اسی کی اختراع ہو۔''

جواب میں کامنی نے پلکیں اوپر اٹھائیں اور ایک مرتبہ بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سپردگی کے انداز میں پلکیں جھکا کر رہ گئی۔ وہ بجلی کے کوندے کی طرح آگے بڑھا۔ اس کی کمر بازوؤں میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے پھولوں کی نازک ڈالی پکڑ کے جھنجھنا دی ہو اس کا جسم سر سے پاؤں تک کامنی کے نرم اور لچکیلے جسم کے لمس سے محفوظ ہونے لگا۔ ایک اور شدید اور فوری جذبے کے تحت اس نے نہ معلوم کس کس طرح اسے بھینچا، چوما

اور پھر لڑکے کی پکار کی آوازیں ہتھوڑوں کے دھمکوں کی طرح سنائی دینے لگیں اور پھر کامنی اڑتی ہوئی خوشبو کی طرح اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

وہ کمرے میں تنِ تنہا کھڑا رہ گیا۔ کھڑکیوں میں داخل ہونے والی چاندنی کی روشنی کی کرسیاں، تپائیاں، تصویریں، پردے اور کتابیں، غرض ہر شے خواب ناک اور ساکن دکھائی دے رہی تھی۔ صرف اس کی ٹانگیں اور بازو لرزاں تھے۔ سانس تیزی سے چل رہی تھی غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے چند غیر مبہم سی آوازیں نکل گئیں۔ کچھ دیر تک وہ خلا میں گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ ایک مرتبہ احساسِ گناہ کی شدت سے کانپ بھی اٹھا۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ پھر اس نے رومال سے منہ اور پیشانی صاف کی، کپڑوں کی سلوٹیں اور کوٹ کی جھول کھائی ہوئی آستینیں کھینچ کر ہموار کیں۔ پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا صحن میں باورچی خانے کی جانب بڑھا۔ کامنی چولہے کے قریب بیٹھی دیگچی میں چمچ چلا رہی تھی۔ اس کا بڑا لڑکا اس کے گھٹنے کے ساتھ لگا ہوا اونگھ رہا تھا۔ وہ چولہے میں لپلپاتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں کامنی کے دمکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ باہمی کشمکش میں کامنی کے بال پریشان ہو گئے تھے۔ گال سرخ ہو گئے تھے۔ قمیص دو تین مقامات سے مسک گئی تھی۔ یہ سب اس کی دست درازیوں کے نتائج تھے۔ اس خیال سے وہ ایک نئی لذت کے احساس میں گم ہو گیا۔

بظاہر کامنی اس کی آمد سے بے خبر دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ بچے کو اونگھتا ہوا دیکھ کر اس نے کہا۔ ''چلو تمہیں سلا دوں۔'' اور اسے سلانے کے لئے اندر چلی گئی۔ رکھی چولہے کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں حالات کا جائزہ لینے لگا۔ کامنی پھر چولہے کے قریب آ بیٹھی۔ اس کی حرکات سے غیر معمولی واقعے کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ دیگچی چولہے سے اتار کر اس نے توا رکھ دیا۔ اور آٹا توڑ کر پیڑا بنانے لگی اور اس سے آنکھیں ملائے بغیر بولی۔ ''آپ کو سردی لگ رہی ہو۔ چولہے کے قریب آ جائیے نا۔''

''واقعی سردی بہت سخت پڑ رہی ہے۔'' یہ کہہ کے اس نے اسٹول کھسکایا اور چولہے کے قریب

آ گیا۔

رکھی کی نظریں اس کے رخسارں، آنکھوں اور تیزی سے جنبش کرتے ہوئے ہونٹوں اور ہاتھوں کی حرکات پر جمی ہوئی تھیں۔ رکھی دل میں وہ بے چین تشنگی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ جو پیاسے ہونٹوں سے شربت کا گلاس پرے ہٹ جانے سے محسوس ہونے لگتی ہے۔ کامنی نے روٹی الٹتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو بھوک تو لگ رہی ہوگی۔''

اس نے اٹھ کر کامنی کے رخسار پر ہونٹ رکھ دیئے۔ ''نہیں کمو!'' مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔'' یہ کہہ کر وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ کامنی نے اپنے آپ کو اس کی مرضی پر چھوڑتے ہوئے کہا ''مجھے روٹی تو پکا لینے دیجئے۔''

''نہیں جان سے پیاری کمو! روٹیاں پھر پکا لینا۔'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ مار کر توا چولہے سے گرا دیا۔

وہ خوش تھا اور سرتاپا نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب وہ بیٹھک میں دری پر لیٹا ہوا تھا۔ ٹانگیں اٹھا کر قریب بچھی ہوئی کرسی پر پاؤں ٹکا رکھے تھے اور بجلی کی جگ مگاتی ہوئی روشی میں ویکلی کا پرچہ پیٹ پر دھرے اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر کامنی چولہے کے آگے بیٹھی اس کے لئے پراٹھے پکا رہی تھی۔ اس روز سے پہلے زندگی کے جو دن گزر چکے تھے، وہ بالکل بے کیف نظر آنے لگے تھے۔ یہ مسرت یہ لذت اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ دل مطمئن تھا۔ جسم ہلکا پھلکا اور چُست محسوس ہو رہا تھا۔ روح پر ناقابلِ بیان کیف عاری تھا۔ اج کامنی اور وہ ایک ہو گئے تھے۔

کھانا تیار ہو گیا تو انہوں نے ایک ساتھ مل کر کھایا۔ ایک دوسرے کے منہ سے منہ ملا کر نوالے چھینتے رہے۔ ہنسی مذاق اور چُہل میں وقت گزر گیا اور آخر دروازے پر دستک سنائی دی۔

کامنی نے دروازہ کھولا۔ بیج ناتھ کا معصوم چہرہ دیکھ کر رکھی کے دل میں فتور پیدا ہو گیا لیکن کامنی آڑے آئی۔ ''آپ کے دوست تو اُٹھ اُٹھ کر بھاگ رہے تھے، بڑی شکل سے بٹھائے رکھا

میں نے۔''

بیج ناتھ نے بے تکلفانہ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔''یار کمال کرتے ہو۔آخر گھبرانے کی کیا بات تھی؟'' دوست کی سادگی اور اخلاص دیکھ کر رکھی کو شرم سی محسوس ہونے لگی۔اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

''کہو، کھانا کھالیا؟''

''ہاں!''

''آؤ تو چلو جیلانی کے ہاں۔''

راستے میں بیج ناتھ دعوت کی باتیں کرتا رہا۔کہنے لگا۔''ڈاکٹر شرما میرے بہت گہرے دوستوں میں سے ہیں۔بڑے پریم سے کھانا کھلایا۔واپس نہیں آنے دیتے تھے۔ہزار حیلوں سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔

جب وہ جیلانی کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں کوئی فوجی رشتے دار باہر سے آئے ہوئے ہیں۔اس لئے وہ برج نہ کھیل سکیں گے۔ان کا پروگرام درہم برہم ہوگیا۔خیر وہ کچھ دیر تک ادھر اُدھر ٹہلتے رہے۔پھر بیج ناتھ نے کہا۔''آؤ گھر بیٹھیں۔سردی بہت زیادہ ہے۔''

''بھئی اب اجازت دو۔اب میں گھر واپس جاتا ہوں۔پھر ملاقات ہوگی۔چنانچہ مصافحہ کر کے وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

آج کے مسرت انگیز واقعے سے اس کا دل اگرچہ مسرور تھا لیکن دوست سے اس پاجی پن کے باعث ضمیر ملامت بھی کرتا تھا۔اور جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اپنی نیک اور معصوم بیوی کے تصور سے اس کا دل اور بوجھل ہو گیا۔بے چاری سردی میں ٹھٹھری ہوئی آگ کے قریب بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

جب وہ جیا کی دکان کے قریب پہنچا تو حسب معمول اس نے پوچھا۔''کیوں بے جیے! کوئی آیا تو نہیں تھا ہمیں ملنے کے لئے؟''

جیا نے سر اوپر اٹھایا۔ ''اجی بابو بیج ناتھ آئے تھے۔ سیدھے بھیتر چلے گئے۔ مجھ سے تو کچھ بولے نہیں۔ جب آپ نہیں آئے تو بیچارے انتجار کر کے چلے گئے۔''

''بیج ناتھ!'' اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

''ہاں جی! بیج ناتھ بابو''

دکان سے مکان تک چند قدم کا فاصلہ اس نے بہت آہستہ آہستہ طے کیا۔ جب وہ سیڑھیوں پر قدم رکھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ اکھڑی ہوئی دو اینٹیں پھر اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہیں۔ اس نے احتیاط سے انہیں ٹکا کر رکھ دیا اور پھر ایک لمحے بھر کے سکوت کے بعد اس کے منہ سے مدھم سی ہنسی نکل گئی اور جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہاں ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ ماحول پر سکون اور آرام دہ محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی بیوی اندر والے دروازے میں کھڑی دکھائی دی۔ وہ اس وقت نوشگفتہ، پھول کی مانند تر و تازہ اور اجلی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پھول جس کا منہ شبنم نے بڑی احتیاط سے دھو ڈالا ہو۔ جس پر جمی ہوئی گرد کی نامعلوم تہہ کسی نے چوم لی ہو۔

بڑے کوچ پر بیٹھ گیا۔ شانتا شاخِ گل کی طرح لچکتی ہوئی نزدیک آئی اور اس کے قریب کوچ میں دھنس گئی۔ اس نے سر سے پاؤں تک بیوی کا جائزہ لیا اور مسکرا کر بولا۔ ''سنو! آج تو تم بہت خوش دکھائی دیتی ہو۔''

اپنے مخصوص انداز میں بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ لجا کر مسکرا دی۔ اس کے تر و تازہ ہونٹوں سے سپید سپید دانت کسی حد تک نمایاں ہوئے اور اس نے بلا کچھ کہے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے کندھے پر رخسار ٹکا دیا۔

شنو کی نیند کی ماتی پلکیں بوجھل ہو کر جھکنے لگیں۔ وہ چند لمحوں تک شنو کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دے کر بولا ''میں بھی بہت خوش ہوں شنو! ذرا ادھر لاؤ عبداللہ سگریٹوں کا ڈبا۔''

☆☆

کلام حیدری

سخی

میں ذکریا اسٹریٹ کے ایک گندے اور چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا ہوں ہوں۔ سامنے سیاہ رنگ کے ٹیبل پر چھوٹی سی چائے کی پیالی رکھی ہے جس میں تلخ قسم کی چائے پر بالائی پڑی ہوئی ہے۔ میرے ٹیبل کے سامنے ایک لمبا سا ٹیبل ہے جس پر کئی دوسرے لوگ بیٹھے ہیں، ان میں سے ایک کو میں پہچانتا ہوں۔ وہ جو شطرنجی ڈیزائن کی لنگی پہنے ہوا ہے اور جس کی گنجی بجائے بٹن کے فیتے سے بند ہونے والی ہے، میں اسے صرف اس وجہ سے پہچانتا ہوں کہ وہ مجھ سے مہینہ میں ایک بار منی آرڈر لکھواتا ہے، کبھی پچاس، کبھی چالیس اور کبھی سو بھی۔

یہ کہاں رہتا ہے، میں نہیں جانتا، یہ کیا کرتا ہے، یہ بھی میں نہیں جانتا، یہ منی آرڈر کہاں بھجواتا ہے، صرف یہ میں جانتا ہوں۔ بی بی سکینہ معرفت شرافت حسین، بیڑی دکان پورنیہ ــــــــ

اور میں نے اب چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں سے لگالی ہے اور بالائی ہونٹوں سے الجھ رہی ہے، میں نے پھونک مار کر بالائی کو کچھ ہٹا دیا ہے اور تب پہلے گھونٹ کے ساتھ، ایک میٹھی تلخ دھار حلق سے پیٹ میں اترتی ہوئی محسوس کر رہا ہوں، میں نے پیالی واپس طشتری میں رکھ دی ہے۔

بی بی سکینہ کے بارے میں مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ اس شطرنجی ڈیزائن کی لنگی والے کی بیوی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا نام مولا ہے اور منی آرڈر لکھواتے وقت اپنا نام مولا بخش لکھواتا ہے۔ پہلے پہل جب میں نے اس سے منی آرڈر فارم پر لکھنے کے لئے اس کا پتہ پوچھا تھا تو اس نے اپنا نام مولا بخش بتایا اور کہا۔ ''معرفتی آپ اپنا ہی لکھ دیجئے''۔

چنانچہ میری معرفت روپیہ بھیجنے والے کے پتے سے بھی مجھے ناواقف ہی رہنا پڑا۔

اور میں نے چائے کی پیالی دوبارہ اٹھالی ہے، اور بالائی کو غور سے دیکھ رہا ہوں جو چائے پینے میں حارج

ہوگی۔ میں ایک لمبا گھونٹ لیتا ہوں اور بالائی تھوڑی سی چائے سمیت میرے منہ میں چلی جاتی ہے اور میں منہ چلانے لگتا ہوں۔

بی بی سکینہ کا شوہر پست قد کا گٹھا ہوا سیاہی مائل آدمی ہے، جس کے کان کی لو تھوڑی سی کٹی ہوئی ہے اور گالوں کی دونوں جانب کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ چہرہ بڑا اور محنتی آدمی کا سا معلوم ہوتا ہے۔ سینہ چکلا اور گردن بھری بھری مگر اوسط درجے کی لمبی ہے آنکھوں میں چمک ہے مگر جیسے وہ دھندلا ہٹوں میں ہو۔ داہنے ہاتھ کی شہادت والی انگلی کا ناخن نکیلا اور لمبا ہے۔

اور میں نے پیالی پھر ہاتھ میں لے لی ہے۔ اور ہوٹل میں آنے والے دو افراد کو دیکھنے لگا ہوں جو دروازے کے پاس رک گئے ہیں اور ہوٹل کا جائزہ لے رہے ہیں ایک کے سر پر ''دلی والوں'' جیسی ٹوپی ہے جو بے میل ہے اور دوسرا ننگے سر ہے اور بال الجھے الجھے ہیں اور دونوں پھر اندر آ جاتے ہیں۔

میں نے چائے کا تیسرا اور آخری گھونٹ لے کر پیالی طشتری پر رکھ دی ہے اور اسے میز کے ایک طرف کھسکا دیا ہے۔

ہوٹل کا ریڈیو چیخ چیخ کر فلمی گانے سنا رہا ہے اچانک وہ زور سے کھڑ کھڑاتا ہے اور ہوٹل کا نوجوان مالک جو ٹھڈی ہاتھوں پر رکھے کسی اردو اخبار کو جانے کب سے پڑھ رہا تھا۔ چونک کر ریڈیو کا بٹن گھمانے لگتا ہے۔

اور میں ان دونوں کو دیکھ رہا ہوں جو ابھی ابھی اس ہوٹل میں داخل ہو کر بیٹھے ہیں۔ اور دلی والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص نے اپنے ساتھی سے کچھ مشورے کرنے کے بعد دو شیرمال اور دو سیخ کباب کا آرڈر دے دیا ہے اور ہوٹل کا لونڈا اس بڑے سے طاق نما سوراخ کے پاس کھڑا ہوا ہے جہاں سے ہوٹل کے باورچی خانے کا منظر دکھائی دیتا ہے۔

اور مولا بخش ایک کروٹ بیٹھے بیٹھے دوسرا پہلو بدل کر بیٹھ جاتا ہے اور باہر سے نظریں ہٹا کر وہ میری جانب دیکھنے لگتا ہے، جیسے اسے میرے دیر تک بیٹھے رہنے پر تعجب ہو رہا ہو، میں اس کی ٹٹولتی نگاہوں سے بچ کر پہلو بدلتا ہوں۔

اور اب میرے انتظار کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے، جس اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے یہاں ملاقات

کرنے کا وعدہ کیا تھا اس کے آنے کی امید تقریباً ختم ہو چکی ہے اور ساتھ ہی ساتھ امید کی جس کرن کے سہارے میں نے تین روپے ساڑھے چودہ آنے میں پچھلے چار دن گزارے۔ تھے وہ کرن اس ہوٹل میں جیسے گم ہوگئی، اب تک وہ ایڈیٹر نہیں آیا۔ جس نے مجھے ترجمہ کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور جس سلسلے میں میں نے سوچا تھا کہ کام ٹھیک ہوتے ہی کچھ ایڈوانس مانگوں گا جس سے ذکریا اسٹریٹ کے ایسے ہوٹلوں میں کم از کم چند دن کھپ سکوں۔

دلی والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص کے آگے ایک شیر مال رکھی ہوئی ہے، اوپر کا سرخی مائل حصہ بے حد اشتہا انگیز ہے اور کباب سے اٹھتا ہوا ہلکا ہلکا دھواں میں آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔

وہ ایڈیٹر ابھی تک نہیں آیا ہے، اور میں سوچ رہا ہوں، مولا بخش کی بیوی سکینہ کیسی ہوگی؟ اور اس کے کوئی بچہ ہے کہ نہیں اور اس وقت مجھے اچانک لگا کہ میں مولا بخش سے مخاطب ہوکر پوچھوں کہ اس کے کوئی بچہ ہے یا نہیں۔ میں نے اس سوال کو مہمل اور بے موقع خیال کرتے ہوئے اپنے ذہن سے نکال دیا ہے۔

اور اب وہ دلی والوں کی ٹوپی پہنے شخص اور اس کا ساتھی آدھی سے زائد شیر مال کھا چکے ہیں اور سیخ کباب سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو اب میں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید اب دھواں اٹھ بھی نہیں رہا ہے۔

وہ ایڈیٹر اب نہیں آئے گا، اور میں نے چار دن یوں ہی بے کار گنوا دیئے۔ ورنہ ان چار دنوں میں دوڑ دھوپ کی جا سکتی تھی، کوئی ٹیوشن ہی تلاش کی جا سکتی تھی، مگر چار روز تک اس اطمینان سے بیٹھے رہنے کے بعد ابھی اچانک اس متوقع کام سے مایوسی پر اب آگے چلنے کی جیسے صلاحیت ہی نہ رہی ہو۔

سکینہ کی عمر بیس سال زیادہ نہ ہوگی اور بچہ بھی کوئی نہ ہوگا۔ یہ شرافت حسین کون ہوگا، اور تب میں سوچتا ہوں کہ، یہ شرافت حسین مولا بخش کا رشتہ دار وغیرہ ہوگا یا پھر دوست ہو سکتا ہے اور سکینہ......

اب یہ کیا تک ہے کہ ایڈیٹر وعدہ کے خلاف اب تک نہیں آیا ہے اور مجھے سکینہ کی عمر کی پڑی ہے، شرافت حسین اور سکینہ کی رشتہ داری کی نوعیت کی فکر ہے، مولا بخش اور شرافت حسین کے تعلقات سے مجھے کیا تعلق ہے؟

اور اب وہ دونوں شیر مال کے بعد چائے بھی پی چکے ہیں اور کاؤنٹر پر ہوٹل کا نوجوان مالک ان سے پیسے لے رہا ہے۔

اب تین بج رہے ہیں، گیارہ بجے سے تین بجے تک انتظار کے بعد نڈھال سا ہو رہا ہوں۔

یہ مولا بخش ہر ماہ کی ۱۳ تاریخ کو منی آرڈر ضرور لکھواتا ہے۔ ایک دو روز آگے یا پیچھے مگر پوری پابندی سے لکھواتا ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں، سکینہ ضرور خوبصورت ہوگی، اور یہ جو مولا بخش کی آنکھوں میں چمک ہے، وہ اسی جوان محبت کی چمک ہے اور جو یہ چمک کسی قدر دھندلا ہٹوں میں ہے وہ فراقِ یار ہے۔

تین روپے ساڑھے چودہ آنے کے تقریباً جدا ہو جانے کے بعد ایڈیٹر نہیں آیا تو اب کیا ہوگا ____ سوچ رہا ہوں، یہ جو جیب میں اب فقط ساڑھے چھ آنے ہیں اس میں سے چھ پیسے یعنی ڈیڑھ آنے بھی جدا ہونے والے ہیں۔

اور میں اس پیالی کو دیکھ رہا ہوں جسے میں کب کا خالی کر چکا ہوں مگر ہوٹل کے نوکر نے اسے ٹیبل سے نہیں اٹھایا ہے، تو یہی وہ پیالی ہے جو مجھے مزید ڈیڑھ آنے سے محروم کر دے گی اور میری جیب میں پانچ آنے رہ جائیں گے اور کلکتہ شہر، اور یہ زکریا اسٹریٹ، اور یہ دلکشا ہوٹل ____

دل سے مانتا ہوگا مولا بخش سکینہ کو جبھی تو ____ اور اب مولا بخش اپنی جگہ سے اُٹھ چکا ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے، اور اب وہ میرے قریب آ گیا ہے اور کہہ رہا ''ہم کل آئیں گے جی ____ آپ رہیں گے نا؟ ____ میں اسے اثبات میں جواب دیتا ہوں اور سوچتا ہوں یہ کل منی آرڈر لکھائے گا۔ اور کل صبح تک میری جیب میں پانچ آنے رہیں گے یا......

میں اس وقت اپنی کوٹھری کی ایک چوکی پر پڑا ہوں، میرے سرہانے دو آنے پیسے تکیہ سے دبے پڑے ہیں، اور میں رات دیر تک جاگنے سے گرانی محسوس کر رہا ہوں۔

اس کلینڈر کی جانب دیکھ رہا ہوں جو ہوا سے پھڑ پھڑا رہا ہے جس میں ایک امریکن عورت جہاز کی سیڑھی پکڑے بڑے ہی قاتل انداز میں کھڑی ہے میں امریکن کلینڈر...... میں منہ ہاتھ دھو چکا

ہوں، بھوک لگ رہی ہے، بڑی احتیاط سے میں تکیہ ہٹاتا ہوں اور دو آنے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیتا ہوں، ڈوری پر ٹنگا ہوا پینٹ پہن لیتا ہوں ___

میں سوچ رہا ہوں، ٹیوشن کی تلاش میں نکلنا بہتر ہوگا کچھ سہارا ہو جائے۔ پھر اطمینان سے نوکری تلاش کروں گا، اور تب سوچتا ہوا انگریزی کی جو ڈکشنری پڑی ہے اسے بیچ کر کچھ پیسے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس خیال سے تقویت محسوس کرتا ہوں ___

اور میرے سامنے حسین بیڑی دوکان، پورنیہ، مولا بخش...... ساٹھ روپے۔

اب میں منی آرڈر لکھ چکا ہوں اور مولا بخش کے ساتھ ہی ساتھ کوٹھری میں تالا بند کر کے سڑک پر آ گیا ہوں اور مولا بخش مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اسے آج مالک نے جلد ہی بلایا ہے اس لئے وہ آج منی آرڈر نہیں لگا سکے گا اور میں کچھ سوچ کر اس سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے فرصت ہے وہ کہے تو میں منی آرڈر لگا دوں۔

''آپ ___؟'' وہ ہچکچاتا ہے مگر میں اسے ہمت دلاتا ہوں کہ آخر وہ بھی آدمی ہے، ایک کام ہی اس کا کر دوں گا تو کیا چھوٹا ہو جاؤں گا۔

مولا بخش، جا چکا ہے اور میری جیب میں ساٹھ روپے ہیں اور منی آرڈر فارم ہے۔ اور میں ٹیوشن کی تلاش میں جا رہا ہوں۔

ابھی شام ہوگئی ہے اور میں دل کشا ہوٹل میں نہیں ہوں میں پارک سرکس میں ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں بیٹھا ہوں، میری میز پر ابھی بیرا نے ایک شیر مال، قورمہ اور سیخ کباب لا کر رکھا ہے اور میں بغور اس شیر مال کو دیکھ رہا ہوں جو بہت ملائم، بے حد لذیذ اور خوبصورت نظر آ رہی ہے۔

میرے ذہن میں اس ایڈیٹر کا خیال نہیں ہے جس نے مجھے ترجمہ کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور گیارہ بجے سے تین بجے تک اس کا انتظار کرنے کے بعد بھی وہ نہیں آیا، اور اس وقت زیادہ سے زیادہ سات بجے ہیں اس ہوٹل میں رونق بڑھتی جا رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں اس ہوٹل تک میرے

قدم کیسے آئے، کوئی ٹیوشن نہیں ملی، نوکری نہیں ملی اور دفعتاً مجھے سکینہ کا خیال آتا ہے جس کے پاس اسی پابندی سے منی آرڈر بھیجا گیا ہے مگر جو اس کو نہیں ملے گا، ساٹھ روپے میری جیب میں پڑے ہیں۔ اور منی آرڈر فارم میں نے کراؤن سنیما کے سامنے پڑے ہوئے پیک کے گملے میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈال دیا ہے۔

میں شیر مال کھانے لگا ہوں اور مجھے خیال آیا ہے اگر میں مولا بخش سے بیس پچیس روپے مانگ لیتا تو شاید وہ دے دیتا مگر مولا بخش کے سامنے دستِ سوال بڑھانے کے خیال سے مجھے بڑی ذلت محسوس ہو رہی ہے۔

یہ کباب کتنا خوش ذائقہ ہے اور پیاز کے ان تراشوں کے ساتھ تو اس کا لطف ہی نرالا ہے۔

میں ڈلہوزی اسکوائر کے ایک آفس سے نیچے اُتر رہا ہوں، پانچویں منزل سے اترتے اترتے پاؤں دکھنے لگے ہیں اور ایسی کتنی ہی بلڈنگوں سے نامراد لوٹتے لوٹتے اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے نوکری نام کی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں ہے۔

ٹرام کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا اپنی تھکن کو دور کر رہا ہوں۔

میری جب میں بائیس روپے کچھ آنے ہیں اور سکینہ کو منی آرڈر ابھی تک نہیں ملا ہے۔ بائیس روپے کتنی بڑی طاقت کا مظہر ہیں۔ میں سوچتا ہوں ابھی کچھ روز اور بھی چکر کاٹ سکتا ہوں۔ بائیس روپے اب بھی میرے پاس ہیں۔

اب میں چلنے لگا ہوں اور رخ کولوٹولہ کی طرف کر دیا ہے، چلتے چلتے اس بلڈنگ تک آ گیا ہوں جو جاپانی بمباری کی زد میں آئی تھی۔

میں وہاں پر آ گیا ہوں جہاں اردو رسالوں کی دوکان ہے اور میں اس سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ سکینہ کا خیال مجھے اس کوٹھی کا خیال دلاتا ہے جو تھیئٹر روڈ میں ہے اور جہاں مجھے ٹیوشن کے لئے آج شام کو بلایا گیا ہے کیا پتہ آج ٹیوشن مل ہی جائے۔

یہ ناخدا مسجد ہے، وہی زکریا اسٹریٹ کے دروازے کے باہر ایک لاش اسٹریچر پر پڑی ہوئی

ہے،اور ایک نو جوان آواز لگا رہا ہے۔

''ایک غریب مر گیا ہے، کفن دفن کے لئے پیسے دے کر ثواب حاصل کیجئے۔''

میں قریب جاتا ہوں۔ فیتے سے بند ہونے والی گنجی، ایک کان کٹی ہوئی لو۔

مولا بخش ____؟ میں ہلکے سے اس کا نام لیتا ہوں، سکینہ کے پاس منی آرڈر پہنچنے سے پہلے یہ خدا کے یہاں پہنچ گیا۔

میں اس آواز لگانے والے نوجوان سے پوچھتا ہوں یہ کیسے مرا۔ ''ٹرک سے کچل کر۔'' نیچے کے دھڑ سے اس نے چادر ہٹا کر دکھایا۔ مجھے چکر آنے لگا ہے۔ یہ ناخدا مسجد ہے، مولا بخش ہے، جس کے کفن دفن کے لئے ایک آنے دو آنے راہ گیر چادر پر پھینکتے جا رہے ہیں۔

میرا ہاتھ جیب میں جاتا ہے۔ بائیس روپے کچھ آنے اس چادر پر پھینک کر جلدی جلدی جانے لگتا ہوں، وہ نوجوان مجھے غور سے دیکھتا ہے۔

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ نوجوان مجھے اب بھی غور سے دیکھ رہا ہے ____

☆☆

واجدہ تبسم

مرد

لگتا تھا، نئی نویلی دلہن سو رہی ہے۔ ہونٹوں پر وہی جان لیوا مسکراہٹ، بالوں میں وہی چمک، ماتھے پر وہی گھونگر، جو حسن کی حفاظت کے لئے مامور کیے گئے سنپولوں کے مانند پیچ ڈال کر سدا جھومتے رہتے ہیں۔ اور تو اور موت نے چہرے کی شادابی اور گلابی رنگت تک پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔

موت ہوئی بھی تو کیسی، اچھے بھلے دونوں مسکراتے، باتیں کرتے، گاڑی میں اُڑے چلے جا رہے تھے۔ باتیں بھی کتنی خوش گوار اور میٹھی میٹھی، سہانے خوابوں کی تعبیریں دینے والی۔ اکلوتے جوان بیٹے کی شادی کی باتیں۔ پیچھے سے ٹرک نے اس بری طرح گاڑی کو ہٹ کیا کہ پہلے تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا۔ مراد صاحب کو پہلے ہی ہوش آیا۔ لوگوں کی بھیڑ کہ میں سب سے پہلے، بلا کسی شرم لحاظ کے انہوں نے تقریباً چلا کر پوچھا ''میری جان کیسی ہے؟''

جان تو نکل چکی تھی۔ اللہ جانے کیسا دھکا لگا تھا کہ وہ ونڈ اسکرین سے ٹکرائیں اور دوسرے ہی لمحے ختم ہو گئیں۔

موت بھی وہ مسکراہٹ نہیں چھین سکی تھی۔ جو مرتے وقت بیٹے کی شادی کی خوش آئند باتوں نے ان کے من موہنے چہرے پر بکھیر دی تھی اور ان کی وہ بے مثال جوانی۔ چالیس سے اوپر ہو چکی تھیں، لیکن لڑکی جیسی نظر آتیں۔ کسی کسی سراپا پر سے ماہ و سال اس طرح گزر جاتے ہیں کہ اُسے چھوتے تک نہیں، اجاڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خود بہاریں اس سے بہار حاصل کرتی ہیں۔

مراد صاحب ہنس کر کہتے ''پی چو، بھئی کمال آفت چیز ہو تم بھی۔ پتہ ہے کل پارٹی میں بیگ صاحب نے کیا پوچھا۔''

''کیا پوچھا؟'' وہ ہنس کر بھولی بن جاتیں۔

''کہنے لگے: آپ کی بٹیا کی تعلیم ختم ہو گئی؟ یعنی بھئی کمال ہو گیا! ہم تمہارے ڈیڈی ہو گئے!

''غضب اللہ کا۔ نکاح ہی توڑ دیں گے کیا آپ؟'' وہ ہنس دیتیں۔ نہ گھنگھروؤں میں وہ جھنک تھی، نہ گلاسوں میں وہ کھنک۔ پتہ نہیں کہاں سے چاندی سونے کے گھنگھر واور ٹوٹتے پیانوں کی کھنک کو ملا جُلا کر اپنے گلے میں بسالیا تھا کہ ہر ساز بے آبرو تھا۔

کبھی جواُن کی طبیعت ذرا خراب ہو جاتی مراد صاحب پاگل سے ہو جاتے۔

''اللہ، اب یوں نہ گھبرائیں۔ کوئی مَری نہیں جارہوں ہوں۔''

وہ ان کے نرم گرم بھرے بھرے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیتے۔'' خدا کے لیے پی چو، ایسے الفاظ منہ سے نہ نکالو۔ میں تو خدا سے بھی ٹکر لے لوں گا تمہارے لیے۔''

''ارے نعوذ باللہ! توبہ کیجئے۔ بھلا کوئی خدا سے بھی ٹکر لے سکتا ہے؟''

''میری جان، میرا مطلب سمجھو۔ میں خدا کے آگے اتنا گڑ گڑاؤں گا کہ اسے بھی میری دعا سنی پڑے گی۔''

لیکن گڑگڑانا کام آیا نہ دعائیں قبول ہوئیں۔ ساتھ ساتھ دونوں بیہوش ہوئے۔ خود ہوش میں آئے تو بس پری چہرہ کی لاش ہی دیکھی۔

برسوں پہلے مراد صاحب کے لیے اماں جب لڑکی دیکھ کر لوٹی تھیں تو انہوں نے کہا تھا۔

''دلہن کا نام ہی پری چہرہ نہیں، واقعی پری چہرہ ہے۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ بھی اسی دنیا کی بسنے والی ہے۔ لیکن جب سمدھن نے نام بتایا تو پھر میں سوچا کہ پری ہے نا۔ کوہِ قاف سے آئی ہوگی۔ اسی لیے اس دنیا کی نہیں لگتی۔''

مراد صاحب زور سے ہنس دیئے۔ ''اماں، قسم سے آپ تو شاعری کر رہی ہیں۔''

''شاعری واعری میں نہیں کیا کرتی۔ بس اللہ سے میری ایک ہی دعا تھی کہ جیسا میرے بیٹے کا اونچا عہدہ ہے، جتنی شان کی اس کی نوکری ہے، بنگلہ ہے، دلہن بھی اسی لائق ملے، یہ نہیں کہ میاں بی بی کے ساتھ گاڑی سے اتریں تو ایسا لگے جیسے......''

''جیسے لنگور کے ساتھ حور۔'' بیٹے نے ماں کی بات اچک لی۔

''ارے چل موئے۔'' وہ پیار سے اُنھیں گلے لگا کر بولیں۔ ''میرا بیٹا بھی لاکھوں میں ایک ہے

انہیں بڑا مان تھا کہ بالکل شہزادہ جیسا ہے میرا بیٹا۔

پری چہرہ عشق کے مارے مراد صاحب کے لئے پی چو بن گئیں۔

''ارے آپ یہ کیا کہہ کر بلاتے ہیں۔لوگ کیا کہیں گے؟''

''پی چو،لوگ کچھ نہیں کہیں گے۔صرف جلیں گے۔ ہے کسی کے پاس ایسا چاند سا چہرہ؟''

اس چاند سے چہرے کو بیٹے کی پیدائش نے کئی چاندوں کی جگمگاہٹ عطا کر دی، ورنہ ہوتا تو ہے کہ بچے لٹیرے ہوتے ہیں، ماں کا حسن لوٹ جاتے ہیں۔ان کا بیٹا تو حسن کی سوغات لے کر اپنا حسین سراپا لئے جب وہ اس کے پیچھے بھاگتی پھرتیں تو مراد صاحب پیچھے سے جا کر ان کی لمبی چوٹی کھینچ لیتے۔

''کیا بیٹے کے پیچھے ہمیں بالکل ہی بھلا دو گی، جان؟''

''اللہ،کیسی باتیں کرتے ہیں آپ! آپ تو سچ مچ میرے دل کی مراد ہیں آپ کی برابری کوئی کر بھی سکتا ہے بھلا؟''

''یہ فرہاد بھی نہیں؟''

''ایسے دس فرہاد ہو لیں نا۔'' وہ ذرا جھینپ کر رہ گئیں۔

''اچھا،تو اتنے لمبے چوڑے پروگرام ہیں!'' وہ رنگ میں آ کر ہنسے۔''تو پھر چلئے کمرے میں کچھ تیاری ہو جائے۔''

''چھی! آپ تو بالکل ہی ویسے ہیں۔''

''ارے ہم تو ہمیشہ ہی ویسے ہیں اور ہمیشہ ہی ویسے رہیں گے۔یعنی آپ کے دیوانے، آپ کے عاشق، آپ کے مجنوں، ارے آپ نے ہم سے کبھی کہا ہی نہیں کہ ہمیں آسمان سے ذرا چاند توڑ کر لا دیجئے، ہم ٹیکا لگائیں گے۔خدا کی قسم ہم پلک جھپکتے میں حاضر کر دیتے۔یا کبھی آپ یہ ننھی سی فرمائش کرتیں، کہ اللہ تھوڑے سے ستارے اتار کر لا دیجئے نا، دوپٹے میں ٹانکنے ہیں، تو یہ بندہ

فوراً روانہ ہو جاتا۔''

''آپ......'' پی چو رُک رُک کر بولیں۔ کیا واقعی آپ مجھے سدا اتنا ہی چاہتے رہیں گے؟''

''اے جان، آزما کر دیکھو، آزما کر۔ بس ایک بات کی فکر اور قلق رہ جائے گا جانم کہ ہمارا نام قصے کہانیوں میں نہیں آ پائے گا، کیونکہ مجنوں کی طرح ہم نہ کبھی صحرا میں پائے گئے۔ نہ مہیوال کی طرح جنگلوں اور بنوں میں رہے۔ بس تمہارے دل کی کتاب میں ہمارا نام ہمیشہ مرقوم رہے گا۔''

وہ شرارت سے اس کی ٹھوڑی چھو کر بولے۔ ''یہی بہت کافی ہے۔ تمہارے دل میں ہمارا نام اور تمہاری آنکھوں میں ہماری صورت۔ پھر دنیا میں اور کچھ نہیں چاہیے۔''

پی چو اپنی کھن کھناتی ہنسی ہنس کر کہتیں۔ ''اللہ، آپ کے سارے ڈائیلاگس اگر ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں نا تو اچھے خاصے رائٹر بن جائیں آپ۔''

''ارے ہم تو آپ کی یہ چاند سی صورت دیکھتے ہی رائٹر، شاعر، سب ہی کچھ بن گئے تھے۔ ہماری کتابیں یا دیوان نہیں چھپا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، جانم۔''

پری چہرہ کو سخت اُلجھن کا سامنا اُس وقت ہوتا جب غیروں کی محفل میں بھی مراد صاحب اپنی عشق بازی کا مظاہرہ کرنے لگتے۔

''کیوں صاحب، اللہ میاں نے ساری دنیا میں ایک بھی صورت ایسی حسین بنائی ہوگی؟ ارے صاحب، ہم زندہ کیسے ہیں۔ یہی حیرت ہے۔ حسن کی یہ بجلی گرتے ہی ہم خاک کیسے نہ ہو گئے، بس اسی پر تعجب ہے۔ لیکن شاید اس میں بھی اللہ میاں کی مصلحت ہوگی کہ ایسے حسین اور شاداب باغ کے مالی ہم بنیں۔ جی بھر کے گل چینی کریں اور پھر بھی ترستے رہیں۔ ایسا مدھ بھرا پورا کا پورا مے خانہ۔ دل بھر کے نظروں کی شراب پئیں۔ اور پھر بھی پیاسے رہیں۔ مگر خدا کی قدم اس تشنگی میں بھی وہ لذت ہے کہ بار بار جینے اور بار بار مرنے کو جی چاہتا ہے۔''

دوست احباب مزے لیتے۔ آخر مراد صاحب کمشنر تھے۔ کچھ عہدے کا رعب، پھر بلا کے حسین، مردانہ وجاہت کے پُتلے۔ شخصیت کا دبدبہ۔ لوگ کھسیانی ہنسی ہنسنے لگتے۔ لیکن ایک بات

طے تھی کہ ان کے حلقہ احباب میں سب ہی پری چہرہ کو بس آنکھوں ہی آنکھوں میں بٹھائے رکھتے۔ ایسی قدر دانی اور عزت بہت ہی کم بیویوں کو نصیب ہوتی ہوگی۔

بنگلے میں داخل ہوتے ہی مراد صاحب ''پی چو۔ پی چو۔'' شروع کر دیتے۔ وہ ہنستی مسکراتی کسی بھی کونے سے سورج بن کر طلوع ہو جاتیں۔

''اللہ آپ کی یہ دیوانگی۔ آ ہی تو رہی تھی۔ اماں آخر کیا سوچیں گی؟''

وہ سر کھجانے لگتے۔ ''ارے بھئی اماں زیادہ سے زیادہ یہی سوچیں کہ جوان بیٹا ہے، جوان بہو ہے۔ کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا ارادہ ہو رہا ہوگا۔''

''تھو تھو۔''

''آپ کو تو ہر بات بد معاشی سے شروع ہو کر بد معاشی پر ہی ختم ہو جاتی ہے، آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے، مراد؟''

''مراد؟' وہ سینے پر ہاتھ مارتے'' ہے ہے، کیا لفظ کہہ یا۔ مراد! بس ہماری ایک ہی تو مراد ہے پیاری کہ آپ سدا ہمارے پہلو میں رہیں۔''

پی چو تو بہ تلّا کرنے لگتیں۔ ''اتنی ساری سہیلیاں ہیں میری۔ سب ہی اپنے اپنے میاؤں کی بُری بُری باتیں سناتی ہیں، لیکن وہ ساری باتیں مل کر بھی آپ کی ایک دن کی باتوں کا عشرِ عشیر تک نہیں ہو سکتیں۔''

''دیکھو دیکھو، پی چو۔ تم نے پھر گڑ بڑ والی باتیں شروع کر دیں۔ اب یہ ننھی سی گلابی گلابی، ننگ جڑی خوبصورت سی ناک چڑھا کر 'عشرِ عشیر کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ نہیں صاحب، آپ نہیں مانیں گی۔ اب سیدھے سیدھے چلی چلیے بیڈ روم میں۔ جو ہوگا وہیں دیکھا جائے گا۔''

وہ لاک دہائیاں دیتیں، لیکن ہوتا وہی جو مراد صاحب چاہتے۔ عید بقرعید پر، کسی شادی بیاہ کے موقع پر وہ سج دھج کر کام میں مشغول ہیں۔ بس کسی نہ کسی کام کے بہانے مراد صاحب گھسے چلے آ رہے ہیں، اندر بے کل سے بے چین بے چین سے۔ خواہ مخواہ کوئی ضروری کام نکالا ئے۔

''ارے پی چو......''

''یہ جب دیکھو تب پی چو، پی چو کیا لگا رکھی ہے آپ نے؟ آپ تو بھلے پپیہا ہوتے اور پی کہاں پی کہاں چلاتے پھرتے۔''

''اس وقت بھی تو پی کہاں پی کہاں کر رہا ہوں، جانم۔ یہ بتاؤ میری اتنی ضروری فائل کہاں رکھ دی؟''

''میں نے؟'' وہ ذرا غصے سے کہتیں۔ ''میں نے آپ کی فائل رکھی؟ ارے اپنی اٹیچی یا بریف کیس دیکھیے نا۔'' پھر بھی بے چاری ڈھونڈنے جاتیں۔ اوپر مراد صاحب پیچھے آ کر انھیں بانہوں میں بھر لیتے۔

''اتنی اچھی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے یہ؟ اچھا تم نے لگائی ہے شاید بھئی دماغ خراب کر دیتی ہو انسان کا۔ آخر اتنے سارے مہمان گھر میں بھرے پڑے ہیں۔ اب میں یوں کمرے میں قید ہو جاؤں گا تو لوگ کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ کیسا زن مرید ہے!'' وہ پری چہرہ کو باتوں میں لگا کر سیدھے لمبے چوڑے بیڈ پر لے آتے۔

''بس یہی ذرا سی شرارت۔ اور پھر...... پھر...... ارے یار، حوا کو اللہ میاں نے آخر آدم کی پسلی سے کیوں نکالا تھا؟ سارا مزا کر کرا کر دیتی ہو بچ بچ کے۔''

دراصل سارا مزہ ہی انہیں اس میں آتا تھا کہ وہ بچ بچ کے رہتی تھیں۔ وہ عورت ہی کیا جو مرد کا اشارہ پا کر آ جائے اور بستر کی طرح بچھ جائے۔ مرد کو تر سانے والی عورت ہی رانی بن کر راج کرتی ہے، ورنہ مرد کی تو فطرت ہی اللہ نے ایسی بنائی ہے کہ وہ فوراً ہاتھ آنے والی عورت کو باندی بنا لیتا ہے۔ مرد کو جھکانے والی، اس سے معافیاں منگوانے والی، اپنے سامنے ناک رگڑنے والی عورت ہی عورت کہلاتی ہے اور سر اونچا کر کے جیتی ہے۔

جوانی بھر پی چو سر اونچا کر کے جیا کیں۔ میاں سدا بھنورا بنے ان کے گرد چکر لگاتے رہے، اور سچ تو یہ ہے کہ پی چو کی جوانی کبھی اس راستے گزری ہی نہیں جس پر چل کر بڑھاپے کی دہلیز آتی ہے۔ بات بات پر، ادا ادا پر نہارنے اور سراہنے والا میاں ہو تو عورت ویسے بھی کبھی بوڑھی نہیں

ہوتی۔ وہ تو فرہاد نے جوانی میں قدم رکھا اور نوکر چاکر آنے جانے والے، سب ہی انہیں، بیگم صاحبہ، جیسے معزز الفظ سے نوازنے لگے تو پری چہرہ کو احساس ہوا کہ میں اب لڑکی سے عورت بن گئی ہوں، ورنہ مراد صاحب کے وہی چونچلے تھے اور وہی مستیاں۔

''اللہ کے لیے مراد...... آخر آپ ہیں کیا؟ برابر میں ہی فرہاد کا کمرہ ہے۔''

''اچھا اچھا، فرہاد کا کمرہ برابر میں ہے۔ تو آپ ایسا کریں کہ اپنی یہ چغل خور چوڑیاں اُتار دیں بجتی ہیں کم بخت تو بجے ہی چلی جاتی ہیں۔''

''یہ بات نہیں مراد۔ اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں، صبح ہی، صبح گیلے بالوں سے اس عمر میں بہت شرم آتی ہے مجھے۔''

دوسرے دن میڈ ان جاپان ہیئر ڈرائر سنگھار میز پر رکھا ہوا انھیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

''یہ بتایئے، آپ مجھے اتنا چاہتے کیوں ہیں؟ میں سمجھتی تھی، چلو جوانی کے دن ہیں، ندی پر طغیانی آئی ہوگی۔ آپ تو ابھی ویسے ہی سرپھرے ہیں۔ آخر آپ کو میرے پاس آتے ہی ہو کیا جاتا ہے؟'' وہ مسکرائیں۔ ''اب تو سنبھل جایئے۔ چالیس سے اوپر کی ہو رہی ہوں میں۔''

''یہ آپ کو چیزیں رکھ رکھ کے بھول جانے کی بہت بری عادت ہے۔ آپ نے اپنی عمر کے بیس سال کدھر رکھ دیے؟ ہمیں تو بس بیس ہی نظر آ رہے ہیں۔ اور جب ہمیں بیس نظر آ رہے ہیں تو وہی صحیح ہوں گے۔ سمجھیں آپ؟''

مراد صاحب کے دل کی کلی تو اس وقت کھلی جب ان کے بھتیجے کے لیے دلہن دیکھنے، پری چہرہ، اماں بی، بھابھی جان اور کچھ دوسری خواتین لڑکی کے گھر گئیں۔ وہاں ان سب نے تو لڑکی پسند کر لی، لیکن لڑکی کے ماموں نے جو کنوارے تھے اپنی بہن سے بے حد خوشامد کی کہ ''لڑکے والوں کی طرف سے وہ جو بے حد خوبصورت، لمبے والوں والی لڑکی بھی آئی ہے اسے ہمارا پیغام پیش کر دیجیے پلیز......''

اس بات کا وہ وہ چرچا ہوا کہ پری چہرہ اپنے آپ میں شرما شرما جاتیں۔ چہرہ گلاب گلاب

ہو جاتا۔ اور مراد صاحب اپنی جگہ اکڑ اکڑ کر کہتے۔ ''دیکھا جانم؟ ہم نہیں کہتے تھے کہ تم بالکل ٹین ایجر ہو۔ دیکھنا یار، کہیں سچ مچ پیغام قبول نہ کر لینا۔ کیوں پیاری، ہمیں چھوڑ کر چلی تو نہیں جاؤ گی نا؟''

''توبہ! کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی۔ کم سے کم فرہاد کا تو خیال کر لیا کیجیے، کالج جاتا ہے جوان ہو گیا ہے۔ کئی دفعہ تو کترا کر نکل جاتا ہے۔ آپ کی ان حرکتوں کو کیا وہ سمجھتا نہیں ہو گا؟''

''ارے سمجھا کرے، جان۔ کیا وہ اپنی بیوی کے ساتھ یہی سب کچھ نہیں کرے گا۔ ہم تھوڑی اسے منع کرنے جائیں گے۔'' وہ شرابی کی سنک کی طرح گھوم پھر کر ایک ہی بات پر آ جاتے۔ ''تو جانم آپ وہ ماموں کا پیغام قبول کر کے ہمیں چھوڑ کر چلی تو نہیں جائیں گی نا۔ آں؟''

اور وہ واقعی چلی گئیں۔ ایسی جگہ جہاں جا کر پھر آج تک کوئی واپس نہیں لوٹا۔

مراد صاحب پاگل ہو کر رہ گئے۔

بہت بڑا حلقۂ احباب تھا۔ تعزیت کرنے والوں اور پُرسہ دینے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ لوگ انھیں سر پٹختا دیکھتے اور دل مسوس لیتے۔ خواس پہ جانے کس طرح پی چو چھپائی ہوئی تھیں کہ نیند کی گولیاں بھی اثر نہ کرتیں۔ ڈاکٹر بے حد پریشان اور حیران تھے۔ چھ چھ گولیاں کھلانے کے باوجود وہ جاگتے، روتے، تڑپتے اور سر پٹختے رہتے۔ انجکشن لگانے کے لئے ڈاکٹر قریب آتے تو رو کر عجیب درد بھرے لہجے میں کہتے۔

''ڈاکٹر، نیند کے انجکشن دے کر چاہتے ہو میں اُسے بھول جاؤں؟ زندگی بھر جسے یاد رکھا اور صرف اُسے ہی یاد رکھا، تو کیا ایک نیند کا انجکشن لے لینے سے میں اس کی یاد بھول جاؤں گا؟ نہیں ڈاکٹر نہیں، نیند کا انجکشن نہیں اب صرف موت ہی اسے میرے دل سے ہٹا سکے گی۔ اور موت بھی کیوں؟ ہمیں کیا پتہ مرنے کے بعد کیا کیا احساسات ہوتے ہوں گے۔ ممکن ہے مرنے کے بعد میں اسے زیادہ یاد کروں، کیونکہ میں نے اُس کے جسم سے زیادہ اس کی روح کو چاہا ہے۔ ممکن ہے وہاں روح سے روح......''

ڈاکٹر، جو دوست بھی تھے، مجبور ہو کر ہٹ جاتے۔

تعزیت کرنے والوں میں دہلی سے پری چہرہ کی دوست نجمہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ان ہی کی بیٹی ثمر سے فرہاد کی بات چیت چل رہی تھی۔ نجمہ ویسے بھی کئی بار آتی جاتی رہتی تھیں۔ پری چہرہ اور وہ دونوں ساتھ ساتھ کی کھیلی پڑھی بڑھی تھیں۔ دونوں کے ایک ایک ہی اولاد تھی۔ نجمہ کا خیال تھا کہ ماؤں سے جس طرح بیٹیوں کو ورثے میں مزاج، عادات، اطوار، خوش مزاجی، بدمزاجی ملتی ہے اسی طرح باپوں سے بیٹوں کو ان کی ہر ادا، عادت اور مزاج ملنا لازمی ہے۔ وہ شروع سے دیکھتی آرہی تھیں کہ مراد صاحب کس قدر ٹوٹ کر پری چہرہ کو چاہتے ہیں۔ اُنھیں یقین تھا کہ فرہاد بھی اپنی ہونے والی دلہن کا یوں ہی پروانہ رہے گا۔اور جب خود پری چہرہ نے رشتے کی بات چھیڑی تو انھیں بیٹھے بٹھائے جنت مل گئی۔ دونوں کے دل خوشیوں اور ارمانوں سے کیسے لبریز تھے۔ نجمہ پر تو پری چہرہ کی موت کی خبر سنتے ہی بجلی گر پڑی۔ بس یہ ہوا کہ وہ خاک اور راکھ نہ بن پائیں، لیکن مردے سے بدتر حالت میں تھیں۔

ثمر پہلی بار ساتھ آئی تھی۔

یوں تو موت کا گھر تھا، لیکن ثمر کی آمد، اس کے وجود اور اس کی آواز نے جیسے ماحول کو ایک دم زندگی دے دی۔ بلا کا حسن پایا تھا۔

''پلیز ثمر، تم پاپو کو فورس کر کے کچھ کھلا دو۔ پتہ نہیں ان بے چاروں کا کیا ہوگا۔''

''میں کیسے کھلاؤں فرہاد......؟ وہ تو سر تک نہیں اُٹھاتے۔'' وہ غم اور ڈر سے ملی جلی کیفیت کے ساتھ بولی۔

''تو آنٹی سے ہی کھلوا دو۔''

''لیکن کیسے فرہاد۔ کمشنر صاحب مانیں تب نا۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''کمشنر صاحب؟'' فرہاد حیرت سے بولا۔ ''تم پاپا کو کمشنر صاحب کہتی ہو؟''

وہ ذرا شرمندہ سی ہو کر بولی۔ ''یہ بات نہیں فرہاد۔ اصل میں ممی انہیں کمشنر صاحب کہتی ہیں نے ہمارے ہاں سب یہی کہنے لگے۔ میں تو یہاں پہلی بار آئی ہوں۔ تمہیں برا لگا ہو تو سوری۔''

''اینی وے، میرے پاپا کا مطلب ہے تمہارے پاپا۔ جاؤ، اب انھیں کھانا کھلا دو، یا کم سے کم

چائے بسکٹ۔ بی اے گڈ گرل۔''

اُن کا دھواں دھواں چہرہ، سوجی سوجی آنکھیں، الجھے الجھے بال اور سراپا پر برستی ویرانی دیکھ کر ثمر کا دل دکھ سے بھر گیا۔ چائے کی ٹرے ہاتھوں میں تھامے ہی تھامے وہ دھیرے سے بولی

''کمشنر صاحب۔''

پھر ایک دم اس نے ڈر کر، پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ سوچا فرہاد نے سنا ہوگا تو پھر برا مانے گا۔ کیا کروں زبان پر تو یہی چڑھا ہوا ہے۔''

اتنے دن میں آج پہلی بار مراد صاحب نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ کچھ نامانوس سی آواز تھی۔ وہ اجنبی نظروں سے اُسے دیکھتے رہے۔ ثمر ڈری گئی۔

''آپ پلیز کچھ کھالیں، کمشنر صاحب۔'' اچانک وہ اٹک گئی۔ مم...... میں ثمر ہوں۔''

''ثمر؟'' مراد صاحب نے زیرِ لب دہرایا ''ثمر...... ثمر بہشت...... جنت کا میوہ۔'' انہوں نے اپنا سر زور سے جھٹکا۔ کیا یہ بات ان کے اپنے دل نے سوچی تھی؟ اسی لمحے انہیں پری چہرہ کی میت والا دن یاد آیا، جب وہ سر پٹخ پٹخ کر رو رہے تھے۔ پورچ میں بکھری ہوئی عورتوں میں سے کسی نے کسی سے پوچھا تھا۔ ''یہ کون اتنا تڑپ تڑپ کر رو رہا ہے؟''

''اے ہے، یہی تو بیگم صاحبہ کے میاں ہیں۔''

''بے چارے بالکل ہی جوان ہیں۔''

''تو بیگم صاحبہ خود بھی تو لڑکی جیسی لگتی تھیں۔

''مگر ان کو تو کوئی بھی اپنی بیٹی دینے کو راضی ہو جائے۔ ایسے جوان خوبصورت ہیں۔''

''بس کرو اللہ کے لیے۔ موت کا گھر دیکھو اور شادی بیاہ کی باتیں دیکھو۔''

مراد صاحب کی نظر دوسری بار اٹھی تو آئینے پر جا پڑی۔ تیسری بار ثمر پر ٹھہری، چوتھی بار اٹھی تو آئینے پر پڑی۔ خود پر ٹھہری رہی۔ اور پانچویں بار اُن کی نظر ثمر پر پڑی تو پھر اٹھی نہیں۔

''اماں!'' مراد صاحب نے دھیرے سے پکارا۔

مراد صاحب کی ماں اور پری چہرہ میں ساس بہو والے تعلقات قطعی نہیں تھے۔ ان کا بیگم پاس رہتی ہیں۔ پھر جب پتہ چلتا کہ نہیں، ساس بہوں ہیں تو یقین کرنے کو جی نہ چاہتا۔

اماں بہو کے، جو بیٹی سے بڑھ کر تھی، غم میں نڈھال سی پڑی تھیں۔

''اماں!''

دوسری بار مراد صاحب کے پکارنے پر اماں کے کمزور وجود میں ذرا سی ہلچل ہوئی اور وہ کراہتے ہوئے دھیرے دھیرے اُٹھ بیٹھیں۔

بیٹے کو پاس پاکر خوشی کی ایک لہر سی بھی آئی اور رونا بھی ٹوٹ کر آیا۔ کیسا ہنستا بولتا پرندوں کا سا جوڑا تھا۔ ایک اُڑ گیا۔ ایک اداس، تنہا رہ گیا۔ اکیلا۔ اکیلا۔

''دنیا اسی کا نام ہے بیٹا۔ خدا کو یہی منظور تھا کہ تم اکیلے رہ جاؤ۔ بڑی خوش نصیب تھی میری بیٹی جو میاں کے کندھے سوار ہو کر جنت کو سدھاری۔ مگر میرے بچے۔'' وہ بغیر آنسوؤں والا رونا رونے لگی۔ بڑھاپے میں خون پانی سب ہی سوکھ جاتے ہیں۔ آنسو کہاں سے اتریں؟

''اماں۔'' وہ ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خود ماں کو دلاسہ دینے کے انداز بولے۔

''وہ بات نہیں اماں۔''

''تیری طبیعت ٹھیک نہیں بیٹے۔ سوتا بھی تو نہیں تو۔ ایک انجکشن لگوا لے۔ مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا بیٹے۔ جینا تو پڑتا ہی ہے۔ اب یہ عمر جینے کی تھی بیٹا؟''

''اماں'' مراد صاحب نے ماں کے کندھے کو ذرا مضبوطی سے پکڑا اور ایک ساتھ کہتے گئے۔

''فرہاد کی تو ابھی تعلیم بھی پوری نہیں ہوئی۔ پھر ابھی اس شادی کی عمر بھی نہیں ہے، اتنی جلدی میں اس کے کندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ نجمہ ایک دو دن میں دہلی چلی جائیں گی۔ ان کی روانگی سے پہلے آپ میرے لیے ثمر کو مانگ لیں۔''

آج پری چہرہ کی موت کو بیسواں دن تھا۔

☆☆

انور عظیم

دھرتی کا بوجھ

چارپائی کی پائینتی کی رسی ڈھیلی ہوگئی تھی۔ کیوال مٹی کی کچی کوٹھری میں، عمر دراز، اس ڈھیلی ڈھالی چارپائی میں، ایک لاش کی طرح دھنس گیا تھا۔ اس کی جھریاں، لگتا تھا کہ سڑی ہوئی، پیاز کے چھلکوں کی طرح تہہ بہ تہہ اُتر آئیں گی۔ آنکھیں زرد اور بے جان تھیں۔ منہ سوج گیا تھا۔ ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ اس کے کلوں اور سر پر چھوٹے چھوٹے بال اُگ آئے تھے۔ جیسے چیونٹیوں نے انڈوں کا جال سا بُن دیا ہو۔ کوٹھری میں کوئی روشن دان نہیں تھا۔ تھوڑی بہت روشنی دروازے سے آجاتی تھی جو آنگن میں کھلتا تھا۔ دروازہ عمر دراز کے منہ کی طرف کھلا ہوا تھا۔ چارپائی چھوٹی تھی اور اس کی ٹانگیں پائینتی کے باہر بندوق کے کندوں کی طرح نکلی ہوئی تھیں۔ فیل پا کی وجہ سے ان دونوں موٹے کُندوں کی کھر دری اور سیاہ جلد پھٹ گئی تھی اور مکھیاں رطوبت چوس رہی تھیں، مکھیاں کبھی اڑ کر اس کے چہرے پر جم جائیں اور وہاں بھی بدمزہ ہو جاتیں اس کالی کوٹھری میں مکھیاں ہی اس کی واحد ہمدم تھیں۔ وہی گنگنا کر اسے جگاتی تھیں وہی لوریاں دے کر اسے سلاتی تھیں۔ وہ دیر سے اپنی زرد کنیل کے پھول جیسی آنکھیں پلک جھپکائے بغیر، گھن لگی کھجور کی کڑی پر جمائے ہوئے تھا اور سورج کی ایک چمکتی ہوئی کرن اس کی پیشانی پر برمے کی طرح تھرک تھرک کر سوراخ کیے دے رہی تھی۔ اس کی گردن کے پسینے سے لاکھوں چیونٹیاں اپنی پیاس بُجھا رہی تھیں اس نے اپنا تھرتھراتا ہوا ہاتھ اٹھایا اور پیشانی پر جمادیا۔ لیکن برما تھا کہ اسی طرح تھر کے چلا جارہا تھا۔ اس کی الٹی ہتھیلی کو چیرتا ہوا وہ اس کے دماغ کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

غضب کی چلچلاتی ہوئی دوپہر تھی اور اس پر اُس کی بہو کا پارہ تھا کہ چڑھتا ہی چلا جارہا تھا ____

اور وہ تھا کہ چپ چاپ گھن لگی کڑیوں کو جن سے تھوڑی تھوڑی دیر پر آٹا گرتا رہتا تھا، گھورے جا رہا تھا۔

''ہونہہ ___ یہاں تو ہُن برستا ہے۔ اللہ کی مار، اپنا کیا ہے۔'' نواب صاحب نے چھتری اٹھائی اور چل دیئے منہ نہار لنگی پھٹکارتے ہوئے ___ اور بھری کڑیل لاش چھوڑ دی سڑنے کو اور سڑاند مری ناک میں بسانے کو'' وہ شلوکے کے بٹن کھول کر اپنے جڑواں بچوں کو دودھ پلاتے ہوئے اپنا منتر پڑھے جا رہی تھی ___ بار بار وہی ایک منتر ''ہائے میں مرگئی ہوتی۔ دونوں پاؤں قبر کو لگ رہے ہیں۔ مسور کی دال کی کھچڑی پکا دو۔ آلو کا بھرتا۔ املی اور پودینے کی چٹنی ___ اور بگھے پر سے ایک چھٹانک گھی بھی منگوالو۔ قسم خدا کی مرجاؤں گا اور دل کی دل میں رہ جائے گی ___ ہاں جی کیوں نہیں۔ بڑے آئے دل کی دل میں رکھنے والے۔ غضب خدا کا ___ '''' مجھ کرم جلی پر ہی زمانے کی بجلی ٹوٹنی تھی۔ یک نہ شد دو شد ___ ارے او چنو کے بچے ___ چٹورا کہیں کا۔ دہی کیوں اڑائے جا رہے ہے، ہائے اللہ ___ منی ذرا وہ پوتڑا پچکار کر۔ وہاں الگنی پر پھیلا دینا ___ ہنہ میں بھی آج بھوکا نہ ماروں تو میرے نام کا کتا پال لینا دوزخ میں۔ نہیں میرے لال سو جا سو جا۔ ارے دیکھ وہ آ رہی ہیں کالی چیزیں ___ پانی پیو گے میرے لال۔ سو جاؤں اوں۔''

وہ صبح سے اِن ہی باتوں کی رَٹ سن رہا تھا۔ اس کی بہو، باسط کی دلہن، برابر بڑبڑائے جا رہی تھی۔ ''دلہن تم عورت ہو یا مشین گن۔'' لیکن مشین گن پھر مشین گن ٹھیری۔ وہ ایک رحم دل بڑھیا پڑوسن کی سٹھیائی ہوئی بات پر کیوں کان دھرتی۔

دن ڈھلنے کو تھا۔ عمر دراز کی کوٹھری میں کاجل سا بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے کڑیاں اوجھل ہوگئیں وہ دروازے سے باہر کی دنیا کو جھانک کر دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی گردن نے مڑنے سے انکار کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں نیلا آنسو بھر آیا لیکن ڈھلک نہ سکا۔ آنکھوں کے دونوں کناروں پر غلیظ سی جھاگ جمی ہوئی تھی۔ اور اب مکھیاں اس کی ناک کو دہلی گیٹ کی طرح نہیں

استعمال کر رہی تھیں۔

سوچنے کی ساری طاقت جو صبح سے خشک سوتا بنی ہوئی تھی اچانک فوارے کی طرح پھنکارنے لگی ___ آج سارا دن کٹ گیا۔ مجھے دلہن نے کھچڑی بھی نہیں دی۔ بڑھیا آئی تھی۔ کتنی بوڑھی ہوگئی ہے۔ اس کے جسم سے دہی اور گھی کی بُو آ رہی ہے۔ آخر تو گوالن ہے۔ پوچھتی تھی ''بڑے بابو دوا دارو ٹھیک سے کراؤ۔ بھگوان رکھے تورا بیٹا کماوت ہے۔ بھرا گھر ہے۔ سب ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بھگوان کرے'' اور بڑھیا اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اس کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ لرز رہی تھی۔ کیا وہ افق پر سورج کے ڈوبنے کا منظر دیکھ رہی تھی اس کالی کوٹھری میں؟ نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ خود اپنے ساتھ عمر دراز کے بچپن کی یادوں کا ایک پورا کارواں لے کر آئی تھی اور جب گئی تھی تو اپنے پیچھے دہی اور گھی کی خوشبو کا جادو جگا کر گئی تھی۔

عمر دراز کی ناک کی حس آہستہ آہستہ مرتی چلی جا رہی تھی۔ اب وہ اپنی پیٹھ سے رِستی ہوئی پیپ کی بدبو بھی نہ سونگھ سکتا تھا۔ لیکن کھانے کی ہر چیز کی بھینی بھینی خوشبو پتہ نہیں کہاں سے اُس کے دماغ میں گھس کر چیونٹیوں کی طرح رینگتی رہی تھی۔ اور دماغ کے ساتوں طبق کو یا جوج ماجوج کی طرح چاٹتی رہتی تھی۔ لیکن کتنے موٹے طبق تھے کہ یاجوج ماجوج کبھی کبھی تھک کر سو جاتے تھے۔ لیکن ان کی موٹائی میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔

''آج بھی دلہن نے کھچڑی نہیں دی۔'' ایک وہ تھی جو اُس کی روح کے تناؤ پر مانجھے کا کام کر رہی تھی۔

کوئی پچھواڑے کی گلی میں مویشیوں کو گالیاں دیتا ہوا جا رہا تھا۔ سرکاری جانور تھے اور ان کے گوبر کے لئے دو چھوکرے لڑ پڑے تھے۔ عادت کے مطابق اس کا جی چاہا کہ اٹھے، جائے اور بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کرا دے ___ ''لڑتے کیوں ہو۔ گوبر بانٹ لو آدھا آدھا چلو چھٹی ہوئی۔''

وہ اٹھ نہ سکا۔ وہ اپنی چارپائی کے کابوس میں جکڑ کر رہ گیا تھا۔ اس کی بیماری کے اٹھائیس دن

اس کے جسم کے جوڑ جوڑ میں، اٹھائیس کیلوں کی طرح کھبے ہوئے تھے۔ ان کیلوں سے چھٹکارا کہاں۔ اندھیرا تھا۔ بچوں کے رونے، جھگڑنے اور گالیاں بکنے کی آوازیں تھیں۔ اندھیرے کے ساتھ دھوئیں کے تلخ جھونکے اُسکی کوٹھری میں در آئے۔

''شاید دولہن نے چولھا جلایا ہے۔ کھچڑی، ہائے کھچڑی۔ بڑھیا ___ تو کہاں چلی گئی؟ تو تو سراپا گھی اور دہی ہے ___ گوالن ___ تو مجھے دیکھنے کیوں آئی؟ آئی تو صرف دہی اور گھی کی خوشبو کیوں لائی؟ دہی اور گھی کیوں نہ لائی؟ خالی خولی ہمدردی کس کام کی۔ ہمدردی کو مکھیاں بہت ہیں۔ لوگ روٹی کھاے ہیں، تو انہیں کھاتے۔''

''بکومت ___ میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ آج اسکول انسپکٹر آیا تھا۔ نوکری کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ اور تم ہو کہ جونک کی طرح آتے ہی خون چوسنے لگتی ہو۔''

آنکھیں کیوں لال پیلی کرتے ہو۔ سنبھالو ان جونکوں کو۔ میں تو چلی جاؤں گی میکے۔ اللہ کا دیا میرے ماں باپ تمہارے در کے بھکاری نہیں ہیں ___''

''بکومت'' باسط غصے میں پھر چلایا۔ ''ابا کا کیا حال ہے؟''

عمر دراز کی آنکھیں دن بھر میں پہلی بار جھپکتی چلی گئیں۔ اندھیرے میں خاموشی کے ساتھ۔

''صبح سے مسور کی کھچڑی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ دم ہی نہیں نکل چکتا بیچارے کا۔''

''آہستہ بولو سن لیں گے تو ان کا دل دُکھے گا۔ باسط بھی حیران تھا کہ آخر ابا ہڈی چمڑا ہو کر کب تک جئے جائیں گے۔

عمر دراز کی پلکیں پھر ٹھہر گئیں۔ اس کے سوجے ہوئے گالوں پر نمکین پانی آہستہ آہستہ تیر رہا تھا۔

دو چوہے دوڑتے ہوئے اس کے جسم پر سے گزر گئے۔ وہ چونکا بھی نہیں۔ وہ اپنے بیٹے اور بہو کی بات سُن رہا تھا۔

''بھئی ابا کی کوٹھری میں ایک چراغ تو جلا دو۔''

''چراغ''؟

''ہاں ہاں ____ ابھی وہ گھر ہی میں ہیں۔ جب وہ قبر میں سو جائیں گے تو میں تم سے چراغ جلانے کو نہیں کہوں گا۔''

عمر دراز کو لگا کہ اس کا بیٹا فرشتہ ہے اور اس کے ہونٹوں سے پھول نہیں چراغ کی لویں ٹپک رہی ہیں اس کی کوٹھری میں ایک لمحے کو اجالا ہو گیا۔ جہاں اُجالا ہو جائے واقعی اسے قبر کون کہے گا۔

''ابھی میں گھر ہی میں ہوں ____ چراغ جلا دو۔''

مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز آئی لیکن کوٹھری میں چراغ نہ جلنا تھا نہ جلا۔ روشنی موت کی طرح اس سے گریزاں تھی۔

باسط اور اس کی بیوی میں رات گئے تک جھڑپ جاری رہی۔ دونوں کو پیسے کی تنگی اور بچوں کی بیماری کا گلہ تھا ____ ''بیماری تو بیماری ____ ان کے تن بدن ڈھکنے کو موٹے جھوٹے کپڑے تک نہیں ہیں ____'' باسط کی بیوی نے سسکیوں میں ڈوبتے ہوئے کہا ''پتہ نہیں میرے باپ نے جنم جنم کو کس کے سنگ باندھ دیا مجھے۔''

بس پھر کیا تھا۔ باسط کے دل کی چوٹ منہ سے دھما کا بن کر نکل پڑی۔ ''اف ____ کون سے گُن ہیں تم میں کہاں کے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ذرا دیکھو۔ شکل چڑیل کی اور مزاج پری کا۔ ہر سال بچہ دیئے جاتی ہو۔ تم نے تو میرا دیوالہ پٹوا دیا۔ ماں باپ سے جدا کرایا۔ تمہارے لئے میں نے بے ایمانیاں کیں۔ ہومیو پیتھی کا جھوٹا ڈاکٹر بن بیٹھا ____ ہونہہ''

ارے ذرا گلا کم پھاڑو۔ ورنہ گاؤں والون نے سن لیا تو دو چار آنے والے مریض بھی نہیں پھٹکیں گے تمہارے پاس۔''

بات عقل کی تھی، خاموشی سے سمجھوتا ہو گیا۔

''تم نے ابا کو کھچڑی کیوں نہ دی کھانے کو۔''

''ارے چھوڑو بھی ____ وہ تو بچوں کی طرح چاند کے لئے ٹھنکتے رہتے ہیں۔ ''تم اُن کی ہٹ

پوری کرسکوتو کرو میں تو نہیں کرتی۔"

"ابا اب زیادہ دن تھوڑے ہی ___ بس چند دن کی بات ہے ___ لیکن چالیس پچاس تو پھر بھی لبے ہو جائیں گے۔ کپڑا تو سونے کے بھاؤ بک رہا ہے۔"

"اجی آپ بھی کہاں کے حاتم ہیں۔ معمولی کپڑا خرید لیں گے۔ کفن کیسا ہی ہو۔ اللہ تو اعمال دیکھتا ہے۔ جیسا کرو گے ویسا بھگتو گے ___"

"آہ بیچارے ___"

"دیکھیے قسم خدا کی ___ ستائیے مت۔ روز روز کی جھلاہٹ۔"

عمر دراز کے کانوں میں جب ہلکی ہلکی سنسناہٹوں کی آواز آئی تو وہ سمجھ گیا کہ جنگلی بطخوں کے جھنڈ دکھن سے اڑ کر اتری جھیل کی طرف جا رہے تھے۔ وہ اٹھائیس دن سے یہی آواز سن رہا تھا، یہ انتیسویں صبح تھی جس کا آغاز جنگلی بطخوں کے پروں کی سنسناہٹ سے ہو رہا تھا۔ اس وقت اٹھائیس دن کے بعد پہلی بار اس کا جی چاہا کہ وہ بھی جنگلی پرندہ ہوتا ہے اور وہ بھی اس طرح دھندلی اور خاموش فضا میں پرواز کرتا۔ اس کا دل آہستہ سے اس کے جسم کو چھوڑ کر اڑا اور اوپر آسمان میں بلند ہوتا چلا گیا۔ برق رفتار جنگلی بطخوں کا یہ تعاقب اس وقت ختم ہوا جب دور کے کھیتوں سے لوگوں کی ہانک اور پکار کی آواز آنے لگی۔

بار بار اس وقت اس کے دل میں ایک سانپ پھن پھیلا کر جھومنے لگا تھا ___ یہ پھن پھیل کر ایک کفن بن جاتا تھا ___ کیا یہ کفن چالیس پچاس روپے کو آئے گا۔ یہ کفن اس کی پوری زندگی سے زیادہ قیمتی تھا ___ زیادہ سفید، زیادہ نیا، زیادہ پاکیزہ اور قابلِ قدر۔

اس کی زندگی جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں ختم ہو رہی تھی۔ اسی گاؤں میں اسی گاؤں میں اس کی بیوی بھی تھی۔ اس اپنے دور اور نزدیک کے رشتے دار بھی۔ خود اس کی بیوی اس کا منہ دیکھنے کی روادار تھی۔ وہ کہتی تھی اسے عمر دراز سے سخت نفرت ہے۔ جب وہ یہ کہتی تھی تو مونہہ چھپا کر، کمرے میں بند ہو کر، دونوں ہتھیلیوں سے اپنے جُھرّی بھرے سفید گالوں کو مل مل کر روتی تھی، اس

کی وجہ کیا تھی۔ یہ خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔

تیس بتیس برس پہلے اسی گاؤں میں اس کے حُسن کے نام سے چراغ جل اٹھتے تھے۔ چھوٹی موٹی، خوبصورت لڑکی، پتلے ہونٹ، نازک انگلیاں ___ اور جب اس کے کانوں میں کسی نے منہ ڈال کر کہا ''بنو ___ بیاہی جا رہی ہو ___ اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ'' تو اس کا دل دھک سے ہو گیا اور گالوں پر سنہری سی سرخی آ گئی۔

شادی کی رات عمر دراز نے اس کے معطر گھونگھٹ کو اپنے بھدے ہاتھوں سے الٹ کر، اس کے مہکتا ہوا سہرا اٹھایا تھا اور اس کی عرق عرق ٹھڈی چھو کر آنکھیں کھولنے کی التجا کرتے ہوئے اپنی جان کی قسم دی تھی تو اس کے گالوں کے چراغ کی لویں لپک کر اس کی آنکھوں تک پہنچ گئی تھیں اور عمر دراز کا دل تہ و بالا ہو گیا تھا۔

عمر دراز اپنے بھائیوں بہنوں میں جنم جنم کا احمق مشہور تھا۔ کتنی مشکل سے اس نے انٹرنس پاس کیا تھا۔ گاؤں میں اس کی دھاک ضرور جم گئی تھی اور اس کی بیوی کا دل قدرے ٹھنڈا ہوا تھا۔ وہ ابھی کمسن نوجوان تھا، مسیں بھیگ رہی تھیں اور اس کا جسم ایک بے ڈول جنگلی درخت کی طرح بڑھ رہا تھا۔ اس کی بیوی، بھائی، گاؤں والے، سب ہی اس کا مذاق اڑاتے وہ ہنستا ___ یہ لوگوں کو کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ وہ جان بوجھ کر ہنس رہا ہے یا محض بے وقوفی میں۔ اس کے دانت بہت بڑے تھے، باہر کو نکلے ہوئے، جیسے ہر گری پڑی چیز کو اٹھا کر وہ چبا ڈالے گا۔ ان ہی دنوں جبکہ وہ اپنی بیوی سے آنگن میں باتیں کرتا کرتا سو جاتا اور اس کی بیوی تارے گنتی رہتی، اس کو ایک چھوٹے سے گاؤں کی پوسٹ ماسٹری مل گئی۔ گاؤں والے دانت انگلی کاٹنے لگے۔ کائیاں نکلا۔ غضب خدا

___ واہ بھائی مان گئے۔''

لیکن کچھ ہی دنوں بعد عمر دراز کے جیل جانے کی نوبت آ گئی۔ اس نے اندھے بھروسے کی کلہاڑی خود اپنے پاؤں پر ماری تھی۔ اس نے ڈاک خانے کی کنجی ایک دوسرے ملازم کو دے دی

اور خود چلا گیا بال کٹانے۔ واپس آیا تو ڈاک خانے کی حجامت بھی ہو چکی تھی۔ سرکاری روپیہ غائب تھا جیل کا پھاٹک اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بہت گھبرایا، بہت رویا اور اس کے بڑے بڑے نکلے ہوئے دانت خود اس کی ہتھیلیوں میں پیوست ہو گئے۔ اسے اپنی حماقت کا بالکل غم نہ تھا۔ نہ اُسے اس کا افسوس تھا کہ اتنی اچھی نوکری اس کے ہاتھ سے مچھلی کی طرح نکل گئی۔ اس کو افسوس تھا کہ ایک شریف آدمی نے جس پر اُسے اتنا بھروسہ تھا اس نے دغابازی کیوں کی۔

''عمر دراز بھائی نوکری کرنے کے لئے عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔''

''عمر دراز بھائی آپ کو عقل کے میدان اور گھاس کے میدان کے سامنے کھڑا کر دیا جائے اور کہا جائے جس میں جی چاہے چلے جاؤ ___ تو آپ کس میں جائیں گے؟''

''ظاہر ہے جو بات گھاس کے میدان میں ہے وہ عقل کے میدان میں کہاں ___ کیوں عمر دراز بھائی'' ایک تیسرا من چلا بول اٹھتا۔

اِن باتوں کے علاوہ عمر دراز کو یہ معلوم تھا کہ اس کے گھر کے تمام لوگ اس سے ناخوش ہیں اور اس پر قہر کی بارش کرتے رہتے ہیں۔ وہ لوگوں کی نگاہوں سے گھبرانے لگا خود اس کی بیوی اس کے پاس خاموش رہتی اور اس کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں بھی ہوں ہاں سے آگے نہ بڑھتی۔ بالکل کچی، گیلی لکڑی جسے چولھے میں ڈال دو تو دھوئیں کے سوا اور کچھ حال نہ ہو۔ گاؤں والوں کی زبان پر تالا کون ڈالتا۔ اس کی ماں گھر والوں کو تو کوس پیٹ کر دبا لیتی تھی، لیکن باہر والوں پر کس کا زور تھا۔

''عمر دراز کالا دیو اور بیچاری اس کی دلہن ___ جوہی کی نازک ٹہنی۔ جنم جنم کو روندی گئی بے چاری۔''

''لوگوں سنا کچھ۔ عمر دراز کی دلہن کا جی کچا کچا رہنے لگا ہے۔ ہائے بدنصیب جان کون سا بچہ ہوگا۔''

''ایسے نکھٹو کے بچے کی ماں بننے سے تو کوکھ جلی ہی رہنا بہتر۔''

'یہ سارے زہر میں بجھے ہوئے تیر اس کے جسم میں خاموشی سے پیوست ہوتے چلے گئے۔ جیسے دل میں سوئیاں دفن ہوتی چلی جائیں۔

جس دن باسط پیدا ہوا وہ خوشی میں پاگل ہو گیا۔ جو آتا بڑے بوڑھوں کو مبارک باد کہتا۔ گھر کی

ماما ئیں تک ایک دوسرے کو مبارک باد کہہ رہی تھیں۔ مگر عمر دراز صرف خوش ہوئے جا رہا تھا۔ اسے کوئی مبارک باد نہیں کہہ رہا تھا۔ اسے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔

اس کا دوسرا بھائی ڈاکٹر ہو گیا۔ لیکن وہ اسی طرح گاؤں میں پڑا رہا۔ اب اس کے بھائی کا موازنہ کر کے لوگ اس کی جان نکالے دے رہے تھے۔ اسے اپنے بھائی سے بڑی محبت تھی اس کا سینہ فخر سے بھول گیا تھا وہ کہتا ____ "جلنے والے جلا کریں ___ میرا تیسرا بھائی بھی ڈاکٹر ہوگا، وکیل ہوگا، مجسٹریٹ ہوگا۔"

"اور تم ان سب کے چپراسی بن جانا۔"

لوگ قہقہے لگاتے، تاڑی پیتے اور اس کی خوبصورت بیوی کی بے رنگ اور بے جوڑ زندگی پر چنے اتنے بڑے آنسو بہاتے جو نظر نہ آتے۔

رفتہ رفتہ عمر دراز کمرے سے نکل کر سائبان میں آیا، سائبان سے دروازے میں اور وہاں سے باہر کے سائبان میں۔ اب اس کا ڈیرا وہیں جما رہتا۔ جب کھانا بھیج دیا جاتا کھانا کھالیتا۔ نہ بھیجا جاتا تو تسبیح اور کلمات کا ورد کیے جاتا۔

دیکھتے دیکھتے ہر چیز بدل رہی تھی۔ اس کا بھائی ڈاکٹر تھا اور وہ اپنے کنبے کے الجھنوں اور پیشے کی مصروفیتوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ چھوٹا بھائی بھی کمپونڈر بن گیا تھا۔ ماں روز بروز قبر سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ باسط بڑا ہو گیا تھا۔ باسط کے بعد کئی بچے اور ہوئے۔ لڑکیاں پیدا ہوئیں اور اللہ کو پیاری ہوئیں۔ البتہ دو لڑکے __ زندہ رہ گئے تھے۔ اس کی بیوی کا حسن گہن میں کھوتا رہا اور اب تو اس کی پیشانی پر بھی جھریاں پڑ گئی تھیں۔ آس پڑوس کے لوگ کہتے۔

"ہائے کمبخت کو دو جوڑی چوڑیاں لانے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ بیوی کے ہاتھ نہ ہوئے ببول کی ٹہنیاں ہوئیں۔"

لیکن اب وہ قرآن کی تلاوت، مسجد کے چراغ اور اذان کے چکر میں کھویا ہوا تھا۔ اس کا کُرتا جو کبھی سیاہ ہوتا، کبھی مٹیالا، اس کے گھٹنوں سے نیچے تک لٹکا رہتا تھا۔ اس کا پاجامہ خاصا شرعی ہو گیا تھا۔

مگراس کے سائز کی کوئی پابندی نہ تھی۔ چڑھاتو اٹنگ ہوگیا اور پھیلا تو غبارہ بن گیا۔ بیوی کو کبھی ترس آتا تو چپکے سے آتی اور اس کے کپڑوں میں پیوند لگا دیتی۔ عید بقرعید خاص طور پر اس کے کپڑوں میں پیوند وغیرہ لگ جاتے۔ ٹوپی تو اکثر نئی ہوتی تو جو چپت گاہ سے سجدہ گاہ تک اس کے سر کو ڈھک لیتی اور ہاں ایک آدھ پُرانے کپڑے کا رومال بھی مل جاتا جس میں خس یا حنا کی خوشبو بھی بسادی جاتی تھی ___ ساتھ روئی کا ایک معطر پھوہا بھی ملتا جو وہ اکثر اپنے کان کی سرنگ میں چھپالیتا۔

اس کے سر کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ اس کے کان کے گوشے دونوں طرف لٹک گئے تھے۔ اس کے دونوں پاؤں سوجنے لگے تھے اور بائیں کان کے پاس ناسور نما زخم ہو گیا تھا اور سیروں نیم کے پتوں کی پولٹیس کے باوجود اپنی جگہ پر جوں کا توں قائم تھا۔ اوپر اس کا منھ تو ننھا سا تھا مگر اس کے اندر ایک سیال سی آگ لگی رہتی تھی۔

اس نے اپنے ڈاکٹر بھائی کے یہاں بچوں کی تعلیم کا کام سنبھالنا چاہ لیکن کچھ نباہ نہ ہو سکا۔ اس کی بیوی اپنے گاؤں میں لڑکیوں کا مکتب لے کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے شوہر کے حصے کے کھیت کی آمدنی سے وہ اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہی تھی۔ بس وہ خود فاضل ہستی تھا۔

ایک روز کئی گاؤں کے چکر لگا کر وہ جب گھر آیا تو اسے کھانا نہیں ملا۔ اس نے مسجد میں نماز ادا کی اور زور زور سے درود اور الحمد للہ پڑھتے ہوئے باہر کی چوکی پر لوٹ لگانے لگا تا کہ لوگوں کو اس کے وجود کا احساس ہو اور سے کھانا مل جائے۔ لیکن اس کی امید غلط ثابت ہوئی۔ آخر جب اس سے بھوک برداشت نہ ہو سکی تو اس نے اپنا لوٹا زور سے زمین پر پٹک دیا۔ پھر بھی گھر کا سناٹا دور نہ ہوا۔ وہ اندر گیا اور بے تحاشا اپنی بیوی کو پیٹنے لگا۔

''خدا تم کو غارت کرے۔ تمہارا ناسور تمہاری موت بنے۔''

ایک طرف کوسنے تھے اور دوسری طرف لات، گھونسے۔ گھر کے سب لوگ سکتے میں تھے۔ بچے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ کسی کو امید نہیں تھی کہ یہ ازلی احمق اتنی جرأت کرے گا۔ اس سے پہلے بھی اسے بھوکا مارا گیا تھا۔ اس کی تذلیل کی گئی تھی، اسے ستایا گیا تھا لیکن اس کا جواب اس نے

ایک دردناک خاموشی سے دیا تھا۔

''میں خون پسینہ ایک کرتی ہوں تو اپنا اور بچے کا پیٹ پالتی ہوں۔ تم کباب میں ہڈی کون ہو۔'' اس کی بیوی بپھر بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔

''اور میرے کھیت کی آمدنی؟''

''شرم نہیں آتی ___ ان تینوں کو دنیا میں لائے ہو تو کیا وہ بس ہوا پانی پر زندہ رہیں گے ___ پگلے۔''

اس کا پاگل پن ختم ہو گیا وہ باہر آ گیا۔ وضو کیا اور چاندنی رات میں باہر گھاس پر جائے نماز بچھا کر نفلیں ادا کرنے لگا۔

صبح وہ گاؤں سے غائب تھا۔

ایک ڈیڑھ مہینے تک تو لوگوں کو اس کا اتہ پتہ کچھ نہ چلا۔ پھر اس کی خبریں آنے لگیں۔ معلوم ہوتا اس گاؤں میں بڑے زمیندار کے پوتوں کو پڑھا رہا ہے۔ پھر خبر آتی وہ تو داروغہ صاحب کے گھر بچوں کی تربیت پر مامور ہے۔ اصطبل کے پاس پوری چھت پر اس کا قبضہ ہے دو روپے اور کھانا کپڑا اور مہینے میں صابن کی دو چکیاں کوئی کھیل مذاق نہیں۔ وہ ان ہی چکیوں سے نہاتا بھی اور کپڑے بھی دھوتا۔ اس کی ڈاڑھی لمبی ہو گئی تھی اور اب وہ اکثر بیکار وقتوں میں مراقبے میں چلا جاتا تھا۔ خدا سے لو لگا رہا تھا۔ تنہائی میں غیب کی باتیں بھی بکا کرتا تھا۔ ہاں ایک بات یہ ضرور ہوئی کہ ایک دن جب داروغہ صاحب نے غصے میں آ کر بہت زیادہ کھانے کا طعنہ دیا تو اس نے اپنا بستر لپیٹا اور نکل گیا۔ اس کا مطالبہ اتنا کم تھا کہ جلد ہی اسے ایک اور گاؤں میں ایک بڑے کاشتکار کے ہاں اس کے شریر نواسوں کی تربیت اور تعلیم کا کام مل گیا۔ پھر ایک جھونپڑا اس کے قبضے میں تھا، بچھانے کو پوال کا گدا تھا، ناریل کا حقہ تھا جس کی ایک چنگاری نے وہ گل کھلایا کہ وہ جھونپڑے سے نکل کر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ اس کے شاگرد دراصل اس کے استاد تھے اور وہ ان کا سلیم الطبع شاگرد۔ معاملہ خود بخود طے ہو گیا۔ وہ گھر سے اچھی اچھی باسی اور تازہ چیزیں اپنے دامن میں چرا

کرلاتے اور اس کا منہ بھر دیتے۔

ایک زمانے تک وہ گھر نہیں لوٹا۔ البتہ اس کی تمام حرکتوں کی اطلاع اس کے گھر پہنچتی رہتی تھی جس کو سن کر گھر کے لوگوں کا سر شرم سے جھک جاتا تھا۔

جب باسط کی شادی طے ہوگئی تو اچانک ایک دن وہ اپنے گاؤں میں آدھمکا۔ لوگوں کو ایک تکلیف دہ حیرانی نے آدبوچا۔ اس نے بھی کسی نے اس سے بات نہ کی۔ اس نے صرف گاؤں کے چھوٹے سرکار کو جھک کر سلام کیا۔ کیونکہ ان کو سلام کرنے سے تو گھوڑے گدھے بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

اندر میراثنیں گیت گا رہی تھیں ___ باہر برات تیار ہو چکی تھی۔ گھوڑے، ٹٹو، ڈولیاں ___ اور سب کے پیچھے من چلے جوانوں کا دل۔ کسی نے اس سے نہیں کہا کہ وہ پیدل کیوں کر جا سکے گا۔ وہ خوش تھا۔ کبھی وہ باسط کی ڈولی کے پاس آتا اور کبھی چھوٹے سرکار کے گھوڑے کے پاس جنھوں نے برات میں شرکت کر کے اس کو بلکہ اس کی سات پشت کو عزت بخشی تھی۔

تھوڑی دیر میں برات اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ ابھی پہاڑ کی چڑھائی تک پہنچا تھا اور برات اتار پر تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ سورج غصے میں سرخ آگ برسا رہا تھا۔ صراحیاں، شربت گلاب اور گکڑیاں، ساری نعمتیں برات کے ساتھ تھیں۔ ٹھیک ہی تو کسی نے کہا تھا! ''ارے عمر دراز بھائی کا کیا ہے وہ تو گاؤں گاؤں کے ہرکارے ہیں۔ انہیں سمدھیانے پہنچنے کیا دیر لگے گی۔''

واپسی پر دلہن کو دیکھنے کے بعد اس کمبخت نے کیا دیا۔ دو روپے کی بھی کوئی سَسُر کی رونمائی ہوتی ہے۔ اس کی خوب خبر لی گئی۔ کھانا کھاتے ہوئے اس پر تیر ونشتر کی بارش ہوئی۔ لیکن وہ ان تیر ونشتر کا خیال کرتا تو ہاتھ سے خوان نعمت کھوتا۔ وہ آنکھ کا اندھا اور کان کا بہرا بن کر پلیٹیں اور کٹورے چاٹتا رہا۔

رات ہوئی تو طعنوں تشنوں کا سلسلہ جاری تھا۔

صبح ہوئی تو وہ گاؤں سے غائب تھا ___ کسی کو کوئی فکر نہ ہوئی۔ بدن سے رینگتی ہوئی چیونٹی

اتر جائے تو اس کا ماتم کون کرتا ہے۔

ایک سال بیتا، دو سال بیتے ___ کئی سال بیت گئے۔ عمر دراز کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لوگ بھول گئے سب کچھ۔ اس کی بیوی البتہ جب بھی موقع ملا اپنی مانگ میں سیندور ڈال کر اور سستی پھستی چوڑیاں پہن کر عمر دراز کی زندگی کا اعلان کرتی رہی۔ ایک لمحے کو عورتیں اپنے دانتوں تلے ہزار دبائے نہ دبنے والی انگلیاں دبا لیتیں اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتیں ''نگوڑی ___ مانگ جلی ___ عورت کا دل ہی تو ہے ___ آس کے دھاگے میں پرو کر رکھتی ہے بیچاری، کیا کرے۔''

گاؤں ویران ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ، جن کے دم خم سے گاؤں کی رونق تھی، اچانک اٹھ کر، گاؤں اور افق کے درمیان اُگ آنے والے ان دیکھے افق کے پیچھے کھو گئے تھے۔ ہاں چھوٹے سرکار کے کھیت، ان کا رعب داب سلامت تھا۔ عمر دراز کا مکتب بھی سلامت تھا۔ باسط اس سے الگ ہو گیا تھا۔ اس کا اپنا گھر تھا، بیوی اور آدھے درجن بچے۔ سلطان اور منان ___ عمر دراز کے جلائے ہوئے دو چراغ گاؤں کے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ عمر دراز کے حصے کے کھیت اور مکتب کی گنڈے دار تنخواہ سے کام چل رہا تھا۔ علاج معالجے کی کوئی زیادہ فکر نہ تھی، باسط ابتدائی اسکول میں ماسٹر ہونے کے علاوہ ہومیوپیتھی کا ڈاکٹر ہو گیا تھا۔ جو مریض کی تسکین کے لئے اس کے سر پر بھی اسٹتھسکوپ رکھ کر دورانِ خون کا راز معلوم کر لیتا تھا۔

زندگی جس طرح کٹ سکتی ہے کٹ رہی تھی۔

عمر دراز کی بیوی دوپہر کے وقت برتن مانجھ کر اور اپنے چھوٹے بچے کا پاجامہ بیونت کر آنگن میں پپیتے کے پیڑ تلے ذرا اونگھنے لگی تھی کہ پوسٹ مین کی گرج دار آواز نے اسے چونکا دیا۔ ایک منی آرڈر تھا۔ عمر دراز نے بھیجا تھا اجمیر شریف سے۔ اس کی بیوی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اجمیر شریف اس دنیا کی کسی جگہ کا نام ہے یا یہ بھی آسمان کے ساتویں طبق کا کوئی شہر ہے۔ اس منی آرڈر کے روپے ابھی خرچ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک خط آیا۔ کسی اجنبی ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

''عمر دراز صاحب بسترِ مرگ پر ہیں۔ اتنے دنوں بعد کہیں سے ان کا پتہ ملا ہے تو آپ کو اطلاع دے رہے ہیں۔ اللہ انہیں محفوظ رکھے۔ ان کا ناسور انہیں کھائے جا رہا ہے۔

جوں توں کر کے اس کی بیوی نے کچھ قرض لے کر کچھ چیزیں بیچ کر روپیہ فراہم کیا روپیہ بیٹے کو دیا۔ باسط نے روپیہ بھیج دیا اور روزانہ عمر دراز کا انتظار ہونے لگا۔ اس کی بیوی کی جھرّیاں اور لٹک آئیں اور آنکھیں اور دھنس گئیں۔ ایک دن عمر دراز آ ہی گیا۔ گاؤں کے سب لوگ جمع ہو گئے۔ عورتوں نے بلائیں لیں اس کمزور ڈھانچے کی جس کی سیاہی پر زردی جھلی بھی چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چند دن میں اس کی گردن کا ناسور بہنا بند ہو گیا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور گاؤں کے چکر بھی لگانے لگا۔ کبھی اس گلی میں، کبھی اس گلی میں۔ خانقاہ کی بے فکر زندگی اور لنگر خانے کی کھچڑی نے اس میں ایک خوف ناک گرسنگی پیدا کر دی تھی۔ اب پھر گاؤں کی عورتیں اس سے بیزار ہونے لگیں ہر شخص عمر دراز کو دھتکارنے لگا۔ قصور اس کا تھا۔ ہمیشہ کھانے ناشتے کے وقت تاک کر آ دھمکتا لوگوں کے گھر اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کے دستر خوان کا صفایا کر کے رکھ دیتا ___ اس کا منہ کھلتا اور بند ہوتا۔ اور کھانے کی ہر نعمت صاف ہو جاتی۔ اب پھر اس کے کان بند تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں ___ صرف اس کے پیٹ کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا فیل پا جگہ جگہ سے پھٹنے لگا تھا۔ آنکھیں ہلدی کی طرح زرد اور داڑھی مونچھ جنگل کی جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ عورتیں کہتیں: ''حد کر دی عمر دراز نے۔ ایسا زمانے کا ندیدہ تو نہ ہو کوئی۔'' شادی، بیاہ، ختنہ، گوشوارہ۔ کوئی تقریب ہو۔ دستر خوان کی ہڈیاں چوسنے اور جھوٹی پلیٹیں چاٹنے کا کام تو وہ عبادت کی طرح کرتا تھا۔ گاؤں والے جہاں اسے بلاتے، اس پر پھبتیاں کستے گالیاں بکتے، دھتکارتے وہاں اس پر مہربانی بھی کرتے۔ تمام کی تمام گلی سڑی چیزیں اسے کھانے کو دے دیتے۔ اور وہ بھی کیسا مزے میں کھاتا کہ لوگ مارے گھبراہٹ اور شرمندگی کے منہ پھیر لیتے۔ وہ اپنے فیل پا کی وجہ سے بہت آہستہ آہستہ چلتا۔ عورتیں دیکھ کر بھاگتیں لوگ اس سے دامن بچاتے کون جانے کچھ کھانے کو مانگ بیٹھے ہاں جب کبھی وہ گاؤں سے باہر کمیروں، گوالوں یا کوریوں کے بگھوں کی طرف نکل جاتا تو اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی۔ دہی ملتا،

چوڑا ملتا، گڑ ملتا، یہاں تک کہ تازہ ککڑیاں اور شکر قندیاں ملتیں۔ وہ اس وقت ان سے باتیں بھی کرتا لوگ اس کے چاروں طرف بیٹھ جاتے۔ وہ ان کو اپنی اجمیر یاترا کی کہانی سناتا۔ ''وہاں سب کی مرادیں بر آتی ہیں خواجہ کی درگاہ پر منوں کھچڑی روز تقسیم ہوتی ہے۔ میں بالکل اچھا ہو گیا تھا۔ یکا یک ناسور پھوٹ نکلا۔ مجھ سے کچھ گناہ ہو گیا تھا۔ میں نے ایک دن پہلے سوچا تھا کیوں نہ چلوں اپنے گاؤں ــــــ یہ بات خواجہ کو بری لگی ــــــ وہاں بڑا آرام تھا ــــــ''

شام کا وقت تھا وہ مغرب کی نماز پڑھ کر واپس آ رہا تھا۔ آج نماز کی صف میں بھی کچھ لوگ اس سے دور کھڑے تھے، ایک آدمی کی جگہ چھوڑ کر۔ اس کی گردن سے بدبو نکل رہی تھی۔ وہ اپنے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس کی بیوی کے ہاتھ سے چراغ گر کر بجھ گیا۔ ''تم اس گھر میں مت آؤ۔ میں تمہارا منھ دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم پھر اجمیر چلے جاؤ۔''

''میں اجمیر نہیں جاؤں گا!'' وہ اتنے زور سے چیخا کہ پپیتے کے پیڑ پر گھونسلے کی چڑیاں اُڑ کر چکر کاٹنے لگیں۔

بیوی سہم کر کھڑی ہو گئی۔

''میں آج سے تمہارا منھ نہیں دیکھوں گا۔''

''میں بھی تمہارا منہ دیکھوں تو سُور کا گوشت کھاؤں'' اس کی بیوی نے بھی تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا اور جب تھوڑی دیر میں اس نے دوبارہ گرے ہوئے چراغ کو جلایا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لیکن یہ اس کا محض وہم تھا۔ عمر دراز تو وہاں سے نکل کر گلی میں کانپ رہا تھا۔

اس دن کے بعد وہ پھر دوبارہ گھر میں داخل نہیں ہوا۔

بڑے، بوڑھے، بچے سب اسے چڑاتے۔ ''میں اجمیر نہیں جاؤں گا'' وہ اس کورس سے بھاگتا۔ مسجد میں پناہ لیتا۔ لیکن بچوں کی فوج وہاں بھی اس کا سر کھلنے پہنچ جاتی۔ فیل پا کی وجہ سے وہ تیز نہیں بھاگ سکتا تھا۔ اس کے پیر سے کھڑاؤں نکل نکل کر آگے بھاگنے لگتی اور اس کے تلوؤں سے خون ٹپکنے لگتا۔

ان دنوں وہ اپنا زیادہ وقت سرکاری ڈیوڑھی پر بتاتا۔ چھوٹے سرکار کے کتب خانے سے پرانی

کتابیں لے لے کر پڑھتا تھا۔ اپنے بھتیجے کی انگریزی کتابیں بڑھتا رہتا اور کبھی اس کے سامنے ہمہ تن سوال بن کر کھڑا ہو جاتا۔

''کیا ہے بڑے ابا۔ وہ اس سے زیادہ نہ پوچھتا اور اپنے چچا کو دیکھنے کے بجائے بہت دور دیکھنے لگتا۔ وہ ایک چونی دونی مانگتا تو اس کا بھتیجہ اٹھنی دے دیتا۔

ایک دن پھر اسے بچوں نے دوڑایا۔ تاڑی پیتے ہوئے بڑے بوڑھوں اور نو جوانوں نے اسے بہت طعنے دیئے۔ ایک آدھ نے رحم کھا کر اسے ہڈیاں چاٹنے کو بھی دیں۔ لیکن وہ اتنا بے دم تھا کہ اس سنہرے موقع کا فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ اس کی گردن کے ناسور سے خون اور پیپ نے بہہ کر اس کے کرتے کے گریبان کو تر کر دیا۔ رات کے وقت وہ چھوٹے سرکار کے اصطبل کے پاس پوال میں گھس کر سو گیا۔ صبح اٹھا تو اس کی گردن ٹیڑھی ہوگئی تھی اور پاؤں کی انگلیاں پھٹ گئی تھیں۔

باسط کا دل اس دن بھر آیا۔ وہ اپنے باپ کو اپنے گھر لے آیا۔ اس کی بیوی نے چند دن اپنے سسُر کی خدمت جی جان سے کی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ ہوا میں معلق ہے۔ نہ آسمان پر جاتا ہے اور نہ زمین پر آتا ہے تو اس کا دل الجھ کر رہ گیا___ روتے ہوئے بچوں کی کمر پر اس نے جھنجھلا کر ہاتھ رسید کئے اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

اس کالی کوٹھری میں یہ اس کی انیسویں صبح تھی اس کی آنکھیں آنسو سے بھر آئی تھیں۔ ''میری آنکھوں کے تارے کتنے ناخوش اور دکھی ہیں......''

باسط منہ اندھیرے اس کی کوٹھری میں آیا۔ ''ابا آج کھچڑی کھائیں گے نا۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عام طور پر ایسے سوال پر عمر دراز کا پورا جسم لرز اٹھتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ خاموش پڑا ہوا تھا۔ باسط نے جھک کر اسکی آنکھوں میں دیکھا___ ''اوہ آج جب کہ ہاتھ بالکل خالی ہے۔''

''میرا کفن نہ خریدنا۔ بڑی گرانی ہے۔ ایسے ہی ڈال دینا مجھے قبر میں۔ خدا تو اعمال دیکھتا ہے۔''

باسط گھبرا کر باہر چلا یا آیا۔ اس نے اپنی چھتری کونے میں کھڑی کر دی اور ٹوپی اتار کر رکھ دی۔ ''منو کی اماں آج کھچڑی ضرور پکا دو۔''

''اچھا۔''

''نہیں ابھی پکادو۔'' وہ خود بھی چولھے کے پاس بیٹھ گیا۔ جلدی جلدی دھوئیں میں کھچڑی تیار ہوئی۔

باسط ایک بڑے سے قاب میں کھچڑی لے کر کالی کوٹھری میں آیا۔ عمر دراز کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کھچڑی کی بھاپ اس کے چہرے اور باسط کے آنکھوں کے درمیان آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ باسط نے باپ کو جھنجھوڑ دیا۔ اور اس کی ناک میں سے دو تین مکھیاں اڑ کر بھاگیں۔ بیٹے نے باپ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا اور بٹھا دیا۔ اُس کا ہاتھ خون اور پیپ سے لت پت ہو گیا اور باپ کی پیٹھ کی کھال جھلی کی طرح اتر آئی۔ بیٹے نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ عمر دراز چار پائی پر گرا اور اس کی زرد آنکھیں پھٹ سے بند ہو گئیں۔

سب ہی ماتم میں شریک تھے۔ عورتیں رو رو کر اس کی ساری زندگی کی یادوں کو دہرا رہی تھیں، بچوں کا منہ اتنا سا نکل آیا تھا۔ اُن کا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ دن ڈھلے جنازہ اٹھا تو سارا گاؤں اس میں شریک تھا۔ نہ شریک تھا تو اس کا بھتیجا۔ اس نے خاموشی سے کہا تھا! ''میں ان لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو کر بڑے ابا کو الوداع نہیں کہوں گا جنھوں نے ان کی زندگی میں اُن سے جانوروں کا برتاؤ کیا ہے۔''

قبرستان میں ایک نئی قبر دھرتی کے نئے زخم کی طرح ابھر آئی۔ اس کی بیوی نے کھنڈر میں چھپ کر گاؤں والوں کو خوش خوش واپس آتے ہوئے دیکھا جیسے ان سب کے دل پر سے پتھر کی سل ہٹ گئی ہو۔ کھیتوں سے واپس آتے ہوئے کسان اپنے جانوروں کو چھوڑ کر اس کی قبر کے پاس آئے اور سر جھکا کر دیکھتے رہے۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی چھاؤں میں کتنی خاموشی سے دھرتی ماں نے اپنے ایک ناقابلِ برداشت بچے کو اپنی چھاتی میں چھپا لیا تھا۔

اپنے بیلوں کو ہانکتے ہوئے ایک نے دوسرے سے کہا۔

''دھرتی کا کلیجہ کتنا بڑا ہے۔''

☆☆

غیاث احمد گدّی

اپّھی

رات سرد تھی، بے حد سرد۔ بارش کی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی باہر اندھیرا تھا اور پراسرار ہوا کے جھونکے چیختے ہوئے گذر رہے تھے۔ اندر آتش دان میں لکڑیاں دہک رہی تھیں اور سارے ماحول پر ایک غم انگیز کیفیت طاری تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی موت ہونے والی ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مرنے والے نے موت سے جنگ جیت لی تھی اور اس وقت وہ لمبے چوڑے پلنگ پر گہری نیند سو رہا تھا، سرخ سفید چہرہ، مہندی سے رنگی سرخ مونچھیں، خشخشی داڑھی، سر پر کاکل، چہرے پر ایک وقار ایک فاتحانہ تبسم، ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا زندگی سے ساری عمر الجھتے رہنے کے باوجود وہ ہراساں نہیں۔

"یہ کون؟ یہ کون ہیں؟

یہ نواب عظمت بیگ ہیں۔ پرانی ہڈی، پرانا جسم اور جسم میں دوڑنے والا پرانا خون جو آج سالہا سال بعد بھی بدستور سرخ ہے۔ کیا ہوا اگر زندگی کی ان آسائشوں نے منہ موڑ لیا جو پشت ہا پشت نسل در نسل تک ان کے ابا حضور خان بہادر عفت اللہ بیگ مرحوم و مغفور کے ایام شباب بلکہ اس سے کچھ آگے تک ساتھ دیا۔ اور زمانے کی گردشوں نے نواب عفت اللہ بیگ سے وہ رہی سہی دولت بھی چھین لی جس کی کمی آج خاندان کے سارے افراد محسوس کر رہے ہیں۔ کیا ہوا اگر آباواجداد کی جائداد میں سے صرف ایک حویلی رہ گئی اور وہ بھی گروی ہے۔ مگر شان تو زندہ ہے وہ آن تو سلامت ہے۔ زمانے کی صرصر نے سارے چراغ بجھادیے مگر وہ وقار، وہ جلال وہ اعلیٰ مزاجی اب بھی باقی ہے۔ اس چراغ کو کون بجھا سکتا ہے جس میں ان کے آباواجداد کا لہو جل رہا ہے؟ آج بھی وہی عظمت وہی شان، وہی احساس برتری نواب عظمت اللہ بیگ کے قدموں

پر لوٹ رہا ہے، جو ان کے جدّ امجد کی امانت تھا۔

یہ ہیں عظمت بیگ!

کہتے ہیں کہ سیکڑوں سال قبل نواب عظمت بیگ کے خاندان کے ایک بزرگ نے پتھروں کی سوداگری کرتے کرتے مغل دربار میں شرفِ باریابی حاصل کیا۔ ایک معمولی پتھر فروش کی طرح مغل دربار میں داخل ہوئے۔ لیکن ایک لمحہ میں مغل خاندان کے کسی بادشاہ نے انہیں وہ رتبہ بخشا کہ سارے دربار، سارے شہر دراگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو سارے ملک نے پتھروں کے اس سوداگر کو جھک کر سلام کیا۔ اس خاک کو افلاک نے سلام کیا۔ یہ مغلوں کا ادنیٰ کمال تھا۔ یہ مغلوں کی ایک جنبشِ لب کا اعجاز تھا۔ نگاہِ کرم کا ایک معمولی کرشمہ کہ ایک معمولی پتھر فروش لمحہ بھر میں ہندوستان کا بے حد دولت مند، بلند اقبال اور اعلیٰ مرتبت انسان ہو گیا۔

اس بات کو سیکڑوں سال گذر گئے۔ رات اور دن، اجالا اور اندھیرا، کتنی بار اس محفل رنگ ونور میں آئے اور آ کر چلے گئے۔ پھر یوں ہوا کہ زمانے کی صرصر بھی چلی اور مغلوں کی نگاہ محبت نگاہ کریمانہ سے جو چراغ روشن کیے گئے تھے وہ بجھے بھی، خود مغلوں کی وہ شان نہ رہی۔ کل تک جو جسم پھولوں سے بھی نرم اور ستاروں سے بھی روشن بستر پر آرام نہ پاتا تھا اسے کانٹوں میں پناہ لینی پڑی۔ جن نازک پیروں میں مخمل سے بھی خراش آتی تھی وہ ریگستانوں اور پتھریلی چٹانوں پر چلنے کے لیے مجبور ہوئے۔ جن نگاہوں نے پیشانی پر شکن کی ہلکی لکیر بھی برداشت نہ کی وہ گستاخ نگاہی کی مرکز بنیں۔

کہتے ہیں کہ جب وہ دست محبت ہی نہ رہا تو محتاجِ محبت کا پوچھنا کیا۔ اور مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی نواب عظمت بیگ کا ستارہ بھی فلک بلندتر سے ٹوٹا اور اپنے پیچھے دور تک نور کی ایک لکیر چھوڑتا ہوا ایک ایسی شاخ پر آ رکا جو خود بجلیوں کا نشانہ بن چکی تھی۔ چنانچہ نواب عظمت بیگ جانتے تھے کہ ان کا قدم جس شاخِ زمانہ پر ہے، نواب عظمت بیگ ایک ستارہ ہی تو ہیں۔۔ ستارہ اپنی تابندگی کیسے کھو سکتا ہے۔

ستارہ! وہ عرش کا باشندہ فرش پر کیسے اتر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ نواب عظمت بیگ ہیں۔ وقت خوردہ کتاب زندگی کا وہ آخری ورق جسے اگرچہ دیمک نہیں چاٹ پائی تھی مگر جو یکسر زرد ہو گیا تھا۔ وہ ورق جسے کوئی انگلی جہاں سے، جس جگہ سے موڑنے کی کوشش کرے گی وہ وہیں سے اسی مقام سے ٹوٹ کر الگ ہو جائے گا۔ لیکن کیا وقت کی انگلی میں اتنی طاقت ہے؟ ہے اتنی طاقت دست فطرت میں؟؟ نہیں نہیں! ہرگز نہیں!! کوئی نہیں...... کوئی نہیں...... یہ عظمت بیگ ہیں۔

''مگر کل۔ مگر کل۔؟'' نواب عظمت بیگ بڑبڑائے۔

اچانک انھوں نے کروٹ لی۔ اور آنکھیں کھول دیں۔ اور پھر چند ثانیے کے بعد بند کرلیں۔ وہی خوب صورت جسم تھا، ستار کے تار کی طرح تنہا ہوا۔ اچھی تیرہ سال کے بعد کس قدر بدل چکی تھی۔ جب وہ ایک کلی تھی، مگر آج..........!''

پھر اچانک نواب عظمت بیگ کو اس کی طنز بھری ہوئی ہنسی یاد آ گئی۔ پھر اس کی زہر میں بجھی ہوئی باتیں یاد آئیں۔ تیرہ سال قبل جب انھوں نے اس کے جسم کو چھوا تھا اس وقت اچھی انہیں ایک معصوم لڑکی محسوس ہوئی تھی، جس کے احساسات سوئے سوئے تھے جو گناہ وثواب کے فلسفے سے کوسوں دور، جسم کی بے حرمتی سے بھی نا آشنا تھی...... مگر کل......''

نواب عظمت بیگ کو معصوم ہوا کہ وہ اس وقت غلطی پر تھے اگرچہ اچھی اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ نہ دے سکتی تھی مگر نفرت کی میخ اس کے سینے میں اتر گئی تھی جسے آج تک چھپائے ہوئے تھی۔ نفرت اور انتقام کا ایک گہرا جذبہ۔۔

نواب عظمت بیگ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائے۔ ایک ہلکی سی آہ ان کے لبوں سے باوجود ضبط کے نکل گئی۔ انہوں نے بھی آنکھیں کھول دیں۔

''تم نے تیرہ سال بعد بڑا سخت انتقام لیا۔ اچھی تم نے صدیوں کی اکڑی ہوئی گردن کو کل جھکنے پر مجبور کر دیا...... آہ!''

''ابا حضور آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' اختر بیگ نے ان کے پلنگ کے قریب جھک کر

دریافت کیا۔

''اچھا ہوں بیٹے، اچھا ہوں............ انہوں نے اختر بیگ کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور پھر سینے کے پاس ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دبایا اور آنکھیں موند لیں۔

''ابا حضور شاید آپ کچھ فرما رہے تھے............؟ آپ فرمایئے کس نے آپ کی تضحیک کی۔ وہ کون تھا جس نے آپ کو جھکنے پر مجبور کیا؟''

وہ چونک اٹھے۔ کیا نیند میں انہوں نے ساری باتیں دہرا دی ہیں ان بچوں کے سامنے؟؟ چانک انھوں نے آنکھیں کھول کر بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کمرے کا جائزہ لیا۔ مقابل کے پلنگ پر ان کا دوسرا بیٹا اختر بیگ بیٹھا ہوا تھا۔ سرہانے صاحبزادی امت النساء بیگم، پیروں کے قریب ان کی بہو اختر دلہن اور ان کے کچھ دور چھوٹا لڑکا انور بیگ......

جب سب لوگ ایک ایک کر کے دروازے سے باہر نکل گئے تو انہوں اطمینان اور بے اطمینانی کا ملا جلا سانس لیا۔ پھر ایک فخر اور غرور سے انکی چھاتی پھول گئی۔ ان کے یہ بچے یہ چھوٹا سا خاندان جس کے ہر فرد کے دل میں ایک دوسرے کے لیے بے پایاں محبت موجیں مار رہی ہے کیا ہوا آج اگر وہ جاگیر نہ رہی۔ کیا ہو جو زندگی کی ان آسائشوں نے منھ موڑ لیا جو پشت ہا پشت سے نسل در نسل ان کے ابا حضور خان بہادر عفت اللہ بیگ مرحوم و مغور کے ایام شباب بلکہ اس سے کچھ آگے تک ساتھ آئیں تھیں............ وہ شان تو باقی ہے۔ عظمتوں کا وہ چراغ تو روشن ہے۔ اس چراغ کو کون بجھا سکتا ہے......

اچھی...... اچھی...... اس کا وہ جسم وہ خوب صورت، بے داغ جسم ستار کے تاروں کی طرح تنا ہوا جسم، پھر اس کی باتیں...... وہ زہریلی دل و دماغ کو خاکستر کر دینے والی باتیں۔ کیا وہ اچھی تھی؟ وہ اچھی جو تیرہ سال قبل شرمائی شرمائی ایک پھول کی طرح اس کی آغوش میں پڑی تھی۔ تیرہ سال قبل...... تیرہ سال قبل...... نواب عظمت بیگ کو ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔

آج انہوں نے اللہ رکھی کے یہاں اس کو دیکھا تھا۔ سمٹی سمٹائی گڑیا سی...... سرخ و سبز ریشم میں

لپٹی لپٹائی ہوئی انہوں نے اس کی تھوڑی پکڑ کر اوپر اٹھائی......

بلب کی تیز روشنی میں اچھی نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ گول سا چہرہ جوانی اور بچپن کی رس بھری سی کیفیت، ناک میں بڑی سی سونے کی نتھ۔ انہوں نے بے اختیار ہو کر اسے چھونا چاہا تھا......

"ابھی نہیں حضور......ابھی نہیں......اس کم بخت نتھ کو اتر لینے دیجئے!!" اللہ رکھی نے کہا تھا۔ پھر یہ نتھ بھی اتر گئی۔ اور جس روز یہ نتھ اترسی اس روز بنارس بھر کی طوائفیں جشن منا رہی تھیں۔ شہر بھر کی طوائفیں، سازندوں، بھڑووں اور دوسرے لوگوں میں کپڑے تقسیم کیے گئے۔ دیگیں پکی تھیں۔ شہنائیاں بجی تھیں۔ اور پوری ایک سو ایک گنیاں، پانچ انگوٹھیاں درجنوں کا مدار جوڑے اور مختلف چھوٹی بڑی چیزیں بے شمار تھیں جو نذر کی گئی تھیں۔ تب کہیں جا کر اچھی ان کے سامنے پیش کی گئی۔

پھر رات بھر وہ سسک سسک کر روتی رہی اور منتیں کرتی رہی کہ مجھے چھوڑ دیجئے.........میں شریفوں کی طرح زندہ رہنا چاہتی ہوں.........!

شریفوں کی طرح۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا ان کے سارے جسم کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ ایک ہلکی سی کراہ ان کے دل میں اٹھی اور وہیں دم توڑ گئی۔ انہوں نے ہلکی سی کروٹ بدلی، آنکھیں کھول کر دیکھا۔ کمرے میں اندھیرا پھیل رہا تھا۔ چراغ کی لو لحظہ بہ لحظہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ شاید تیل ختم ہو رہا ہے......... انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چراغ کو گھورنا شروع کر دیا۔ زرد، زرد، اداس اداس سی روشنی پھیلانے والی لو ایک دم سے جھک گئی۔ لیکن پھر استادہ ہو گئی۔

اچھی ——— ! نفرت کی ایک لہر سی ان کے دل میں اٹھی ——— ! دو کوڑی کی طوائف اس کی یہ ہمت کہ وہ نواب عظمت بیگ کی تضحیک کرے۔ پھر گذشتہ رات بھی انہیں یاد آئی جب وہ ایک دوست کے اصرار پر ایک طوائف کو خوش کرنے گئے تھے اور وقت نے تیرہ برس پیچھے چھوڑے ہوئے نقش پا کو سامنے لا کھڑا کیا۔ تیرہ برس پہلے اچھی ایک کلی تھی جو اب شگفتہ پھول بن چکی تھی۔

ایک ہلکا سا تبسم تھا جو ایک بے باک قہقہے میں بدل گیا تھا۔ جاگتے ہوئے جسم کی ایک کسلمندی تھی جو آج بھر پور انگڑائی ہوگئی تھی۔

انہوں نے برسوں کے سوئے ہوئے جذبات کو بپھرتا ہوا محسوس کیا اس پچپن برس کی سرد راکھ سے شباب کی آنچ پھوٹ پڑی۔ انھوں نے تخلیہ چاہا۔ اچھی بھرپور روشنی میں ایک دم نیم عریاں ہوگئی۔ نواب عظمت بیگ کا بوڑھا دل اچانک اچھل کر ان کے حلق تک آپہنچا......

نور ہی نور............ آگ ہی آگ......

انہوں نے اس آگ کو چھونا چاہا۔ دفعتاً اچھی تن کر کھڑی ہوگئی۔

''نواب صاحب اس جسم کی قیمت آپ کو معلوم ہے۔؟ بارہ سو روپے۔ آپ نواب ہیں، رئیس ہیں۔ دولت آپ کے قدموں پر لوٹتی ہے۔ اسی دولت کے سہارے آپ نے سینکڑوں شریف عورتوں کو کوٹھے پر بٹھا دیا ہوگا...... صرف بارہ سو۔ کیا آپ کے پاس ہیں......؟ شاید نہیں۔ شاید بارہ آنے بھی آج آپ کے جیب میں نہیں ہیں۔ مجھے سب معلوم ہے...... اس ڈھول میں اندر محض پول ہے اور کچھ نہیں......!

نواب صاحب ہم طوائفیں اپنے دروازے سے کسی کو بغیر کچھ دیئے واپس نہیں کرتیں۔ کہیے خیرات دوں؟ اپنے اس جسم کی خیرات۔؟؟''

خیرات...... وہ چکرا گئے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا......

☆☆

دیویندر اِسّر

سدھارتھ

ریلوے اسٹیشن کے باہر اچانک میری ملاقات پریش رائے سے ہوگئی۔ دو۔ ڈھائی برس بعد۔ یہ ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا۔ پریش رائے سڑک کے کنارے ناریل پانی پی رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اپنی فرم کی نئی پروڈکٹ کی پرورش کے لئے آج رات ہی دہلی کے لئے گاڑی پکڑنی ہے۔ دلی جانے والی اِس سے پہلے کوئی گاڑی نہیں۔

''چلو۔ پہلے ناریل پانی پیو۔ پھر کہیں بیٹھ کے اطمینان سے باتیں کرتے ہیں؟''۔ اُس نے کہا۔

ناریل پانی پینے کے بعد ہم سڑک کے کنارے ایک ٹی اسٹال میں چلے گئے اور ایک دھول بھری مَیل جمی میز کے گرد ایک ٹوٹے پھوٹے بنچ پر بیٹھ گئے۔

دو اسپیشل۔ پریش رائے نے آرڈر دیا۔

چائے والے نے کیتلی میں آدھا کپ دودھ اور دو چمچ چینی اور ڈال دی۔ دو پھین بھی دے دینا۔

میں چائے والے کی تہہ در تہہ چائے کی پتی جمی کالی سیاہ کیتلی کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا سر دے کر رہے ہو مسٹر ــــــ'' اُس نے مجھے چائے والی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں''۔ میں نے کہا۔

''بھائی دیکھتے کیا ہو؟ اِس کا باہر بھیتر ایک ہی ہے۔'' وہ بولا۔

اتنے میں چائے آگئی۔ ساتھ میں دو پھین اور کئی مکھیاں بھی۔

ٹی اسٹال کے باہر دُھول اُڑ رہی تھی اور اندر کالے دھوئیں سیاہ آنکھیں جل رہی تھیں۔

''ہماری فرم بڑے پیمانے پر شہروں کے نواحی علاقوں، قصبوں اور دیہاتوں میں اپنا بزنس پھیلا رہی ہے۔ ابھی تک اِن علاقوں میں نیورچ اور بڑھتی وئی مڈل کلاس کو پوری طرح ٹیپ نہیں کیا گیا ......خیر چھوڑو اِن باتوں کو۔ تم یہاں کیا کررہے ہو؟'' ___ میں نے پوچھا۔

''بس۔ یونہی ذرا گھومنے نکل پڑا''۔ اُس نے انگوچھے سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر انگوچھا میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے رُومال نکال لیا تھا۔ یہ ہمارا انگ وسترم ملٹی پرپز ہے۔ سفر پر نکلے تو گلے میں ڈال لیا۔ تھک گئے تو کمر میں باندھ لیا۔ دھوپ لگی تو سر پر رکھ لیا۔ ہاٹ گئے تو سودا سلف باندھ لیا۔ اشنان کیا تو شریر پونچھ لیا۔ نیند آئی تو سر کے نیچے رکھ لیا ___ اچھا تم یہاں کہاں ٹھہرے ہو؟۔

اُس نے پوچھا۔

''ابھی تو کہیں نہیں۔ اور پھر دِن بھر کی ہی بات ہے۔ ویسے بھی یہاں ٹھہرنے کی کوئی مناسب جگہ دکھائی تو دی نہیں۔ اِدھر اُدھر گھوم لوں گا۔ سمے کٹ جائے گا''۔ میں نے کہا۔

''تو پھر میرے ساتھ چلو۔ شام کو لوٹ آنا۔''

''کہاں؟''

''یہیں پاس میں ایک گاؤں ہے۔ پانچ چھ کوس کی دوری پر۔ ساتھ بھی رہے گا اور تمہارا مارکٹ سروے بھی ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر میں بس آنے والی ہی ہوگی۔''

ہم سڑک کے کنارے ایک درخت کے گرد بنے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ دو چار مسافر اور بھی انتظار کررہے تھے۔ چند منٹوں بعد بس آگئی۔ اور ہم اُس میں سوار ہوگئے۔ کنڈکٹر کی کرپا تھی کہ ہمیں سیٹیں مِل گئیں۔

ڈیزل، پسینے اور بیڑی سگریٹ کی بُو میں بس ہماری یاترا شروع ہوئی۔

''تم آگئے۔ بڑا اچھا ہوا۔ بات چیت میں سفر کٹ جائے گا۔'' وہ بولا۔

بس کچی پکی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر دھول اُڑاتی، دھواں پھیلاتی، شور مچاتی، ہچکولے کھاتی، لڑھکتی

جارہی تھی۔ بس کے اندر اتنا شور تھا کہ بات چیت بس اشاروں میں ہی ممکن تھی۔

پریش رائے نے انگوچھے سے مُنہ ڈھک لیا اور اُونگھنے لگا۔

☆☆☆

پریش رائے سے میری پہلی ملاقات مسوری میں ہوئی تھی۔۔ میں اور وہ مسوری میں لائبریری کے پاس ایک ہی لاج میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ آتے جاتے اُس سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی، وہ صبح تڑکے نکل جاتا اور شام کو اندھیرا ہوتے ہی واپس آتا۔ میں یہاں کچھ اپنے کام سے اور کچھ نندنی شوداسانی کے فیشن شو کے سلسلے میں دِن بھر مصروف رہتا۔ رات کھانے پر کسی ریستوراں میں اُس سے ملاقات ہو جاتی۔ جب بارش میں باہر نکلنا بند ہو جاتا تو وہ بالکنی میں بیٹھ کر بادلوں اور بوندوں کا نظارہ کرتا رہتا۔ اور جب پانی کی بوچھاڑ اُس کے جسم کو شرابور کر دیتی تو وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر کوئی کتاب پڑھنے لگتا۔ یا اکیلے ہی شطرنج کھیلنے لگتا ___ وہ کبھی کبھی وائلن بھی بجاتا تھا۔

جس روز نندنی شوداسانی کے فیشن کا باقاعدہ طور پر افتتاح ہونا تھا میں نے اُسے بھی چلنے کے لئے کہا۔ لیکن شاید اُسے میرا آئیڈیا کچھ پسند نہیں آیا۔

میں نے بڑے ہی فلمی انداز میں کہا ___ ہر وہ آدمی جو کچھ بھی وہ ہے۔ وہاں موجود ہوگا رنگ برنگ لباسوں میں شوخ و شنگ لڑکیاں، تڑک بھڑک، چکاچوند روشنی میں چھچھاتے تھرکتے، سجے سجائے جوان جسم ___ ہواؤں میں رنگ، روشنی اور خوشبوئیں بکھیرتے ہوئے......

اُس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ اور پھر کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

''چلو تھوڑی دیر کے لئے ہی آجانا۔'' میں نے کہا۔'' چہل قدمی بھی ہو جائے گی اور نندنی شوداسانی سے تمہاری ملاقات بھی ہو جائے گی۔'' ''او کے'' اُس نے کہا۔

سوائے ہوٹل میں فیشن شو کا گرانڈ افتتاح ___ دلی کی مشہور کامیاب صنعت کار اور معزز سماجی خاتون ارونا ملہوترہ نے کیا تھا۔ شو بڑا کامیاب رہا۔ نمائش بینوں، ___ خریداروں اور سلے

برٹیز___ کے جمگھٹ کے باعث بھی اور بزنس کے لحاظ سے بھی۔ ہم بہت خوش تھے۔ اتنے میں پرلیش رائے بھی آ گیا۔ میں نے نندنی شوداسانی سے اُس کا تعارف کرایا۔ ___ رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں کے اِس شیشہ گھر میں میرا شامل ہونا کچھ انٹی فیشن سا لگتا ہے۔'' پرلیش رائے نے کہا۔

''اوہ ___ نو ___ انٹی فیشن بھی ایک فیشن ہے۔'' نندنی شوداسانی بولی ___ ''کوفی یا کولڈ ڈرنک؟۔''

''پہلے کولڈ رنک، بعد میں کوفی۔''

جب میں چلنے لگا تو وہ بولا۔ ''اونلی کوفی پلیز۔''

نندنی شوداسانی پرلیش رائے کو اپنے نئے ڈی ,ائنز دکھا رہی تھی۔

''فیشن کی مارکٹ بڑی تیزی سے بدل رہی ہے۔ ہر روز نئے ماڈل، نئے لباس، نئی تراش خراش۔ اب تو زمانہ دی بولڈ اینڈ دی بیوٹی فل اور THE RICH AND THE FAAMOUS کا ہے۔ HAUTECOUTOUR کے لئے جتنی INVESTMENT اچاہئے وہ میں الیفورڈ نہیں کر سکتی۔ میں تو PRET-A-PORTE پاپولر پرائس پر ریڈی ٹو ویر ڈریسز ہی تیار کرتی ہوں۔ لیکن میری کریئشنز آرٹسٹک ہوتی ہیں۔'' نندنی پرلیش رائے کو بتا رہی تھی۔

''وہ تو ہے ہی۔ پینٹنس ہوں یا پوشاکیں ___ اوراقِ نظر آئی ہیں۔ جو شکل نظر آئی۔ تصویر حسین نظر آئی۔'' پرلیش نے کہا۔

''یہ میری نئی بنائی پوشاکیں ہیں ___ '' نندنی نے اپنے پہنے ہوئے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ PSYCHEDLIC رنگوں والا ہالٹر، کریم کلر جیکٹ۔ اور اُسی رنگ کے پیرللز۔ شانے پر سُرخ شول، نارنجی فلیٹ فارم شوز۔ کلائیوں پر بون اور سیپوں کی جیولری۔ گلے میں تعویز نما دھاتو کا پینڈل ___ ''کوفی کا پیالہ ہاتھ میں لئے پرلیش رائے اُس کے ساتھ ساتھ چل

رہا تھا ___ نیلی فیڈڈ جینس، کھادی کا بھورا کرتا، راجستھانی مرزئی، کولہاپوری چپل اور گلے میں منی پوری سُرخ سیاہ سفید مفلر ___ آرک لائٹ میں خوش رنگ ملبوسات اور لوگوں کی اس بھیڑ میں مجھے وہ کوئی جادوئی متحرک کمپوزیشن نظر آرہے تھے ___ میں نے پہلی بار محسوس کیا ___ پریش رائے کی آنکھوں میں اتنی چمک ہے جیسے وہ سب کچھ اپنے اندر جذب کر رہی ہے ___ اور میں نے کئی بار محسوس کیا کہ نندنی کے تانبہ رنگ بدن میں کتنی مقناطیسی کشش ہے۔

ہال میں فوٹوگرافرز کے کیمروں کی فلیش لائٹز جل بجھ رہی تھیں اور میڈونا کا گیت سن فلو کی گرم ہواؤں میں تیر رہا تھا ___ آئی ایم اے میٹریل گرل۔

جس روز فیشن شو ختم ہوا۔ میں نے نندنی شوداسانی کو اپنے لاج میں مدعو کیا۔ تھوڑی دیر تک بکنگ اور کولکشن کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر ہم پریش رائے سے ملنے اُس کے کمرے میں چلے گئے۔

وہ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا ___ اُس نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔

''کیا پڑھا جا رہا ہے؟'' نندنی نے کتاب اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہرمین ہس کی سدھارتھ تھی۔''

''اتنی پرانی کتاب اب پڑھ رہے ہیں۔ چالیس پچاس برس پرانی تو ہوگی ہی۔'' نندنی نے کہا۔

''ستر برس پرانی۔ انگریزی میں چھپتے چھپتے بھی ۳۲۔۳۰ برس ہو گئے۔''

پھر بھی ___!

''آدمی پرانا ہو جاتا ہے۔ کتاب پرانی نہیں ہوتی۔'' پریش رائے بولا۔

شاید ایک ہم سب بوڑھے ہو جائیں گے۔ لیکن زمانہ اِن کتابوں سے بہت آگے نکل چکا ہوگا۔'' نندنی نے کہا۔

''زمانہ تاریخ میں آگے بڑھتا ہے۔ لیکن ''کال'' میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔''

''یہ کچھ فلاسفی کی بات ہے ___ '' سندنی بولی۔

''فلاسفی کی نہیں، زندگی کی ___ جب میں نے اِسے پہلی بار پڑھا تھا تو یہ محض ایک کتاب تھی۔

''اور اب؟''

''اور اب جب پڑھ رہا ہوں تو کسی بہت پرانے دوست سی لگتی ہے۔'' پریش نے کہا۔

''پھر بھی ___ گزرا ہوا زمانہ کبھی واپس نہیں آتا۔

''لیکن آدمی گزرے ہوئے زمانے میں لوٹ سکتا ہے۔لوٹتا ہے۔لوٹنا پڑتا ہے۔اب آپ اپنی فیشن کی دنیا کو ہی لیجئے۔آج کا فیشن پچھلے دس برسوں سے آگے بڑھا ہے۔بڑھا ہے نا؟'' پریش رائے نے کہا۔

''بالکل بڑھا ہے۔''

''لیکن اُس سے پچھلے دس برسوں میں واپس چلا گیا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''وہی گرنج۔GRUNGE۔وہی سب کچھ جو ۲۰ سال پہلے تھا۔''

''اور بار بار وہی چنریا، چولی، لہنگا ___ روپ بدل کر سامنے آرہے ہیں۔''

''تو آپ بھی فیشن کے TRENDS پر نظر رکھتے ہیں۔''

''نہیں کچھ ایسا نہیں۔بازار سے گزرتا ہوں تو کسی عورت کو نظر چُرا کے دیکھ لیتا ہوں۔'' پریش رائے نے سندنی شودانی سے اُس کے ڈیزائنر کے بارے میں پوچھا۔اُس نے بتایا کہ اُس نے نیویارک انسٹی ٹیوٹ آف فیشن ٹکنالوجی میں ٹریننگ لی ہے۔حوض خاص ولیج میں اُس کا بوتیک ہے۔؟''

''کیا نام ہے بوتیک کا؟''

''پیرہن''۔

''رنگ پیرہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام___''

''آپ کو شاعری کا بھی شوق ہے۔؟''

''نہیں کچھ ایسا نہیں۔ بس یونہی کبھی کبھی کسی کا شعر گنگنا لیتا ہوں۔''

پھر نہ جانے کس بات پر نندنی اور پریش رائے میں بحث چھڑ گئی۔ موضوع فیشن اسکول، کالج یا FEMINISM نندنی کہہ رہی تھی۔ ''وہ زمانہ گزر گیا۔ جب اسکول، کالج کی لڑکیاں شاعری پڑھتی تھیں اور آہیں بھرتی تھیں۔ شاعروں سے غائبانہ عشق کرتی تھیں اور تکیئے بھگوتی تھیں۔ یہ MTV جنریشن ہے۔ ME جنریشن NOW جنریشن'' نندنی متواتر بولے جارہی تھی۔

''صحیح کہہ رہی ہیں'' پریش رائے بولا___ ''لیکن زمانے اتنا نہیں بدلا جتنا کہ آپ سمجھتی ہیں۔ ہر زمانے کے اپنے اپنے آئی کانس ہوتے ہیں۔ آئی کانس بدلنے سے نفسیات نہیں بدلتی۔'' پریش رائے نے کسی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا___ ''مجھے کچھ ہلکا سا یاد پڑتا ہے شاید وہ کتاب THE GENERAITON OF NARCISSES تھی۔ مسٹر پریش رائے۔ زندگی ہو یا انسان۔ اُسے کسی دوسرے کی کتاب سے نہ پڑھا جاسکتا ہے اور نہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر زندگی مایا جال ہے تو کتاب بھی شبد جال۔''........ نندنی کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ یہ بحث کی گرمی تھی یا شمپین کا اثر___ معلوم نہیں۔

بالکل صحیح۔ زندگی ہو یا انسان۔ اُسے کسی دوسرے کی کتاب سے نہیں پرھا جا سکتا۔ لیکن ہر کتاب زندگی اور انسان کو نیا جنم دیتی ہے۔ اُسے کسی نئی انجانی دنیا میں لے جاتی ہے۔ کسی جانے پہچانے شبد کو معنی اور کسی احساس کو نیا شبد دیتی ہے۔ کسی جسم کو نیا لباس دینے سے کسی انسان کو نئی روح، نیا دشوار ہے۔ پریش رائے نے اپنی آواز اونچی کرتے ہوئے کہا___ ''لوگوں کی باتیں ہیں۔ معنی کتاب میں نہیں زندہ لوگوں میں ہوتے ہیں........ نیم روشن کمروں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے۔ لودیتے جواں جسموں کا لمس محسوس کرتے ہو جو لوگ زندگی کی لذت سے محروم رہتے ہیں

وہ کتاب کی مصنوعی دنیا میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔اور سمجھتے ہیں کہ انہیں روشنی مل گئی۔وہ سدھارتھ سے گوتم انگریزی میں بول رہی تھی۔

پریش رائے نے کتاب کو ایک طرف سرکاتے ہوئے اور ذرا جھک کر کہا۔

مائی ڈیر نندنی شودا سانی۔ ہر احساس آدمی کی مندگی میں ایک ایسا زیرو ٹائم سا آتا ہے۔ جب وہ کتاب کی طرف آتا ہے اور پھر کتاب سے زندگی کی طرف لوٹتا ہے ___ یہ ایک انت ہیں یا ترا ہے۔انسان کے وراٹ درشن کی۔

نندنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔اُس پر ہلکی سی غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ہم سب کمرے سے لان میں آئے۔رات بالکل سیاہ تھی۔ چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔باہر تھوڑی تھوڑی سردی اور نمی تھی۔شاید اوس پڑنا شروع ہوگئی تھی۔ پریش رائے نے اپنی شال نندنی کے شانے کے گرد لپیٹ دی۔اور پھر چپ چاپ اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔

میں نندنی کو اُس کے ہوٹل چھوڑنے اُس کے ساتھ چلا گیا۔

☆☆☆

دلی میں پریش رائے سے میری ملاقات اُس کے دفتر میں ہوئی۔نندنی شودا سانی کو یشونت پلیس میں کسی ایکسپورٹ ایجنٹ سے مِلنا تھا۔ ہمارے پاس قریب آدھا گھنٹے کا وقت تھا۔نندنی نے کہا ___ وہ تمہارا دوست ..... کیا نام تھا ___ سدھارتھ۔نہیں ___ وہی جس سے تم نے مسوری میں ملوایا تھا۔'پریش رائے،'میں نے کہا۔ہاں پریش رائے ___ اُس کا دفتر بھی تو یہیں کہیں ہے۔ مجھے پریش رائے کا صحیح پتہ معلوم نہیں تھا۔اور نہ ہی اُس نے بتایا تھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ یہ تو لاج کا جسٹر دیکھنے سے کچھ یاد رہ گیا کہ یشونت پلیس میں اُس کا دفتر ہے۔لیکن نمبر معلوم نہیں۔ دو تین جگہ سے پوچھا لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہیں مِلا۔ جو حلیہ ہم نے بتایا تھا اُس حُلیے کے کسی شخص کا دفتر یہاں نہیں تھا۔ایک ریستوراں کے مالک سے معلوم ہوا۔اس کا دفتر بائیں کوری ڈور میں تیسرے نمبر پر ہے۔تیسرے نمبر پر ایک چھوٹا سا سائن بورڈ لگا تھا۔

INFOMATICS CONSULTANCY۔ہم اندر داخل ہوئے۔ ری سپشن ڈیسک پر ایک خوبصورت موڈ سیکریٹری سے سامنا ہوا۔میں نے نندنی سے کہا___ ''یہ لڑکی تمہارا ماڈل بن سکتی ہے۔ پریش رائے سے بات کرنا___ ''سیکرٹری نے پریش رائے کو خبر دی۔شیشے کی دیوار کے پیچھے تین چار لوگ کام کر رہے تھے۔اس شیشہ گھر سے ایک شخص باہر آیا___ گرے پتلون، دھاری دار قمیص۔ ہلکے بھورے رنگ کی ٹائی لگائے۔

''پریش رائے'' ___ اُس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے اُسے ایک دم پہچاننے میں کچھ وقت محسوس ہوئی۔اور پھر وہ خود ہی بول اُٹھا___ ''ہائے جے کے ___ ہیلو مس شودا سانی___ کیسے ہیں آپ___؟''

پھر ہم ایک طرف ری سپشن کارنر میں صوفے پر بیٹھ گئے۔سینٹر میں لیٹکس جیوٹ کارپٹ پر شیشے کی ٹاپ والی گول میز پڑی تھی۔ایک کونے میں کافی پر کولیٹر شوگر کیوبز اور تین چار پیالے پڑے تھے۔دوسرے کونے میں ربر پلانٹ تھا۔سامنے دیوار پر ایلا انجولی مینن کی پینٹنگ تھا اور پورے ریسپشن کارنر میں امجد علی خان کے ہمیر راگ کی سرودھنیں تازہ ہوا کی طرح سہلا رہی تھیں۔پریش رائے نے بغیر پوچھے کافی بنائی اور پیالے، ملک پاؤڈر شوگر کیوبز ہمارے سامنے رکھ دیئے۔وہ خود بلیک کوفی پیتا تھا۔

''اسنیکس؟___ ''اُس نے پوچھا۔

نو تھینکس___ ایک بزنس لنچ اپرائمینٹ ہے___ ہم نے کہا۔

پریش رائے نے بتایا کہ وہ ایک ملٹی میڈیا فیوژن فرم کے اشتراک سے IT, SA. INFORMATION TECHNOLGY SYSTEM ANALYSIS SERVICE چلا ہے۔

''شاید اسی لئے تمہارے دفتر کی ہر چیز COMPUTER CONTROLLER ہے_________ بلائنڈز سے لے کر تمہاری سکریٹری تک۔

وہ مسکرا دیا۔

''ہمارے یہاں کام میں AUTOMATION ہے۔ کام کرنے والے نہیں۔ میں ERGONOMICS کا قائل ہوں۔ اُس نے کہا۔

''تمہارا مطلب ہے STATE OF THE _________ ARTTECHNOLOGY WITH TRNSCDENTAL MEDITATION

__ کل شام کیا پروگرام ہے۔ آپ کا؟ اگر فرصت ہو تو شام پانچ بجے تاج پیلس آیئے گا___ نندنی شودا سانینے کہا۔

کیا کوئی پارٹی دے رہی ہیں؟۔

''گھبرایئے نہیں کوئی فیشن شو نہیں ___ نندنی کا HIGH HEM AND LOW NECK اگر آپ دونوں مل جائیں تو فیشن کی دنیا میں انقلاب آجائے گا___ ''میں نے کہا۔

پریش رائے ہنس دیا___ نندنی نے کہا'' کسی دن اِس پر بھی بات ہو جائے گی۔''

پریش رائے بھی مصروف تھا۔ اور ہمیں بھی دیر ہو رہی تھی۔ ہم نے اجازت لی اور دفتر سے باہر آگئے۔ مٹینگ سے فارغ ہو کر ہم حوض خاص ولیج کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں نندنی نے پوچھا۔

''یہ پریش رائے وہ تھا نا مسوری میں جس سے ہم مِلے تھے۔

''کیوں؟''

''کچھ نہیں۔ ویسے ہی___ ''اُس نے کہا___ اور وہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔

تاج پیلیس میں کسی سوامی کے آشرم کی جانب سے ایک شاندار سا گم تھا۔ سامنے دیوار پر، ادم نموشوائے، کی نیون لائٹ جل بجھ رہی تھی۔ ہال میں گیروے دستر، موڈ فیشن، ایتھنک ___ پہناوے والے ہر عمر کے مرد عورتیں موجود تھیں۔ ویڈیو اسکرین پر کسی سنیاسی کی فلم دکھائی جا رہی

تھی۔ نرمل جھرنے، چاروں طرف ہریالی۔ ونسپتی کے کھلے آنگن میں ٹہلتی اور نیویارک کے PSYCHEDELIC روشنیوں والے بالوں میں پروچن دیتی ___ سب کچھ اُجلا چمکتا آئینہ سا تھا جس میں اُس موہ لینے والی شخصیت کے مسحور کن عکس متحرک تھے۔ جب ویڈیو فلم ختم ہوئی تو پوڈیم کے پیچھے ایک چہرہ نمایاں ہوا۔ لمبے ہلکے سُرخ سنہرے بال۔ نیلی ساڑی میں ملبوس گلے میں رودراکش کی مالا۔ ایک چالیس بیالیس برس کی خوبصورت خاتون، وہ بتا رہی تھیں۔ کچھ سال پہلے ایک ذاتی کرائسس کے باعث اُن کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ اُس کی زندگی پوری طرح SHATTER ہو چکی تھی۔ وہ ایک مینٹل رَیک تھی۔ اُس کی ازدواجی زندگی NIGHTMARE ثابت ہوئی۔ پھر وہ 'ما' کی شرن میں آئی۔

شانتی کی تلاش میں۔ اُسے شانتی مِل گئی۔ اُس کا نیا جنم ہوا ہے۔ ایک ناری کے روپ میں ایک کامیاب برنس پرسن کے روپ میں۔

یہ خاتون کون ہیں؟ پرلیش رائے نے مجھ سے پوچھا۔

ارونا ملہوترہ۔ ANETREPRENEUR PAR EXCELENCE A GREAT CELEBRITY

"یہ وہی تو نہیں جنھوں نے مسوری میں نندنی شودا سانی کے فیشن شو کا ______ افتتاح کیا تھا۔؟"

"لیس ویری مچ۔" میں نے کہا۔

"اوم نموشوائے۔" پرلیش رائے نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

ہال کی سب روشنیاں بجھ گئی تھیں صرف پوڈیم پر ایک بلب ننھی سی قندیل کی مانند جل رہا تھا۔ اور پھر ہال 'اوم نموشوائے' کی دھونی سے گونجنے لگا۔ لوگ آنکھیں بند کر کے سر ہلا ہلا کر اوم نموشوائے کا جاپ کر رہے تھے کچھ دیر تک یہ عمل جاری رہا۔ روشنیاں پھر جگمگا اُٹھیں۔ سب کو 'ما' کا پرساد دیا گیا۔ اور ساتھ ہی چائے کوفی کا دور شروع ہوا۔ دیس بدیس سے کئی لوگ آئے ہوئے تھے ___

بزنس مین؟ فلم اسٹار، ٹی وی میڈیا کے ستارے، جرنلسٹ، بیورو کریٹس، ڈاکٹر، انجینئر، سیاستدان، سائنس دان، نرتیہ، کلا، سنگیت، رنگ منچ کے لوگ ___ انٹلکچوبلکرز ___

کافی کے دَوران نندنی شوداسانی نے پریش رائے سے پوچھا۔

''کیسے لگا؟۔''

''ٹھیک ہے اِن لوگوں کو سکون کی کتنی ضرورت ہے! پلنگ کے پائے سونے کے ہی کیوں نہ ہوں۔ سرہانہ تو بہرصورت نرم ہی چاہیئے۔'' اُس نے کہا۔

''آج زندگی کتنی فاسٹ ہوگئی ہے؟ کتنی ٹینشن بڑھ گئی ہے؟ ڈپریشن ___ چاروں طرف.......'' نندنی کہہ رہی تھی۔

میں جب چار پانچ برس کا تھا۔ تو ماں کی انگلی پکڑ کر کبھی کبھی گاؤں کے پاس ایک ٹیلے پر بنے مندر میں جایا کرتا تھا۔ مندر کیا تھا۔ پیپل کے ایک درخت کے گرد مٹی گارے سے بنے ایک کچے چبوترے پر شولنگ روپی پتھر ستھاپت کر دیا گیا تھا۔ اِرد گرد کے گاؤں کے لوگ وہاں آتے تھے۔ اور سب مل کر سنکیرتن کرتے تھے۔ اور جھوم جھوم کر گاتے تھے۔ اوم نموشوائے۔ اور پھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوجاتے تھے۔ پریش رائے کہہ رہا تھا۔ ''وہی صدیوں پرانی زندگی، وہی صدیوں پُرانے وِشواس۔''

''اب زمانہ بدل گیا ہے!'' نندنی شوداسانی کہا۔

''ہاں ___ زمانے واقعی بدل گیا ہے۔ ٹیلے پر بنا کچا چبوترا تاج پیلیس میں آ گیا ہے۔ پیپل کا پیڑ ساگوان کا بنا پوڈیم بن گیا ہے۔ شولنگ کی جگہ ویڈیو اسکرین کے رنگین عکس نے لے لیا ہے .....زمانہ واقعی بدل گیا ہے۔'' پریش رائے نے کہا۔

''جب LIVINGSTYLE اور آرٹ کی نمائشیں، فیشن شو اور سوپر تھیٹر۔ اور سنگیت کی محفلیں، شادی کے منڈپ، پارٹیاں، بزنس کانفرنسیں، اور گرام سدھار کے سیمینار پانچ ستارہ ہوٹلوں میں ہوتے ہیں تو پھر بھجن کیرتن کیوں نہیں۔'' میں نے کہا۔

پریش رائے خاموش رہا۔کوفی پینے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے وہ رُکا ___ ہمیں کسی دن گھر آنے کے لئے کہا۔اپنا پتہ دیا ___ اور چلا گیا۔

اِس کے بعد پریش رائے سے کئی دِنوں تک میری ملاقات نہیں ہوئی۔ایک دِن سوچا کیوں نہ اُس کے گھر اُس سے مِلا جائے ___ میں نے نندنی شوواسانی سے کہا ___ اُس نے کہا کہ اُسے بھی اُس سے کمپیوٹر گرافکس کے بارے میں کچھ بات چیت کرنی ہے ___ اور اگلے اتوار ہی وہ اُس کے گھر جا پہنچے بغیر اطلاع کے۔

پریش رائے گھر پر ہی تھا۔اُس نے دو چوکیاں سرکاتے ہوئے ہمیں بیٹھنے کے لئے کہا۔___ لیکن ہم اُس کے ساتھ ہی فرشتی بستر پر بیٹھ گئے۔اُس نے بستر پر پڑی ہوئی چیزیں ___ کتابیں ،رسالے، پین، مارکرز، کوی کا پیالہ، کیسٹس۔وغیرہ سمیٹ کر ایک طرف سرکا دیئے۔اور واکمن کو سرہانے کے قریب رکھ دیا۔تھوڑی دیر رسمی باتوں کے بعد وہ کوفی بنانے چلا گیا۔اُس کے کمرے میں کتابوں کے کئی شیلف تھے۔شیلفوں کے اُوپر، کتابوں کے بیچ۔دیواروں پر کئی طرح کے آرٹی فیکٹ اور منی ایچر زتھے۔سیاہ لکڑی کے نیگرو کاروِنگ۔ہڑپا کی کانسے کی بنی برہنہ نرتکی کی مورتی۔ چینی ڈریگن والی ہینگنگ ___ بستر کی لوہے کی پتریوں کی بنی آفرنگ جس میں پرندے، جنگلی جانور، کِسان، شکاری، پیڑ پودے اور کی دیئے بنے ہوئے تھے۔گوتم بدھ کا ٹیرا کوٹا کا مجسمہ، مدھوبنی پینٹنگس ___ بھگت سنگھ کی تصویر ___ سب کچھ بڑا بے جوڑ،ان میل سالگتا تھا ___ بے ترتیبی سے بکھرا پڑا سا ___

پریش رائے کافی بنا کر لے آیا۔اپنے لئے وہ بلیک کافی لایا تھا۔

’’آپ نے ڈیکوریشن کی اتنی ساری چیزیں جمع کر رکھی ہیں۔لیکن ترتیب سے رکھا نہیں نندنی شوواسانی نے کہا۔

’’دراصل میں INTERIOR DECORATOR تو ہوں نہیں۔اور نہ ہی کوئی بڑا آرٹ کلکٹر یا آرٹ کا پارکھی ہوں ___ میں تو بس ___ فائنڈر ہوں۔جو چیز پسند آئی کسی نے

دے دی، سستے داموں میں مِل گئی۔ حاصل کرلی۔ کسی ایمپوریم سے تو کبھی کچھ خریدا نہیں۔ اور کو جہاں جگہ ملی اُس نے وہیں بسیرا کرلیا۔

''آخر کوئی نہ کوئی ڈیزائن، ترتیب، مناسبت اور میچنگ تو ہونی چاہیے ___ IT IS ALL CHAOS'' نندنی نے کہا۔

''آپ صحیح فرماتی ہیں۔ میں نے دو چار بار انہیں رنگ، سائز، بناوٹ، مقام، زمانے، تھیم کے مطابق رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اِنہوں نے پرزور پروٹسٹ کیا۔ ہم کھلونے نہیں ___''

پرلیش رائے تھوڑ دیر خاموش رہا ___ پھر بولا ___

''اِن کا ظاہر الگ الگ ہے۔ لیکن اِن میں کہیں نہ کہیں کوئی روحانی رشتہ ضرور ہے۔ آپ نے کبھی اِنہیں آپس میں باتیں کرتے سُنا ہے۔ اگر تم بدھ بھگت سنگھ سے موت اور نجات کے مسئلے پر بات کرنا چاہے تو میں اِنہیں کیسے روک سکتا ہوں ___ کیسے الگ کرسکتا ہوں ___'' پرلیش رائے نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ جسے وہ جامد ساکت بے جان چیزوں کے بارے میں نہیں جیتے جاگتے لوگوں کے بارے میں بات کررہا ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے بات چیت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ کمرے میں گراموفون پر ریکارڈ ابھی تک چل رہا تھا۔ بہت مدھم مدھم مدھر مدھر سروں میں گنجن بن چھانڈی ہے ___ کہاں جاؤں مادھو...... جو میں ہوتی جل کی مچھلی......

''یہ کس کی آواز ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دلیپ کمار رائے کی۔''

''بڑی مدھر آواز ہے؟ بھگتی رس میں ڈوبی ہوئی۔'' نندی نے کہا۔

ہم نے یہ نام نہیں سنا تھا اور نہ یہ آواز پہلے کبھی سنی تھی۔ شاید کوئی بہت پُرانا ریکارڈ تھا۔

اتفاق سے کچھ برس پہلے ان سے میری ملاقات چنڈی گڑھ میں ہوگئی۔ ایک گیسٹ ہاؤس میں سفید ریش، سفید جٹائیں ___ آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ، ہاتھ میں بید کی چھڑی ___ چہرے پر وہی جلال۔ وہ ہمارے کمرے کے سامنے سے کئی بار گزرے ___ میرے من میں

خواہش ہوئی کہ ان سے ملاقات کروں۔ پھر ایک دن میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔ وہ دلیپ کمار رائے ہی تھے۔ پریش رائے نے ایک تصویر دکھائی جس میں وہ دلیپ رائے' ایک خاتون اور پریش کا کوئی دوست تھا۔

لیکن ان سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ بار بار میرا من اُٹھتا۔ کہ ان ہونٹوں کو ہلتے ہوئے' بولتے ہوئے' سنوں۔ لیکن ___ پریش رائے کچھ اُداس سا ہو گیا۔

جب بھی ان کا ریکارڈ بجاتا ہوں تو اُن کا وہی جادو ___ جس میں ہر ٹھوس چیز پگھل کر سیال ہو جاتی ہے۔ اور آدمی اس میں جذب ہو جاتا ہے۔

پریش رائے کسی سے مخاطب نہیں تھا۔ اپنے آپ سے بھی نہیں۔ بس وہ اس آواز کی ترنگوں پر تیر رہا تھا۔ ہم حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور جب یہ طلسم ٹوٹا تو اس نے ہماری طرف دیکھا۔

اچانک ہماری نظر فرشی بستر کے ساتھ لگی دیوار پر لٹکی تصویر پر پڑ گئی۔

''یہ کس کی تصویر ہے؟'' ہم نے پوچھا۔

''میری ایک دوست ہیں انجنا بسواس۔ ہم سینٹ اسٹیفن کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ حالانکہ اس کا سبجیکٹ سائنس تھا اور میرا سوشیالوجی ___ ایک دن پتہ چلا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی نکسلائٹ گروہ میں شامل ہو گئی ہے۔ اور آندھرا پردیش' بہار اور مدھیہ پردیش میں سرگرم عمل ہے۔ مجھے کچھ حیرت ضرور ہوئی کہ وہ لڑکی جو پرندوں کے اسپتال میں زخمی پرندوں کی مرہم پٹی کرتی تھی کیسے ___________ POWER FLOWS FROM THE BARREL OF GUN پر عمل کرتی ہوگی۔ وہ جو اتنے دھیمے سے بات کرتی تھی کہ کئی بار صرف ہونٹ ہلتے نظر آتے تھے آواز سنائی نہیں دیتی تھی کیسے بارود کی بُو اور شور میں سانس لیتی ہوگی۔ دو تین برس تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ کچھ عرصے بعد اس کا ایک ساتھی واپس آ گیا ___ اس سے پتہ چلا کہ اس کا قتل ہو گیا ہے۔ لیکن اسے

بھی معلوم نہیں تھا کہ قتل کس نے کیا؟ بس اتنا معلوم ہوا کہ اس کی اپنے گروہ کے ساتھیوں سے بڑی گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں ۔ اور پھر پولیس بھی اس کے تعاقب میں تھی ENCOUNTER بھی ہوسکتا ہے۔ اصلی یا جعلی ۔ جس علاقے میں وہ کام کرتی تھی اس میں سے بھی کوئی ہوسکتا ہے۔ بس یہی پتہ چلا کہ اس کی لاش گاؤں کے پاس ایک جنگل میں ملی ۔ پولیس نے لاش کو لاوارث قرار دے کر جلا دیا۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں یہ سب کچھ کیسے' کیوں ہو گیا؟ کرم کا فلسفہ' آزمائش' DESTINY یا SUFFERING کچھ سمجھ نہیں آتا۔

دلیپ کمار رائے کی آواز کب کی رک چکی تھی ۔ لیکن ریکارڈ اب بھی گردش میں تھا۔ باہر بادل اُمڈ آئے تھے ۔ کمرے میں اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی ۔ تھوڑی دیر میں بوندا باندی شروع ہوگئی ۔ پریش رائے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگا۔ وہ کچھ لمحے یونہی کھڑا رہا۔ بادلوں کو گہراتے برستے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالے اور اوک میں بارش کی بوندیں جمع کیں اور پھر پانی بھری ہتھیلیوں سے اپنے چہرے کو نم کر لیا۔ وہ کھڑکی سے واپس آیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی سرریلسٹ کیفیت تھی ۔ وہ تھوڑی دیر یونہی بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اور پھر اچانک بولا ___ ''اگر آپ اجازت دیں تو تھوڑی دیر بارش میں بھیگ لوں ۔ ''اور بازو پھیلا کر ناچنے گانے کے سے انداز میں ٹرلیس میں ادھر اُدھر تھر کنے لگا۔ نہ جانے کیوں میری آنکھوں کے سامنے ناچتے گاتے چیتنیہ مہاپربھو کی ایک تصویر گھومنے لگی ۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آگیا۔ وہ پوری طرح بھیگ چکا تھا۔

معلوم نہیں بارش کا پانی جسم کے مساموں میں داخل کر کہاں گم ہو جاتا ہے ۔ اس نے کہا اور کپڑے بدلنے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گیا ۔ اس کا چہرہ بہت کھلا کھلا سا تھا ۔ بہت تازہ تازہ سا نظر آ رہا تھا۔ جیسے ابھی ابھی اس کا جنم ہوا ہو۔

بچپن میں جب موسم کی پہلی بارش ہوتی تھی تو ہم گھروں سے نکل کر گلیوں میں نکل آتے تھے ۔ ناچتے تھے ۔ گاتے تھے ۔ برس گئی رام بدریا کاری ۔ اب جب موسم کی پہلی بارش ہوتی ہے میں

جہاں بھی ہوں۔ جس حال میں بھی ہوں۔ بارش میں ضرور نہاتا ہوں۔ ماں کہا کرتی تھی۔ جب رِتو کی پہلی برکھا ہوتی ہے۔ جب ہوا میں سوگندھ اُڑنے لگتی ہے۔ جب مٹی کا رنگ بدلنے لگتا ہے۔ جب پنکھ پنکھیروں کی اُڑان میں گتی آجاتی ہے تو سمجھو کہ موسم بدل رہا ہے ____

کمرے میں یادوں کی موہوم سی دھند چھا رہی تھی۔ باہر بادل بہت گھرے اُمڑ آئی تھے۔ پریش رائے نے کیسیٹ پلیئر ____ میں ایک کیسیٹ لگا دیا۔ آن کیا۔ اور سرہانے پڑی وائلن اُٹھائی اور بجانے لگا۔ طبلے کی آواز گونجنے لگی۔ یہ ذاکر حسین صاحب کا طبلا وادن ہے۔ میں ان کے ساتھ وائیلن پر سنگت کرتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوا کہ سب کے دہنوں میں پرانی یادیں' گھرے بادل، مٹی کے بھورے رنگ' آدھی رات کو کھلے بیلا کی خوشبو' اور پتوں کا نازک لمس' کچے بیروں کی کھٹی مٹھی لذت' پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ۔ ذاکر حسین صاحب کے طبلے کی دھڑکتی تھاپ اور پریش رائے کے وائیلن کی سریلی دُھنیں...... سرشٹی کے نازک اسرار ریشم سے دھیرے دھیرے کھل رہے تھے۔ کمرے کے گرد ایک جادوئی جال بنتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک طبلے کی آواز بند ہو گئی۔ شاید کیسیٹ پورا چل چکا تھا۔ کتنا سمے بیت گیا۔ یا شاید سمے ٹھہر گیا تھا۔ پریش رائے نے وائیلن سرہانے رکھ دی۔ کمرے میں سناٹا سا چھا گیا۔ باہر بارش لگاتار ہو رہی تھی۔ ماحول میں ہلکی سی دھند سی چھا گئی تھی۔ باتوں کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔ جیسے ہی بارش تھمی ہم نے پریش رائے سے اجازت لی۔ وہ ہمیں نیچے چھوڑنے آیا۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی' پھر شروع ہو گی تھی۔ کار کے شیشوں پر پانی کی بوندیں روشنی میں موتیوں سی چمک رہی تھیں۔ وائپر کام نہیں کر رہا تھا۔ میری ساری توجہ بھیگی ہوئی سڑکوں پر کار ساودھانی سے چلانے پر مرکوز تھی ____ اور نندی ان سب سے بے خبر کھڑکی کے شیشوں پر انگلیوں سے ساز بجاتی کچھ گنگنا رہی تھی۔

''کیا گنگنایا جا رہا ہے ____ '' میں نے اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ____ بس یونہی ____ ''

''پھر بھی!''

''میں جب نو دس برس کی تھی تو بڑی اماں کو گنگناتے ہوئے سنا کرتی تھی۔ بس وہی یاد آرہا ہے ۔''

''کیا؟''

''بڑی اماں گایا کرتی تھی۔ کچھ زیادہ یاد تو نہیں۔ بس تھوڑا سا یاد رہ گیا ہے۔''

الفی پہن الکھ جگاواں

اپنے پیا نوں ڈھونڈ لیاواں

میں تے کر کے جوگن والا ویس ہادیا۔

میری دکھاں والی جندڑی دیکھ ہادیا۔

نندی یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔ راستے بھر بوندیں پڑتی رہیں۔ راستے بھر وہ خاموش رہی۔

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی تھی۔ میری یادوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ہمیں یہیں اُترنا تھا بس سے اتر کر سڑک پار کر کے میں اور پریش رائے ایک پگڈنڈی پر چل پڑے۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے کھیت تھے۔ جنہیں جنگل کاٹ کر بویا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم گاؤں پہونچ گئے اور ایک مکان کے سامنے آکر ہم رک گئے۔ ایک چبوترہ نما برآمدے میں ایک وئید جی روگیوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس مکان میں دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ اینٹوں کا فرش تھا۔ تازہ پلستر کی ہوئی دیواریں تھیں۔ اور کھپریل کی چھت تھی۔ پریش رائے نے وئید جی کی چرن وندنا کی اور ایک کمرے میں چلا گیا جہاں ایک ڈاکٹر مریضوں کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں ایک لیڈی ڈاکٹر مریضوں کی جانچ کر رہی تھی۔ میں باہر وئید جی کے پاس بیٹھ گیا ____ سفید گاڑھے کی دھوتی' لال رنگ کا کرتا ____ کچھ دنوں کی بڑھی ہوئی داڑھی۔ سیاہ بال گردن تک بڑھے ہوئے ____ وہ روگیوں سے گھر پریوار کی باتیں بھی کرتے جاتے اور دوا کی پڑیاں بھی باندھتے جاتے۔ کبھی گیت

،کبھی شبد، کبھی دوہے، کبھی بھجن بھی سناتے جاتے۔ اتنے میں پریش رائے دوسرے کمرے سے ہو کر آ گیا۔ اور باہر جمع لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ ہمارے پاس آ گیا ___ بولا ___ ''پہلے بھوجن کر لیں، پھر اگلا پروگرام طے کرتے ہیں ___ ''مریضوں سے فارغ ہو کر، ہم سب بھوجن کرنے لگے۔ چاول بھات چٹنی ___ پریش رائے نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر میاں بیوی ہیں ___ اور شہر میں ان کا بہت بڑا پولی کلینک اور نرسنگ ہوم ہے۔ اس کے پرانے دوست ہیں۔ اور مہینے میں ایک بار آتے ہیں۔ ساتھ میں دوائیں، روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں۔ بچوں کے لئے کھلونے، ٹافیاں، کپڑے، کاپیاں، کتابیں تصویریں لاتے ہیں ___

پریش رائے ایک کونے میں پڑے ہوئے باکس سے چیزیں نکال کر دکھانے لگا۔

''لیکن یہ سب کچھ آپ کیسے MANAGE کر لیتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے اپارٹمنٹس کی ایسوسی ایشن یہ سب کام کرتی ہے۔ سب کچھ اکٹھا ہو جاتا ہے اور پتہ بھی نہیں چلتا ___ بچے اس میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں ___ سال میں ایک بار ان بچوں کو یہاں لے آتے ہیں اور یہاں کے بچوں کو شہر میں۔''

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ___ سیاست سے لے کر سنیما تک ___ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پریش رائے نے کہا ___ کہ وہ کچھ دیر کے لئے کہیں جا رہا ہے۔ سورج ڈوبنے سے پہلے ہی لوٹ آئے گا ___ میں نے کہا ___ ''میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

چلتے چلتے ہم گاؤں سے باہر نکل آئے۔ اور پھر ایک جنگل میں داخل ہو گئے ___ اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ کوئی پگڈنڈی نہیں تھی۔ ہم درختوں کے بیچ راستہ بنتے ایک پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پریش رائے بتاتا جاتا تھا کہ یہ کون سا پیڑ پودا ہے۔ ڈھاک، پیپل، بانس، املی، مہوا۔ بڑ۔ تھوڑی دور جا کر وہ رک گیا۔ ایک پیڑ کے گرد پیلا دھاگہ بندھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا جھولا اس پیڑ کی ٹہنی پر لٹکا دیا۔ اور دھرتی پر پڑے زرد سوکھے پتے صاف کرنے لگا۔ اس نے اپنے جھولے سے ایک بڑی سی موم بتی نکالی۔ اور صاف کی ہوئی زمین پر ایک پتھر کے ساتھ ہارے رکھ

دی۔ اور پھر جنگلی سفید گلاب کا پھول جلتی ہوئی موم بتی کیس اتھ رکھ دیا۔ میں نے پریش رائے کی طرف سوالیہ نشان سے دیکھا۔

''یہ وہ بھومی ہے جہاں انجنا بسواس کی لاش ملی تھی۔'' اس نے کہا۔

تھوڑی دیر وہ آنکھیں موندے گھٹنوں بیٹھا رہا۔ سینے پر کراس کا نشان بنایا____ اور پھر جھولا اُٹھا چپ چاپ واپس چل پڑا۔ نہ جانے میرے ذہن میں یہ سوال کیسے آیا____ میں نے پریش رائے سے پوچھا____ کیا تمھیں ایشور پر وشواس ہے؟..... اور کس ایشور پر......؟

وہ میرا سوال سمجھ گیا اس نے میرے سوال کا سیدھا جواب نہیں دیا۔

''روشنی کی لو،مٹی کے رنگ اور پھول کی خوشبو____ ان سے باہر'ان سے پرے'ان سے اوپر کوئی ایشور ہے کیا؟۔''

ہم دونوں خاموش گاؤں کی جانب چل دیئے۔

پھر باتوں باتوں میں نہ جانے نندنی شوداسانی کا ذکر کیسے آگیا۔

بڑی مدت سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے کہا____ ''ایک دو بار میں حوض خاص ولیج میں اس کی بوتیک پر بھی گیا۔ لیکن وہ نہیں ملی۔''

پریش رائے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''معلوم نہیں آج کل کہاں ہے وہ؟ میں نے پھر کہا۔''

''سنا ہے کوئی کتاب لکھ رہی ہے''____ وہ بولا۔

''کیا ان دنوں تمہاری اس سے ملاقات ہوئی ہے؟''

''کافی عرصہ پہلے____ ایک بار ایک فارن وزیٹر کے ساتھ اس کے بوتیک پر گیا تھا۔ پریش رائے نے کہا۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس سے اس کی ملاقات ہوئی کہ نہیں۔

پریش____ ایک بات پوچھوں____ میں نے کہا____ ''نندنی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟''

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور بڑے زور سے ہنسا۔

''یہی سمجھنے کے لئے تو وہ کتاب لکھ رہی ہے ___ اُس نے کہا۔

اور پھر سارے راستے کوئی بات نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر میں ہم گاؤں واپس پہونچ گئے۔

گاؤں میں عورتیں اور پرش ایک چھوٹے سے میدان میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ پرشوں نے اپنے سروں پر لال، پیلے اور سفید رنگ کی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ ان میں رنگارنگ پنکھ لگا رکھے تھے۔ گلے اور بازوؤں پر تعویز بندھے تھے۔ کچھ عورتیں پیتل کی تلی چادر کی ٹوپیاں مہنگے موتیوں کے کمر بند، کوڑیوں اور مونگوں کا مالائیں۔ کانسے پیتل اور گلٹ کے گہنے پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے جسم پر گودنے بنے تھے۔ ان کے کانسہ رنگ جسم کا شاید ہی کوئی انگ ایسا تھا جس پر کوئی نشان نہیں تھا۔ گالوں، پنڈلیوں کلائیوں، چھاتیوں پر، نابھی کے گرد، پیٹھ، کندھوں، ایڑیوں اور پنجوں پر ___ پھول، پتیاں، دائرے، تکون، بندوں ___ اور پھر بڑے بڑے ڈھولوں پر تھاپ پڑی۔ کچھ تر ہی بجا رہے تھے، کچھ سینگ، کچھ شنکھ۔ کچھ بانسری۔ پُرش اور عورتیں گھیرا ڈال کر ناچ رہے تھے۔ مجھے ان کے بول سمجھ نہیں آ رہے تھے۔ میں نے پرلیش رائے سے پوچھا کہ وہ کیا گا رہے ہیں، اس نے کہا ___ اسے بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ لیکن تھوڑا بہت سمجھ لیتا ہے ___ شاید وہ کہہ رہے ہیں۔

''میرا یہ چھوٹا سا گاؤں اتنا پیارا/ اتنا سندر/ جیسا کہ چندرما/ میں اپنے گاؤں میں خوش ہوں/ اس میں میرا گھر ہے/ میرے گاؤں میں پیڑ پودے اور خوشیاں پلتی ہیں/ دیوی ماں/ ان سب خوشیوں، ان سب پھو پھولوں کی خوشبو/ ہر گھر کے آنگن میں، ہر گاؤں میں پھیلا دو ___''

ڈھولوں کی آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر پورے گاؤں ش میں گونج رہی تھی۔ عورتیں پرشوں کے گھیرے کے بیچ سے ناگ کی طرح بل کھاتی نکل رہی تھیں۔ نرتیہ کی گتی تیز ہو رہی تھی۔ ان کے گیتوں کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ نرتیہ کی گتی، ڈھولوں کی آواز، گیتوں کی گونج ___ کھردرے ننگے کالے میلے پاؤں کے نیچے اُڑتی اُداس دھول ___ یہ کیسی دھندلی دنیا تھی۔ اور پھر دھیرے دھیرے سب کچھ شانت ہو گیا۔ شام کے سائے بڑھنے لگے ___ سورج دیوتا پہاڑیوں کے پیچھے

است ہونے لگا ___ اندھیرا ہونے سے پہلے ہم سڑک پر پہونچ جانا چاہتے تھے۔ گاؤں میں دیئے یالالٹین کے سوا کوئی روشنی نہیں تھی۔ میں ڈاکٹر میاں بیوی سے ساتھ ان کی موبائیل میڈیکل وین میں واپس ریلوے اسٹیشن پہونچ گیا۔ اور رات کی گاڑی سے دلی کے لئے روانہ ہوگیا۔ پریش رائے وہیں رک گیا تھا ___

پریش رائے سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

اس بات کو کئی برس بیت گئے۔ میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے ایشیا ریجن کا ایگزیکیٹو ڈائرکٹر بن کر اسٹیٹس میں سیٹل ہوگیا ہوں۔ انڈیا ___ صرف ایک بار ہی جاسکا ہوں۔ ماں کی موت پر۔ بس۔ نہ پریش رائے سے ہی ملاقات ہوئی اور نہ ہی نندنی شودا سانی سے ہی مل سکا۔ ایک دن میں ایک بک اسٹور میں کتابیں دیکھ رہا تھا کہ میری نظر ایک کتاب پر پڑی۔ کتاب کا نام کچھ عجیب سا تھا۔ جیسا کہ آج کل کی انگریزی کتابوں کا ہوتا ہے۔

کتاب کا نام تھا۔ SIDDARTHA AND THE CULTURE OF DRESS DESIGNING

میں نے کتاب کو اِدھر اُدھر سے پلٹ کر دیکھا۔ میری نگاہ کتاب کے انتساب پر پڑگئی۔

''سدھارتھ کی یاد میں''

اور اس کے نیچے ایک کویتا درج تھی۔

''سدھارتھ جب گھر سے نکلتے ہیں،تو گوتم بن کر لوٹتے ہیں۔'' (امر جیت کور)۔

اور وہاں۔ اس کتاب کے لکھنے والے کا نام تو میں بتانا بھول ہی گیا۔ یعنی نندنی شودا سانی لیکن سدھارتھ؟؟؟

☆☆

جمیلہ ہاشمی

اگنی دا

کرنل مرزا کا ہیلی کاپٹر گوپے کے سامنے پیلی اور تپش سے سیاہ پڑتی گھاس پر سے ابھی اڑا تھا۔ ٹھاکر تیج سنگھ کی تلاش میں صحرا کے اوپر لمبی اور نیچی پرواز کے لیے انہوں نے پروگرام کے مطابق اپنی دوربینیں اور بھری ہوئی بندوقیں، گولیوں کے راؤنڈ بھی ساتھ لیے تھے۔ ہم کئی دنوں سے اس ٹوبے کو اپنا ٹھکانا بنائے ہوئے تھے کیونکہ یہ ٹوبہ رنہال پوسٹ اور جے پور کی سرحد کے قریب تھا۔ دونوں حکومتوں کو ٹھاکر تیج سنگھ کی ضرورت تھی۔ اس کے سر پر ایک بہت بڑا انعام مقرر تھا جس کا اعلان کئی بار ہو چکا تھا مگر سردار صحرا کے ہونے کے غرور طبیعت کی بے باکی اور جرأت مندی نے اسے اپنی جان سے بھی بے پروا بنا دیا تھا۔ وہ کڑے پہرے اور تنگ گھیرے کے باوجود جو چاہتا کر گزرتا۔

گرم ہواؤں کے ابلتے ہوئے چکر کھاتے اور آگ اگلتے اس موسم میں جب سورج تمہارے سر پر چمک رہا ہو اور ریت کے لہریوں میں سے آگ کے شعلے لپکتے ہوں وہ اپنے تیز رفتار اونٹوں کے جھنڈ لے کر جس پوسٹ پر موقع ملتا حملہ کر دیتا۔ ہم تقریباً پچاس آدمی اس جنگ میں لگا چکے تھے اور کرنل مرزا دکے لیے یہ اب زندگی اور عزت کا سوال بن گیا تھا۔ مردہ یا زندہ تیج سنگھ۔

جھکڑوں اور خونی آندھیوں کے گھیرے میں تیز رولروں میں ہونکتا ہوا سناٹا ہمارے چاروں طرف ہے بدطینیت دشمن کی سی چالاکی سے وہ آدمی کو گرفتار کرتا اور فنا کرتا ہے۔ صحرا کی بے چین روحیں پل پل لمحہ لمحہ زندگی کی کھوج میں گھومتی ہیں۔ خانہ بدوشوں کی طرح ٹیلے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوا۔ غصہ ور دیوانی اپنا سر جھٹکتی شور مچاتی ہے، ریت کے ابلتے ہوئے فواروں میں سورج اپنا زور اور توانائی لگاتا ہے مگر شاید میں اپنی مہندی لگی پوروں سے رات کی اوڑھنی پر ٹھنڈے ستارے

ٹانکتی ہیں اسے سجاتی ہیں پھر خاموشی کی ڈھولک پر لمبی تانوں والے راگوں کی پھوار ریت کے ذروں کو رچھاتی ہے۔ کال کڑچھی بولتی ہے۔

سارے ٹولیے سیاہ کیچڑ بن جاتے ہیں جو اندر کی تپش سے پھٹ جاتی ہے اور کالے چڑ مڑاتے ہوئے پرتوں کی طرح کھڑ کھڑاتی ہے تو ریت اس ساز پر اپنے وحشی گیت اور موت کے ترانے گاتی ہے۔ مگر یہ ٹوبہ جس کا پانی پاتال سے ملا ہے کبھی نہیں سوکھتا کیونکہ اس اونچے ٹیلے کی خطرناک ڈھلوان سے نیچے کی طرف چنڈ اور کریل رائی اور پھوگ کے پودے بڑے چھتنار جال کے درخت میں الجھے ہوئے اس پر گرے پڑتے ہیں اور پانی پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ جیسے پیاس بجھانے کو مہکے ہوں ٹھنڈا اور میٹھا پانی آسمان کی نگاہوں سے چھپا سخت موسم میں بھی اس میں ہلکورے لیتا ہے۔ صحرا میں گم ہوئی گائیں، راہ بھولے ہوئے اونٹ، بھٹکے ہوئے ہرن سب اس پانی پر کبھی نہ کبھی جمع ہوتے ہیں۔ دوست اور دشمن اس چشمے پر اکٹھا ہوتے ہیں۔ خدا کی اس فیاضی پر خوش ہوتے ہیں۔

اور اس اونچے ٹیلے پر بنے گوپے پُرپیچ راہوں سے ایک دوسرے سے ملے ہیں یوں لگتا ہے ایک شہر آباد تھا۔ اناج اور اسلحہ اور کپڑے اور تصویریں بنانے کا سامان پنسلیں اور برش کاغذ اور کینوس، سنگار کا پٹارہ گھنگھرو اور ستار، ڈھولک شہنائی اور انگریزی کتابیں بے شمار لوٹ کے ڈھیر، نایاب چیزیں پھیلی ہوئی زندگی کا سمٹا سا نقشہ۔

شام قریب تھی۔ دھوپ کے زور میں ذرا کمی تھی۔ جب ہیلی کاپٹر بلند ہوا ہے تو ڈھلی ہوئی فضا میں تیر کی طرح سنسناتا ہوا دور تک دکھائی دیتا رہا پھر افق نے اُسے اچک لیا اور نظر کی حد سے پرے اس کی بھر بھر بھی بند ہوگئی۔ میں نے باہر گوپے میں آ کر ادھر ادھر بھی دیکھا بندوق کو چٹائی پر رکھ دیا۔ اپنے اکڑے ہوئے اعضا کو سیدھا کرنے کی خاطر سر سے اوپر ہاتھ اٹھا کرے انگلیوں کو چٹخا۔ دائیں بائیں گھوما۔ ہوا کے آنے والے سوراخوں سے آنکھ لگا کر دیکھا سپاہی بندوقیں لیے مستعد کھڑے تھے۔ میں نے ٹھنڈی ریت پر اوندھے لیٹ کر اپنے جلتا ہوا چہرہ چٹائی پر رگڑا۔ آنکھیں

خود بخود بند ہونے لگیں اور پھر جانے کب مجھے نیند نے آلیا۔

جناب! یہ عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ سپاہی کی آواز توپ کے گولے کی طرح میرے کان میں داغی گئی۔ گھبرا کر میں نے بندوق پر ہاتھ مارا۔ اکڑی ہوئی ٹانگوں نے ہلنے سے جواب دے دیا۔ سوئی ہوئی انگلیاں بے جان سی بندوق کے گرد مردہ گھاس کی طرح بکھر گئیں۔

تنگ راہ سے پرے مجھے ایک گھاگرے کی گوٹ دکھائی دی اور گھیر پر اٹکے ہوئے ملگجے کرتے کے دامن پر لٹکے ہوئے ہاتھ تڑے مڑے کاغذ کی طرح زاویوں اور مثلثوں اور ٹکڑوں اور شکلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ لمبی انگلیاں پتلی تھیں جیسے کسی زمانے میں یہ ہاتھ ساز بجاتے رہے ہوں۔ ان انگلیوں نے برش اور قلم سے تصویریں بنائیں ہوں۔ پتھر کو تراش کر اس میں سے مورتیاں نکالی ہوں۔ یہ ہاتھ کمزور نہ تھے مگر مضبوط اور جب جوان ہوں گے تو جانے کیا ہوں گے۔ اب بھی ان سے گھبراہٹ نہیں جھلکتی تھی۔ چہرہ مجھے اس وقت تک دکھائی نہیں دے سکتا تھا جب تک میں باہر نہ جاؤں یا آنے والی کو اندر نہ بلاؤں بندوق کو اپنے سامنے تانے جب میں جھک کر باہر آیا تو میرے سامنے ایک دھندلے بھولے ہوئے خواب کی سی صورت تھی۔ پرچھائیں، مورتی جو پتھروں تلے دبی دبی ریزہ ریزہ ہو چکی ہو مگر بکھری نہ ہو سفید بالوں میں کہیں کہیں سیاہی تھی اور گوندے جمائے ہوئے چمکیلے بالوں میں مانگ گم ہوئی پگڈنڈی کی طرح تھی سفید بھویں، پپوٹوں پر چھائی ہوئی تھیں اور پپوٹے بے پلکوں کی آنکھوں پر گرے گرے تھے۔ نگاہ الٹ سے جھانکتی کرن تھی اور دھیرے دھیرے دیکھے جانیوالی شکل کو اجالتی تھی۔ گردن سیدھے کندھوں پر ٹکی ہوئی ذرا آگے کو جھکی ہوئی تھی جیسے کوئی وجود صدیوں پرانے پردوں کو ہٹا کر آج کی دنیا کو دیکھ رہا ہو۔

میں ''اگنی داہوں'' تیج کی دائی ماں، ٹھاکر تیج سنگھ کی دائی ماں۔''

میں اُسے دیکھتا ہی رہا۔

''کیا تم نے اسے کھوج لیا۔ کیا وہ تمہارے پاس ہے؟'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ لفظ گڈ مڈ ہو رہے تھے۔

''اج سرسے آئی ہوں۔کیا تم بیٹھنے کا نہ کہو گے؟''

مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔

''تم اپنی بندوق کو پرے کرلو۔ یہ نہیں کہ مجھے اس کھلونے سے ڈر آتا ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں پھر وہ اپنا بھاری گھاگرا سمیٹ کر اس کے گھیروں پر بیٹھ گئی۔ جوتیاں اتار کر اپنے سامنے رکھ لیں اور پاؤں کو دبانے لگی۔

''تمہیں اپنے سے کسی بڑے افسر کا انتظار ہوگا کہ تم خود مجھ سے بات کرسکو گے۔؟''

مجھے چپ دیکھ کر اس نے کہا ''میرا بچہ سیدھا اور بھولا ہے، ہٹیلا بالک۔ ہوائیں اُسے چک پھیریاں دیتی ہیں۔ اپنے ساتھ اڑائے اڑائے پھرتی ہیں۔''

''ہوائیں بھی کسی کو قید کرسکتی ہیں۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں سچ کہتی ہوں یہ ہوائیں اپنی لہروں اور آوازوں سے ایسا جادو جگاتی ہیں، ایسی ہانک لگاتی ہیں یہ کبھی نہ ختم ہوتے صحرا پر دن رات ناچتی ہیں تم نے کبھی ریت پر ناچ کے چکر نہیں دیکھے نا ورنہ تمہیں پتہ ہوتا کہ ان پر اگر کوئی ایک بار پاؤں دھر دے تو پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ پھر کسی کی نہیں سنتا۔ اپنی دائی ماں کی بھی نہیں۔''

''عجیب بات ہے۔'' میں نے جواب دینے کے لئے کہا۔

''تمہیں پتہ ہے نا دکن سے ہوا کھلے تو بارش ہوتی ہے گھنیرے کالے بادل امنڈ گھمنڈ کر آتے ہیں۔ بجلی کے لہریے زمین کو چمکا دیتے ہیں ایسے ہی چکروں کی بھی کہانی ہے۔ مگر تم شہروں کے رہنے والے یہ سب کیا جان سکتے ہیں۔

''اچھا!'' اب میں دلچسپی اور توجہ سے بات سن رہا تھا۔

ہوا آدمی کو اپنے اندر لپیٹ لیتی ہے اپنی بلاؤں کو اس پر بٹھا دیتی ہے اس کے سر میں گھومنے پھرنے اور آزادی کے خیال بھر دیتی ہے۔ وہ جوانوں کے دل کو آبادیوں سے پھیر دیتی ہے وہ دیوانے ہو کر بستیوں سے نکل آتے ہیں۔ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھی رہی۔

کرنل خشک لمبی لیٹی ہوئی سوکھتی چرمراتی گھاس پر سے چلتا ہوا روشنی ملی نیلاہٹ کے گلابی پڑتے اجالے سے ہمارے طرف آیا۔ گوپے کی طرف چبوترے پر قدم دھر کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

''یہ تیج سنگھ آف اجے سر کی دائی ماں ہے اگنی دا۔'' میں نے فراغت کا سانس لیا اور بندوق کو اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں بدلا۔

کرنل نے گہری سوچتی ہوئی نگاہ سے اگنی دا کی طرف دیکھا جو اپنی ادھ مندی آنکھیں کھول کر بے خوفی سے کرنل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کرنل کے ماتھے پر ایک رگ زور سے پھڑک رہی تھی شاید اسے غصہ آ رہا تھا۔

''کیا کہنے کی ضرورت ہے کہ تیج سنگھ کے لیے وہ اگر کسی بڑی ریاست کا راجہ ہو تو بھی سزا سے نہیں بچ سکتا۔'' وہ پورا اپنی ایڑی پر گھوم گیا اور ٹیلے کی بلندی سے اس نے نیچے پاتال سے سے ملے ٹوبے پر نگاہ دوڑائی جہاں جال میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں اور شام کی ہوا سے پانی گیت کی لے پر مست مانجھی کی طرح تال کے بیچ ٹھہرا ہوا تھا۔

''میرا سوال سن لو جواب دینا نہ دینا تمہارے اختیار میں ہے۔ اگنی دا کی آواز میٹھی تان کی طرح کرنل کے پیچھے سے اٹھی۔

''مگر یہ سب ناممکن ہے۔ تم یہ چاہو گی کہ میں اس کا پیچھا نہ کروں۔'' کرنل نے جھنجھلا کر اپنا پاؤں زمین پر مارا۔ میں مہینے سے اس جلانے والی گرمی اور پیڑوں کو کملا دینے والے صحرا میں ڈیرے ڈال کر یونہی نہیں پڑا ہوں۔

اگنی دا نے ڈھلک جانے والے دوپٹے کو سر پر برابر کیا۔ ''بھکشانا تے بات کرنے کا ادھیکار تو دو۔ تم بہت غصے میں ہو۔ تمہیں ہونا ہی چاہئے۔ تم بہت دنوں سے اس صحرا میں گھوم رہے ہو۔ یہ بھی مجھے معلوم ہے تم تیج سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی کھوج میں ہو۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ ہیں۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر آگے کو جھک گئی۔ ''میں نے تین نسلوں سے اس کی چاکری کی ہے۔ تین نسلوں کی رگوں میں میرا دودھ ہے۔ کیا مجھے کچھ کہنے نہ دو گے؟''

''مگر تمہاری بات ایسی ہوگی جو میں کبھی نہیں مان سکتا۔ پھر ایسی باتیں سننے سے کیا ملے گا۔'' کرنل نے بہت آہستگی سے کہا جیسے اگنی دا سے زیادہ اپنے آپ سے بحث کرکے اپنے آپ کو منوا رہا ہو۔

''دیکھو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں کہوں گی جس سے تمہاری راہ میں مشکلیں پیدا ہوں۔ سوچ کر جواب دو مجھے واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ اجے سر میں اب میرا کون بیٹھا ہے۔''

''کیوں اجے سر میں تمہارا خاندان ہوگا۔ بہوئیں، بیٹیاں، بیٹے، پوتے، گھر۔'' کرنل نے کہا۔

میرا سب کچھ اس صحرا میں ہے۔ صرف تیج میرا ہے۔ میرا ٹھاکر۔''

کرنل نے کہا۔ ''گوپے میں چٹائیں سیدھی کردو دیے جلاؤ ہم اگنی دا کی بات سن ہی لیں'' اور میری طرف دیکھ کر کہا ''ٹوبے کے چاروں طرف پہرہ دونا کردو۔ میں سارے ٹوبوں اور پانی کے ٹھکانوں پر دیکھ آیا ہوں ایک بوند کہیں نہیں سوائے اس ٹوبے کے رکن پور کے پانی کے ذخیروں کا بھی یہی حال ہے۔''

میں نے سر جھکا دیا۔ ریت ٹھنڈی ہو رہی تھی سیاہ آسمان دوج کے چاند کی روشنی میں خالی خالی سا تھا ڈھلوان پر درختوں میں ہوا سرسرا رہی تھی اور کسم سر سے ابھرتی تو بال بکھرائے کنجنی کی طرح ہمارے چاروں طرف چک پھیریاں لیتی۔ مدھم زردی میں ستارے ایک دم نہیں جیسے اندھیری راتوں میں ہوتا ہے۔ ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں ہمارے سروں پر جمع ہو ہے تھے۔

''نا تو اں اگنی دا کسم سر تک کا لمبا راستہ تم نے کیوں کر طے کیا گرمی اتنی بے پناہ تھی اور تم تو ہوا کے ایک جھونکے سے اڑ جاؤ۔''

دیے کی لو سیدھی اس کی زمانوں سے بھی پرانی آنکھوں میں پڑ رہی تھی اور وہاں ہیرے کی چمک اور پھر الگ الگ ٹکڑے میں الگ جیسے ہیروں کے ریزوں سے بنی مورتی پھر دیوں کی لو

کانپے اور دکھائی دے۔ اگنی دا نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

''کسم سر میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پھر سانس لینے کے لیے رک کر اس نے کہا۔'' پہلے یہ سارے ٹوبے آباد تھے جیتے جاگتے لوگ یہاں رہتے تھے۔ اجے سر سے اکثر کسم سر آیا کرتی تھی۔ میرے ٹھاکر کے دادا کے وقتوں میں یہ آبادیاں تھیں۔ راج محلوں کی سی رونقیں تھیں۔ پھر اور لوگ، خراب موسم، وقت سب نے مل کر اجے سر کر دیک گڑھی بنا دیا'

سیٹی کی آواز کرنل کے منہ سے نکل گئی۔

''تمہیں وشواس نہیں ہے نا۔ میں بھگوان کی سوگندھ اٹھا کر کہتی ہوں۔ یہ سب سچ ہے۔''

''ان ویرانوں کو دیکھ کر کبھی یہ گمان نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''اس دھرتی پر تماشے ہوتے ہیں اور آکاش یہ تماشے دیکھتا ہے، دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے راجے ڈاکو بن جاتے ہیں، عزت دار بڑے لوگ بس مٹی میں مل جاتے ہیں۔'' اگنی دا کی مدھم مگر مضبوط اور صاف باتیں سب کو سنائی دے رہی تھیں۔

''یہ تو ہے، یہ تو ہے۔'' کرنل نے اپنے گھٹنے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔ جب تم یہ سمجھ گئے ہو تو آگے کی بات بھی تمہیں سمجھ میں آجائے گی۔''

''اگنی دا میں تمہاری بات سمجھتا ہوں اور پھر بھی مجھے پتہ ہے تیج سنگھ کو دنیا کی کوئی حکومت معاف نہیں کرے گی۔'' کرنل کی آواز الجھی ہوئی، جھگڑالو، تیز اور قطعی تھی۔

''میں نے کہا ہے تم ٹھاکر کو چھوڑ دو؟'' اس نے ہم سب کے منہ کی طرف دیکھا۔

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اصل میں سارا قصور میرا ہے۔ اس ساری کہانی کی مصیبت میرے لائے لائی ہوئی ہے۔ بڑے ٹھاکر کو میں نے بچوں کی طرح پالا تھا۔ امر سنگھ کو تیج سنگھ کے باپ کو میں نے اپنا دودھ پلایا ہے اور اس سینے میں آگ جلتی ہے الاؤ لپکتے ہیں۔ جب میں وہ سب یاد کرتی ہوں جو ہوا۔'' وہ سر جھکا کر چٹائی پر

ہاتھ پھیرنے لگی۔

''امر سنگھ سیدھا تھا۔ بھولا اور وشواس کرنے والا اور اس لیے جب اس کے گھر میں وشواس گھات ہوئی تو اسے پتہ ہی نہ چلا۔ کوئی سوچ سکتا ہے کہ وہ بہو جس کو سہاگ رات سے میں نے اپنے ہاتھوں کا سایہ کیا جس کے قدموں میں آنکھیں بچھائیں جسے اپنے کوکھ سے جنم پانے والی بیٹیوں سے زیادہ پیار کیا۔ وہ مجھے ہار دے گی میرے دل کو اپنے پیروں میں مسل کر آگے نکلے گی وہ اس کی پروا نہیں کرے گی جو اس کا سہاگ تھا پہلے پہل میں نے سوچا ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ میری آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہوں۔ میرے کان کم اور غلط سنتے ہوں۔ یہ صرف دیور اور بھابھی کی چھیڑ چھاڑ ہو۔ ذرا سی دل لگی تھوڑا سا دلار یونہی مان اور کھیل۔ پتہ نہیں امر سنگھ کو کیوں شبہ نہیں ہوا۔ میں اسے بتا سکتی تھی، ہوشیار کر سکتی تھی مگر اس گھرانے میں خون کی ہولی دیکھنی نہیں چاہی۔ جب سے بیت جاتا ہے تو بس بیت ہی جاتا ہے اور میرا دل یوں ہی اندر باہر ہوتا رہتا تھا۔ خوف کے مارے یوں ہی دھڑکتا تھا۔ جب سب ختم ہو گیا۔ بہو کے سولہ سنگھار اور پور پور سوگندھ اس کے پاؤں کی پائل، اس کے ماتھے کی بندیا۔ اس کی مانگ کا سیندور، اس کی آنکھوں کا کاجل اس کی ستی ساوتری ہونے کی چالیں اس کی ہنسی کی موہنی اس کے ہونٹوں کے میٹھے بول سب مل کر وہ زہر بنے جو تھا کر امر سنگھ کی جان لے گئے۔

رام سنگھ اور بہو نے مل کر ایک جال پھیلایا تھا جس مس امر سنگھ پھنسا اور اس سے پہلے کہ وہ پھڑکتا وہ نہ رہا۔ آج اس گھڑی سوچتی ہوں جب اس نے ان دونوں کو اپنے پاس دیکھا ہوگا ان کی ظالم آنکھوں میں اپنے انت کا لکھا پڑھا ہوگا۔ اس ایک لمحے اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس کا دل تو خود ہی پھٹ گیا ہوگا۔

سیڑھیوں سے اترتے ہوے میں نے رام سنگھ سے کہا تھا چھوٹے بھیا یہ تم نے کیا کر دیا ہے۔ اپنی فتح کی خوشی میں اپنے مکمل اور طاقت ور ہونے کی اس گھڑی میں اس نے مجھے دھکیل کر پرے کر دیا زور سے ہنسا اور کہا۔

تو تم اگنی جانتی ہو نا کہ سب کیا ہوا ہے۔ اپنی زبان بند رکھو۔ جو دیکھا ہے بھول جاؤ۔ اجے سر کا ٹھاکر میں ہوں، میں ہوں اور اس نے زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا تھا۔ اور پھر وہ لوٹ گیا تھا۔

اجے سر رام سنگھ کا تھا۔ اجے سر کی راج گدی سوگ کے بعد اسے مل گئی۔ سال بیتنے پر بہو بھی اس کی ہو گئی۔ اپنے بھائی کے خون میں ڈوبا۔ ہنستا اور خوش اجے سر کا ٹھاکر بن گیا۔"

"ہوسکتا ہے یہ تمہارا وہم ہو۔ رام سنگھ کو زہر نہ دیا گیا ہو۔ تمہاری سوچ ہو۔" کرنل نے کہا۔

"پہلے پہل میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ میں جلن کے مارے دیوانی ہوں ایسی کوئی بات نہیں مگر وہ رات وہ گھڑی بھلائے نہیں بھول سکتی۔ رام سنگھ کا سہاگ، گھر کی سیڑھیوں سے اترنا، مجھ سے ملنا۔ اس کی خوشی۔ یہ سب بُرا خواب سمجھنے پر بھی سمجھے نہیں جاسکتے۔ بھلائے نہیں جاسکتے۔"

"مجھے پینے کو پانی کا ایک گھونٹ دو بھگوان کے لیے۔ میرا گلہ سوکھ رہا ہے۔" اگنی دا نے ہاتھ پھیلایا میں نے اٹھ کر صراحی سے مٹی کا صحرا اس میں بھر کر اسے تھما دیا۔" ہاں یہ کسم سر کا پانی ہے۔ امرت جہاں پاتال کے سارے سوتے اکٹھے ہوئے ہیں۔"

"سارے ٹوبوں میں کڑوا اور بدبودار پانی ہوتا ہے صرف کسم سر کا پانی پینے کے قابل ہے کبھی سیاہ نہیں پڑتا۔ کبھی سورج کی گرمی سے سوکھتا نہیں اور کبھی کسی پر بند نہیں کیا گیا۔ صرف اب ہم اس پانی کو گھات بنا کر تیج سنگھ کے منتظر تھے۔"

"اجے سر کی گڑھی کا مالک تو میرا ٹھاکر ہے۔ میں نے اُسے بہو کے سائے سے بھی جدا رکھا اب سوچتی ہوں ہوسکتا ہے اگر یہ ماں کی گود میں رہتا تو حالات دوسرے ہوتے۔ مگر نہیں یہ کیسے ہوسکتا تھا رام سنگھ تو اس کی جان کا لاگو تھا۔ اگر اس کے رونے کی آواز اسے کولکیوں اور آنگنوں کے پاس سے کبھی سنائی دے جاتی تو بہو پر بگڑتا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا وہ بھلا اسے کہاں برداشت کر سکتا تھا۔

میں اسے چھپا کر رکھتی۔ جب یہ کھلکھلا کر ہنستا تو مجھے ڈر لگا رہتا۔ یہ میرے دل کے وہم تھے میری بھول تھی میں سمجھتی تھی رام سنگھ اب تیج کو بھول گیا ہے۔ مہتاب اور شہتاب پیدا ہوئے تو اس

نے مجھے بلایا تھا۔ پالنے پر جھکے ہوئے اور دونوں ایک سی صورتوں کو پیار کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''اگنی دا۔ دیکھو یہ میری وجے ہے۔''

''ٹھاکر بھگوان سدا سکھی رکھیں'' میں نے دور کھڑے ہو کر کہا تھا۔

''قریب آؤ اور دیکھو یہ تیج سے زیادہ خوبصورت نہیں ہیں کیا؟''

دل اچھل کر میرے حلق کے قریب خون خون ہونے لگا۔ میں نے ہاتھ منہ پر بھینچ لیا اور جھک کر ان دونوں کو دیکھا اور پھر سیدھے ہو کے کہا ''یہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ اور میرا ٹھاکر بڑا ہے۔ بڑا اور بہت سندر۔''

''اگنی! رام سنگھ نے مڑ کر کہا ''تمہاری یہ جرأت۔ تم ہمارے ہی منہ پر ہمارے بچوں کو برا کہہ رہی ہو۔''

''چھوٹے بھیا میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ یہ ابھی چھوٹے ہیں ابھی کیا پتہ چل سکتا ہے۔''

''ہم چھوٹے بھیا نہیں ٹھاکر رام سنگھ ہیں۔ اس گڑھی کے مالک اور یہ شیر کے بچے ہیں۔ ان کا پتہ تمہیں پالنے میں بھی چل سکتا ہے۔'' اس نے گرج کر کہا۔

بہو لیٹے سے اٹھ گئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ باندیاں منھ ڈھانپ کونوں میں چھپ گئیں۔ صرف میں کھڑی تھی اور میں نے کہا تھا۔

''جب تیج بڑا ہوگا تو وہ ٹھاکر ہوگا۔ چھوٹے بھیا یہ اس کے باپ ٹھاکر امر سنگھ کی گڑھی ہے'' میرے سارے شریر میں سے جان نکل گئی تھی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ہاتھ پسینے سے ٹھنڈے ہو گئے تھے مگر میں نے بڑے ٹھاکر کو گودوں کھلایا تھا۔ رام سنگھ اور امر سنگھ دونوں کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ مجھے اپنے حق اور اپنی شکتی پر بڑا مان تھا۔

''اس تھپڑ کے نشانوں میں آج بھی آگ سلگ اٹھتی ہے۔ جب میں یہ سب یاد کر رہی ہوں۔ چھوٹے بھیا کے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں جل اٹھتی ہیں۔'' اگنی دا نے اپنا تڑا مڑا زمانوں پرانے

کاغذوں کا سا گال سہلایا۔

''اگنی دا۔ اگنی دا۔'' وہ چیخنے لگا ''یہاں سے چلی جاؤ۔ اگنی دا'' مگر میرا سارا جسم یوں ڈھے گیا تھا جیسے بارش میں کچی دیوار بیٹھ جائے۔

اس کے بعد ہر دن ایک نئی مصیبت لے کر آتا۔ رام سنگھ تیج کو بلاتا دانت پیستا اسے ڈانٹتا پھٹکارتا کبھی حکم دیا جاتا کہ تیج کو گڑھی سے باہر نکلنے نہ دیا جائے اس پر نت نئے عذابوں اور نت نئی پابندیوں کی آزمائش ہوتی۔

ہوسکتا ہے کہ اگر میں اپنی زبان بند رکھتی تو ہم پر یہ عذاب نہ ٹوٹا کرتا ان سارے زمانوں، لمبے سالوں میں یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ اصل دشمن میں تھی۔ جب دوسرے آپ کا حق چھینتے ہیں تو وہ ساری راہیں بند کردیتے ہیں۔ ان کے اپنے دل تک جانے والے راستوں پر بھی پہرے ہوتے ہیں وہ نرمی، محبت، رشتہ، حق، ہر شے کو بھول جاتے ہیں۔ ان کے لیے یہ کہانیوں کی باتیں ہوتی ہیں جو کسی اور دیس میں، کسی اور جنم میں زندہ ہوتی ہیں۔

میں جب تیج کو مہابھارت کی کتھائیں سناتی تو وہ ہنس دیتا۔ ''اگنی دا، جو آدمی چھٹپنے میں کچھ نہ کر سکے، جوانی میں بھی کچھ نہیں کر پاتا۔ اگنی دا میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔ تم ایسے ہی اپنی جان کھپاتی ہو۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ یہی تمہارے سپنوں کا سوُریر بن کر گڑھی کا مالک بن جائے گا۔ میں کونڑ ہوں۔ پانڈوؤں کی ماں کا بیٹا۔''

جب میں منہ لپیٹ کر لیٹ جاتی اور اس سے نہ بولتی تو وہ کہتا۔ ''اگنی دا اگر تم کہتی ہو تو میں بہت بڑا اونچا سورویر بن جاؤں گا۔ میرا سر چھت سے بھی اونچا ہوگا۔ بازو پھیلا کر یہ ساری جگہ گھیر لوں گا۔''

''اگر تم کرسکو تو مجھے پھانسی پر لٹکا دو۔'' میں نے اسے جھوٹے سپنوں میں الجھائے رکھا۔ میں چوری چوری اسے گھوڑوں پر سواری کیلیے بھیجتی۔ اسے تیر چلانا اور وہ سارے کرتب جو گڑھی کے ٹھاکر کو آنا چاہئیں سکھاتی رہی۔ میں نے اسے اندر سے نہیں باہر سے ٹھاکر بنا دیا۔ ایک نراشا اور

گھٹن اور بنا محبت کے پلا ہوا بچہ۔سہما ہوا ڈرا ہوا۔ ڈرایا دھمکایا بچہ وہ آزادی اور دل کہاں سے لاتا جو ٹھا کر بننے کے لیے ضروری ہے۔'' وہ چپ ہوگئی جیسے کھوگئی ہو۔ایک دو پہر جب رام سنگھ کے باز گڑھی کا چکر لگا رہے تھے اڑ رہے تھے تو تیج نے ان میں سے ایک کو اپنے تیر سے زخمی کر دیا۔ میں نہ نہ کرتی رہی اور اس نے مجھے خوش کرنے کے لیے اپنے تیر کا صحیح نشانہ آزمانے کے لیے اس اڑتے باز کو نشانہ بنایا۔

دیواریں بھی کانپ رہی تھیں اور خوف سے سہمے ہوئے نوکران میں گھسے جاتے تھے جب رام سنگھ نے میرے آنگن کا دروازہ توڑ ڈالا۔ اس نے تیج کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ چیختا رہا اور وہ اسے ٹھوکریں لگاتا رہا۔ اسی گھڑیوں میں بھگوان سو جاتا ہے کیا؟''

بہت دیر تک اگنی داخاموش رہی۔ تھکی ہوئی چڑیا کی طرح زور زور سے سانس کھینچتی ہوئی یادوں کے دیوں میں خون جلاتی رہی۔

جب بہوا سے دیکھنے آئی تو جانے رات کا کون سا پہر ہوگا۔ تیج رہ رہ کر چیختا تھا اور ڈر کر سسکنے لگتا تھا۔ ذرا سا بچہ ستار کے تنے ہوئے تار کی طرح ہوا سے بھی بج اٹھتا ہو۔ کوفت اور شرمندگی اور بے عزتی کے احساس سے روندے جانے ٹھکرائے جانے کی اذیت سے سوجے ہوئے چوٹ کھائے ہوئے جگہ جگہ سے ابھرے ہوئے زخموں کی وجہ سے سو نہ سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ صرف خشک سسکیاں تھیں جن کو روکے ہوئے بیٹھی میں سنکائی کر رہی تھی۔ روشنی کی چبھن سے بچنے کیلیے اپنی آنکھوں پر پردہ ڈالنے کے لیے میں نے دیا بجھا دیا تھا۔ عجیب سنسناتی ہوئی بے تاب رات تھی۔ ناگن کی طرح پلٹ پلٹ کر جس کی تنہائی پلٹ پلٹ کر مجھے ڈستی تھی۔ تیج کا کوئی بھی نہ تھا۔ میرا کوئی نہ تھا۔ ہم بھگوان کی اتنی بڑی دنیا میں اکیلے تھے۔ اکیلے اور بھلائے ہوئے۔ میں امر سنگھ کو اور بڑے ٹھاکر کو اور سارے گزرے ہوؤں کو یاد کر رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کوئی نہیں ہے کچھ نہیں ہے۔ میں اور تیج پاتال میں گھر گئے ہیں۔ بھگوان میں یہاں سے کیسے نکلوں۔ کسے پکار کے آواز دوں۔ بہو نے دیا تپائی کے نیچے رکھ دیا۔ میں کھڑی ہوگئی۔

''اگنی داتیج کا کیا حال ہے۔''

''اچھا ہے رانی ماں۔ٹھیک ہے'' میں نے سر جھکا کر کہا۔

''اگنی، میں تمہاری بہو ہوں۔تیج کی ماں ہوں۔رانی ماں نہیں ہوں۔'' بہو میرے پاؤں کے قریب بیٹھ گئی ''جو آ گیا رانی ماں'' میں نے اپنے پاؤں گھاگھرے کی گوٹ کے اندر کر لیے۔''تیج کی ذرا دیر ہوئی آنکھ لگی ہے اگر برا نہ مانیں تو آنگن میں چلیں وہ روشنی دیکھ کر جاگ جائے گا۔'' ہم دونوں باہر آ گئیں۔

اگنی، اس میں میرا کوئی دوش نہیں تم نے تیج کو روکا ہوتا۔ٹھاکر کے باز پر تیر کیوں چلایا۔''

''دیکھو بہو میں تمہیں دوش نہیں دیتی مگر تم شتاب اور مہتاب کی ماں ہو اس بن ماتا پتا کے بچہ پر کچھ تو دیا کرو'' اسے جینے کا حق تو دو تمہاری کرپا ہوگی۔اگر تم اپنے پتی سے کہہ کر اسے کسی سکول میں بھجوا دو ہیں جہاں پر امر سنگھ کو بھجوایا گیا تھا۔''

''میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نہیں چھڑایا۔ٹپ ٹپ آنسو میری انگلیوں کے بیچ سے گرتے رہے۔دونوں ہاتھوں کو بھگوتے رہے میں بنا ہلے کھڑی رہی۔ایسی ہی رات تھی کالی اور دکھ بھری گونجوں سے کراہتی ہوئی۔''اگنی دا، تم کچھ بھول نہیں سکتیں مجھے تیج سے ملنے دو، اس کے زخموں پر مرہم لگانے دو۔یہ دیکھوں میں یہ لائی ہوں۔''اس نے ایک ڈبیہ میرے ہاتھ میں دے دی۔

''جانے اس میں کیا ملا ہو۔تمہارے پتی دیو کو پتہ چل گیا تیج کو جیتا نہ رہنے دے گا اس لیے تم یہ واپس لے جاؤ اور خود بھی جاؤ۔'' میں نے اسے اپنے آنگن سے تقریباً دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

''تیج اچھا ہوا تو مجھے اُسے گڑھی سے باہر بھجوانے کی جلدی لگ گئی۔میں نے آپ ہی آپ پرانے دنوں کی یادوں کے سمے۔اس کے کپڑے اور دوسرا سامان ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔سامان جو کبھی میں نے ٹھاکر امر سنگھ کے لیے تیار کیا تھا۔ایسا ہی سامان جو میں نے بڑے ٹھاکر کے لیے بنایا تھا۔اپنے زمانوں میں میرا دل ہلکا ہوتا مگر اب بھاری اور ڈوبتا ہوا تھا۔

اگلی صبح اسے روانہ ہونا تھا۔ سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں میں تیج کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی، جانے اب کب ملنا ہو اور ہو بھی سکے کہ نہیں ۔ جینا اور مرنا تو بھگوان کے بس میں ہے پر میں پل پل مر رہی تھی۔ آج تک مر رہی ہوں ۔ چاروں دشاؤں میں طوفان اور ہوائیں اور بلوان دشمن ہیں ۔ میرا اکیلا بچہ تیرے حوالے ہے۔ بھگوان میرا یہ آنگن سونا نہ ہونے دینا۔ یہ دیا جلتا رہے۔ امر سنگھ کا یہ نام مٹ نہ جائے۔ بھگوان تو نے موت بنائی ہے اور زندگی بھی۔ تو نے آشائیں دی ہیں اور ان کو پورا کرنے کا بھی زور تیرے پاس ہے۔'' پھر میں نے اور تیج نے مل کر مورتی کو پرنام کیا۔ میں نے آسن سے اٹھا کر سیندور کا ٹیکا اسے لگایا جیسا گڑھی کے ٹھاکر اپنی پیچدار پگڑی پہنتے سمے لگاتے ہیں۔ امر سنگھ کی پگڑی اس کے سر پر رکھی تو اس نے کہا۔

''اگنی دا میں کسی شے پر وشواس نہیں رکھتا۔ نہ بدلہ لینے میں نہ گڑھی کا سردار بننے میں اتنی لمبی چوڑی دینا ہے اس میں مجھے بھیج رہی ہو تو وعدوں میں قید نہ کرو۔ اب ہم یہاں سے باہر کہیں ملیں گے تمہیں پتہ ہے میں اب واپس نہیں آؤں گا۔ میں کس لیے واپس آؤں۔ اگنی دا، دیکھو رو کر نہیں اب ہنس کر مجھے وداع کرو۔ اجے سر کی گڑھی تو ساری دنیا نہیں ہے؟ جانے کیا کیا تمہاری اور میری آنکھوں نے نہیں دیکھا جو ہے۔'' میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ یہ ذرا سا بچہ جو میرے سینے کے ساتھ لگ کر سوتا تھا اور جب بھوک لگتی تھی تو منہ بسور کر کھانا مانگتا تھا۔ یہ ایک دم اتنا بڑا اتنا سمجھ دار کیسے ہو گیا۔ یہ بڑی بڑی باتیں جو مجھے بھی سمجھ میں نہیں آتیں اس نے کب کہاں سے سیکھی ہیں؟ میں نے تو اسے کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دے۔

''تمہیں پتہ ہے اگنی دا جب میں گھوڑوں کو بھگانے کے لئے باہر جاتا ہوں تو میں ہوا کے چکر میں اپنا پاؤں ضرور دھرتا ہوں۔ مہاراج کہتا ہے کہ اس چکر میں پاؤں دھرنے والا ہوا کے جادو کے زور سے باقی بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے خوب گھومتا ہے مسافر بنا رہتا ہے۔''

''بھگوان میں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔'' تو یہ مہاراج تھا جس نے میرے تیج کو ہوا کے چکر میں پاؤں دھرنے کا بتایا تھا۔؛؛

''یہ چکر کیا ہوتا ہے؟'' کرنل نے پوچھا۔

''صحرا میں رہنے والوں کے اپنے وہم ہیں۔'' میں نے اگنی دا کی جگہ جواب دیا ''ہر جگہ کے چھوٹے چھوٹے وہم ہوتے ہیں۔ شگون اور اشارے۔''

''تیج اسکول سے کبھی واپس نہیں آیا۔ چھٹیاں ہوتیں تو وہ اپنے کسی ستاد کے ساتھ پہاڑ پر بھجوادیا جاتا سردیاں ہوتیں تو وہیں پڑھائی کی کمی پوری کرنے کے خیال سے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں ٹکا رہتا۔ میں بولائی ہوئی دیوانوں کی طرح اپنے آنگن سے ادر دالانوں میں اور دالانوں سے باہر چھت پر اوپر نیچے پھرتی رہتی۔ آس لگائے لگائے راہ دیکھتے دیکھتے سولی پر لٹکے لٹکے مجھے نیند بھی نہ آتی لمبی دوپہروں کو جب سوچیں میرا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ ہے بھگوان اب کیا ہوگا؟ کبھی تو، کبھی تو سکھ اور تیج مجھے آن ملیں گے۔

جب اجے سر کی گڑھی کے باہر ایک سنسان رات میں تیج مجھے ملا ہے۔ تو اسے دیکھتی رہ گئی۔

''تم نے مجھ یہاں کیوں بلایا ہے۔ گھر چلو۔ میرے سونے آنگن میں بہار آئے۔ میں تمہاری راہ دیکھتی رہی ہوں۔''

''اگنی دا۔'' اس نے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کے مجھے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''اب میں بڑا ہوگیا ہوں اور تمہارے آنگن میں سمانہیں سکتا۔ تم نے ہی تو مجھے کہا تھا کہ تو سورویر ہو۔ تب تم مجھے کس آنگن میں لیے جاتی ہو۔''

وہ اتنا بڑا، ایک دم عقلمند ہوگیا تھا کہ مجھے کوئی جواب سجھائی نہ دیا۔ میں اس کے ساتھ لگ کر کھڑی رہی، کھڑی رہی، اس کے پسینے کی سگندھ اس کا بھرا ہوا جسم یہ سب میرے تھے۔ ہاں میں اب اس پر مان کر سکتی تھی۔ شتاب اور مہتاب کی ماں نہیں، بہو نہیں۔ میں تیج کی ماں تھی۔ وہ مجھے کمزور بچہ سمجھ کر میرے سفید بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ میرے ماتھے اور گالوں کو چوم رہا تھا مجھے گھڑی گھڑی اپنے سے لگا رہا تھا۔ تیج میرا بچہ تھا۔ میرا اپنا تھا۔

''تیج! میرے بچے آخر تم کہاں جا رہے ہو۔'' جب اس نے مجھے اپنے سے الگ کیا تو میں نے پوچھا۔

''یہ گمبھیر، بڑی اور گہری رات ہے اس میں کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اس میں کیا ہے۔ نہیں معلوم نہیں بس میں یہی کھوجنے نکلتا ہوں۔ انجانے کا جادو، ہوا کا جادو، زور سے ٹکر لینے کا جادو مجھ کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس نے مجھے پھر اپنے ساتھ لگالیا۔

مجھے بہلاؤ نہیں تیج۔ مجھے بتاؤ تم کہاں رہتے ہو۔ راتوں کو کہاں گھومتے ہو۔ کچھ مجھے جاننے کا ادھیکار ہے۔ ہے کہ نہیں۔'' میں نے پوچھا تھا۔

اس نے ہنس کر کہا تھا۔ ''سارے ادھیکار تمہارے ہیں مگر ان سوالوں کے جواب کسی اور وقت دوں گا۔ جب کبھی پھر ملیں گے۔ صرف یہ کہتا ہوں کہ جب میرے زخموں کے نشان ابھرتے اور دکھتے ہیں۔ جب ان میں پھر سے ٹیسیں اٹھتی ہیں تو میں ان لوگوں کے لیے دوا کھوجتا ہوں جو دکھی ہوں اور جن کی مدد کرنے والے کوئی نہیں۔ میرے لیے کسی گڑھی کی ضرورت نہیں۔ کسی نیلے ہیرے کی ضرورت نہیں۔''

''بے کار کی باتیں۔'' کرنل نے چٹائی پر اپنا پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''مجھے تیج نے یہی کہا تھا۔ تب سے اب تک اس گھڑی تک جانے کتنا سمے بیت گیا ہے۔ میری اور اس کی بھینٹ کہیں نہیں ہوتی۔''

''میں تمہارے تیج کو ڈھونڈتا تو پھر رہا ہوں۔ کرنل نے بات ختم کی ہی تھی کہ گولی چلنے کی آواز آئی ہم نے پھونک مار کر دیا بجھا دیا۔ بندوقیں اٹھائیں اور باہر کی طرف بھاگے۔ ستاروں کا غبار روشن اور زیادہ چمکنے والے تاروں کے درمیان آبشار کی طرح ہمارے سروں پر گر رہا تھا۔ جال میں سوئی ہوئی چڑیاں بے چین ہو کر جاگ اٹھی تھیں، کہیں جنڈ اور کریل کی خشک ٹہنیوں پر پانی کے کھارے ٹڈوں نے اپنی چر چر پھر شروع کر دی تھی۔

بھاگتے قدموں، اونٹوں کے بلبلانے اور گولیوں کی ہر طرف سے آوازیں گھوم پھر کر سناٹے کو

توڑ رہی تھیں۔ ہوا جس رخ چلتی آواز اُدھر ہی پلٹتی تھی۔

ہمارے پیچھے سے اگنی دا کی آواز گونجی۔ ''تیج ٹھاکر میں یہاں ہوں۔ تمہاری اگنی دا۔''

ہمارے ہاتھ بندوقوں پر جم گئے۔ سانس رُک گئی۔ جس طرف سے آواز ابھرے گی ہم اُدھر ہی نشانہ باندھیں گے۔

اور ہم ٹھیک ہی منتظر تھے۔ ٹوبے کے کنارے سے کسی نے زور سے کہا۔

''اگنی دا۔ سورگ میں۔'' اس سے پہلے کہ ہم شست باندھتے بات ختم ہوگئی۔

رنہال پوسٹ پر جس اگنی دا کو ہم نے دشمن کے سپاہیوں کے حوالے کیا اس کا وزن چڑیا سے بھی ہلکا تھا۔ بند آنکھوں کے گرد عجیب مسکان تھی۔ بے دانتوں کا چہرہ بھرا بھرا تھا اور گلابی جیسے بھور کا مکھ ہو۔ انجانے کے اور ہوا کے چکروں میں جانے کون قید تھا اور کون آزاد تھا۔ سورگ کہیں ہے بھی کہ نہیں۔

☆☆

انور خاں

سوکھے جھرنے

کرفیو ہٹتے ہی میں نے یوسف کو فون کیا

''ہیلو'' اس کی کرخت آواز میری سماعت سے ٹکرائی مجھے تو اطمینان ہوا۔

''کیسے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''زندہ ہوں'' وہ غرایا۔ ''یہی جاننا چاہتا تھانا''

''کل ششی ملا تھا۔''

''کون ششی؟''

''تیرا کالج کا یارِ غار'' میں نے کہا۔ ''شا کھا پرکھ''

''کیا کہہ رہا تھا؟'' یوسف نے پوچھا

''وہ کہہ رہا تھا، یوسف کو سمجھاؤ۔ حالات اچھے نہیں ہیں۔ رات میرے علاقے سے نہ گزرے۔''

''شا کھا پرکھ ہے تو کیا۔ سالا پورے علاقے کا ٹھیکیدار ہو گیا کیا؟''

''وہ تیرے بھلے کے لئے کہہ رہا تھا۔ ہر آدمی تو تجھے نہیں پہچانتا۔ کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو کیا؟

''تو تو یہی چاہتا ہے؟''

''پاگل پچھلے ایک ہفتے میں وہاں پانچ آدمی چاقو سے زخمی ہوئے ہیں۔ اور تو نے ششی سے کیا کہا تھا؟''

''کیا کہا تھا؟''

''تو نے یہ کیوں کہا کہ اپنے پیسے کی پیتا ہوں۔ تیری طرح فقیر نہیں اور اس کے ساتھیوں کے سامنے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔''

میں تو سیدھے راستے پر جا رہا تھا۔ وہی زور سے اُسے ''بیوڑے'' کہہ کر چلایا تھا۔ پھر میں اور کیا کہتا۔ میں کیا کہتا۔ میں کیا بار میں جا کر اس کی طرح پھوکٹ میں پیتا ہوں؟''

''وہ تو دوستی میں مذاق کر رہا تھا۔ اِس کے ساتھی بگڑ جاتے تو؟ تجھے نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ دو چار غنڈے ہمیشہ رہتے ہیں۔ اور بیوڑا تو تو ہے ہی۔ ورنہ لت نہ ہوتی تو کیا تو دن میں بھی وہاں سے گزر سکتا تھا؟'' میں نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے یہی کہنے کے لئے تو یہ جب سے ہمدردی کا ناٹک رچا رہا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''

اس نے فون منقطع کر دیا۔

یوسف مجھے اپنا دشمن خیال کرتا ہے۔ چالیس سال پہلے میں نے اپنے کالج کی ہم جماعت زلیخا سے شادی کر لی تھی۔ تب سے وہ مجھ سے خفا ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ زلیخا سے محبت کرتا ہے۔ اس نے مجھے کبھی بتایا ہی نہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے زلیخا میں بس ایسی ہی دلچسپی ہے جیسی مردوں کو عموماً ہوتی ہے۔ میں نے زلیخا کے سامنے شادی کی تجویز رکھی اس نے قبول کر لی۔ ہر مشرقی لڑکی کی طرح وہ بھی کسی معقول پیغام کی منتظر تھی۔ کوئی لڑکا ہو۔ بس ٹھاک ٹھاک ہو جس کے ساتھ زندگی چین سے گزر جائے۔ اگر وہ انکار کر دیتی تو کون سا مجھ پر پہاڑ ٹوٹ پڑتا۔ مجھے وہ اچھی لگی میں نے پیغام دے دیا۔ اگر وہ انکار کرتی تو بس تھوڑا سا افسوس ہوتا، پھر کوئی اور ڈھنگ کی لڑکی مل جاتی۔ اگر وہ مجھے بتا دیتا کہ وہ زلیخا کو چاہتا ہے۔ اس سے شادی کا خواہش مند ہے تو میں ہرگز پیغام نہ دیتا۔ لیکن اس نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ شاید اسے ہیٹی محسوس ہوئی۔ ہم دونوں بچپن کے دوست ہیں اور ہماری حریفائی بھی اتنی ہی پرانی ہے۔ امتحانات میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش۔ کھیلوں میں ایک دوسرے کو شکست دینے کی

خواہش۔ کئی بار اس کے نتیجے میں مار پیٹ بھی ہوئی لیکن پھر سب کچھ بھول بھال کر ایک ہو گئے۔ نادانستگی میں میں نے اس کی محبوبہ اس سے چھین لی اور وہ بری طرح ٹوٹ گیا۔

میری شادی کے بعد وہ کبھی میرے گھر نہیں آیا۔ شاید یہ تصور ہی اس کے لئے جاں کاہ تھا کہ ہم دونوں کو اکٹھے دیکھے۔ ان دنوں زلیخا اس سے واقف تھی۔ اگر اس نے پہل کی ہوتی تو شاید آج وہ اس کی بیوی ہوتی۔ اس کے باوجود میں اس سے برابر ملتا رہا کہ وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ میں جب بھی اس کے گھر جاتا وہ مجھے رکنے کے لئے کہتا۔ اور مجھے کسی قریب کے ریستوران میں لے جاتا۔ رفتہ رفتہ وہ کچھ نارمل ہو گیا تھا لیکن مجھے معاف نہ کر سکا۔

شادی کے چند سال زلیخا اور میں ایک جان دو قالب رہے۔ پھر وہ اپنی گرہستی میں ایسی الجھی کہ بچوں کے علاوہ سب کچھ فراموش کر بیٹھی۔ اسے تو بس ایک عدد شوہر چاہئے تھا جو اسے مل گیا۔ بچے ہو جانے کے بعد میری حالت گھر میں کمّی رہ گئی۔ میں کیا کرتا۔ میں نے اپنے دوستوں اور واقف کاروں میں پناہ لی۔ دن بھر کے کاموں سے فراغت پا کے قریب کے ہوٹل کا رخ کرتا ہوں۔ رات گئے تک دوستوں میں ریس، مٹکے، کھیل کود، شیئر بازار سیاست اور دنیا بھر کی الم غلم باتیں ہوتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو اس زندگی کا اپنا ایک لطف ہے۔ جسے دوسرے نہیں سمجھ سکتے۔ لوگ ہمیں دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں۔ یہ لوگ تھک گئے ہیں۔ اور اسی لئے زندگی کی دوڑ سے الگ ہو گئے ہیں ورنہ ہماری طرح یہ بھی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں لگے ہوتے...... لیکن ہم مطمئن ہیں۔ اوپری دل سے ہم انہیں سراہتے ہیں کہ وہ لوگ کتنے کامیاب ہیں۔ اپنی زندگی پر تاسف کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن اندر سے ہمیں ان پر ہنسی آتی ہے۔ جو جاہ و عزت اور شہرت کے پیچھے گھلے جا رہے ہیں۔ ہم تو دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں۔

شام کو یوسف مجھ سے ملنے آیا۔

''کیوں فون کیا تھا؟'' اس نے تک چڑھے لہجے میں پوچھا۔

''میں ڈر رہا تھا تجھے خدانخواستہ کچھ ہوا تو نہیں؟''

''یہ تسلی تجھے کبھی نہیں ملنے کی۔''

''چائے منگواؤں......اے عبدل......''

یوسف نے غصے سے مجھے دیکھا۔میرا پوچھنا اسے برا لگا۔

''میں سمجھا تھا شاید تو کولڈ ڈرنک......''

''پنج ناٹک مت کر'' وہ اور بگڑا ''میں پچھلے تین سال سے تیرا یہ ناٹک دیکھ رہا ہوں۔''

''پچاس سال'' میں نے تصحیح کی ''ہم لوگ بچپن کے ساتھی ہیں۔''

''پر تجھے دوستی کی قدر کہاں؟'' وہ غرایا۔

''قدر نہیں ہوتی تو تجھے فون کیوں کرتا؟''

''میں سب سمجھتا ہوں تو نے فون کیوں کیا تھا؟''

شاید اسے وہم ہو گیا ہے کہ میں اس کی موت کی راہ دیکھ رہا ہوں۔

''تیرے مرنے سے میرا کیا فائدہ؟'' میں نے پوچھا۔

''تجھے تو چھٹکارہ مل جائے گا نا'' ایک تلخ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر جاتی ہے ''ہر وقت تجھے ستاتا جو رہتا ہوں۔''

''جس کو جانا چاہئے وہ تو جاتی نہیں۔تو خواہ مخواہ میرے گلے کیوں پڑتا۔''

''اس کی بات مت کر'' وہ زور سے پھٹ پڑا۔اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ہوٹل میں بیٹھے لوگ اپنی میزوں سے گھوم کر ہمیں گھورنے لگے۔

''اے گدھے آہستہ بات کر تماشا کیوں کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔

ویٹر چائے کی پیالیاں رکھ گیا۔

''مسکہ پاؤ منگواؤں؟''

''بن مسکہ لا۔''

ویٹر ہنستا ہوا چلا گیا۔وہ اس ڈرامے کا عادی ہو چلا ہے۔

''تو اس کے نام سے اتنا بد کتا کیوں ہے؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مجھے ہنسی آئی۔ شاید اس کے تصور کی زلیخا ابھی انیس سال کی ہے۔ پھر مجھے اس پر رشک آنے لگا۔ جینے کے لئے اس کے پاس ایک تصور تو ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا۔ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ خوبصورت زلیخا میرے ساتھ ہے۔ اس کی مترنم ہنسی، لمبے لمبے سیاہ بال، گدرایا ملائم جسم۔ نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں، تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں۔ غالب کا یہ شعر نہ جانے کتنی بار دوہرایا ہو گا۔ مگر ہم دونوں ہی خستہ و درماندہ ساتھ ہونے کا ناٹک نبھا رہے ہیں۔ اچھا ہے یہ میرے گھر نہیں آتا۔ ورنہ زلیخا کو آج دیکھ لے تو شاید صدمے سے مر ہی جائے۔

زلیخا کے تصور سے وہ موج میں آ گیا ہے۔ ہنسی، مذاق، لطیفے، چہلیں۔ اب وہ میری شادی سے قبل کا یوسف معلوم ہو رہا تھا۔ کم عمر، کھلنڈرا، زندہ دل۔

اچانک سب کو احساس ہوا کہ رات کے دس بج رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں کتنا وقت ہو گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''دو روز بعد ملنے آؤں گا۔'' میں نے اس سے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' اس کا چڑچڑا پن عود کر آیا۔ میں ابھی بہت دن جیوں گا۔'' اس نے اپنا بیگ اٹھایا۔

''کب آئے گا تو؟''

شام کو چھ بجے کے بعد۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ چلا گیا۔

دو روز بعد میں اس کے گھر گیا۔ دروازہ بند تھا۔ دیر تک گھنٹی بجائی اور دستکوں کے باوجود دروازہ نہیں کھلا تو میں نے زور زور سے کھٹکھٹانا شروع کیا ___ پڑوسی باہر نکل آئے آخر ایک نوجوان اپنے فلیٹ کی گیلری سے اس کے گھر میں کودا اور دیوان خانے کی چٹخنی کھولی۔

وہ سامنے صوفے پر لیٹا تھا۔ دائیں کروٹ۔ آنکھیں میز پر ہی رکھی زلیخا کی نوجوانی کی تصویر پر اٹکی تھی۔ یہ تصویر اس نے کالج کی میگزین سے نکالی ہوگی، میں نے سوچا اور اسے انلارج کر کے فریم کروایا ہوگا۔

اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔

''میں نے زلیخا کو فون کیا۔ ''زلیخا آج میں دیر سے آؤں گا۔''

''کیوں؟''

''یوسف کا انتقال ہوگیا۔''

''کون یوسف؟''

''میرا دوست۔ تمہیں یاد ہے۔ کالج میں ہمارے ساتھ تھا۔''

مجھے تو کچھ یاد نہیں آرہا۔ لیکن آپ جلد آنے کی کوشش کیجئے گا۔ اور ہاں جنازے کے ساتھ مت جانا۔ اس عمر میں......''

''کیسے نہ جاؤں؟

میں نے اس کی آنکھیں بند کیں اس کے گالوں پر پیار کیا۔

سوکھی آنکھوں میں اتنا پانی کہاں سے آ گیا؟

رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے میں قریب کے صوفے پر گر پڑا۔

☆☆

نند کشور وکرم

طولِ شبِ فراق

کسی شکست کی طرح گردن جھکائے آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتا ہوا وہ اپنے کمرے کی جانب جا رہا تھا۔ اس وقت وہ معمول سے زیادہ پریشان اور غمگین نظر آ رہا تھا۔ اس کے خشک اور منتشر بالوں نے اس کا حلیہ مزید بگاڑ رکھا تھا۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کا تمام اثاثہ لٹا چکا ہو یا کسی دور دراز واقع مرگھٹ سے اپنی کسی عزیز ترین ہستی کو نذرِ آتش کرنے کے بعد لوٹ رہا ہو۔ اسے اس طرح مغموم اور اداس دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی جانب چل پڑا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو پیچھے سے آواز دی۔

''ہاتو یاما''

لیکن ہاتو یاما پر میری آواز کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ پہلے کی طرح ہی آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھتا رہا۔ اس پر میں دوبارہ چیخ اٹھا۔

''ہاتو یاما''

اس بار اس نے چونک کے پیچھے کی جانب دیکھا اور مجھے دیکھتے ہی اس کے پژمردہ اور غمگین چہرے پر خود بخود ہی پھیکی سی مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی اور بولا...... ''ہیلو۔ کب آئے؟''

''میں تو تین گھنٹے سے ویٹنگ روم میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا تھا؟''

''اور معاف کرنا بھئی۔ میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ دراصل میں بھول ہی گیا تھا کہ میں نے تم سے کافی ہاؤس میں ملنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔'' پھر وہ مجھے بازو سے گھسیٹتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اچھا آؤ اندر کمرے میں چل کر بیٹھیں'' اس نے یہ چند جملے اپنے مخصوص جاپانی لہجے والی انگریزی میں ادا کئے۔ اور پھر اپنی نیلی پتلون کی جیب میں سے چابی نکال کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے لگا۔ اور

میں اس کے پریشان چہرے کا جائزہ لینے میں محو ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ جب سے اس کی جوان و حسین بیوی ہیتی اور بچہ اور یانا گاسا کی میں ایٹم بم کی نذر ہوئے تھے تب سے اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ اکثر کھویا کھویا سا رہتا تھا اور شراب اس نے کثرت سے پینی شروع کر دی تھی اور گھنٹوں غم والم کے بحرِ عمیق میں غرقاب رہتا...... لیکن آج تو وہ معمول سے زیادہ پریشان اور غمگین دکھائی دے رہا تھا۔ اندر کمرے میں جا کر اس نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا اور کئی لمحے تک وہ بے حس و حرکت آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ اور میں اس عرصہ میں اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی اداسی اور پریشانی کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں اٹھ کر اس کے پاس ہی پلنگ پر جا کر بیٹھ گیا اور اس کے منتشر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھنے لگا......

''کیا بات ہے ہاتویاما؟''

ہاتویاما نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہ اسی طرح دیوار کی طرف پیٹھ کئے بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ آخر اس کی مسلسل خاموشی سے اوب کر میں نے زبردستی اس کا چہرہ اپنی طرف پھیرا تو دنگ رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو دجلہ و فرات کی مانند بہہ رہے تھے۔ میں نے اس کی پرنم آنکھوں اور چہرے کو صاف کرنے کے بعد ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاتویاما تم اتنے اداس کیوں ہو؟''

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں اس کی غیر معمولی اداسی سے دل ہی دل میں حیران و پریشان ہو رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ کئی مرتبہ کافی ہاؤس یا بار میں بیٹھے بیٹھے اداس ہو جاتا تھا اور اپنی بیوی اور بچے کی یاد سے بیقرار ہو کر کسی انجانی دنیا میں کھو جاتا تھا۔ مگر آج تو خلافِ معمول عام دنوں سے زیادہ اداس اور نراش نظر آ رہا تھا۔ میں ابھی اپنا سوال دوبارہ دہرانا ہی چاہتا تھا کہ آہستہ آہستہ کھڑے ہو کے اس نے الماری سے وہسکی کی بوتل نکالی اور پھر گلاس میں ڈال کر دھیرے دھیرے چسکیاں لینے لگا۔

میں یوں بھی کم پینے کا عادی ہوں لیکن آج اس کی پریشانی نے مجھے اتنا فکرمند بنا دیا تھا کہ اس

کا ساتھ دینے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ جب اس نے دو گلاسوں میں وہسکی ڈال کر ایک گلاس میری طرف بڑھایا تو نہ چاہتے ہوئے بھی چپ چاپ وہ گلاس اس کے ہاتھوں سے تھام لیا اور اس کا ساتھ دینے کے لئے دھیرے دھیرے چسکیاں بھرتے ہوئے تخیلات کی پرواز میں اس اولین ملاقات کے منظر میں کھو گیا، جب میں پہلی بار ہاتویاما سے ملا تھا......

ہاتویاما سے میری پہلی ملاقات فائن آرٹس گیلری میں ہوئی تھی جہاں میں عظیم روسی فنکار رورِک کے قابل ستائش شاہکاروں کو دیکھنے میں منہمک تھا۔ جب میں دیوکارانی کے پورٹریٹ کے پاس پہنچا تو اس میں مجھے زندگی رقص کرتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں کئی لمحے مجسمۂ حیرت بنا اس منہ بولتی تصویر کے سامنے کھڑا رہا۔ اچانک میرے شانے پر کسی نے ہاتھ رکھ کر میرا نام پکارا۔ میں چونک سا پڑا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا دیرینہ آرٹسٹ دوست راجن متل ایک جاپانی کے ساتھ کھڑا تھا۔ جب میں ان کی طرف مڑا تو راجن نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''یہ ہیں میرے عزیز ترین بچپن کے ساتھی راکیش جنہیں میں پیار سے راکی پکارتا ہوں۔ یہ ماڈرن آرٹ کی دلدادہ ہیں اور ان کی کئی تخلیقات عوام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں'' اس کے بعد اس نے اس اجنبی جاپانی کا مجھ سے تعارف کرانا شروع کیا۔

''راکی۔ یہ جاپان کے مشہور مجسمہ ساز ہاتویاما ہیں۔ شاید تم نے آج کل ان کے بارے میں اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ یہ یہاں بھارت سرکار کی دعوت پر گاندھی جی کا مجسمہ بنانے کے لئے تشریف لائے ہیں۔''

راجن کے تعارف کرانے پر مجھے یک لخت یاد آ گیا کہ ابھی پرسوں ہی میں نے اخباروں میں اس کے فوٹو کے ساتھ اس کی آمد کی خبر بھی پڑھی تھی۔ میں نے فوراً ہی اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے آگے بڑھا دیا اور کہا۔

''مجھے آپ سے مل کر انتہائی خوشی ہوئی۔''

''اور مجھے بھی'' اس نے رسماً انگریزی میں جواب دیا۔

اس کے بعد ہم گیلری میں تصویریں دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس سے فارغ ہونے کے

بعد ہم تینوں ''گے لارڈ'' چلے گئے جہاں ہم نے خوب پیٹ بھر کر ڈنر کھایا۔ اور پھر جب ہم وہاں سے اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف روانہ ہوئے تو مجھے ہاتویاما کے بارے میں کافی واقفیت حاصل ہو چکی تھی۔

سگریٹ کا ایک طویل کش کھینچ کر اس نے بتایا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں وہ نیویارک میں تھا اور اس کی رفیقہ حیات ناگاساکی میں۔ جب ہٹلر نے یورپ کے کئی ممالک کو تاخت و تاراج کر دیا تو اس کی بیوی جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے گھبرائی اور اسے جلد واپس آنے کے لئے لکھنے لگی۔ ان دنوں ہوائی اور سمندری دونوں ہی راستے خطرناک تھے۔ پھر بھی وہ اپنی جان پر کھیل کر نیویارک سے ناگاساکی پہنچ گیا کیونکہ اسے اپنی بیوی سے انتہائی پیار تھا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے اکلوتے نوزائدہ بچے کو دیکھنے کے لئے بھی بے تاب تھا جس کی پیدائش اس کے نیویارک پہنچنے کے چند ماہ بعد ہوئی تھی۔

ناگاساکی پہنچ کر وہ خوش خوشی اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ زندگی گزارنے لگا...... لیکن پھر۔ پھر ایک دن ایٹم بم کے مہلک اور ہولناک دھماکے نے اس کی دنیائے مسرت اجاڑ کر رکھ دی۔ اس کی بیوی اور بچہ لقمۂ اجل ہو گئے۔ وہ خود اس قیامت خیز حادثے سے بچ تو گیا مگر ہمیشہ کے لئے لنگڑا بن کر رہ گیا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد وہ سکون کی تلاش میں تمام روئے زمین کا چکر لگا آیا لیکن وہ اپنی عزیز بیوی اور لختِ جگر اوریا کو بھلا نہ سکا...... اور اب وہ بھارت سرکار کی دعوت پر گاندھی جی کا قدِ آدم مجسمہ بنانے کے لئے یہاں آیا ہوا تھا۔

آج سے پیشتر ایک بار کافی ہاؤس میں بھی جب وہ سگریٹ کے طویل کش کھینچ کر مرغولے بناتا کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا تو میں نے اس سے کہا تھا۔

''ہاتویاما اگر کہو تو ایک سوال پوچھوں؟''

''ہاں ہاں بڑے شوق سے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا کہ بات کیسے اور کہاں سے شروع کروں۔ آخر چند ثانیے ایسے ہی تذبذب کے عالم میں رہنے کے بعد میں نے سوال کیا۔

''کیا تم بتا سکتے ہوں کہ تمہاری بیوی اور بچے کی موت کیسے ہوئی ؟''

وہ کچھ اداس سا ہو گیا اور اس کا اداس چہرہ دیکھ کر میں خود ہی پچھتانے لگا کہ میں نے اس سے ایسا سوال کیا ہی کیوں؟ ہاتو یاما کچھ دیر تو چپ چاپ تصویرِ غم بنا کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے دوسرا سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر کافی ہاؤس کی چھت پر ٹکٹکی جمائے بولا......

''شاید تم جانتے ہی ہو گے کہ جاپان کو شکست دینے کے لئے اتحادیوں نے ایٹم بم کا سہارا لیا تھا۔ اور اسی ایٹم بم نے ہیروشیما اور ناگاساکی کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ناگاساکی پر بم پڑنے سے چند گھنٹے پیشتر میری بیوی نے مجھ سے کہا تھا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہم ساری دنیا کا چکر لگائیں گے۔ آہ اس وقت کسے معلوم تھا کہ کل صبح ہونے سے پیشتر ہی موت کے ظالم ہاتھ اسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیں گے۔ رات ہم اطمینان سے سوئے۔ اچانک مجھے ایک زبردست دھماکا سنائی دیا اور اس سے پہلے کہ میں آنکھ کھول کر حالات کا جائزہ لیتا، یک لختِ مجھے اپنے اوپر پہاڑ ایسا وزن گرنے کا احساس ہوا اور درد و تکلیف سے میری چیخ نکل گئی۔ لیکن اس کے بعد مجھے قطعی ہوش نہیں۔ اس واقعہ سے تیسرے دن بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں شدتِ درد سے بری طرح تڑپ رہا تھا اور میرے جسم پر پٹیاں بندھی ہوئی تیں۔ میں نے آنکھ کھولنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھ کر حالات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ میرے اردگرد ڈاکٹروں کے علاوہ متعدد نرسیں بھی ادھر اُدھر گھوم پھر رہی تھیں۔ میں نے ان سے متعدد سوال کئے مگر انہوں نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ ان سب کے چہرے اترے ہوئے تھے اور وہ دلدوز حادثے سے از حد دُکھی اور اداس نظر آتے تھے کئی دنوں بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ ناگاساکی پر اتحادیوں نے ایٹم بم گرایا تھا جس سے سارا شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہزاروں انسان لقمۂ اجل ہو گئے تھے۔ عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں، بچے یتیم ہو گئے تھے اور ماؤں کی گودیں سونی ہو گئی تھیں اور جو زندہ بچے تھے ان میں زندگی کا کوئی لطف باقی نہیں رہا تھا کیونکہ ان میں سے کسی کی ٹانگ نہیں تھی اور تو کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔ کوئی اندھا ہو گیا تھا تو کسی کا چہرہ انتہائی ڈراؤنا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ میری بیوی اور بچہ بھی شاید دوسرے ہزارہا انسانوں کے ساتھ موت کا شکار ہو گئے تھے۔

وہ بات کرتے کرتے ایکا ایکی خاموش ہوگیا۔اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اوراس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرگئی تھیں۔کئی لمحے وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ایسا جان پڑتا تھا جیسے وہ اپنی بیوی اور بچے کی یاد سے پھر غمگین ہوگیا ہے۔اس کے ہاتھ کا ادھ جلا سگریٹ قریب قریب ختم ہوچکا تھا۔پھریک لخت وہ چونک پڑا اوراس نے اپنی ادھوری داستان کا بقیہ حصہ سنانا شروع کیا۔

......''بیتی اور اوریا کی موت نے میرے لئے قیامت برپا کردی۔لیکن پھر بھی مجھے ان کی موت کا یقین نہیں آتا تھا،اس لئے روبصحت ہوتے ہی میں نے اپنی ٹانگ کی پروانہ کرتے ہوئے بھی ان کی تلاش شروع کردی۔ناگاساکی کے کھنڈرات اور ہسپتالوں کا چپہ چپہ میں نے ایک ناکام امید کے بھروسے چھان مارا۔اورآخر جب امید کا آخری سہارا بھی مجھ سے چھن گیا اور مجھےان کی موت کا قوی یقین ہوگیا تو میں پاگل سا ہوگیا۔دن بھر دیوانوں کی طرح ناگاساکی کے کھنڈرات میں آوارہ گردی کرتا رہتا۔تنگ آکر میں نے ناگاساکی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیا اور بے مقصد اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔کبھی امریکہ چلا جاتا تو کبھی فرانس۔مگراس کے باوجود بھی مجھے دلی سکون نصیب نہیں ہوا۔میں جہاں بھی گیا ان کی یاد میرا تعاقب کرتی رہی۔ان کی یاد میں ایک لمحے کے لئے بھی نہ بھلا سکا۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اوراس نے جیب سے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگایا اوراس کے کش لگاتے ہوئے نہ جانے کون سی دنیا میں کھوگیا میں بھی اس کی اذیت ناک اور دلدوز داستانِ حیات سے غمگین ہوگیا تھا......اتنا غمگین کہ اس کے بعد میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور چپ چاپ بیٹھا اس کے اندرونی دردو کرب کے احساس سے دکھ کے ساگر میں غرقاب رہا۔اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ اگر میرا بس چلے تو ابھی اسے اقوام متحدہ کے نمائندوں کے سامنے لے جاکر کھڑا کردوں اوران سے چیخ چیخ کر کہوں کہ:

''اے امن عالم کے علمبردارو۔کیا تم دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو مہلک ایٹمی ہتھیار بنانے سے نہیں روکو گے؟ دیکھو ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے ایٹم بموں کا نتیجہ؟ اس کی بیوی اور بچہ اس قیامت خیز حادثہ میں ہلاک ہوگئے۔اور یہ بالکل تنہا ہوکر آج ایک زندہ لاش بن گیا ہے۔لیکن

یہ صرف اس ایک واحد انسان کی داستان الم نہیں بلکہ یہ ان لاکھوں انسانوں کی دکھ بھری کہانی ہے جنہیں ایٹم بم کا شکار بنایا گیا ہے۔ جنہیں موت بیماری اور اندرونی کرب سے دوچار کیا گیا ہے۔ کیا تم ان کی حفاظت نہیں کروں گے؟ کیا تم لاکھوں انسانوں کو اس غیر قدرتی موت اور بیماریوں سے نہیں بچاؤ گے؟ کیا تم ان گنت بچوں کے یتیم ہونے کے ذمہ دار نہیں ہو؟ بولو، جواب دو۔ کیا ایٹمی ہتھیاروں کی جنگ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ کیا انسان کو آرام اور سکھ کی اسی زندگی گزارنے کا موقع نہیں ملے گا؟ بولو۔ جواب دو؟

کافی دیر تک ہم دونوں اس طرح اسی طرح ساکت وصامت بیٹھے رہے۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی بات چیت نہ کی۔ وہ تو شاید اپنی بیوی اور بچے کی ابدی جدائی سے دکھی ہوکر ان کے ساتھ گزارے ہوئے فرحت آمیز اور پرمسرت دنوں کے تصور میں کھو گیا تھا اور میں اس کی کہانی کے المیہ انجام سے از حد غمگین ہو گیا تھا۔ اس دن ہمیں پتہ ہی نہ لگا کہ کب ہم کافی ہاؤس سے اٹھے اور کب ایک دوسرے سے جدا ہوئے......

میں ابھی تک وہسکی کی چسکیاں بھرتے ہوئے ہاتو یاما کے ماضی کے بھیانک حادثے کے تصورات میں کھویا ہوا تھا اور وہ گلاس پر گلاس بھر کر حلق میں انڈیلے جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ پوری بوتل ختم ہوگئی اور اس نے الماری سے دوسری بوتل نکال کر پینی شروع کر دی۔ اب شاید وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اچانک میری نگاہ گھڑی پر پڑی۔ بارہ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ میں فوراً گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اٹھتا دیکھ کر اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''ارے یار۔ بیٹھو نا۔ تم تو ابھی سے اٹھنے لگا۔''

''نہیں۔ معاف کرنا ہاتو یاما مجھے دیر ہو رہی ہے۔ گھر میں میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔''

بیوی کے انتظار کی بات میں نے کہہ تو دی لیکن پھر فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہ کہہ کر اچھا نہیں کیا۔ کیونکہ وہ اس بات سے زیادہ غمگین ہو کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔

''یار۔ معاف کرنا تمہاری بیوی تمہارے انتظار میں پریشان ہو رہی ہوگی۔''

'' کچھ دیر بعد میں اس سے ہاتھ ملا کر جلدی جلدی بڑے بڑے ڈگ بھرتا اپنے گھر کی طرف

چل پڑا۔ سارا راستہ میں نے ہاتویاما کی اداسی اور پریشانی پر غور کرتے ہوئے کاٹا اور رات سوتے وقت بھی اس کا اترا ہوا پژمردہ چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا۔

رات تاخیر سے سونے کے کارن صبح میں جلدی نہ اٹھ سکا۔ جب آنکھ کھلی تو گھڑی ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔ میرے اٹھتے ہی نوکر بیڈ ٹی لے کر وارد ہوا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے سوچا کہ جلدی سے تیار ہو کر ہاتویاما کی خیر و عافیت دریافت کرنے چلوں کیونکہ رات وہ شدت غم سے وھسکی کے گلاس پر گلاس چڑھائے جا رہا تھا۔ اتنے میں نوکر نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا تا کہ میں اپنی عادت بموجب خبریں سن سکوں۔ مگر پہلی خبر سنتے ہی چائے کا پیالہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نیوز ریڈر کہہ رہا تھا......

''ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ نئی دہلی کے ایک ہوٹل میں جاپان کے شہور مجسمہ ساز ہاتویاما نے خودکشی کر لی ہے۔ مرحوم ابھی چند ہفتے ہوئے بھارت سرکار کی دعوت پر گاندھی جی کا مجسمہ بنانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ خودکشی کرنے سے پیشتر وہ ایک خط چھوڑ گئے ہیں جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنی عزیز رفیقہ حیات ہیتی اور ننھے بچے اوریا کی ابدی فرقت گوارا نہیں کر سکتے جو ناگاساکی میں اتحادیوں کے ایٹم بم کا نشانہ بن گئے تھے۔ ان کی یاد ہمیشہ ان کا تعاقب کرتی رہتی ہے۔ ان کے بغیر وہ ایک زندہ لاش ہیں اور ان کی جدائی میں انہیں ایک پل بھی سکون نصیب نہیں ہوتا...... اس لئے وہ اس اذیت ناک زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کر رہے ہیں تا کہ......

میں اس سے زیادہ کچھ نہ سن سکا اور اسی طرح لباس شبانہ پہنے ہی ہوٹل پہنچنے کے لئے باہر کی طرف دوڑ پڑا......

☆☆

منشا یاد

دیدۂ یعقوب

وہ اپنی آمد کے پروگرام کی تفصیل بتا رہا تھا مگر مجھے اس سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کس ایئر لائن سے آئے، کس کلاس میں سفر کرے اور کون سے روٹ سے پہنچے۔ پیاسی زمین کو اس سے کیا کہ بادل مشرق سے آئے یا مغرب سے؟ اسے تو بارش چاہیے۔ میرے لیے وہی ایئر لائن سب سے اچھی جو اُسے رش کے اس موسم میں جلد از جلد گھر لے آئے اور اگرچہ ساتویں آٹھویں روز ہم اس کی آواز سن لیتے مگر اسے دیکھتے ہوئے اداسی کے بگولوں سے اٹے ساتھ آٹھ سو دن اور اتنی ہی العطش العطش پکارتی پیاسی راتیں ہو گئی تھیں۔ آواز کا رابطہ بالمشافہ ملاقات کا بہت اچھا نعم البدل ہے مگر محبت لمس چاہتی ہے مجھے یاد ہے جب شروع شروع میں اس کا فون آتا تو میری بیوی اس سے بات کر کے رونے لگتی۔ میں کہتا تمہیں تو خوش ہونا چاہیے مگر وہ کہتی اس کی آواز سن سکتی ہوں اسے دیکھ تو نہیں سکتی نا۔ ایک بار میں نے اس سے اس بات کا ذکر کیا تو کہنے لگا اس کا انتظار بھی ہو جائے گا عنقریب آپ لوگ انٹرنیٹ کے ذریعہ میری آواز کے ساتھ تصویر بھی دیکھ سکیں گے لیکن کیا ہماری اس سے تشفی ہو جائے گی؟

مجھے اس کی آمد کی خبر سن کر خوشی تو ہوئی ہے مگر زیادہ نہیں کیونکہ اس کا مطلب ہوتا ہے سال دو سال کی پھر لمبی جدائی۔ مجھے اس کی متوقع آمد کا انتظار کھینچنا اور دل کی منڈیر پر کوے کا بولتے رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے یا پھر وہ لوٹ کر نہ جانے کے لئے آئے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں کبھی اسے اتنی دور نہ جانے دیتا۔ ابا کے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کے بعد ایک روز میں نے حساب لگایا کہ وہ میری پیدائش کے بعد بچاس برس تک زندہ رہے لیکن تعلیم اور ملازمت کی خاطر میں اُنہیں گاؤں چھوڑ کر شہر آ گیا اور میری عمر کے پچاس برسوں میں سے ابا کے حصے میں زیادہ سے زیادہ کتنے برس

آئے ہوں گے۔ یہ حساب کر کے مجھے سخت صدمہ ہوا کہ ابا زندہ تھے اور اسی دنیا میں تھے مگر میں پینتیس برس ان سے دور رہا اور ان کی زندگی میں کبھی اس دوری کو محسوس تک نہ کیا۔ لیکن اب میرا اپنا بیٹا مجھ سے جدا ہوا ہے تو مجھے ابا کے جذبات و احساسات کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا ہے وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے ملنے آجاتے اور جب تک قیام کرتے ان کی خواہش ہوتی مجھے دفتر سے چھٹی ہو اور میں دن رات اُن کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہوں مگر میں سال دو سال میں گاؤں کا ایک آدھ چکر لگاتا تو مشکل سے ایک دو راتیں گزار سکتا پھر مجھے اس شہر کی رونقیں، روشنیاں اور اپنی دلچسپیاں پکارنے لگتیں اور بعض اوقات میں شام کے وقت واپس چل پڑتا۔ وہ کہتے یہ وقت تو گھر لوٹنے کا ہے تم گھر سے جا رہے ہوں میں ضروری کام کا بہانہ کرتا انہیں کیا بتاتا کہ میرا گھر تو کہیں اور ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار شام کے وقت جب میں روانہ ہو رہا تھا وہ کتنے اداس اور پریشان تھے۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ سب لوگ مجھے بے وقت سفر کرنے سے روک رہے تھے مگر وہ خاموش تھے۔ رخصت کرتے وقت اُن سے نہ رہا گیا اور بولے تمہاری ماں جی زندہ ہوتیں تو کیا تم تب بھی ایسا ہی کرتے۔ لیکن میرا دل نہ پسیجا اور اپنی مجبوری بتا کر چلا آیا۔ وہ رات اور ایسی کئی راتیں ابا نے کیسے کاٹیں ہوں گی، مجھے اس کا اندازہ اب ہوا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے میرے لڑکپن میں ابا کو داستانِ حضرت یوسف بہت پسند تھی۔ میرے شہر چلے جانے کے بعد وہ راتوں کو بلند آواز میں یہ قصہ پڑھتے رہتے۔ ماں جی بتاتی تھیں کہ وہ زیادہ تر وہی حصے پڑتے تھے۔ جن میں بیٹے کی جدائی میں حضرت یعقوب کی حالتِ زار کا بیان ہوتا۔ یا پھر جب حضرت یوسف کا قاصد بشیر ان کا کرتہ اور یہ خوش خبری لے کر پہنچا تھا کہ آپ کا محبوب فرزند نہ صرف زندہ اور سلامت ہے بلکہ مصر شہر کا والی ہے۔ حضرت یعقوب نے بیٹے کا کرتہ اپنی نابینا آنکھوں سے لگایا تو وہ روشن ہو گئیں۔ ماں بتایا کرتی تھیں کہ یہاں پہنچ کر تمہارے ابا کی آواز بھرا جاتی اور وہ کوئی بہانہ کر کے پڑھنا چھوڑ دیتے۔ آخر عمر میں جب وہ پڑھ نہیں سکتے تھے تب بھی لیٹے

ہوئے بلند آواز میں فراقیہ دوہڑے پڑھتے رہتے تھے۔ اگلے روز اس نے پھر فون کیا اور بتایا کہ اسے سیٹ نہیں مل رہی اب وہ نیویارک جا کر قسمت آزمائی کرے گا اور اطلاع دے گا کہ وہ کس فلائیٹ سے کب آ رہا ہے۔ اگر اطلاع نہ دے سکا تب کراچی یا لاہور پہنچ کر فون کر دے گا ورنہ ہم لوگ فکر نہ کریں اُسے گھر کا راستہ معلوم ہے خود ہی پہنچ جائے گا۔

دو تین روز میں وہ ہمارے درمیان ہوگا اور ہم اسے دیکھ اور چھو سکیں گے۔ اس خوشگوار خیال سے دل میں عجیب مسرت آمیز ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ آنکھوں کے سامنے بار بار اس کی صورت ابھرنے لگی۔

اُس کی امی کا اصرار تھا کہ وہ عید سے کم از کم ایک روز پہلے ضرور پہنچ جائے اس نے یقین دلایا تھا امی آپ فکر نہ کریں میں عید کی صبح کا آغاز آپ کے ہاتھوں بنائی دودھ سویوں ہی سے کروں گا۔ اس کے بعد ہمارا اُس سے ٹیلی فون کا رابطہ ختم ہوگیا اور ہم اس کی اگلی کال کا انتظار کرنے لگے۔ گھر کا کوئی فرد جب بھی ٹیلی فون انگیج کرتا وہ بھری ہوئی شیرنی کی طرح غرانے لگتی۔ مگر پورا ایک دن خراب فوٹو اسٹیٹ مشین سے صاف کاغذ کی طرح نکل گیا اور انتظار کی لمبی رات شروع ہوگئی۔ آج اسے پروگرام اور وعدے کے مطابق پہنچ جانا چاہئے تھا مگر ابھی تک اس کے روانہ ہونے کی اطلاع آئی یا نہیں ہمیں اور بھی اداس اور پریشان کر دیتے۔

اُس نے ابھی سے اس کی پسند کی ڈشیں بنانا اور انہیں فریج میں محفوظ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمیں کو یہ بھی سہولت حاصل ہے کہ محبت اور مامتا کے اظہار کا متعدد بار موقع بھی مل جاتا ہے اور مصروفیت میں وقت اچھے طریقے سے گزر جاتا ہے۔ عورتوں کو ایک بڑی سہولت بھی حاصل ہے کہ وہ ہر موقع پر رو کر اپنے جذبات کا اظہار کر سکتی اور اپنے دل کا غبار نکال سکتی ہیں۔ یوں تو بعض مرد بھی ایسا کرنے میں باک محسوس نہیں کرتے مگر میرے جیسے دیہاتی پس منظر کے مردوں کو ایسا کرنے میں اپنی مردانگی خطرے میں نظر آ جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں پڑھائی کی خاطر پہلی بار گھر سے نکلا اور شہر جا رہا تھا تو گھر کی چھوٹی بڑی سب عورتوں نے مجھے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے رخصت کیا تھا مگر ابا

نے صرف خاموشی سے سر پر ہاتھ پھیرنے پر اکتفا کیا تھا۔لیکن وہ جو بار بار رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے نزلے کی شکایت کر رہے تھے وہ کیا تھا؟

وہ پریشر کوکر کا ڈھکنا کھولتی بند کرتی، ہنڈیا میں کفگیر چلاتی اور سل بٹے پر قیمہ پیستی ہوئی جب جی چاہتا اُسے یاد کر کے چند آنسو بہاتی اور نارمل ہو جاتی۔مگر میرے اندر کا پریشر کوکر ہلکی آنچ پر چڑھا رہتا ہے اتنی ہلکی آنچ کہ ویٹ میں لرزش پیدا نہ ہو اور سیٹی کی آواز سنائی نہ دے۔یوں میں نے بھی عید کی خریداری کرتے وقت اس کی پسند کا خیال رکھا اور کھانے پینے کی بہت سی چیزیں محض اسی کے لیے خرید کرتے وقت اس کی پسند کا خیال رکھا اور کھانے پینے کی بہت سی چیزیں محض اسی کے لیے خریدی تھیں مگر بھرم کی خاطر اس کا اعلان نہیں کیا تھا۔ویسے بھی کھانے پینے کا شعبہ خواتین سے مختص ہے۔میں بتا دیتا تب بھی کریڈٹ اُسے ہی جاتا۔ماں جی بھی ایسا ہی کرتی تھیں۔جس روز میری آمد متوقع ہوتی وہ میری پسند کی چیزیں پکا پکا کر رکھتی جاتیں، گاؤں کی دکان سے برفی اور جلیبیاں منگاتیں اور موسمی پھل اور کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والے گھر کے قریب سے ہوکا دے کر خالی نہ گزر سکتے۔ابا کہتے یہ پانچ روز مری رہتی ہے۔ہفتہ کے دن مشین بن جاتی ہے۔اس روز ماں جی اندر باہر جاتے ہنڈیا میں ڈوئی چلاتے اور بستروں کی چادریں اور تکیوں کے غلاف بدلتے ہوئے مولوی عبدالستار کا ستوارہ گنگناتی رہتیں:

چھن چھن اور اُداسی ہوئی کیوں نہیں آیا یار میاں
نین میرے بھر ہنجو روون کر کے زاروزار میاں
غم سنیار چھکے جند میری جیوں بارے وچ تار میاں
آکھ ستار زُٹھوں کس کارن ایہہ دنیا دن چار میاں

اتنے کام کاج کے بعد بھی وقت بچ جاتا تو وہ اپنا چرخہ اٹھا کر چھت پر لے جاتیں اور شہر سے آنے والے راستے کی طرف رخت کر کے انتظار کی پُرشوق پونیا کاتنے لگتیں۔میری بائسکل کے پہیئے اور ماں جی کا چرخہ ایک ساتھ گھومتے۔واپسی کا سفر ہمیشہ آسان اور اچھا لگتا۔ہوا مخالف ہوتی

تب بھی لگتا پکی ڈور سے بندھا کھنچا چلا جا رہا ہوں۔ ابا کو بھی اس روز باہر کے سارے کام بھول جاتے اور وہ مصروفیت اور گھر میں رہنے کا کوئی بہانہ تلاش کر لیتے۔ لکڑیاں چیرتے، ٹوٹی ہوئی چارپائیوں کی مرمت کرتے یا ان کی ادوائنیں کستے۔ مگر ظاہر نہ ہونے دیتے کہ وہ ہفتہ بھر کے ملتوی کیے ہوئے گھر کے کام کاج آج ہی کیوں انجام دے رہے ہیں۔ مگر میرے پاس مصروف رہنے اور وقت گزارنے کا بہت سا جدید ساز وسامان موجود ہے۔ کتابوں میں جی نہ لگے تو آڈیو ویڈیو کیسٹس اور سی ڈیز ہیں۔ اور جب چاہوں اپچ ٹو اپچ گھومنے والے ڈش انٹینا پر مختلف ممالک کے دل بہلانے والے پروگرام دیکھ سکتا ہوں۔ کمپیوٹر ٹائپ کی مشق کر سکتا، شطرنج کھیل سکتا اور انسائیکلوپیڈیا کی فائل کھول کر پہروں مصروف رہ سکتا ہوں۔

وہ کھانے پکاتی رہی اور میں ٹی وی دیکھتا اور میوزک سنتا رہا مگر اس کے باوجود لگا جیسے اوقیانوس ہم نے کشتی کے بغیر ہاتھ پاؤں مار مار کر عبور کیا ہے جاگنے کے باوجود آخری سحری میں کسی نے پیٹ بھر کر نہ کھایا۔ کئی بار ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کا گمان ہوا، مگر وہ چپ تھا۔

آج جمعرات کا روز تھا۔ آج اس کے آنے کی توقع یقین کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ نظر نہ آنے والی ماں جی نے سویرے سویرے ہی میرے کانوں میں گنگنانا شروع کر دیا تھا۔

رات جمعے دی کرماں والی بھیجی رب ستار میاں
اج امید وطن دی ہوئی لاواں ہار سنگار میاں
دیوے بال دھراں نذرانہ چانن کراں بزار میاں
آکھ ستار نبی دا کلمہ ایہہ دنیا دن چار میاں

مگر آخری روزے کا وہ دن بھی انتظار کے دیکھنے سے بھوکے گنے کی طرح گزر گیا۔ ٹیلی فون کی طرح ہم بھی زیادہ تر چپ رہے۔ ہاں آتے جاتے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ لیتے۔ ایک ہی سوال جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

ماں جی اداس ہو جاتی تھیں لیکن ہر باپ کی طرح ابا زیادہ حقیقت پسند تھے اور سفر کو وسیلہ ظفر

سمجھتے تھے۔ وہ ماں جی کو کتابوں سے پڑھ کر ان شہزادوں اور سوداگر بچوں کی کہانیاں سناتے جو مہم جوئی اور سوداگری کے لیے دور دراز کے کوہ قافوں اور پرستانوں کے سفر کرتے۔ جنوں دیووں سے لڑتے بھڑتے اور ایک روز اونٹوں پر زر و جواہرات کا خزانہ اور دیس دیس کی سوغاتیں لادے کسی بدیع الجمال یا حسن آرا پری کے ساتھ کامران لوٹتے۔ مجھے خیال آنے لگا نئے دور کے اپنے کوہ قاف ہیں۔ علامہ اقبال کی توقع کہ ''گیا دور سرمایہ داری گیا۔ تماشا دکھا کر مداری گیا'' پوری نہ ہوئی۔ سائنس، ٹکنالوجی اور صنعت کی ترقی نے سرمایہ داری نظام کو اتنا طاقت ور اور پُرکشش بنا دیا کہ سارے نظریے اس کے سامنے باطل ہو گئے اور اُس نے معیشت، سیاست اور دنیا کے ذہین دماغوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ ترقی پذیر ملکوں کے مہم جو نوجوان نئے کوہ قافوں کے خواب دیکھنے اور ان کے توفلوں، جی میٹوں اور ویزوں کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔

اب ہمیں اس کی روانگی کی نہیں، اپنے ہی کسی شہر کراچی، لاہور یا اسلام آباد پہنچ جانے کی اطلاع کا انتظار تھا۔ گاڑی میں پٹرول ڈلوا کر اور چمکا کر کھڑا کر دیا گیا تھا اور راشد ضرورت کے سوا اسے باہر جانے سے روک رکھا تھا تا کہ اشارہ پاتے ہی ایئر پورٹ روانہ ہو سکیں۔ مگر ٹیلی فون خاموش تھا اور جیسے جیسے سورج غروب ہوتا جا رہا تھا اندیشوں اور وسوسوں کے سائے بڑھتے آ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پُرسکون دکھائی دینے کی اداکاری کر رہے تھے۔ ساری حسیات سمٹ کر سماعت بن گئی تھیں۔ ٹیلی ویژن ڈرامے میں بھی فون کی گھنٹی بجتی تو ہم ایک ساتھ فون کی طرف لپکتے۔

پھر پاس پڑوس کی چھتوں ٹیرسوں پر چڑھے ہوئے لوگ آسمان کی اسی جانب عید کا چاند تلاش کرنے لگے جدھر سے ہمارے ماہ منیر نے طلوع ہونا تھا۔ مگر فون تھا کہ بج ہی نہیں رہا تھا اور بجتا بھی تو بیزار کن مکالمہ شروع ہو جاتا۔

''کوئی اطلاع آئی؟''

''نہیں''

''کیوں؟''

''کیا پتہ''

''شاید وقت چانس کی سیٹ مل گئی ہو اور فون کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔''

''ہو سکتا ہے''

''ضرور رستے میں ہوگا''

''اللہ کرے''

بڑا مختلف ایئر لائنز کی فلائٹس کی تفصیل جمع کرلایا تھا مگر پی آئی اے نے رش کی وجہ سے اپنے بعض فلائٹس کو ڈائیورٹ کیا تھا اس لیے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کب اور کس فلائٹ سے پہنچ سکتا ہے۔ افطاری کرتے ہوئے اس کے اندر کی کیفیت گویا ہوئی۔

''اللہ کرے آج چاند دکھائی نہ دے۔''

''ایک روزہ اور رکھنا پڑ جائے گا۔''

''کوئی بات نہیں...... کل تک وہ پہنچ ہی جائے گا۔''

''کل تک بھی کوئی اطلاع نہ آئی تو؟''

''ایسا نہ کہیے مجھے ہول آتا ہے''

مگر چاند نکل آیا اور لوگوں کی عید ہوگئی۔

اندر نصرت فتح علی خان مجبور دلوں پر پھاہار کھنے والی آواز میں گا رہے تھے۔ ''لکھاں عیداں نالوں چنگا سانوں اک دیدار کسے دا'' وہ کچن میں میٹھی سویاں پکاتے ہوئے آنسوؤں کا نمک بہا رہی تھی اور میں کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی مگر لائن کٹ گئی۔ دو تین مرتبہ ایسا ہوا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ دور کا کال ہے وہ کوشش کر رہا ہے مگر رش کی وجہ سے ٹھیک طرح سے لائن نہیں مل رہی۔ اس سے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ وہ خیریت سے ہے مگر یہ سوچ کر ہم مزید اُداس ہو گئے کہ وہ ابھی تک ہم سے دور ہے مگر کہاں؟ اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کیونکہ اس کے بعد فون پہلے کی طرح

پھر خاموش ہو گیا اور رات بھر خاموش رہا۔

اُس کے لیے پھر وہی باورچی خانہ اور میرے لیے ریموٹ کنٹرول۔ مگر آج میں دھڑکتے دل کے ساتھ سی این این اور بی بی سی سے صرف خبروں کے بلیٹن سن رہا تھا اور دل ہی دل میں دنیا بھر کی بسوں گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اور اگر چہ اس کا مختلف پکوان تیار کرنے کا جذبہ کسی حد تک سرد پڑ گیا تھا مگر ان عورتوں کو ایسے تہواروں پر اور بہت سے کام ہوتے ہیں وہ اڑھائی تین بجے اور بیڈروم میں آئی۔ کچھ دیر اُسے یاد کیا، ٹسوے بہائے اور پُرسکون ہو کر سو گئی۔

عید کی صبح میں آنکھوں میں جگراتا لیے اٹھا تو وہ نیچے جا چکی تھی اور کمرے میں اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ وہ عید گاہ جانے کے لیے سب سے پہلے تیار ہوتا اور مجھے آوازیں دینے لگتا تھا۔ جانتا تھا میں ہر بار دیر کر دیتا ہوں اور عموماً آخری صف میں جگہ ملتی ہے۔ مگر آج میں سب سے پہلے تیار ہو گیا کیونکہ دیر تو دیر سے جاگنے کی وجہ سے ہوتی تھی۔

عید گاہ کے رستے میں کھوکھے والے نے بلند آواز میں ٹیپ ریکارڈ لگایا ہوا تھا اور عابدہ پروین گا رہی تھی۔ ''ماواں نوں پیرا بجڑے کھوہنا ایں۔ بھیناں دینا ایں ویر'' مجھے نئے دور کے عالمی پیروں کا خیال آیا اور میرے اُلجھے ہوئے دماغ نے فوراً گیت کی پیروڈی کر ڈالی ''ماواں تو کھوہنا دریا بجڑے کھوہنا ایں۔ بھیناں تو کھوہنا ایں ویر''

عید کی نماز پڑھتے ہوئے میں نے تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیا وہ بڑے اور چھوٹے کے ساتھ میرے پہلو میں کھڑا ہے۔ پھر سلام پھیرا گیا۔ داہنے والوں پر سلامتی اور رحمت۔ باہنے والوں پر سلامتی اور رحمت۔ میری دعا سروں سے لمبی ہو گئی۔ دائیں بائیں آگے پیچھے اور نیچے ہر مقیم اور مسافر پر سلامتی اور رحمت۔ بھورلیہ منگنا رب کولوں اک خیر منگاں تیرے دم دی۔

ہم اس توقع پر گھر لوٹے کہ شاید کوئی اطلاع آئی ہو مگر گھر کے صدر دروازے پر وہی ایک اداس چپ فقیر بن کر بیٹھی ہوئی تھی اللہ کے نام پر ایک اچھی خبر۔

وہ دن بھر مہمانوں کی خاطر تواضع میں لگی رہی اور اس کے لئے کھانے پینے کی چیزیں سینت سینت کر رکھتی رہی۔ یہ اسے پسند ہے۔ یہ اُس کا حصہ ہے۔ یہ کھا کر وہ بہت خوش ہوگا اور میں پتہ نہیں کہاں تھا؟ تھا بھی کہ نہیں۔ اور پھر وہی ہجر اور انتظار کی لمبی رات چڑھ آئی۔ میں طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کرکے اپنے کمرے میں آیا اور اس کی یادوں کی چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ چند برس پہلے جب میرے پیٹ کا ایک نہایت پیچیدہ آپریشن ہوا اور مجھے کئی ہفتے ہسپتال میں رہنا پڑا تھا تو وہ ہر روز ٹیلی فون کرتا اور ڈاکٹروں، نرسوں اور میرے تیمارداروں کو تفصیل پوچھ پوچھ کر پریشان کرتا۔ اور ہر بار اصرار کرتا کہ میری اس سے بات کرائی جائے۔ زخم تازہ اور خراب تھے۔ پٹیوں اور ٹانکوں میں جکڑا ہوا میں ریسپشن کے ٹیلی فون تک نہ جاسکتا تھا اور ٹیلی فون کمرے میں نہ آسکتا تھا۔ مگر وہ ہر روز اصرار کرتا۔ عزیز و اقارب اُسے یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ میں بہتر ہو رہا ہوں مگر اس کا ایک ہی اصرار تھا کہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ جیسے اسے شک ہو کہ ہوں بھی یا نہیں۔ میرا خیال ہے اس کے ایک کولیگ رضوان کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا تھا اس کا اس نے بھی گہرا اثر لیا تھا۔ رضوان کے والد کئی ہفتے کوما میں رہنے کے بعد جا چکے تھے مگر اسے مسلسل یہی بتایا جاتا رہا ہے کہ ڈاکٹروں نے اُنہیں اٹھنے اور بولنے سے منع کیا ہوا ہے۔ تب وہ ایک روز خود چلا آیا۔ گھر پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ اُن کے چالیسویں کی تیاری ہو رہی ہے۔

میں خود بھی اس کی آواز سننا اور اُسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں ہوں۔ آخر ایک روز میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا اور رات کو جب بتائے ہوئے وقت پر اس کا ٹیلی فون آیا تو مجھے سہارا دے کر ریسپشن پر لایا گیا۔ پچاس ساٹھ قدموں کا فاصلہ اتنا طویل اور تکلیف دہ تھا کہ لگتا تھا کہ سارے ٹانکے کھل جائیں گے۔ اور زخموں سے خون بہنے لگے گا۔ مگر اس سے بات کرنے کی تاہنگ مجھے کھینچے لیے چلی۔ جب میں پالنے سے نکلنے والے ناتواں بچے کی طرح پاؤں پاؤں چلتا ریسپشن کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ دنیا کے ہسپتال سائز نقشے کے اندر چل رہا ہوں۔ ہزاروں میلوں کا ایک قدم اسلام آباد، کراچی، فرینکفرٹ، نیویارک، اور بس ایک قدم اور شکاگو۔

ابو یہ آپ ہیں؟

آپ کی آواز کیوں بدلی ہوئی ہے۔

کیا بہت تکلیف میں ہیں؟

آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔

ابو میں فوراً آ جاؤں؟

کئی دنوں کی روکی ہوئی سسکیاں سوالوں کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس رات مجھے سخت درد تھا جس میں بد احتیاطی کی وجہ سے اور اضافہ ہو گیا تھا۔ بس اس کی آواز کے ٹرینکولائزر سے چند منٹ سکون سے گزرے تھے مگر میں نے اس نقاہت، تکلیف اور جذباتی ہیجان میں بھی خود پر قابو رکھا تھا اور اپنی مردانگی پر حرف نہ آنے دیا تھا۔

پتہ نہیں مجھے اُس کی اور ابا کی یاد ایک ساتھ کیوں آ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان کی بھی اس سے بڑی دوستی رہی۔ اپنے پوتوں اور نواسوں میں وہ سب سے زیادہ پیار اسی سے کرتے۔ کئی بار چھٹیوں میں اُسے اپنے ساتھ گاؤں لے جاتے۔ خوب خاطریں کرتے۔ انہوں نے چارہ لانے کے لیے ایک گدھی رکھی ہوئی تھی جس کے ساتھ اس کے بچھڑی بھی تھی۔ انہوں نے اسے گدھی پر سوار کیا تو کہنے لگا۔

''دادا جی...... اس کا ہینڈل کہاں ہے؟''

وہ بہت محظوظ ہوئے اور اس کی رسی تھماتے ہوئے بولے۔ ''یہی اس کا ہینڈل ہے۔'' کچھ عرصہ بعد وہ شہر آئے تو اس نے ان سے گدھی کی خیریت معلوم کی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اور اس کی بچی دونوں بیمار ہو کر مر گئی ہیں۔ اس کا اسے بہت افسوس ہوا اور اس نے محلے کے ہر گھر میں اس کا اظہار کیا کہ دادا جی کی ساری کھوتیاں مر گئی ہیں۔ پڑوسیں اس کی امی کے پاس افسوس کرنے آتیں اور یہ پوچھنا ضروری سمجھتیں کہ کیا تم لوگ پیچھے سے کمہار ہو۔ اس پر ہم سب نے اسے خوب ڈانٹا

پھر جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو گاؤں گیا اور کچھ دنوں بعد اداس ہو گیا۔ ایک روز اپنے

داداجی سے کہنے لگا۔

''میں واپس گھر جانا چاہتا ہوں''

''یہ بھی تو تمہارا اپنا گھر ہے۔''

''میں یہاں بور ہو رہا ہوں''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

ابا بتاتے تھے کہ تب تک انہیں معلوم نہ تھا کہ بور ہونا کیا ہوتا ہے اور نہ ہی وہ کبھی بور ہوئے تھے۔ مگر اس کے بعد وہ بھی بور ہونے لگے۔ اور جب زیادہ بور ہو جاتے تو کرایہ لے کر ہمیں ملنے شہر آ جاتے۔

اس کے امریکہ چلے جانے کے کچھ عرصہ بعد ایک روز میرے ہاتھ پندرہ بیس برس پرانی ڈائری لگ گئی۔ پہلے صفحے پر ایک ضروری نوٹ درج تھا۔

مجھے یاد آیا۔ میں نے اسے سبحان تیری قدرت پکارنے والے کالے تیتر کی ایک من گھڑت کہانی سنائی تھی۔ جو اسے سے قدر پسند آئی کہ اس نے رات کے دس بجے ضد شروع کر دی مجھے ابھی کالا تیتر لا کر دوں۔ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ سردیوں میں کالے تیتر گرم علاقوں کو چلے جاتے ہیں۔ گرمیوں میں واپس آئیں گے تو لا دوں گا۔ مگر اس کا اندیشہ دور نہیں ہو رہا تھا۔ تب میں نے اسے یقین دلانے کیلئے ڈائری نکالی اور اس پر لکھا۔

ضروری نوٹ

گرمیوں میں عامر کو کالا تیتر لا کر دینا ہے۔

اس نے کہا یہ بھی لکھیں کہ بھولنا ہرگز نہیں ہے۔ میں بھی لکھ دیا...... ''بھولنا ہرگز نہیں ہے۔'' تب کہیں جا کر اس کی تسلی ہوئی اور وہ مطمئن ہو کر سو گیا کہ اب گرمیاں آتے ہی ابو کو کالا تیتر لا کر دینا پڑے گا۔ کیونکہ یہ ان کی ڈائری میں لکھا جا چکا ہے۔ وہ ٹھیک ہی سمجھا تھا کہ لکھا ہوا مٹایا نہیں جا سکتا۔ مگر گرمیاں آنے تک مجھے ہی نہیں اُسے بھی بھول گیا۔ لیکن لکھا ہوا اب تک موجود ہے۔ تحریر بڑی

ظالم چیز ہے۔آدمی بھول جائے یا مٹ جائے تب بھی باقی رہتی ہے۔اور یہ وقت کتنا سنگ دل اور تیز رفتار ہے۔ابھی کل کی بات لگتی ہے کہ وہ میری انگلی پکڑ کر چلتا تھا اور اب مجھے مشورے اور ہدایتیں لکھ لکھ کر بھیجتا ہے۔چھوٹی چھوٹی فرمائشیں کرنے اور حقیر حقیر سی چیزوں سے بہل جانے والا اب خود میرے لیے قیمتی تحائف لاتا ہے۔میں بھی ابا کے لیے ہر بار نئے کپڑے،سوئٹر اور گرم چادر وغیرہ لے جاتا تھا اور سمجھتا تھا اُن کے سب دکھ دور ہو گئے۔لیکن کیا چیزیں اور تحائف جدائی کے زخموں کو مندمل کر سکتے ہیں۔

رات کا آخری پہر شروع ہو گیا تھا مگر ٹیلی فون اب تک خاموش تھا۔میں چاہتا تھا کچھ دیر ضرور سو لوں ورنہ بیمار پڑ جاؤں گا۔مگر نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔پتہ نہیں اس وقت کس ملک کے کس شہر میں ہو گا یا کن پانیوں پر اس کا جہاز پرواز کر رہا ہوں گا کمرہ اس کی یادوں سے پٹا پڑا تھا۔

جب وہ بہت چھوٹا تھا میں منہ کی سیٹی میں اس کا نِک نیم پکارتا تھا۔وہ اس سیٹی کو پہچانتا تھا۔گھر میں جہاں کہیں بھی ہوتا میری سیٹی سن کر پالتو جانور کی طرح دوڑتا ہوا فوراً پہنچ جاتا۔اسے اس طرح پکارنے کی میری عادت اس کے ساتھ ہی بڑی ہوتی گئی اور جب وہ میڈیکل میں داخلہ کے بعد بہاولپور چلا گیا تو میں اپنی اداسی کا اظہار اسی سیٹی سے کرتا لیکن جب مجھے احساس ہوا کہ اس کی امی اور آپی پہچاننے لگی ہیں کہ یہ عام سیٹی نہیں میں اُسے یاد کر رہا ہوں تو میں نے سیٹی بجانا چھوڑ دیا۔ ان عورتوں کو پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ میں اندر سے اتنا کمزور ہوں۔

مجھے یاد آ رہا تھا کہ جس روز اس کا ویزا لگا تھا اور وہ جتنا خوش تھا ہم اتنے ہی اداس تھے۔اس کی امی بہت روئی تھیں۔میں نے بھی اس کی آنکھوں سے رو لیا تھا تا کہ اپنی آنکھیں خشک رکھ کر اسے ہمت اور حوصلے سے رخصت کر سکوں۔مجھے یقین ہے کہ میری آنکھیں بھی تر ہو جاتیں تو وہ حوصلہ ہار جاتا اور اپنا جانا موقوف کر دیتا۔رخصت ہوتے وقت وہ بہت پُر جوش تھا۔اس کی آنکھوں میں نئی منزلوں کی چمک اور خواب تھے اور وہ اکیلی ہم دونوں کے حصوں کا رونا رو رہی تھی۔

چند ماہ پہلے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس بار اس کا ٹیلی فون آئے گا تو اسے واپس آ جانے پر قائل

کرنے کی کوشش کروں گا مگر جس روز اس کا ٹیلی فون آیا۔ اس روز ایٹمی دھماکے کی خوشی میں ڈالر کا ریٹ دگنا ہوگیا اور میں چپ ہوگیا...... مالاں توں وِیریا بجوے......!

وہ سو رہی تھی۔ اندیشوں، واہموں اور یادوں سے بے نیاز۔ میں نے اُٹھ کر نیند کی گولی کھائی اور دوبارہ بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے اور یادوں کی جگالی کرنے لگا۔ مجھے یاد آ رہا تھا جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ ہمارے درمیان میں سوتا تھا اور اسے میری یا اپنی امی کے گال پر ہاتھ رکھ کر سونے کی عادت تھی۔ ہاتھ ہٹا دیا جاتا تو جاگ پڑتا یا پھر نیند ہی میں دوبارہ ہاتھ وہیں رکھ لیتا۔ شاید اسے اُس لمس سے سوتے میں تحفظ کا احساس رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہمیں بھی اس کے ہاتھ کی عادت ہوگئی۔ لیکن اب سال دو سال بعد وہ چند دنوں کے لئے آتا ہے تو ہم اُسے پہلے کی طرح بار بار لپٹا نہیں سکتے، پیار نہیں کر سکتے اور اُس کے ہاتھ کو اپنے گال پر رکھ کر سو نہیں سکتے۔ وہ پاس بیٹھا باتیں کرتا رہے اسی کو بہت جانتے ہیں۔ مگر وہ کہاں کھو گیا؟ اُس نے فون کیوں نہیں کیا؟ کیا اس کی عید بھاگ دوڑ یا سفر میں گزری؟ عید کے موقع پر اپنے گھر نہ پہنچ سکنے کا اسے کس قدر ملال ہوگا۔ ان ہی خیالات میں کھویا ہوا میں نہ جانے کب سو گیا۔ سو گیا یا شاید جاگ ڈیٹی میں سپنا دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ میرے پہلو میں لیٹا ہوا ہے اور اس کا ننھا سا ہاتھ میرے گال پر ہے۔ میں اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہوں۔ پھر اس کے ننھے سے نرم نرم ہاتھ کو پکڑ کر چومنا چاہتا ہوں مگر وہ بڑا سخت ہوتا جاتا ہے۔ میں چونکتا ہوں اس کی امی کمرے میں نہیں تھی۔ نیچے کی منزل سے باتوں کا شور سنائی دے رہا تھا اور وہ میرے سرہانے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے لپٹا لیا اور احتیاط کے سارے بندھن توڑ کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

☆☆☆

سلام بن رزاق

کام دھینو

وہ مارچ کی ایک صاف وشفاف صبح تھی اور سورج پہاڑی کے پیچھے سے یوں طلوع ہو رہا تھا جیسے کوئی نٹ کھٹ بالک کسی نئی شرارت کی فکر میں دیوار کی اوٹ سے جھانک رہا ہوں۔صبح کی ہوا کے لطیف اور خوشگوار جھونکے جوار کی فصل کو ہولے ہولے چھیڑتے گزر رہے تھے۔جیسے ماں اپنے بچے کو بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیر رہی ہو۔فضا میں جوار کی مہک بسی ہوئی تھی اور درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔بھرت پور کی اکلوتی بڑی سڑک اور گلیاں تقریباً سنسان تھیں۔البتہ گھروں کے آنگنوں سے بیلوں یک ڈکرانے اور بکریوں کے ممیانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔کسی گھر سے ایک آدھ بچے کی چیخ کر رونے کی آواز بھی آ جاتی۔ایک بنیا اپنی دکان کا ایک پٹ کھولے دکان کی چوکھٹ پر بیٹھا داتون کر رہا تھا۔دو گوالے سروں پر دودھ کی کین رکھے لپ لپ جھپ جھپ گزر رہے تھے۔سامنے سے ایک گوالا سائیکل پر سوار چلا آ رہا تھا۔اس کی سائیکل کے ہینڈل سے دودھ کی خالی کین لٹکی ہوئی تھیں جو سائیکل کے ڈگاڈوں سے ٹکرا ٹکرا کر کھڑ پڑ کھڑ پڑ کر رہی تھیں۔

تبھی بھرت پور میں ایک جیپ گاڑی داخل ہوئی۔جیپ گاڑی کی باڈی پر چاروں طرف سے بڑے بڑے بینرس لگے ہوئے تھے جن پر جلی حرفوں میں مختلف نعرے لکھے تھے۔اور ہر بینر پر سورج کا نشان بنا ہوا تھا۔جیپ گاڑی کے دائیں بائیں پارٹی کے جھنڈے فر فرا رہے تھے۔پیچھے دو بڑے سے بھونپو بھی فٹ تھے۔جیپ گاڑی میں چار پانچ نوجوان بیٹھے تھے۔جیپ گاڑی دھواں اُڑاتی سڑک پر آ گئی۔اور اُسی وقت بھونپو سے آواز آئی۔

''بھرت پور کے باسیو! جاگو غفلت سے جاگو...... ابھی نہیں جاگے تو کبھی نہیں جاگو گے۔دیکھو

رات بیت گئی۔ اندھیرا چھٹ گیا۔ ناانصافی، نابرابری، بھوک اور بے کاری کا اندھیرا ___ نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ یاد رکھو سورج صرف اونچی عمارتوں اور محل دو محلوں کو روشن نہیں کرتا۔ وہ جھونپڑوں، جھگیوں میں بھی اپنا نور بکھیرتا ہے۔ یہ سورج تمہاری خوش حالی اور مسرتوں کا ضامن ہے۔ یاد رکھو سورج کا نشان ___ جاگ اُٹھا ہندوستان ___ جاگو تم بھی جاگو اور اپنے محبوب لیڈر الحاج مرزا اُترا ب علی کو ووٹ دو ___''

''مرزا اُترا ب علی ___ زندہ باد ___''

بھونپو کی آواز سے سب سے پہلے تو بوڑھے اپنی اونگھ سے جاگے۔ پھر جوان آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے۔ بلکہ بعض کو ان کی بیویوں، ماؤں اور بہنوں نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ سب اپنے اپنے بستر شوں سے اُٹھ بیٹھے، دروازے وا ہونے لگے۔ لوگ دروازے کھول کھول کر ورانڈوں چبوتروں، گیلریوں اور سیڑھیوں پر آ کھڑے ہو گئے۔ کھڑکیوں کے پٹ کھلے اور عورتیں گردنیں نکال نکال کر جھانکنے لگیں۔ بچے ماؤں کے کاندھوں کے اوپر سے اور باپوں کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل نکل کر اپنی کیچ بھری آنکھوں کو ملتے، بہتی ناکوں کو اُلٹی ہتھیلیوں سے پونچھتے کچھ تجسس، کچھ استعجاب کا چھچا بنائے، اور نوجوان پیشانیوں پر بل ڈالے اُس طرف نہارنے لگے جدھر سے بھونپو کی آواز آ رہی تھی۔ جیپ گاڑی بھرت پور کی بڑی سڑک پر دھول اُڑاتی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ جیپ کی رفتار بہت دھیمی تھی۔ جیپ کے بھونپو سے اعلان نشر ہو رہا تھا۔

''صاحبو! آیئے، گرام پنچایت کے میدان میں بابائے قوم الحاج مرزا اترا ب علی بہ نفسِ نفیس آپ سے خطاب کرنے تشریف لا رہے ہیں۔''

ایک بوڑھے نے اپنی کیچ بھری آنکھیں مچمچاتے دوسرے بوڑھے سے پوچھا۔

''یہ مرزا اُترا ب علی کون صاحب ہیں؟''

''کوئی نیتا لگت ہیں'' دوسرے کا جواب۔

''نیتا؟ ہمارے جمانے میں تو گاندھی بپا، جواہر لال، مولانا آجاد جیسے لوگ نیتا ہوتے تھے۔

یہ کیسے نیتا ہیں؟''

''یہ نئے جمانے کے نیتا ہیں چاچا!'' ایک نوجوان ـــ

''کتاب کرنے آرہے ہیں۔ کیا مطلب؟''

''کتاب نہیں ـــ خطاب۔''

بھرت پور کے اکلوتے کالج، کیرتی مہاوِدّیالے کے لیکچرر بولے جو کالج میں اردو پڑھاتے تھے۔

''ہاں ـــ ہاں، وہی کھتاب کرنے آرہے ہیں۔ مطلب کیا کرنے آرہے ہیں؟''

''بھاشن دینے آرہے ہیں۔''

''اچھا ـــ بھاشن دینے۔ ہم سمجھے۔ کھتاب مانے کوئی پاٹھ واٹھ کرنے آرہے ہیں۔''

''پاٹھ تو پنڈت لوگ کرتے ہیں کاکا۔ نیتا لوگ بھاشن دیتے ہیں۔''

''ہاں ـــ ہاں مالوم ہے ـــ'' کاکا کو نوجوان لیکچرار کی علمیت ناگوار لگی۔

گرام پنچایت کے اکلوتے میدان میں ایک بڑا سا چوکور سرکاری چبوترا بنا ہوا تھا جس پر ایک چھت بھی پڑی ہوئی تھی۔ اکثر رام لیلا کے ناٹک اور نوٹنکیاں وغیرہ اُسی چبوترے پر کھیلے جاتے۔ ہولی کے موقع پر میدان میں بڑا سا گڈھا کھود کر اُس میں آگ روشن کی جاتی اور ''ہولیکا' کو جلایا جاتا۔ گنپتی کے موقع پر یہاں ایک بہت بڑا گنپتی بٹھایا جاتا۔ محرّم میں اسی چبوترے سے تعزیے، بھی اُٹھتے اور انہیں یہیں لاکر ٹھنڈا کیا جاتا۔ عید میلاد کا جلوس بھی اسی میدان سے نکلتا تھا۔ اور اگر کوئی چھوٹا موٹا منتری یا نیتا اس گاؤں سے گزرتا تو اُس کے اعزاز میں اسی میدان میں جلسہ منعقد ہوتا اور وہ منتری یا نیتا اسی چبوترے سے گاؤں والوں کو خطاب کرتا۔ بھرت پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں ہندو مسلم کی ملی جلی آبادی تھی۔ مگر ان میں پیشے کے اعتبار سے اکثریت گوالوں کی تھی، جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ دس پندرہ کرسچنوں کے بھی گھر تھے اور اُن کا ایک مختصر سا چرچ بھی تھا جہاں وہ اپنی اتوار کی عبادت کیا کرتے تھے۔

بھرتپور کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ یہاں آج تک کوئی فساد نہیں ہوا تھا۔ مُلک میں آئے دن ہونے والے فسادات کی خبریں یہاں بھی پہنچتیں۔ ٹی وی اور ریڈیو سے خبریں نشر ہوتیں مگر بھرت پور کے لوگوں پر ان فسادات کی خبروں کا کوئی خاص ردّ عمل نہ ہوتا۔ بیچارے اپنے مویشیوں میں اور کھیتی باڑی میں ایسے منہمک رہتے کہ اُنھیں ان خرافات کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

ایسا نہیں تھا کہ بھرت پور میں جھگڑے فساد نہیں ہوتے تھے۔ یہ جھگڑے زیادہ تر روزمرہ کی معمولی باتوں پر ہوتے اور بڑے بزرگوں کے بیچ بچاؤ یا پنچوں کے کہنے پر فوراً ختم بھی ہو جاتے۔ ان میں مذہبی فسادات کی بربریت اور شدّت پسندی نہ ہوتی۔ دو ایک دفعہ مذہبی معاملوں پر بھی گرما گرمی ہوگئی تھی مگر گاؤں والوں نے خود ہی مل ملا کر اُسے طے کر لیا تھا۔

سورج آسمان پر اب کئی گز اوپر آ چکا تھا۔ لوگ ایک ایک دو دو کر کے گرام پنچایت کے میدان میں جمع ہونے لگے۔ میدان کے چبوترے کو رنگ برنگی جھنڈیوں اور پتاکوں سے سجا دیا گیا تھا۔ چبوترے پر چار پانچ کُرسیاں اور ایک میز بھی رکھ دی گئی تھی میز پر غلاف بچھا تھا اور اُس پر ایک گلدان رکھا تھا۔ لوگ میدان میں آ آ کر چبوترے کے سامنے بیٹھے جا رہے تھے۔ جن میں بوڑھے اور جوان بھی شامل تھے۔ کچھ نوعمر لڑکے میدان میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ ایک طرف بوڑھوں کے درمیان چلم بھی چل رہی تھی۔ نوجوان ایک دورے کو کہنیوں سے ٹہوکے دیتے کسی مذاق پر رہ رہ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ تبھی میدان میں ایک طرف وہی صُبح والی جیپ آ کر کھڑی ہوگئی جو بھونپو پر بار بار تُراب علی کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔ جیپ کے پیچھے تین چار کاریں بھی تھیں۔ کاروں کے دروازے کھلے اور چند کرتے پاجامے پہنے موٹے تازے لوگ باہر نکلے جو لباس کے اعتبار سے تو سفید پوش تھے مگر جانے کیوں اُن کے کرخت چہرے اُن کے لباس سے ہم آہنگ نہیں تھے___

سب خراماں خراماں چبوترے کی طرف بڑھے۔ سب آگے آگے مرزا تُراب علی چل رہے تھے

جو کالی شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامہ زیب تن کیے ہوئے تھے اور جن کے سر پر فر کی بھوری ٹوپی تھی۔ چبوترے پر کھڑے نوجوانوں نے آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا اور اُنھیں چبوترے پر بچھی کرسیوں پر بٹھایا۔ تُراب علی کی کُرسی سب سے اُونچی تھی۔ ایک نوجوان نے مختصر طور پر مہمانوں کا تعارف کرایا۔ جلسے کی غرض وغایت بتائی۔ دو ایک چھوٹی موٹی تقریریں ہوئیں پھر تُراب علی کے نام کا اعلان ہوا۔

تُراب علی اپنی شیروانی کا دامن سنبھالتے مائک پر آئے۔ میدان میں خاموشی چھا گئی اِدھر اُدھر اُچھلتے کودتے بچوں کو چند لوگوں نے ڈپٹ کر چپ کرایا۔ تُراب علی نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔ ''بھرت پور کے باسیو! ہمارا نام تُراب علی ہے۔ ہم اس گاؤں کے نہیں ہیں۔ اور نہ ہی اس سے پہلے کبھی ہم اس گاؤں میں آئے۔ ممکن ہے آپ نے پہلے ہمارا نام بھی نہ سنا ہو۔ مگر یقین جانئے ہم نے خواب میں بار ہا اس گاؤں کو دیکھا ہے آپ کے چہرے دیکھتے ہوئے ہمیں محسوس ہو رہا ہے ہم ایک ایک چہرے سے آشنا ہیں۔ ہم نے جب بھرت پور آنے کا قصد کیا تو ہمیں بتایا گیا کہ بھرت پور کے باسیوں نے یہ طے کیا ہے کہ وہ صرف اُسی امیدوار کو ووٹ دیں گے جو گوالا برادری سے تعلق رکھتا ہوگا۔ بڑا اچھا فیصلہ ہے۔ اس معاملے میں ہم بھی آپ کے حامی ہیں۔ مگر ہم آپ کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس حلقے سے چودہ امیدوار کھڑے ہیں اور اُن میں ایک بھی گوالا یعنی آپ کی برادری سے تعلق نہیں رکھتا۔ میں بھی گوالا نہیں ہوں مگر میں جو بات کہنے جا رہا ہوں اسے ذرا غور سے سنئے۔ میں ایک سچا ہندوستانی ہوں ساتھ ایک پکا مسلمان بھی ہوں۔ ایک طرف مجھے اس بات پر ناز ہے کہ میرے اجداد نے اس سرزمین سے اتنا پیار کیا ہے کہ اسے فردوس بریں بنا دیا۔ تو دوسری طرف مجھے فخر ہے کہ میں اس رسول کا کلمہ پڑھتا ہوں جس نے دائی حلیمہ کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ دائی حلیمہ کون تھیں؟ ایک گوالن ہی تو تھیں۔ میرا رسولؐ۔ میرا کالی کملی والا گوالا نہیں تھا مگر اس نے دائی حلیمہ کی بکریاں چرائی ہیں۔ اپنے مقدس ہاتھوں سے بکریوں کا دودھ دوہا ہے، ان کی مینگنیاں صاف کی ہیں۔ اُنہیں دُلارا اور پُچکارا ہے۔ بے شک وہ گوالا نہیں تھا مگر

اس نے گوالے کے سارے کام انجام دیئے ہیں اب آپ ہی بتایئے جب میرے نبیؐ دو جہاں کے سردار نے دودھ دوہا ہے اور بکریوں کے گلّے کی نگہبانی کی ہے تو پھر اُن کی امت کا ایک گنہ گار خادم بھلا اس کام سے اپنے آپ کو علاحدہ کیوں کر سمجھ سکتا ہے؟''

چبوترے کے آس پاس کھڑے چند نوجوانوں نے مرزا تُراب علی زندہ باد، کا نعرہ لگایا۔ تُراب علی نے ایک لحہ توقف کیا پھر آگے اُسی جوش سے بولے۔

''آج اِس بھرت پور میں ـــ گوالوں کی اس چھوٹی مگر قدیم بستی میں ـــ میں اپنے آقائے نامدار سرکارِ دو عالم حضرت محمدؐ کی خاکِ پا کے صدقے میں اپنے آپ کو ''گوالا'' برادری میں شامل کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں میں آپ کے سامنے اپنے ہاتھوں سے دودھ دوہ کر یہ ثابت کردوں کہ میں گوالا نہیں ہوں مگر گوالوں سے الگ بھی نہیں ہوں۔''

ایک بار پھر تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے میدان گونج اٹھا۔ تُراب علی کہہ رہے تھے۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس متبرک کام کے لیے بیسیوں حضرات اپنی اپنی گائیں، بھینسیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ گر اس مرحلے میں بھی میرا نبیؐ میری رہنمائی کرے گا۔ یاد کیجئے خدا کے رسولؐ جب مکّہ سے ہجرت کر کے مدینے پہنچے تھے تب مدینے کا ہر شخص اُنہیں اپنا مہمان بنانا چاہتا تھا مگر آپ نے اعلان کیا تھا کہ ـــ

''ہماری اونٹنی جس مکان کے سامنے ٹھہرے گی ہم اُس کے گھر مہمان ہوں گے۔''

اور آپ کی اونٹنی شہر کے آخر میں ایک غریب انصاری کے گھر کے سامنے رُکی تھی اور آپؐ اُسی صحابی کے مہمان ہوئے تھے ـــ ہم بھی حضور کے نقشِ قدم پر چلیں گے اور گاؤں کے آخر میں جس گوالے کا گھر پڑے گا اُسی کے آنگن میں دودھ دوہ کر خود کو آپ کی برادری کا ایک رُکن بنالیں گے۔''

ایک بار پھر مرزا تُراب علی زندہ باد کا نعرہ لگا۔

تُراب علی کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

جلسہ ختم ہوا۔ تُراب علی چبوترے سے نیچے اُترے۔ پارٹی کے رضا کاروں نے اُنھیں گھیر لیا۔ ان کے گلے میں اُن کی ناک تک پھولوں کی مالائیں پڑی ہوئیں تھیں۔ تُراب علی دونوں ہاتھ جوڑ کر سب کو نمسکار کرتے اور سب کے نمسکار قبولتے ایک طرف چلنے لگے۔ لوگ باگ بھی ایک جلوس کی شکل اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ہر دس بارہ قدم پر پارٹی کے رضا کار 'تُراب علی زندہ باد' کے نعرے لگا رہے تھے۔ جلوس گاؤں کی اکلوتی بڑی سڑک سے گزر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنے اپنے گھروں کے سامنے کھڑے متجسس نگاہوں سے جلوس کو دیکھ رہے تھے۔ عورتیں کھڑکیوں اور نیم وا دروازوں کے پیچھے حیرت اور دلچسپی سے جلوس کا نظارہ کر رہی تھیں۔ تُراب علی آگے آگے دونوں ہاتھ جوڑے سراپا، نمسکار، بنے چل رہے تھے۔ بس کو یہی فکر تھی کہ دیکھیں تُراب علی کس کے گھر چل کر دودھ دوہتے ہیں۔

آخر جلوس گاؤں کے باہر آ گیا۔ گاؤں کے باہر ہریجنوں کی بستی تھی۔ اب جلوس ہریجن واڑے سے گزر رہا تھا۔ تھوڑی دور چل کر ہریجن واڑہ بھی ختم ہو گیا اور تُراب علی ایک بے حد شکستہ اور معمولی مکان کے سامنے جا کھڑے ہو گئے۔ یہ مادھو گوالے کا مکان تھا جس کی دیواریں کچی مٹی کی تھیں اور جس کی چھت ناریل اور تاڑ کے پتوں سے چھائی ہوئی تھی۔ باہر اپنے مکان کے کچے چبوترے پر بیٹھا مادھو بیڑی پی رہا تھا۔ اُس کی بیوی دیوار پر گوبر کے اُپلے تھاپ رہی تھی۔ اور پاس ہی دروازے کے سامنے کھونٹے سے ایک چتکبری گائے بندھی ہوئی تھی۔ اُس کی سیاہ پیشانی پر دو سینگوں کے بیچ میں سفید ہلال کا سا نشان بنا ہوا تھا۔ تُراب علی نے مادھو کو پرنام کیا۔ مادھو بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی بیوی نے بھی گھبرا کر اُس ہجوم کو دیکھا اور اپنے گوبر سے سنے ہاتھوں ہی سے آنچل درست کرتی ہوئی گھر میں چلی گئی۔ تُراب علی مادھو کے قریب آئے۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پلٹ کر گائے کو عقیدت اور پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ساتھیو! ہم اسی گیاں کا دودھ دوہیں گے۔ ہم سمجھتے ہیں یہی گاؤں کا آخری مکان ہے۔''

اِدھر اُدھر سے آوازیں آنے لگیں۔

''ہاں یہی ہے--- یہی ہے۔''

مادھو اُن سب کو حیرت اور خوف سے دیکھ رہا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں ایک رضا کار نے آگے بڑھ کر مادھو کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اگر تُراب علی نے اُس کی گائے کا دودھ دوہ دیا تو اس کی یعنی مادھو کی قسمت ہی سنور جائے گی۔

مادھو مٹی کا مادھو بنا منہ کھولے آنکھیں پھاڑ یا یک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ پوری، بات تو اس کی سمجھ میں نہیں آئی مگر وہ اتنا سمجھ گیا کہ اُس کی گائے کا دودھ دوہنے کی بات ہو رہی ہے۔

وہ منع کرنا چاہتا تھا کیونکہ ابھی صُبح ہی اس نے گائے کا دودھ دوہا تھا۔ اس نے منع کرنے کے لئے 'نہیں' میں گردن ہلانی چاہی مگر اپنی عادت کے مطابق جلدی جلدی 'ہاں' میں گردن ہلا دی۔ جو گردن پُشتہا پُشت سے 'ہاں' میں ہلنے کی عادی ہو وہ یکلخت 'نا' میں کیوں کر ہل سکتی تھی۔

رضا کاروں نے ایک دم سے ہو ہلّا کیا کہیں سے چم چم کرتی پیتل کی ایک کلسی آ گئی۔ کوئی ایک بالٹی میں پانی لے آیا۔ تُراب علی نے اپنی شیروانی کی دونوں آستینیں چڑھائیں اور مادھو کی گائے کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے۔ ہجوں نے اُنھیں اور گائے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ رضا کاروں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر ایک حلقہ سا بنایا اور ہجوم کو آگے بڑھنے سے روکنے لگے۔ لوگ ایک دوسرے کے کاندھوں پر سے اُچھل اُچھل کر تُراب علی کو دودھ دوہتا دیکھ رہے تھے۔ بعض لڑکے آس پاس کے درختوں پر چڑھ کر نظارہ کرنے لگے۔ تُراب علی نے لُتے میں پانی لیا اور اپنے ہاتھ دھوئے، پھر گائے کے تھنوں پر پانی ٹپکایا۔ گائے ذرا کسمسائی۔ مگر تُراب علی نے پُچکار کر اُسے شانت کیا۔ پیتل کی کلسی اُس کی ٹانگوں کے نیچے رکھا اور کسی مشاق گوالے کی طرح دونوں ہاتھوں سے اُس کے تھن سہلانے لگے۔ لوگ سانسیں روکے کھڑے تھے۔ سہلاتے سہلاتے تُراب علی نے دفعتاً دونوں مٹھیاں کس کر جو زور سے کھینچا تو 'چرز' کی آواز کے ساتھ سانپ کی زبان کی طرح پتلی مگر پگھلی ہوئی چاندی جیسی سفید دودھ کی دھار پیتل کی کلسی میں گری۔ کئی لوگوں کی زبان سے بے ساختہ 'واہ' نکلی۔ مجمع میں جیسے حیرت اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

تُراب علی ’’چر چر۔۔۔دودھ دوہ رہے تھے اور چاروں طرف نعرہ ہائے تحسین کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ مادھو یہ سب دیکھ رہا تھا وہ کہنا چاہتا تھا۔ ’’بس کرو بھائی، میری گیاں ابھی بیائی ہے بچھڑے کے لیے بھی تو کچھ دودھ رہنے دو۔‘‘ مگر وہ کُچھ نہ کہ سکا۔ چپ چاپ کھڑا حیران آنکھوں سے تُراب علی کو دودھ دوہتا دیکھتا رہا۔ جب کلسی تقریباً ایک تہائی بھر گئی تب تُراب علی اپنے ہاتھ دھوتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوے۔ ایک رضا کار نے آگے بڑھ کر تولیہ پیش کیا۔ تُراب علی تولیہ سے ہاتھ خشک کرتے مادھو کی طرف مڑے۔

’’بھائی مادھو! ہم تمہارے بہت شکر گزار ہیں کہ تم نے ہمیں اپنی گیاں کا دودھ دوہنے کا موقع فراہم کیا۔ تمہاری اس کشادہ دلی کا ذکر ہم ودھان سبھا میں کریں گے اور تمہیں زندگی بھر یاد رکھیں گے۔‘‘

پھر وہ مجمع کی جانب مڑ کر گویا ہوئے۔

’’بھائیو! اب تو آپ لوگوں کو یقین ہو گیا نا کہ تُراب علی آپ کا اپنا بندہ ہے۔‘‘

بیشتر لوگ تو چپ رہے مگر پارٹی کے رضا کار ’’جی ہاں، جی ہاں، کہتے ہوئے گردنیں ہلانے لگے۔ رضا کاروں نے مجمع کو ہٹا کر تُراب علی کے لیے راستہ بنایا۔ اور تُراب علی تیز تیز چلتے ہوئے اپنی کار میں جا کر بیٹھ گئے۔ پارٹی کے دوسرے لوگ بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ اور کاروں کا یہ قافلہ تُراب علی زندہ باد، کے نعروں میں دھول اڑاتا ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ گاؤں کے بچے شور مچاتے تھوڑی دور تک کاروں کے پیچھے بھاگے مگر کاریں جلد ہی دور نکل گئیں۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔ مادھو اپنی گائے کے پاس کھڑا اُس غبار کی جانب دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے تُراب علی اور اُن کی کاروں کا قافلہ روپوش ہو گیا تھا۔ گائے اپنی دُم سے مکھیاں اڑاتی، کنوتیاں ہلاتی دھیرے دھیرے جگالی کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی لاتعلقی تھی اور اس کے پیروں کے پاس وہ پیتل کی کلسی لڑھکی پڑی تھی جس میں ابھی ابھی تراب علی نے دودھ دوہا تھا۔ کلسی کا دودھ فرش پر بہ کر مٹی میں جذب ہو چکا تھا اور آس پاس مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مادھو

دھیرے دھیرے چلتا ہوا گائے کے پاس آیا پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ گائے نے ایک جُھرجُھری سی لی۔ مادھو دوبارہ اپنے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا۔ مادھو کی گھروالی جو ابھی تک دروازے کی اوٹ سے سارا تماشا دیکھ رہی تھی دروازہ کھول کر باہر آئی۔ اس کی گود میں اُن کا تین سال کا کالا کلوٹا مریل سا بچہ تھا۔ جس کے ہاتھ پاؤں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے مگر پیٹ ڈھول پر مڑھے چمڑے کی مانند تنا ہوا تھا۔ بچہ متواتر ریں ریں کیے جا رہا تھا۔ بیوی نے مادھو سے پوچھا۔

''کون تھے یہ لوگ؟''

''مالوم نہیں ـــــ'' مادھو نے جیب سے بیڑی نکالی۔

''اُنہوں نے اپنی گیاں کا دودھ کیوں دوہا ـــــ؟''

''مالوم نہیں ـــــ'' مادھو نے بیڑی ہونٹوں میں دبالی۔

''تم نے پوچھا نئیں؟''

''پوچھا تھا ـــــ مگر انہوں نے جو کچھ بتایا میری سمجھ میں نہیں آیا ـــــ'' مادھو نے بیڑی سلگا کر ایک گہرا کش لیا۔

''ارے اُنہوں نے جبر دستی اپنی گیاں کا دودھ نکالا اور تم بولتے ہو میرے کو مالوم نئیں۔ اور اُس پر ظلم یہ کہ بنا کھائے پیئے پورا دودھ گرا دیا اور چلے گئے۔''

مادھو کچھ نہیں بولا۔ وہ دور خلاء میں دیکھتا بیڑی کے کش لے رہا تھا۔ اس کی بیوی تھوڑی دیر تک بک بک جھک جھک کرتی رہی جب دیکھا کہ مادھو ٹس سے مس نہیں ہو رہا ہے تو اپنے ریں ریں کرتے بچے کی پیٹھ پر ایک دھپ لگائی اور پیر پٹکتی ہوئی اندر چلی گئی۔

ابھی سورج نصف النہار پر نہیں آیا تھا۔ بھرت پور کے چھوٹے سے بازار کی ساری دکانیں کھل گئی تھیں۔ جن کی کل تعداد چار چھ سے زیادہ نہیں تھی۔ روزانہ صبح سڑک کے کنارے سبزی بیچنے والی عورتیں اپنی ٹوکریاں تقریباً خالی کر چکی تھیں بلکہ دو ایک نون تیل اور بچوں کے لیے چنا سینگ خرید کر اپنے گھروں کو سدھار بھی چکی تھیں۔ کاشی رام کے، سدانند ہندو ہوٹل، میں تھامسن ایلوا ایڈسن

کے زمانے کا پرانا گراموفون بج رہا تھا۔ ''آہیں نہ بھری، شکوے نہ کیے، کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا'' کاشی رام کرسی پر بیٹھا کاؤنٹر ٹیبل پر اپنی انگلیوں سے بے آواز تال دے رہا تھا۔ ہوٹل میں چار پانچ میلی کچیلی میزیں لگی تھیں جن پر ڈھیر ساری مکھیاں بھن بھنا رہی تھیں۔ صرف دائیں کونے کی ایک میز پر بنڈی دھوتی پہنے دو لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہوٹل کا اکلوتا ویٹر چڈی بنیان پہنے، دائیں کاندے پر میلا سا تولیہ ڈالے ایک کونے میں پیر پر پیر رکھے کھڑا گانے کی دھن پر اپنا گھٹنا ہلا رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے جمنا داس پان والے کی پان پٹی کی دکان تھی۔ دُکان میں شمسو ٹانگے والا اپنے ٹانگے میں بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا تھا۔ اور اس کے ٹانگے میں جُتی کنگال گھوڑی کنوتیاں پھٹ پھٹاتی، اپنی دُم سے بار بار مکھیاں اڑا رہی تھی۔ پاس ہی تین چار لونڈے ایک دوسرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھے صُبح تُراب علی کے دودھ دوہنے کا واقعہ کو لے کر ہنسی ٹھٹھا کر رہے تھے۔

یکا یک کہیں سے شنکھ پھونکنے کی آواز آئی۔ شنکھ پھونکنے کے فوراً بعد ڈھم ڈھم ڈھول بجنے لگا۔ لونڈے چونک کر آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ شمسو ہڑ بڑا کر نیند سے جاگا۔ جمنا داس نے ٹرانزسٹر کا کان اینٹھا۔ کاشی رام نے بھی گراموفون بند کر دیا۔ اتنے میں سامنے سے بیل گاڑیوں کا ایک جلوس آتا دکھائی دیا۔ سب سے آگے جو بیل گاڑی تھی اُس پر ایک شخص کھڑا بھونپو سے منہ لگائے چیخ رہا تھا۔

''بھرت پور کے باسیو! کبھی کبھی ایک صحیح فیصلہ اتہاس کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ اور اب سمے آ گیا ہے کہ آپ پنڈت اونکار ناتھ کو ووٹ دے کر ایک نئے اِتہاس کی شروعات کریں۔ پنڈت جی بھرت پور والوں کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ پنڈت جی کے پتا شری پنڈت ہزاری پرساد کے نام سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ وہی ہزاری پرساد ہیں جنھوں نے آنند پور میں مہا لکشمی کا بھویہ مندر بنایا ہے اور جس کی سالانہ جاترا میں آپ لوگ بھی شریک ہوتے ہیں۔ پتا شری تو دھرم کی سیوا کر رہے ہیں مگر پنڈت اونکار ناتھ، لوک سیوا، میں وشواس رکھتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی آواز ودھان سبھا تک پہنچے تو پنڈت اونکار ناتھ ہی کو ووٹ دیجیے کیونکہ پنڈت اونکار ناتھ کی آواز

آپ کی آواز ہے۔ پنڈت جی کا نشان ہے "رتھ" رتھ جو ہمارے دھرم، ہماری سنسکرتی اور ہماری راشٹر کا پرتیک ہے۔ "پنڈت اونکار ناتھ زندہ باد، اُس بیل گاڑی کے پیچھے تقریباً بیس پچیس بیل گاڑیاں چلی آ رہی تھیں۔ ہر گاڑی میں دس دس بارہ بارہ نوجوان کھڑے چیخ چلا رہے تھے، ناچ رہے تھے۔ اودھم مچا رہے تھے۔ ایک بیل گاڑی پر ایک بہت بڑے رتھ کا ماڈل بنا ہوا تھا، اُس رتھ پر اونکار ناتھ ایک عدد دلآ ویز مسکان چپکائے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ اور جھک جھک کر سڑک کے دونوں طرف کھڑے لوگوں کو پرنام کر رہے تھے۔

گاؤں کے بے کار نوجوان اور آوارہ گرد چھوکرے گاڑیوں کے آس پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک بار پھر گھروں کی کھڑکیوں ورانڈوں اور مکانوں کے چھجوں کے نیچے انسانی سروں کا جنگل اُگ آیا۔

ڈھم ڈھم ڈھول بج رہا تھا۔ شنکھ پھونکے جا رہے تھے اور بار بار پنڈت اونکار ناتھ کی جے جے کار ہو رہی تھی یکا یک پنڈت جی نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے۔ دفعتاً ڈھول اور شنکھ خاموش ہو گئے، نعرے رُک گئے۔ اور چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ ایک نوجوان نے لپک کر بھونپو پنڈت جی کے سامنے کر دیا اور پنڈت جی نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔

"بھرت پور کے باسیو! ہمارا آپ کا سمبندھ بہت پرانا ہے۔ میرا پریچے تو ابھی ابھی دیا جا چکا ہے۔ میں اپنے بارے میں زیادہ باتیں کرنا یا سننا پسند نہیں کرتا۔ میں اپنا اصلی پریچے تو آپ لوگوں کو اُسی وقت دے سکوں گا جب آپ مجھے چن کر ودھان سبھا میں بھیجیں گے۔ میں جانتا ہوں بھرت پور والے بڑے کام کاجی لوگ ہیں وہ فالتو راج نیتی میں اپنا سمے نشٹ نہیں کرتے مگر یہ بھی سچ ہے کہ راج نیتی کے بنا اس دیش کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ ایک صاف ستھری حکومت بنانے کے لئے آپ جیسے بے غرض لوگوں کو آگے بڑھنا ہوگا۔ دو گھنٹے پہلے جو مہاشے یہاں بھاشن دینے آئے تھے اُن کا بھرت پور سے دور دور تک کوئی سمبندھ نہیں۔ میں کہتا ہوں صرف دودھ دوہنے سے کوئی جاتی برادری والا نہیں ہو جاتا۔ اُنہوں نے محمد پیغمبر کی مثال دی کہ وہ بکریاں چراتے تھے اور دودھ

دوہتے تھے اس پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں اِن مثالوں کے لیے آخر سمندر پار جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارے پُرانوں میں سب سے بڑی مثال تو ماکھن چور نند لال ہری گوپال کی ہے۔ مجھے بتایئے شری کرشن سے بڑا گوالا اس دھرتی پر پیدا ہوا ہے۔ نہیں نا۔ تو پھر سُن لیجئے ہمارا یعنی پنڈت اونکار ناتھ کا رشتہ سیدھے کرشن گوپال ہی سے جُڑتا ہے۔"

'پنڈت اونکار ناتھ کی جے'، کے نعرے سے پورا میدان گونج اٹھا۔ پنڈت جی لمحہ بھر کو رُک کے پھر بولے "ہم اسی وقت چل کر اپنے ہاتھوں سے آپ کو دودھ دوہ کر بتائیں گے۔ اور اسی گئو ماتا کا دودھ دوہیں گے جس کا اس سے پہلے دوہا گیا۔ ارے پرائے آکر ہماری ماتا کا دودھ دوہ لیں اور ہم جو اُس کی سنتان ہیں اپنی ماتا کے کشیر امرت سے محروم رہ جائیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

ایک بار پھر بیل گاڑیوں کا جلوس مادھو کے گھر کی طرف بڑھا۔ چھوکرے بالے گاڑیوں کے پیچھے ہو لیے کچھ اور لوگ بھی جو مفت کی تفریح کے دلدادہ تھے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر مادھو کے گھر کی طرف چلے ڈھول بجاتا، شنکھ پھونکتا اور نعرے لگاتا ہوا جلوس مادھو کے گھر کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ مادھو جلوس کو دیکھ کر ایک بار پھر سٹپٹا گیا۔ سٹپٹا کر کھڑا ہو گیا۔ پنڈت اونکار ناتھ دھوتی کا چھور سنبھالتے اپنی رتھ گاڑی سے اُترے۔ مادھو کے پاس آئے۔ مادھو منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ پنڈت جی سفید براق لباس میں آسمانی دوت معلوم ہو رہے تھے۔ اُن کی چوڑی روشن پیشانی پر سُرخ تلک اُن کی شخصیت کو مزید جاذب نظر بنا رہا تھا۔ پندت جی مادھو کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے۔

"مادھو! ہم تم سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی گیاں کا دودھ دوہنے کی اجازت دو۔ ہم اپنے ہاتھوں سے دودھ دوہ کر یہ ثابت کر دینا چاہتے ہیں کہ اصلی گوالے ہم ہیں۔"

اور اس سے پہلے کہ مادھو ہاں یا نا کہتا پھر کوئی ایک پیتل کا بھانڈ لے آیا۔ پنڈت اونکار ناتھ نے کہا۔ "ہم دودھ دوہنے سے پہلے گئو ماتا کی شدھی کریں گے۔ پرائے ہاتھوں کے لمس سے ماتا اپوتر ہو گئی ہے۔" تُرنت کئی دوڑ کر مندر کے پجاری سے پنچ پاتر میں گنگا جل لے آیا۔ پنڈت اونکار

ناتھ نے اپنے گلے سے سونے کی زنجیر نکالی اور اُسے گنگا جل میں ڈبویا۔ پھر خود زیرِ لب کوئی منتر پڑھتے ہوئے گائے پر گنگا جل کے چھینٹے دینے لگے۔ تھوڑا سا گلال گائے کی پونچھ پر لگایا۔ اور دودھ دوہنے بیٹھ گئے صبح سے دو دفعہ دودھ دوہا جا چکا تھا۔ تھنوں میں ہاتھ لگاتے ہی گائے نے پچھلا پاس جھٹکا اور بھانڈا لڑھک کر دور جا پڑا۔ پنڈت اونکار ناتھ منتر بُدبداتے ہوئے اٹھے اور گائے کے پُٹھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے چمکارا۔ دونوں ہاتھ جوڑے کر گائے کو پرنام کیا۔ ایک رضا کار نے بھانڈا لا کر پھر گائے کے تھنوں کے پاس رکھ دیا اور پنڈت جی دوبارہ دودھ دوہنے بیٹھ گئے۔ گائے کو پُچکارتے پُچکارتے تھنوں کو تھام لیا۔ گائے نے کوئی تعرّض نہیں کیا۔ تھوڑی دیر تک اُس کے تھنوں کو سہلا کر انھوں نے جو کھینچا تو سفید دودھ کی دھار سیدھی بھانڈے میں گری ''ہر ہر مہادیو'' کے نعرے سے بھرت پور گونج اٹھا۔ تقریباً پاؤ بھانڈا دودھ دوہنے کے بعد پنڈت جی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پنڈت جی نے محسوس کرلیا کہ گائے کے تھنوں میں اب دودھ کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں ہے۔ اُدھر گائے بھی دوبارہ پاؤں جھٹکنے لگی تھی۔

کُچھ لوگوں نے بڑھ کر پنڈت جی کے گلے میں پھول مالائیں ڈالیں۔ پنڈت جی نے وہ ساری پھول مالائیں گائے کے گلے میں ڈال دیں۔ ایک بار پھر پنڈت جی کی جے جے کار ہوئی۔ پنڈت جی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مادھو کہاں ہے؟''

''وہ اُدھر کھڑا ہے۔'' کسی نے اشارہ کیا۔

مادھو اپنے شکستہ مکان کے دروازے پر حیران و پریشان کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ ایک دوسرے پر اس قدر سختی سے جمے ہوئے تھے کہ لگتا تھا اب وہ قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ پنڈت جی بڑی اپنائیت سے آگے بڑھے اور مادھو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''دھنیہ ہو مادھو! ___ تم اور تمہاری گائے آج پورے راشٹر کی آتما کا پرتیک بن گئے ہیں۔''

مادھو کُچھ نہ بولا ___ وہ بولتا بھی کیا۔ پوری صورتِ حال اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی

جارہی تھی۔ پنڈت اونکار ناتھ اپنی رتھ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ بیل گاڑیوں کا قافلہ نعروں سے گونج میں دھول اڑاتا، شنکھ پھونکتا، ڈھول بجاتا ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ بیل گاڑیوں کے ساتھ آئے ہوئے گاؤں والے اور چھوکرے بالے بھی واپس اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

اب سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا اور سایے لمبے ہوتے جارہے تھے۔ لوگ دوپہر کا بھوجن کر کے چارپائیوں ورانڈوں اور آنگنوں میں پیڑوں کے نیچے بیٹھے بیڑی اور چلم پیتے اور تمباکو چونا کھاتے ہوئے آج کے جلسوں جلوسوں اور نیتاؤں کے دودھ دوہنے کی باتوں کو لے کر اپنی اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق خیال آرائیاں کررہے تھے۔ کچھ لوگ مرزا اثراب علی کی بھلمنساہت اور سادگی کی تعریف کررہے ہیں تھے اور کچھ پنڈت اونکار ناتھ کے علمی گھرانے اور ان کی قومی اسپرٹ کے گُن گارہے تھے۔ اُدھر مادھو اپنے گھر کے دروازے کے سامنے فکرمند بیٹھا تھا۔ آج اس نے دوپہر کی روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھائی تھی۔ بیوی نے جوار کی دو موٹی روٹیوں کے ساتھ بینگن کا ساگ پروسا تھا۔ آدھی پیاز کی ڈلی بھی رکھی تھی مگر وہ بڑی مشکل سے صرف ایک روٹی اور تھوڑا سا ساگ حلق سے اتار سکا۔ پھر غٹ غٹ آدھا لوٹا پانی پی کر دھوتی سے منہ پونچھتا دہلیز میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ سامنے بندھی گائے کو غور سے دیکھا گائے اپنے آگے پڑی خشک گھاس کی پتیوں کو دھیرے دھیرے چبارہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں کوئی بھاؤ نہیں تھا۔ مادھو نے اُسے تشویش سے دیکھا۔ بیڑی کے دو تین کش لیے گھٹنوں میں سرڈال کر بیٹھ گیا۔ بیوی نے روٹی کھائی، بچے کو روٹی کھلائی، برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھے اور ایک کونے میں بوریا ڈال کر بچے کو پہلو میں لیے لیٹ گئی۔ اُس نے مادھو سے اُس کی چنتا کا سبب بھی نہیں پوچھا۔ پوچھنا بھی فضول تھا۔ مادھو ایک ہی جواب دیتا۔ ''مالوم نئیں——''

مادھو دروازے میں بیٹھے بیٹھے اپنے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے اونگھ گیا۔

اتنے میں چاروں طرف سے تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ جیسے زبردست آندھی آرہی ہو۔ مادھو کا شکستہ مکان خشک ٹہنی کی طرح کانپنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس نے دیکھا کہ بے شمار مویشی جن میں

گائیں، بیل، بھینسیں، اور سانڈ بھی شامل تھے دندناتے چلے آرہے ہیں۔تب اُسے پتا چلا کہ دراصل وہ آندھی نہیں تھی بلکہ اُن جانوروں کے دوڑنے کی دھمک سے زمین کانپ رہی ہے۔مگر یہ کیا؟

اُن جانوروں میں سب سے آگے اُس کی اپنی گائے تھی اُس کی آنکھیں اُلٹی ہوئی تھیں، نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے اور منھ سے جھاگ نکل رہا تھا۔وہ سر کو جھکائے دونوں سینگیں آگے کیے سیدھے اُسی کی طرف دوڑتی چلی آرہی تھی۔گویا صرف ایک ہی ٹکر میں اُسے دھرتی کے دوسرے سرے پر اُچھال دے گی۔وہ گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اُسے روکنے کا اشارہ کیا مگر گائے کی رفتار میں رتی برابر فرق نہیں آیا۔گائے قریب آتی جارہی تھی۔قریب اور قریب۔مارے خوف کے اُس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔اچانک اسے ٹھسکا لگا اور اس نے کھانستے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔سامنے گائے اُسی طرح کھونٹی سے بندھی دُم سے مکھیاں اڑاتی آہستہ آہستہ منہ چلا رہی تھی۔مادھو نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور ہونٹوں پر دو اُنگلیاں رکھ کر اُنگلیوں کی جھری میں سے منہ میں بھر آئے لُعاب کو 'پچ' سے تھوکا۔

اچانک اُسے ایک بار پھر لوگوں کے نعروں کی آوازیں سنائی دیں۔اُس نے کسی متوحش جانور کی طرح اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔نعروں کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔تبھی اُس نے دیکھا کہ گاؤں کی اُسی اکلوتی سڑک پر ایک اور جلوس چلا آرہا ہے۔آگے آگے کوئی شخص دھوتی کرتا پہنے گلے میں پھولوں کی مالائیں ڈالے چل رہا تھا اور اس کے پیچھے کچھ لوگ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر نعرے لگا رہے تھے۔چند لمبے بالوں اور دُبلے جسموں والے نوجوان کسی چالو فلم کی دُھن پر ناچ بھی رہ تھے۔

ایک آدمی۔دھوتی کرتا پہنے گلے میں پھولوں کی مالائیں ڈالے چل رہا تھا اور اس کے پیچھے لوگ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر نعرے لگا رہے تھے۔چند لمبے بالوں اور دبلے جسموں، والے نوجوان کسی چالو فلم کی دُھن پر ناچ بھی رہے تھے۔

مادھو ایک سے کھڑا ہوگیا۔جلوس والے اُس کے سامنے آکر رُک گئے۔دھوتی کرتے والے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مادھو کو پرنام کیا اور اپنے زردی مائل دانتوں کی نمائش کرتا خواہ مخواہ 'ہی ہی'

کرنے لگا۔ پھر بولا۔

''مادھو بھاے! میرا نام بابو راؤ ہے۔ گریب لوگوں کی سیوا کے واسطے الیکشن میں کھڑا ہوں۔ میں بھی پہلے تمہارے ما فک گریب تھا۔ ابھی اپنے کو بھگوان نے دو پیسہ دیا ہے پن میں گریبی کو نہیں بھولا۔۔۔ گریب ہی گریب کے کام آتا ہے۔ یہ پیسے والے ایک نمبر کے حرامی ہوتے ہیں۔ گریب کا کھون چوستے ہیں۔ سالے جونک ہوتے ہیں جونک۔۔۔ میں نے سنا ہے میرے سے پہلے اِدھر دو نیتا لوگ آ کر گئے۔ تمہاری گاے کا دودھ بھی نکالا۔ دونوں پاکھنڈی تھے۔ کھالی دودھ نکالنے سے کوئی گوالا نہیں ہو جاتا۔ ارے میں تو بچپن سے گاؤ ماتا کی سیوا کرتا آیا ہوں، اس کا گوبر اُٹھانا، اسے نہلانا، اس کا دودھ نکالنا اپنی گھٹی میں پڑا ہے۔ یہی اپنا کام ہے۔ دودھ کیسے نکالا جاتا ہے میرے سے پوچھا۔ مادھو بھاے میرے کو اپنی گاے کا تھوڑا دودھ نکالنے دو......''

مادوھ نے تُرنت بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں، بھگوان کے لیے۔۔۔ اب اور نہیں۔۔۔ گاے کے تھن میں اب ایک بوند بھی دودھ نہیں ہے۔ میں اب اسے ہاتھ لگانے نہیں دوں گا۔

''مادھو بھائے! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر میں نے تمہاری گاے کا دودھ نہیں نکالا تو بڑی بے اِجتی ہوگی کیونکہ وہ لوگوں نے تمہاری گاے کا دودھ نکالا ہے۔ میں تھوڑا سا نکالوں گا جادا نہیں۔۔۔ مادھو بھاے! گریب کی اجت گریب کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔''

مادھو نے بہت منع کیا مگر بابو رائے ہاتھ جوڑ کر ایک ہی بات دوہراتا رہا۔

''گریب کی اِجت گریب کے ہاتھ میں ہے۔'' بابو راؤ کے ساتھیوں نے بھی مادھو کو سمجھایا۔ دو چار اُسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ ہر کوئی اُسے سمجھا رہا تھا۔ وہ بار بار منع کر رہا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اُنہیں کیسے سمجھائے۔ کیسے منع کرے کیونکہ وہ تو اس کی سن ہی نہیں رہے تھے صرف اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

پھر پتا نہیں کب اور کیسے ایک لوٹا منگوالیا گیا۔ اور مادھو نے دیکھا کہ بابو راؤ اُس کی گائے کے

پیروں کے پاس بیٹھا اُسے پچکار رہا ہے۔ مادھو کے نرغے میں گھرا ایک عجیب سی بے بسی کے ساتھ یہ سب دیکھ رہا تھا۔ گائے بے چینی سے پچھلے پاؤں جھٹک رہی تھی۔ بار بار دُم ہلا رہی تھی۔ دائیں بائیں سینگ چلا رہی تھی۔ مگر بابوراؤ بھی کافی ضدی تھا۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح اس کے تھنوں سے تھوڑا سا دودھ نچوڑ ہی لیا۔۔۔ بابورائے کے چھوکرے ایک بڑا سا دائرہ بنا کر ''گوبندا آلا رے آلا'' گانے لگے۔۔۔ مادھو آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر جانے کب بابورائے نے اسے دھنیہ واد کہا۔ کب وہ لوگ وہاں سے رخصت ہوئے۔ مادھو کو کچھ بھی یاد نہیں۔ جب اُس کے حواس ذرا درست ہوئے تو اُس نے دیکھا کہ سب لوگ جا چکے ہیں اور پچھم کی طرف سورج چند گز اور جھک گیا ہے اور پہاڑی کے پیچھے جیسے کسی نے بہت بڑا الاؤ روشن کر دیا ہے۔ پھر اس نے اپنی گائے پر نگاہ ڈالی اور ایک دم سے چونک گیا۔ گائے اب زمین پر بیٹھ چکی تھی بلکہ لیٹ چکی تھی۔ اس کا جُگالی کرتا منھ بھی بند تھا اور اُس کی سفید سفید شیشہ آنکھوں کے ڈھیلے کافی پھیل گئے تھے۔ اُس نے اُس کے تھنوں کی طرف دیکھا۔ تھن سوجے ہوئے سے لگ رہے تھے اور رنگ بھی گہرا گلابی ہو گیا تھا۔ اُسے لگا اگر اب کے اُنھیں کسی نے ذرا سا بھی چھیڑا تو بجائے دودھ کے خون کے سُرخ سُرخ سطرے ٹپکنے لگیں گے۔ وہ گائے کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اُس کا ماتھ سہلانے لگا۔ پھر قریب پڑی خشک گھاس کے چند تنکے اُس کی طرف بڑھائے گائے گھاس کھانے کی بجائے اُس کا ہاتھ چاٹنے لگی۔ مادھو کا دل بھر آیا۔ اور وہ منہ سے چ۔۔۔ چ۔۔۔ کی آواز نکالتا ہوا اسے پچکارنے لگا۔۔۔ جانے وہ کتنی دیر تک گائے کے پاس بیٹھا اُسے پچکارتا چُمکارتا رہا۔ شام کے سایے لمبے ہونے لگے تھے۔ آسمان پر بگلوں کی ایک ڈار اُڑتی ہوئی کسی طرف کو جا رہی تھی۔ پہاڑ اور جنگل سے ڈھور لوٹ رہے تھے۔ گڈریے چھوکروں کی ایہہ، ایہہ، ٹر، ٹر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مادھو گائے کے پاس سے اُٹھ کر دوبارہ اپنی دہلیز پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی خوف زدہ نظریں گاؤں کی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔۔۔ اگر چہ سڑک پر دور تک کوئی راہ گیر دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر نہ جانے کیوں اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ ●●

انور عنایت اللہ

سہاگ

جب سے شہر میں دن دہاڑے ڈاکے پڑنے لگے تھے، ہم گھر کا دروازہ کھولنے اور بند کرنے کے معاملے میں بڑی احتیاط برتنے لگے تھے۔ انسان پچھتر سال کی عمر کے لپیٹ میں ہو تو ہر چیز میں احتیاط برتنی ہی پڑتی ہے چلنے پھرنے میں، کھانے پینے میں، سونے جاگنے میں، ہنسنے بولنے میں بھی، کیونکہ بڑھاپے میں، حفظِ مراتب کا خیال ذرا مشکل ہی سے آتا ہے۔

کل دوپہر کو کھانے کے بعد لیٹا ہی تھا کہ کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔

''اس وقت کون ہوسکتا ہے؟'' میری بیوی نے لیٹے ہی لیے کہا۔ پھر بڑبڑائی۔ ''تمہارے پرستار ہی ہوں گے۔ انہیں تم بھی دوپہر یا میں یاد آتے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بیزاری سے اٹھی اور آہستہ آہستہ دروازہ کی طرف بڑھی تو میں نے جلدی سے کہا۔

''اچھی طرح دیکھ بھال کر دروازہ کھولنا۔''

''ہاں ہاں ___ یاد ہے مجھے ___ پر ہمارے پاس ہے کیا جو ڈاکو آئیں گے ___ اور وہ بھی دن دہاڑے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ دروازے پر رُک گئی شیشے کی آنکھ والے ننھے سے سوراخ سے باہر جھانک کر دیکھا اور مڑ کر بولی۔

''میرا خیال ٹھیک تھا ___ تمہاری ہی مہمان ہے ___ لڑکی ہے، خوش شکل اور جوان!'' لہجے کا طنز واضح تھا۔ یہ سن کر میں اُٹھ بیٹھا۔ اتنے میں آنے والے نے دوبارہ بے چینی سے گھنٹی بجائی۔ میں نے جلدی سے ڈریسنگ گاؤن پہنا۔ اتنے میں بیوی نے زور لگا کر پہلے دروازے چٹخنی کھولی جو امریکہ سے آئی تھی اور اس کا خودکار تالا۔

دروازہ کھلتے ہی، اس سے پہلے کہ وہ پوچھتی کہ بی بی آپ کون ہیں اور کس سے ملنے آئی ہیں، ایک جوان لڑکی اندر آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی، اس کے پیچھے پیچھے دو ہٹے کٹے نوجوان، جو قمیص پتلون میں تھے اور سب نے سیاہ عینکیں لگا رکھی تھیں۔ اندر آتے ہی لڑکی نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔ اور نوجوانوں نے پستول تان لئے ایک نے آہستہ سے کہا۔

''شور مچانے کی کس میں ہمت تھی۔ معقول کام کرنے کی ہمت تو پاکستان آتے ہی عین جوانی میں چلی گئی تھی۔ بیوی تو سدا کی ڈرپوک تھی۔ اس پر خوف سے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ ڈاکو ہمیں ہانک کر ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ بیٹھنے کا حکم دیا تو ہم دونوں فوراً بیٹھ گئے۔ ایک نوجوان کو برآمدے میں وہ رسّیاں پڑی نظر آ گئیں جنہیں باندھ کر ہمارے قصاب نے پچھلے ہفتے بھینس کی قربانی کی تھی۔ وہ یہ رسّیاں لے آیا۔ ہمیں ادب سے کرسیوں پر بٹھایا اور پھر لڑکی میری بیوی کے ہاتھ پاؤں باندھنے لگی۔ اس نے جوں ہی رسّی کو اس کے گرد لپیٹا میں نے فوراً کہا۔

''خدا کے لئے کس کر نہ باندھنا ـــــ چند مہینے ہوئے اس کا بائی پاس ہوا تھا۔''

''فکر نہ کریں انکل!'' صاحبزادی بولیں ''ہم احتیاطاً برائے نام باندھ رہے ہیں۔''

جب میری باری آئی تو بیوی نے تڑپ کر درخواست کی ـــــ ''ذرا احتیاط سے بیٹی ان کے تو دو بائی پاس ہو چکے ہیں۔ ہائی بلڈ پریشر بھی ہے انہیں ـــــ دل کے پرانے مریض ہیں۔''

یہ سنتے ہی ایک نوجوان جو پستول لئے میرے قریب کھڑا تھا آہستہ ہنسنے لگا۔

''کمال ہے بھئی ـــــ لگتا ہے، بائی پاس نے آپ کے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے''!

اس کی بدتمیزی کا بڑھاپے میں کیا جواب دیتا؟ صبر کے گھونٹ پی کر خاموش رہا۔

جب ہمیں باندھنے کی کارروائی مکمل ہو گئی تو لڑکی نے پیار سے پوچھا۔ ''چابیاں کہاں ہیں آنٹی؟''

''ہمارے یہاں کوئی ایسی قیمتی چیز نہیں ہے جسے تالے میں بند رکھیں۔'' میری بیوی نے جل کر مریل آواز میں جواب دیا۔

''جھوٹ نہ بولیں آنٹی!۔۔۔ ہمیں معلوم ہے۔ پچھلے کئی سال سے آپ کی بیٹی اور دونوں بیٹے ہر ماہ ڈالر بھیج رہے ہیں۔ یہ رقم آپ کے کسی بینک اکاؤنٹ میں جمع نہیں ہوئی۔ ڈالر کی صورت میں آپ گھر ہی پر رکھتی ہیں۔ ضرورت کے وقت بولٹن مارکیٹ پر بلیک سے فروخت کرتے ہیں انکل۔۔۔ پرسوں آپ نے دوسو ڈالر بھنائے تھے نا؟''

ان بدمعاشوں کو تو سب کچھ معلوم تھا انکار بے کار تھا۔ اس لئے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو بتایئے، کہاں ہے وہ رقم؟۔۔۔ سارے ڈالر؟'' ایک نوجوان نے پوچھا۔ چہرے سے وہ بے رحم لگ رہا تھا۔ عین اس وقت ہماری بڑی دیوار گھڑی نے ایک گھنٹہ بجایا۔ پورے ڈیڑھ بجے تھے۔ اس کی اواز سنتے ہی میری بیوی بولی۔

''سنو۔۔۔ تمہاری دوا کا وقت ہوگیا۔''

یہاں جان پر بنی ہوئی تھی۔ اور اس احمق کو میری دوا کی پڑی تھی۔ اسے تو دعا مانگنی چاہئے تھی کہ پڑوس سے کوئی ہمارے یہاں آجائے۔ ہمارے دونوں پڑوسیوں کے فون اکثر دوپہر کو 'ہیلڈ اپ'' ہوجایا کرتے تھے اور وہ شکایت کرنے ہمارے یہاں اکثر اس وقت آتے تھے جب مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا کرتا۔ ان میں سے ایک ریٹائرڈ کرنل تھے اور دوسرے اپنے وقت کے مشہور باکسر۔

''انکل کی دوا کا وقت ہوگیا؟'' لڑکی نے پوچھا۔ ''فکر نہ کریں میں ابھی کھلاتی ہوں کہاں رکھی ہے؟''

''دائیں طرف خواب گاہ میں۔۔۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر۔۔۔ نیلی شیشی ہے۔۔۔ ایک گولی دینی ہوگی۔'' میری بیوی نے اتنے پیار سے اُن کی رہبری کی جیسے وہ اپنی بیٹی یا بہو سے مخاطب ہوں۔

''پانی بھی وہیں ہے۔۔۔ تھرماس میں۔'' میں نے جل کر مزید رہبری کی۔

جب تک یہ مکالمے جاری رہے۔ ایک نوجوان تو ہم سے قریب پستول تانے بیٹھا رہا اور دوسرا کپڑوں اور کتابوں کی الماریوں سے لے کر میلے کپڑوں کی ٹوکری تک کی اطمینان سے تلاشی لے کر ڈالر جمع کرتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ اسی گھر کے مکیں ہوں اور ہر کمرے کے راز سے

اچھی طرح واقف ہوں۔

اتنی دیر میں لڑکی نے مجھے گولی کھلائی پانی پلایا اور پھر اُس نوجوان کی طرف مڑی جو گھر کی تمام پونجی، میرے سوٹ کیس، بیوی کی نئی پرانی ساڑیاں، ریڈیو، کیسٹ پلیئر، وی سی آر، ٹی وی وغیرہ گھر کی چادروں میں باندھ کر اب واپس ہمارے پاس آ گیا تھا۔ ''اچھی طرح دیکھ لیا نا؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''ہاں ــــ بڑی عجیب عجیب جگہ چھپا رکھے تھے ڈالر!'' وہ ہنسا۔ اس پر پستول والا نوجوان بولا۔

''صرف آنٹی کے زیور رہ گئے ہیں ــــ تم اُتار لو۔'' اس نے لڑکی کو مشورہ دیا۔ یہ سنتے ہی میں نے گھگھیا کر درخواست کی۔ ''کم از کم انہیں چھوڑ دیجیے۔''

''ساری انکل! ــــ ہم کچھ نہیں چھوڑ سکتے۔ اگلے ہفتے ناغہ ہے۔ اس کی کسر بھی پوری کرنی ہوگی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''ناغہ''؟ میں نے حیرت سے اس کا یہ ایک لفظ دہرایا یہ سنتے ہی دوسرا لڑکا ہنسا۔

''جی ہاں ناغہ انکل ــــ ہم ایک ہفتے کام کرتے ہیں اور دوسرے ہفتے ریسرچ!'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''ریسرچ؟'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''خواہ مخواہ اپنے ذلیل کام کو ریسرچ کا لیبل لگا کر اس مقدس لفظ کا مذاق نہ اُڑاؤ۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔

چالیس سال تک یونیورسٹی میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ریسرچ کرانے کے بعد مجھے اس لفظ کے تقدس کا احساس تھا۔

''ہم مذاق نہیں اُڑا رہے انکل! واقعی ہم ایک ہفتہ ریسرچ کرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی کے یہاں ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ تبھی تو ہم جدید ترین آلے بھی استعمال کرنے لگے ہیں آپ نے کبھی غور کیا؟ ایسے اداروں کے مرکزی دفتروں پر اب ڈاکہ کیوں پڑ رہا ہے جو کمپیوٹروں کا کاروبار کرتے

ہیں؟''

اس کا جواب سن کراس حالت میں بھی مجھے ہنسی آ گئی۔ اس نے اب کے ایک عجیب سوال کیا۔

''اچھا تو آپ لوگ اب کمپیوٹر چرا رہے ہیں؟۔۔۔ ان کمپیوٹروں کو چلائے گا کون؟۔۔۔ آپ کے ساتھ ڈاکو؟''

میں نے پوچھا۔ میں انہیں زیادہ سے زیادہ باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا تھا۔ کرنل صاحب کا فون کئی دنوں سے ٹھیک چل رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ آج وہ ضرور خراب ہوگا تو وہ شکایت کرنے ہمارے یہاں آئیں گے۔

میرے سوالوں کا جواب ان لڑکوں نے نہیں بلکہ لڑکی نے دیا۔

''جی نہیں انکل۔۔۔ ہم میں سے اکثر تعلیم یافتہ ضرور ہیں لیکن کمپیوٹر بھلا کیسے چلا سکتے ہیں؟ اسے تو پیشہ ور پروگرامر چلاتے ہیں پچھلے چند مہینوں میں صرف کراچی سے کم ازکم پچاس تربیت یافتہ پروگرامر اغوا ہوئے ہیں۔ ہم ان لوگوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جب ہم اُن سے تربیت حاصل کرلیتے ہیں تو انہیں انعام واکرام دے کر، آرام سے گھر پہنچا آتے ہیں۔ اس لئے اب اُن کے اغوا ہونے کی خبریں اخباروں میں نہیں شائع ہوتیں۔''

لڑکی کا جواب یہیں تک پہنچا تھا کہ ایک نوجوان نے اُسے بری طرح ڈانٹا۔

''کئی بار کہہ چکی ہوں۔ بزرگوں سے ہمیشہ تمیز سے باتیں کرو۔۔۔ پڑھ لکھ کر تم نے ادب گنوایا۔ لڑکی نے اسے سمجھایا۔ کیوں وقت ضائع کر رہے ہو، دیکھتے نہیں بڈھا باتوں میں لگا رہا ہے۔''

''اچھا اچھا۔۔۔ آئندہ کروں گا۔۔۔ اب جلدی کرو۔ کہیں ان کا کوئی پڑوسی اپنے فون کی شکایت رکنے آن نہ ٹپکے۔'' اس کے ساتھ ساجد نے جواب دیا۔

اس کی باتیں سن کر میرا دل بیٹھ گیا۔ مدد کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ ان کم بختوں کی ریسرچ تو واقعی مکمل تھی اتنی دیر میں لڑکی میری بیوی کے کان کے بُندے اتار چکی تھی۔ جوں ہی چوڑیاں اتارنے کیلئے اس کی دائیں کلائی کو پکڑا، میری بیوی نے گھگھیا کر کہا۔

''خدا کے لئے بیٹی!۔۔۔ ان چوڑیوں کو چھوڑ دو۔۔۔ یہ میری سہاگ کی نشانی ہیں۔ باون سال پہلے نکاح کے وقت میرے شوہر نے محبت سے پہنائی تھیں۔ شاید تیری شادی نہیں ہوئی ورنہ تو ان چوڑیوں کی اہمیت کو سمجھ سکتی، انہیں ہاتھ نہ لگا بیٹی''!

یہ سنتے ہی نہ جانے کیا ہو کہ لڑکی یکا یک رُک گئی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب تاثر پیدا ہوا، جیسے کوئی بہت ہی تکلیف دہ خیال آ گیا ہو۔ اس کے چہرے کے تاثرات کو بدلتے، اس کے دونوں ساتھیوں نے بھی دیکھ لیا۔ ایک نے غصے سے کہا۔ '' بکواس بند کیجئے۔۔۔ بار بار اسے بیٹی کہہ کر اور سہاگ کا ذکر کر کے، اس احمق لڑکی کے جذبات سے نہ کھیلئے۔۔۔ آپ کو پتہ ہے یہ کس لئے ڈاکو بنی ہے؟ ہم کس لئے ڈاکو بنے ہیں؟۔۔۔ قمر! اتارو چوڑیاں جلدی۔ اس نے بے خیالی میں لڑکی کا نام لیا اور اُسے حکم دیا۔ لیکن دوسرے نوجوان نے مداخلت کی۔

''نہیں رحیم! اسے کچھ نہ کہو۔''

'' کیوں نہ کہوں؟'' رحیم نے جل کر جواب دیا۔ ''اس کے میاں کو شادی کے مہینہ بھر بعد قتل کر دیا گیا۔ تو وہ دوسروں کے سہاگ کی کیوں قدر کرے؟''

''چُپ ہو جاؤ رحیم! اب لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ ''ان چوڑیوں کی قیمت زیادہ سے زیادہ پانچ چھ ہزار ہو گی۔ تم میرے حصے سے اتنی رقم کاٹ لینا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ میری بیوی کی طرف مڑی اور دھیمے لہجے میں کہا۔ '' آپ اطمینان رکھیں اماں! میں آپ کی چوڑیاں نہیں اُتاروں گی۔ وقت نے میرے ساتھ ظلم کیا تھا۔ ہماری جنگ معاشرے سے ہے، جو تعلیم کے وسائل تو بڑھائے جا رہا ہے لیکن ملازمتوں کے نہیں جو اپنے ایک حصے میں دولت کے انبار لگوا رہا ہے اور دوسرے کو مشکل سے ایک وقت کی روٹی دیتا ہے اس کی ناانصافی کی سزا میں آپ کو نہیں دوں گی۔ ہم اپنی خوشی سے ڈاکو نہیں بنے اماں! حالات نے ہمیں ڈاکو بنایا۔ ہمیں اپنا انجام معلوم ہے۔۔۔ پر ہم مجبور ہیں کیونکہ ایک بار غلط راستے پر چل نکلو تو لوٹنا محال ہوتا ہے۔ بس آپ دعا کریں کہ موت آئے تو عزت سے آئے۔''

پھر وہ ساجد کی طرف مڑی اور بولی ''کام کی چیزیں لے لی ہوں تو چلو نکل چلیں۔ میرا دماغ پھرا تو میں وہ چیزیں بھی انہیں واپس کردوں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دوپٹے سے چہرہ پونچھا۔ پتہ نہیں اس کی پیشانی پر ابھرے ہوئے پسینے کے قطرے تھے یا اس کی انکھوں میں سے جھانکنے والے آنسو جو سہاگ کے ذکر پر آ گئے تھے۔

چند لمحوں کے بعد وہ چلے گئے ــــ چُپ چاپ ــــ بالکل اسی طرح، جس طرح آئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے سوچا ــــ ان تعلیم یافتہ بظاہر شریف گھرانے کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ڈاکو بنانے کا کون ذمہ دار ہے؟ ــــ اس کا حل اخلاقی ہے یا کڑی سزائیں اور فوجی کارروائیاں؟

☆☆

ساجد رشید

راکھ

بیماری اور موت مل کر بھی شمع کے چہرے کی کشش کو ختم نہیں کر سکے۔ جمال نے فرش پر رکھی بیوی کی لاش کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ شمع کا مردہ جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ صرف چہرہ کھلا تھا۔

شمع کی گھنی سیاہ پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ ایک ٹک اس کے سرخ و سفید چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ شمع نے پیالی اٹھا کر کوفی کا ایک گھونٹ لیا لیکن اس کی پلکیں بدستور جھکی رہیں۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ میز پر تھوڑا جھک گیا میں بہت سیریسلی کہہ رہا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

جمال نے شمع سے کل بھی یہی بات کہی تھی۔ لیکن شمع نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ صرف جھرجھری لے کر رہ گئی تھی۔ جمال کی خواہش کو سُن کر وہ خوفزدہ ہوگئی تھی۔ شادی کے اس تصور ہی سے اُسے بخار سا ہو جاتا تھا۔ جسے ساری دنیا کی عورتیں تحفظ سمجھتی ہیں۔ ''بابا کو اگر پتہ چل گیا کہ ایک مسلمان لڑکے سے وہ شادی کرنا چاہتی ہے تو......سوچ کر ہی وہ کانپ جاتی تھی۔ دو برس قبل جمال سے اس کی ملاقات ایک فوٹو گرافی ایکزی بیشن میں ہوئی تھی۔ جسے تین امیچر فوٹو گرافرز نے مل کر ترتیب دیا تھا۔ شمع کو ایک تصویر بے حد پسند آئی تھی۔ جس کا عنوان تھا۔ ''زندگی'' جس میں ایک سی گل کو سمندر کی بپھری موجوں سے کچھ اوپر پرواز کرتے دکھایا گیا تھا۔

شمع نے جب ایگزی بیشن کے ناظم سے اس فوٹو گرافر کے بارے میں پچھا۔ تو اس نے چشمہ لگائے ایک سانولے سے نوجوان کی طرف اشارہ کیا تھا جس نے ایک ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ وہ ایک عورت سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ جمال کو ایک عمدہ تصویر پر مبارک باد

دینے کا خیال ترک کر کے وہ جب گیلری کی سیڑھیاں اترنے لگی تب اس نے سوچا کہ یہ فنکار کی ناقدری ہے۔ وہ لوٹ کر ایکزی بیشن ہال میں آ گئی تھی۔ اور اس عورت کے جانے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ جو اپنی سوتی ساڑی سلیولیس بلاؤز اور ہینڈلوم کے جھولے کی وجہ سے کوئی آرکیٹیکٹ معلوم ہو رہی تھی۔ اس عورت کے چلے جانے کے بعد شمع نے جمال کے قریب جا کر اپنا تعارف کراتے ہوئے تصویر کی تعریف کی تھی۔ دوران گفتگو اس نے بتا دیا تھا کہ وہ جے جے اسکول آف آرٹس میں انسٹرکٹر ہے اور ملازمت کا یہ اس کا پہلا سال ہے۔ دوسرے روز جمال نے جے جے اسکول میں جا کر شمع کو وہی تصویر تحفے میں پیش کی تھی۔ دونوں کی رسمی ملاقاتیں دوستی اور دوستی جلد ہی محبت میں بدل گئی تھی۔

''جمال اگربتیاں کہاں ہیں۔؟'' جمال نے گردن گھما کر دیکھا اس کا فوٹوگرافر دوست منوج تھا۔ جمال نے وال کیبنٹ سے اگربتی کا پیکٹ نکال کر منوج کو دیا۔ منوج نے اگربتیاں شیشے کے ایک گلاس میں ڈال کر شمع کے سرہانے سلگا کر رکھ دیں۔ دھواں دھیرے دھیرے بل کھاتا ہوا فضا میں ایسے تحلیل ہونے لگا جیسے کمرے کے بوجھل ماحول سے وہ بھی افسردہ ہو۔ منوج نے جمال کے قریب آ کر اسے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔'' کیا تم نے اپنی ڈیڈی کو خبر کر دی ہے؟ جمال نے اثبات میں سر ہلایا، اور شمع کے بابا کو؟ جمال نے سر جھکا دیا۔ شمع کے بابا کو اس نے دادر ہندو کالونی میں خود جا کر خبر دی تھی۔ اُنہوں نے شمع کی موت کی خبر ایک سنگین خاموشی کے ساتھ سنی تھی۔ اور اُس کے گھر سے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر لیا تھا۔

''شمع اور میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' جمال کے اِس جملے پر شمع کے بابا نے اپنے جنیوں میں انگوٹھا ڈال کر اسے دو بار اوپر نیچے کیا۔ اور پھر موٹے چشمے کے پیچھے سے اُسے گھورتے ہوئے بولے تھے'' تم جانتے ہوں ہم لوگ پونیری برہمن ہیں۔ میرے پتا جی پونے میں اس عمر میں بھی جنم لگن اور مرتیو۔ کی رسمیں کرتے ہیں۔ اور تم ایک مانساہاری مسلمان...... جمال اس سوال کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا۔ اس نے فوراً کہا میں دھرم بدل لوں گا۔ جمال کے اس جواب نے کچن میں

ماں کے ساتھ چھپ کر دونوں کی باتیں سُن رہی شمع کے دل کے بوجھ کو کم کر دیا۔

''کوئی بھی غیر ہندو ہندو نہیں بن سکتا۔''

''اور اگر میں آریہ سماجی طریقے سے ہندو بن جاؤں کیا تب بھی آپ مجھے سویکار نہیں کریں گے؟''

نہیں کبھی نہیں'' بابا نے سخت لہجے میں جواب دیا۔'' کون کس دھرم میں پیدا ہوگا۔ایشور کی اِچھا سے ہوتا ہے۔انسان کی مرضی سے نہیں سمجھے۔''

دورانِ گفتگو شمع کی ماں نے جمال کے لیے اپنی چھوٹی بیٹی کے ہاتھ سے جب اسٹیل کے گلاس میں پانی بھجوایا۔تو بابا نے بڑی ملائمت سے لڑکی سے کہا۔''شیشے کے گلاس میں پانی لاؤ جمال پانی پئے بغیر ہی وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا تھا۔دوسرے روز جمال کو شمع نے بتایا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اسے پہلی بار پتہ چلا کہ بابا مسلمانوں کو ناپسند کرتے ہیں۔وہ کہہ رہے تھے۔''اگر کسی مہار کے ساتھ بھی بھاگ جائے تو مجھے اتنا دکھ نہیں ہوگا جتنا ایک ملیچھ کے ساتھ شادی کرنے سے ہوگا۔'' کہتے ہوئے شمع رو پڑی تھی۔میں تمہیں چاہتی ہوں جمی۔'' ہچکیوں سے اس کے کندھے۔ہلنے لگے تھے۔

اسی روز جمال نے اپنی والدہ کو شمع کے بارے میں بتا دیا تھا۔وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اپنے جوان بیٹے کے اتنے بڑے ارادے پر غور کرتی رہیں۔پھر کہا۔''اگر وہ مسلمان ہو جاتی تو میرے خیال میں تمہارے ابو کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' جمال دس بارہ دنوں تک شمع سے روز ہی ملتا رہا لیکن مذہب تبدیل کرنے کی تجویز اُس کے سامنے رکھنے کی ہمت وہ اپنے میں مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔ایک روز سماوار ریسٹورنٹ میں جمال نے کھانے کے لئے شمع کو پوچھا تو اس نے یاد دلایا کہ آج اس کا منگل وار کا برت ہے۔وہ صرف لیمو پانی لے گی۔جمال نے کوفی ختم کر لی لیکن وہ اپنا منشا بیان نہ کر سکا۔شمع نے لیمو پانی کے گلاس پر اُبھر آنے والے ابخرات کی بوندوں کو انگلی سے پھیلاتے ہوئے کہا۔''میرے بابا تمہارے ہندو ہو جانے کے بعد بھی تمہیں سویکار کرنے کیلئے تیار

نہیں ہیں۔ تو میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے کہ میں مسلمان ہو جاتی ہوں۔"

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شمع اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی کر لے گی۔ شمع نے ایک روز خاموشی سے بدن کے کپڑوں کے ساتھ گھر اور مذہب دونوں کو چھوڑ دیا۔ جامع مسجد میں کلمہ پڑھ کر وہ شمع کلکرنی سے شمع جمال ہوگئی۔ مسجد ہی میں جمال اور شمع کا نکاح ہوا تھا۔

جمال کی بڑی بہن نے کمرے میں شمع کے مردہ جسم کو دیکھتے ہی ایک دبی دبی چیخ ماری۔ اور جمال سے لپٹ کر رونے لگیں۔ جمال کی آنکھیں خشک تھیں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سینے میں کوئی وزنی پتھر رکھا ہوا ہو۔

"یہ کیسے ہوگیا جمال؟...... وہ روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔

"خدا کو یہی منظور تھا باجی، حوصلہ رکھئے۔"

بڑی بہن نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کر کے اپنی والدہ کو اور والہ کی بابت دریافت کیا۔ کہ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچے۔ پھر اس نے مراٹھی ترجمہ والے قرآن کو کپ بورڈ سے اُتار کر شمع کے قریب بیٹھ کر وہ دھیمی آواز میں تلاوت کرنے لگی۔ شمع عربی تو نہیں پڑھ سکی تھی۔ البتہ کبھی کبھار قرآن کا مراٹھی ترجمہ ضرور پڑھ لیا کرتی تھی۔

جمال کو اس درمیان لنٹاس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں سینئر فوٹوگرافر کا جاب مل گیا تھا۔ ایجنسی نے ہی اسے بوریولی میں سنگل روم کا ایک فلیٹ بھی الاٹ کر دیا تھا۔ جو میاں بیوی کے لئے کافی تھا۔ وہ اس فلیٹ میں شمع کے ساتھ منتقل ہو گیا تھا۔ لیکن ہفتے کے روز دونوں محمد علی روڈ جمال کے والد کے مکان پر ضرور جاتے تھے شمع نے ایک روز سوچا کہ اتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ بابا نہ سہی آئی (ماں) نے تو اس کو معاف کر دیا ہوگا، وہ جمال کو بتائے بغیر کالج سے فارغ ہو کر دادر ہندو کالونی پہنچ گئی۔ وہ دروازے پر کھڑی بیل بجاتی رہ گئی لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا شاید آئی ہول سے اُسے دیکھ لینے کے بعد ایسا کیا ہو۔ اُس کے بعد اُس نے پھر کبھی ماں کی دہلیز کا رخ نہیں کیا۔

شمع نے خود کو جمال کے گھر کی تہذیب کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کی تھی۔ رمضان

کے روزے اس نے پہلی بار رکھے۔لیکن منگل وار کے برت کا اس کا معمول برقرار رہا۔ جمال جب تک گھر نہیں آجاتا۔ وہ کھانا نہیں کھاتی تھی۔اس نے یہ عادت اپنی آئی سے پائی تھی۔ آئی کہا کرتی تھی پتی پرمیشور ہوتا ہے پتنی کو اس سے پہلے کھانا نہیں کھانا چاہتے۔جمال نے اسے کئی بار سمجھایا کہ ان کے یہاں اس قسم کی کوئی تہذیب نہیں ہے۔اسے وقت پر کھالینا چاہئے۔لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتی۔لوگ کہتے ہیں کہ محبوبہ بیوی بنتی ہے تو اس میں پہلے جیسی کشش نہیں رہ جاتی۔لیکن شادی کے بعد بھی دونوں کی محبت میں نہ صرف شدّت آگئی تھی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورا خود کو محسوس کرتے تھے۔

کمرے میں شمع کے بے جان جسم کے قریب ہی باجی اور کچھ دوسری رشتے دار عورتیں اور بچیاں قرآن کی تلاوت کررہی تھیں۔ابو اور امی بھی پہنچ گئے تھے۔امی تو شاید راستے بھر روتی رہی تھیں۔اُن کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔انہوں نے آتے ہی جمال کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔جیسے اُس کے سینے کا سارا درد اپنے کلیجے میں اُتار لینا چاہتی ہوں۔تب بھی اُس کی آنکھیں خشک ہی رہیں۔

''بیٹے غسالہ کو میں نے خبر کردی ہے۔وہ بس آتی ہی ہوگی۔انہوں نے اپنی آنکھوں کو پوچھتے ہوئے کہا۔ابو دروازے کے قریب سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوئے اپنی بہو کی ملنساری اور سگھڑپن کی تعریفیں کررہے تھے۔''رمضان کے مہینے میں بہو نے سارے روزے رکھے اور پانچوں وقت نماز ادا کی کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ غیر قوم سے آئی ہے۔میت میں آنے والے بھی مرحومہ کی انھیں صفات پر تعریفی کلمات ادا کررہے تھے۔

گذشتہ ایک مہینے سے شمع کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی ڈاکٹر نے یرقان تشخیص کیا تھا۔بیماری کے سنگین نتائج بھی نکل سکتے ہیں یہ بھی تنبیہ کرُدی تھی۔کیونکہ شمع امید سے تھی۔جمال نے کبھی سوچا بھی نہ تھا اس کی یہ بیماری اتنی خطرناک ثابت ہوگی۔ورنہ وہ دفتر سے چھٹی لے کر خود ہی اس کی نگہداشت کرتا۔یہی سبب تھا کہ اس نے بیماری کے دنوں میں بھی شمع کو منگل وار کا برت رکھنے سے نہیں روکا۔دو تین روز قبل شمع کو دن میں چار پانچ قے ہوئی تو وہ روہانسی ہوگئی، اس نے جمال

سے کہا ''دیوالی میں میں اپنے بابا اور آئی کا آشیرواد لینے نہیں گئی تھی نا شاید اسی کا شاپ ہے۔''
جمال نے اس بات پر اُسے محبت بھری ڈانٹ پلائی تھی کہ وہ پڑھی لکھی ہو کر اس طرح کے وہم رکھتی ہے۔ اس نے کہا تھا۔ ''وہم ہے یا حقیقت میں نہیں جانتی لیکن پُنر جنم میں میرا وشواس ضرور ہے میری اوپر والے سے یہی پرارتھنا ہے کہ دوسرے جنم میں بھی وہ مجھے تمہاری ہی پتنی بنائے۔'' اس جملے پر جمال نے بے اختیار بخار سے گرم اس کی پیشانی چوم لی تھی۔

کل رات اچانک ہی شمع کی طبیعت بگڑ گئی۔ ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن اور دوائیں دے کر اس خدشے کا اظہار ضرور کر دیا تھا کہ یرقان اپنے آخری اسٹیج پر ہے اس لیے شمع کو کل سویرے ہی کسی اچھے اسپتال میں داخل کروانا بہت ضروری ہے۔ جمال نے آنکھوں میں ہی ساری رات کاٹ دی تھی انجکشن کی وجہ سے شمع گہری نیند ضرور سوئی لیکن صبح جاگنے کے بعد اسکی حالت پھر بگڑ گئی۔ شمع کی ایسی حالت دیکھ کر جمال بری طرح نروس ہو گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو فون کیا لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی شمع بجھ گئی تھی۔

''بیٹے تمام لوگ آ چکے ہیں۔ غسالہ نے میت کو غسل تک دے دیا ہے۔ ابو جمال کو قریب بلا کر بولے۔ دفن کے لیے کیا سوچا ہے مغرب بعد یا عشاء بعد؟

انہیں جواب دینے کے بجائے جمال شمع کی لاش کو دیکھنے لگا۔ جسے غسل کے بعد کفن پہنا کر دیدار کے لئے رکھا گیا تھا۔ غسل کے بعد چہرہ اب اور نکھر آیا تھا۔ اُسے لگا جیسے وہ ابھی اُٹھ کر کہے گی۔ ''ارے مجھے جگایا کیوں نہیں؟'' اور اکثر چھٹی کے روز جمال پہلے اُٹھ جاتا تو خود ہی چائے بنا کر پی لیتا۔ شمع کو گہری نیند سے جگانے میں اسے اس لیے تکلف ہوتا تھا کہ وہ ہفتہ کے چھ روز بڑے سویرے اٹھ کر گھر کے کام کاج میں جٹ جاتی تھی اُسے دفتر بھیجنے اور کالج جانے کی تیاری میں کافی وقت لگتا تھا اس لیے عام دنوں میں صبح سویرے اُٹھنا اس کی مجبوری تھی۔

مہرہ صاحب نے کہا ہے کہ ایجنسی کی طرف سے شمع کی ایک OBITUARY ٹائمز آف انڈیا۔ میں دی جائے۔''

منوج نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

جمال نے کاغذ پر نظر ڈالی۔

شمع جمال

تاریخ پیدائش: ۱۸/اپریل بروز بدھ ۱۹۶۸ء

تاریخ وفات: ۱۲/جون روز منگل 1995ء

جمال کی نگاہ تاریخ وفات پر آ کر ٹھہر گئی۔ اوہ آج منگل وار ہے۔ شمع کے برت کا دن! شمع نے اُسے بتلایا تھا کہ ہر منگل وار کو گنیش جی کا برت میں جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے رکھ رہی ہوں۔ کبھی ناغہ نہیں کیا۔ اس نے بڑے فخر سے کہا تھا شمع کی آواز کی بازگشت دیر تک جمال کی سماعت میں جاری رہی۔

''جمال میاں تم نے بتایا نہیں تدفین کب ہوگی۔'' ابو نے دوبارہ اسے یاد دلایا۔ جمال نے نم آنکھوں سے شمع کی لاش کی طرف دیکھا۔ سرہانے اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ دھوئیں کی نیلی گاڑھی لکیریں فضا میں دھیرے دھیرے رینگ رہی تھیں اماں اور باجی تلاوت کر رہی تھیں۔

''شمع کو قبرستان میں نہیں شمشان لے جانا ہے۔''

''ہیں!! جمال کے اس جواب پر ابو کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ چند ثانیوں تک وہ بیٹے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ جو فرطِ جذبات سے لرز رہا تھا۔ پھر انہوں نے شمع کی لاش کو غور سے دیکھا۔ اور غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کیا یہ اس کی اپنی خواہش تھی؟''

''نہیں۔ اس کے اور میرے درمیان اس موضوع پر کبھی بات نہیں ہوئی اور پھر اتنی جلدی یہ کچھ ہو جائے گا ہم نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔''

''دیکھو میاں وہ مسلمان ہو چکی تھی۔ اس نے کلمہ پڑھا تھا.....'' ابو دانتوں کو بھینچ کر سخت لیکن دھیمی آواز میں بولے۔'' اس نے میرے مذہب سے متاثر ہو کر اپنا مذہب نہیں بدلا تھا۔ مجھے حاصل کرنے کے لئے اس نے مذہب تبدیل کرنے کی رسم ادا کی تھی۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' ابو کی آواز غصے سے بلند ہوگئی۔ کمرے اور راہداری میں موجود تمام لوگ چونک کر انکی طرف دیکھنے لگے۔

میں کہہ چکا ہوں جو مجھے کہنا ہے میں اس کی آتما کو سکون پہنچانا چاہتا ہوں۔''

''کیا جلانے سے اس کی آتما کو سکون مل جائے گا۔'' ان کا لہجہ اتنا ہی تیز اور تلخ تھا کہ امی اور باجی کلام مجید رحل پر بند کر کے باپ بیٹے کے قریب چلی آئیں۔

''ابو ذرا سوچیے شمع نے میرے لیے مذہب بدل دیا تو میں اس کی آتما کو سکون پہنچانے کے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتا۔''

امی اور باجی نے اسے خدا کا واسطہ دے دے کر سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔ ''شمع کی آتما کو داہ سنسکار سے ہی سکون ملے گا۔''

ابو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے اور امی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے سیڑھیوں سے دھم دھم کرتے ہوئے اتر گئے باجی کچھ لمحوں تک اس کا منہ تکتی رہیں۔ پھر شمع کے بے جان چہرے پر ایک نظر ڈال برقعہ پہنتے ہوئے وہ بھی چلی گئیں۔ ایک ایک کر کے سارے رشتے دار، اور شناسا اپنی خشمگین نگاہوں کی حدت کو کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف اگربتیوں کا دھواں اذیت ناک خاموشی کے ساتھ لپٹ کر گریہ کر رہا تھا۔

منوج کی دستک پر دروازہ کھلا سامنے شمع کے بابا کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے آئی منہ میں پلو دیئے ایسے کھڑی تھیں جیسے رو پڑیں گی۔ بجھے ہوئے چہرے اور دھندلی آنکھوں سے انہوں نے جمال کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ جمال نے پیتل کی ایک چھوٹی سی کلسی جس کے منہ پر سرخ کپڑا بندھا تھا۔ بابا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا میں آپ کی بیٹی کو لوٹانے آیا ہوں۔''

بابا نے کلسی کی طرف کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ آئی دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور جمال کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔

انور قمر

طلسم آباد

میں جب ٹرین سے اترا تو اسٹیشن ویران تھا۔ اسٹیشن کی وسیع عمارت سے میں جب باہر آیا تو باہر بھی ویرانی تھی۔ بس ایک آدمی کچھ فاصلے پر سیاہ کوٹ پتلون میں ملبوس ہاتھ میں چھڑی لئے کھڑا تھا۔ جوں ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس نے چھڑی کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں دھیمی رفتار سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سر پر سیاہ ٹوپی ہے۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ ہے اور اس نے اپنے ہاتھ سیاہ دستانوں میں چھپا رکھے ہیں۔ میں جب اس کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس کے بوٹ کا رنگ بھی سیاہ ہے۔

اس نے اشارے سے پوچھا ''پاس؟''

میں نے اپنی ریاست کا عطا کردہ پاس جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ جانچنے کے بعد اس نے وہ پاس مجھے لوٹا دیا۔ ضابطے کی اس کارروائی سے اُسے کچھ اطمینان ہوا۔ چہرے پر سے اس کے وہ تناؤ جاتا رہا۔ جو میں نے اس کے مزاج سے منسوب کر دیا تھا۔

وہ پلٹا اور چھڑی کے اشارے سے مجھے اپنے پیچھے آنے کی ہدایت کی۔ وہ آگے آگے اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ کچھ دور کی مسافت کے بعد میں نے دیکھا کہ سیاہ عمارت اس ویرانہ میں اچانک نمودار ہوگئی یہ سیاہ پوش اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس نے مجھے اشارے ہی سے ہدایت کی کہ میں اپنی جگہ پر رکا رہوں۔ وہ خود عمارت کے آہنی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی وہ دروازہ خود بخود کھل گیا جوں وہ اندر داخل ہوا، وہ دروازہ جس آہستگی سے کھلا تھا اسی آہستگی سے پھر بند ہو گیا۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، سارے میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں کے ٹھنٹھ، دور تک پھیلی ہوئی چٹیل زمین بے ترتیبی سے اُگی ہوئی کانٹے دار جھاڑیاں ان کھلساتی تپش، گرم ہوا منھ پر خاک اڑا رہی تھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری جیب سے رومال نکالا لیکن ابھی میں اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھنے ہی جا رہا تھا کہ مجھے عمارت کے عقب سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ ٹاپ بہ تدریج بڑھنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک سیاہ بگھی پر سوار ہے اور کوچوانی کر رہا ہے۔ بگھی کا پچھلا حصہ کھلا ہوا ہے۔ جس میں ایک بہت بڑا تابوت پڑا ہوا ہے۔ اس نے چابک لہرا کر مجھے بگھی کے آخری سرے پر نصف اسٹول پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں نے بلاچون و چرا اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ رخصتی سے قبل اپنی ریاست نے مجھے یہی تاکید کی تھی۔

بگھی شہر کی مرکزی شاہراہ سے گزرنے لگی۔ عمارتیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ کھڑکیوں پر چیتھڑے اور دروازوں پر ٹاٹ جھول رہے تھے۔ دکانوں کے پٹ بند تھے پر محسوس ہوتا تھا کہ اندر لین دین ہو رہا ہے۔ کارخانوں پر تالے پڑے تھے، لیکن ان میں سے ٹھک ٹھک ٹھک کی آواز آتی سنائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بستی کے واسیوں نے اپنی روحیں وہیں چھوڑ دی ہیں فقط اپنے اجسام لے کر اس بستی سے ہجرت کر گئے ہیں۔

بستی کے چوک میں پہنچ کر اس نے بگھی روک دی۔ وہ نیچے اترا۔ میں نے اس کی پیروی کی۔ اس نے آسمان پر نظر ڈالی۔ آسمان تانبے کی طرح تپ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ آسمانی کیفیت کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ پھر اس نے بگھی کھول دی اور گھوڑے کو چارہ دینے میں مصروف ہو گیا۔

مجھے سیاحی پسند ہے اور بستی بستی، قریہ قریہ گھومنے اور وہاں کے اسرار اور رسوم و رواج معلوم کرنے کا مجھے شوق ہے۔ آپ کی دلبستگی کی خاطر میں یہاں دو ایک قصبوں کی روایات نقل کرتا ہوں۔

کوڑھیوں کی ایک دور آباد بستی میں مجھے کوڑھیوں نے سانپ سے ڈسوایا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ مجھے ضرر پہنچانا چاہتے تھے۔ بلکہ اس لیے کہ میں ان کے ٹھنٹھ سے ہاتھوں سے مصافحہ

کرسکوں۔۔۔ کوڑھی عورتوں سے محبت کرسکوں۔۔۔ ان کی ناکوں کے خلا میں جھانکوں۔۔۔ ان کے بچوں کے ٹنڈ منڈ پیروں کو گدگداؤں تو مجھ سے کوڑھ کے جراثیم نہ چمٹ جائیں۔

اذیت کے بعد لذت

لذت میں پنہاں اذیت

ایک قصبے کے مردوں کو اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے جنسی اختلاط کی اجازت تھی۔ وہ جب بھی اینٹھتے فوراً دری بچھا دیتے اور کتوں کی نقابیں اپنے چہروں پر چڑھا کر، گھر میں آواز دیتے، جو بھی آ جاتا، یہ اسے دری پر لٹا دیتے اور مصروف عمل ہو جاتے۔

ایک گاؤں کی رسم تھی کہ ہر اس شخص کا عضوئے مخصوص کاٹ لو جو آپ سے بغل گیر ہو جائے۔۔۔ پھر یہ اس لوتھڑے سے رستا ہوا خون اپنے چہرے پر مل لیا کرتے تھے۔

لیکن اس شہر کا سب ہی کچھ نرالا تھا۔ نہ تو شہری تھے، نہ جانور، نہ پرندے تھے، نہ پھول، نہ ہوا تھی، نہ پانی، بس تھا تو وہ سیاہ پوش تھا جو گھنٹہ بھر سے مجھے چھڑی کے اشارے پر نچائے جا رہا تھا۔ میں نے سوچا...... آخر یہ کیسا کھڑاگ ہے؟ یہ سیاہ پوش کون ہے؟ اس غیر آباد مقام پر کیا وہ تنہا رہتا ہے؟ اور یہ تابوت؟

اس میں کس کی لاش ہے؟ کسی کو قتل تو نہیں کر دیا اس نے؟ کہیں میرا انجام بھی۔۔۔ یہ خیال آتے ہی میرا دل بیٹھنے لگا۔

سیاہ پوش نے ہاتھ جھٹکے انگلیوں سے چپکی ہوئی گھاس کی پتیوں کو الگ کیا۔ کوٹ سے چین سے بندھی جیبی گھڑی نکالی، وقت دیکھا، آسمان پر دوبارہ نظر ڈالی وقت کا صحیح تعین کر چکنے کے بعد وہ تابوت کے قریب آیا۔ بڑی احتیاط سے اس کا منہ ذرا سا کھولا اس کا ہاتھ تابوت کے اندھیرے میں رینگ رینگ کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ وہ ہاتھ دھیرے سے پھر باہر آ گیا۔ میں نے دیکھا اس ہاتھ میں چوزے کی سائز کا ایک گِدھ تھا۔ چھوٹا سا نرم نرم بھورا بھورا، سیاہ پوش نے اس کا رُخ سورج کی طرف کر دیا۔ اور گردن اٹھا کر اپنی نگاہیں سورج پر گاڑ دیں اور لگا سہلانے اس گِدھ کو۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ گِدھ اپنے سائز میں بڑھنے لگا پہلے تو وہ مرغ کی جسامت کو پہنچا اور پھر شُتر مرغ کے برابر کا ہوگیا۔ سیاہ پوش نے جیب سے ایک چھلہ نکالا اور اُسے گِدھ کے بائیں پیر میں پہنادیا چھلے کی کرامت تھی یا گِدھ کی ذات کی تکمیل۔ وہ بے چینی سے اپنے پر پھڑ پھڑانے لگا۔ سیاہ پوش نے چند کلمات کا وِرد کیا اور اپنے ہاتھ کو سر سے بلند کرکے گِدھ کو پرواز پر روانہ کردیا۔۔ گِدھ اپنے پر پھڑ پھڑاتا اُڑا اور ہمارے سروں پر چکرانے لگا۔ ہر چکر پر وہ اونچا اُٹھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ مجھے پھر چوزہ سا نظر آنے لگا۔ سیاہ پوش نے اپنے کوٹ کی جیب سے مٹھی بھر کالے مونگ نکالے ان پر دم کیا اور وہ مونگ گِدھ کی سمت ہوا میں اُچھال دیئے۔ پھر کیا تھا۔ تمام آسمان گِدھوں سے ڈھک گیا۔

میں نے سوچا معاملہ گمبھیر ہے۔ اس قدر گمبھیر کہ اندازہ مشکل نظر آرہا ہے۔ میں نے سیاہ پوش کی طرف قدرے احترام سے دیکھا۔ اس کی ادھ ڈھکی پیشانی پر بل تھا۔ اور ادھ چھپی آنکھوں میں تفکر۔ اس نے تابو پھر کھولا۔ اب اسے اپنی مطلوبہ شئے کھوجنے میں دقت نہ ہوئی۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو وہ ایک سور کو تھامے ہوئے تھا۔ سیاہ پوش نے سرخ وسفید سور کے منہ پر بوسا دیا۔ بوسے کی لذت سے سرشکار ہوکر سور نے آنکھیں بند کرلیں۔ سیاہ پوش نے اسے ہولے سے زمین پر رکھا اور اس کی پشت سہلانے لگا۔ سور نے گویا دردِ زہ سے نجات پا جانے کی سی مسرت انگیز چیخ ماری۔ اور آگے دوڑ گیا۔ اب وہاں اس سور کے بے شمار بچے چلبلا رہے تھے۔ سیاہ پوش نے ان کے سروں پر اپنی چھڑی کو ایک دائرے میں حرکت دی۔ وہ اپنی تھوتھنیاں اٹھائے سورج کو تکنے لگے۔ جوں جوں چھڑی دائرے بناتی گئی توں توں ان کی جسامت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ماں کے قد کو پہنچ گئے۔ سیاہ پوش نے انہیں ایک سمت ہانک دیا۔ وہ اپنی پشتیں مٹکاتے دوڑ گئے۔

میں سوچنے لگا۔

گِدھوں سے سوروں سے کیا نسبت ہوسکتی ہے؟

یہ مردہ خور پرندہ ہے۔ بدہیئت بھی ہے۔ سؤر فضلے اور کوڑے پر پلتا ہے اور یہ بھی کریہہ صورت

جانور ہے لیکن ان دونوں کا اس سیاہ پوش سے یا سیاہ پوش کا ان دونوں سے کیا تعلق ہے؟

ہزاروں گِدھ ہمارے سر پر منڈلا رہے تھے۔ سورج کی تمازت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ زمین تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ میرے سر کا پسینہ گردن سے بہتا پشت پر، پشت سے بہتا کمر پر اور کمر سے بہتا جوتوں میں پہنچ رہا تھا اور زمین کی تپش سے خشک ہوا چلا جا رہا تھا۔

مجھے اپنے آپ سے چڑ سی ہونے لگی۔

کیا ضرورت تھی مجھے یہاں آنے کی؟

ایک مہمل سے کھیل کا مجبور تماشائی بننے کی!

پھر مجھے یاد آیا۔ اگر اس روز میرا اس ریستوران میں گذر نہ ہوتا تو وہ واقعہ نہ پیش آیا ہوتا...... اور دم توڑنے سے پہلے میں اس سے نہ ملا ہوتا تو شاید یہاں آنے کی نوبت نہ آئی ہوتی۔ اب تو وہ واقعہ کسی خواب کی طرح دُھندلا دُھندلا سا یاد رہ گیا ہے۔

اس نے روٹیاں ہوا میں اُچھالی تھیں......

سالنوں کے قاب لوگوں پر انڈیلے تھے۔ شراب کے گلاس دیواروں پر پٹخے تھے؟ عورتوں کے زیوروں کو نوچا تھا۔ ان کے نیم برہنہ جسموں کو برہنہ کیا تھا۔ مردوں کی توندوں پر لاتیں ماری تھیں۔ ان کے بھی کپڑوں کو تار تار کیا تھا۔ اور لٹھوں کی مار سے ریستوران کی آرائشی مصنوعات تباہ کر دی تھیں۔ اور پھر......

اس شہر کا نام چیخ چیخ کر دہراتے ہوئے نوجوان نے۔ اپنے کلیجے میں خنجر اتار لیا تھا۔

اپنے پر ظلم اور ستم ڈھانے والوں کے خلاف احتجاج...... مؤثر احتجاج میں نے سڑکوں پر پتھر کوٹنے والے انجن کے تلے دبی ہوئی لاشیں دیکھی ہیں۔ زخموں اور ناسوروں پر بھنکتی مکھیوں سے بسی ہوئی بھوکوں اور ناداروں کی موتوں کا میں چشم دید گواہ ہوں سیلابوں کے اگرنے کے بعد درختوں میں پھنسی ہوئی، اکڑی ٹھٹھری اور پھولی ہوئی لاشیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ فلک بوس عمارتوں سے چھلانگ لگاتی ناآسودہ روحوں کا منظر میری آنکھوں میں تازہ ہے۔ پہاڑوں

سے پھسل کر برف میں روپوش ہوئیں اور قبروں سے کھودی ہوئی لاشیں گل و بلبل کو چھونے کی کوشش میں گنوائی گئیں گی جائیں۔ سنگ ساری سے پارہ پارہ ہوئیں لاشیں اور خود سوزی سے بھسم ہوئے جسم بھی میں نے دیکھے ہیں...... جنھیں دیکھ کر جی متلانے لگتا تھا اور محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی کنپٹیوں پر سلاخوں سے ضربیں لگا رہا ہو۔ لیکن اس نوجوان کی موت نے مجھ پر کوئی ایسا ناخوشگوار تاثر نہیں چھوڑا...... بلکہ اس نے یوں جان دیدی کی جیسے کہہ گیا ہو مجھ سے۔

''یہ رہا سب کچھ۔''

میں اسی لمحہ سفر پر روانہ ہونا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ میں اس وقت تک اس شہر کا رُخ نہیں کر سکتا تھا کہ جب تک میری ریاست مجھے سفر کا پروانہ نہیں عطا کرتی۔

کیا ضرورت تھی مجھے یہاں آنے کی؟

ایک مہمل سے کھیل کا مجبور تماشائی بننے کی؟

یہ سوالات میرے ذہن میں اسی طرح چکرا رہے تھے کہ جس طرح وہ گدھ سر پر منڈلا رہے تھے۔ لیکن اب میں اس نوجوان کی خودکشی، گلی میں غائب ہوئے سوروں اور ان گدھوں کے تعلق کی درمیانی کڑی تلاش کر رہا تھا۔

ان کے درمیان کوئی تعلق تھا بھی یا نہیں؟

یا یہ میرا محض قیاس تھا؟

پر...... کسی بے تاب گِدھ کی چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی ساتھ ہی کسی سور کی کراہ سنائی دی۔

سیاہ پوش نے پہلے آسمان کی طرف اور پھر اس گلی کی طرف دیکھا اس کے گلے سے کتے کی غراہٹ سنائی دی۔ ڈھکے ہوئے ہونٹ پھڑ پھڑائے اس تابوت کا سر پھر کھولا اور ایک ہاتھ بھر کا گڈا باہر نکالا۔ گڈے کا لباس کرتے اور دھوتی پر مشتمل تھا۔ سر پر ٹوپی تھی اور ہاتھ میں کاغذوں کا پلندہ۔

گڈے کے منہ سے اپنا منہ جوڑ کر سیاہ پوش نے اپنا دم اس کے سینے میں منتقل کیا۔ گڈے کے سینے میں زیر و بم پیدا ہوئے۔ گویا اس میں جان پڑ گئی ہو۔ اس نے پوری انگڑائی لی کہ گویا لمبی نیند سے

جا گا ہو پھر وہ سورج کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ سیاہ پوش نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا نہ سمجھ میں آنے والے چند کلمات اس کی زبان سے ادا ہونے لگے۔ آن واحد میں اس گڈے کا سائز قدمِ آدم کے برابر ہو گیا۔ اب میرے سامنے ادھیڑ عمر کا آدمی کاغذوں کا پلندہ لئے کھڑا تھا۔ سیاہ پوش نے اسے بھی اسی گلی میں ہانک دیا جس گلی میں وہ سوَر داخل ہوئے تھے۔

میں حیرت سے اُسے کاغذوں کا پلندہ بغل میں دبائے گلی میں داخل ہوتا دیکھتا رہا۔ سیاہ پوش نے جیب سے مٹھی بھر مونگ پھر نکالے اور اس شخص پر اُچھال دیے۔ میں نے دیکھا کہ اسی حلیے کے کئے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ پھر وہ اسی گلی میں جا کر روپوش ہو گئے۔

سیاہ پوش نے دوبارہ گھڑی جیب سے نکالی، ایک نظر اس پر ڈالی، تیزی سے مڑا اور اب کی مرتبہ تابوت کا ڈھکن اس نے پورے کا پورا کھول دیا۔ تابوت کافی بڑا تھا اور جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے مجھے اس کے اندر موجود عجوبات نظر نہیں آ رہے تھے۔ ابھی میں قریب جا کر اس کے اندر جھانکنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ سیاہ پوش کا ہاتھ اس میں سے برآمد ہوا...... ایک ...... دو...... تین ...... چار...... غرض کہ یکے بعد دیگرے وہ کئی گڈے اور گڈیاں اس میں نکالتا چلا گیا۔ ایک اُچٹتی نگاہ پھر گھڑی پر ڈالی۔ اور وقت کی کمی کا شدید احساس اس کی حرکتوں سے عیاں ہو گیا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے ان گڈے گڈوں کو ایک مناسب ترتیب میں لگانے لگے۔ دو ایک کا مقام اس نے غور کرنے کے بعد بدلا۔ اور اب کی بار غور سے دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اُن کے رخ سورج ہی کی سمت تھے۔ وہ ان کے پشت پر کھڑا ہوا اور سورج پر نظریں گاڑ کر ان کے سروں پر دست شفقت رکھتے ہوئے میری سمجھ میں نہ آنے والے ان ہی کلمات کا ورد پھر کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان میں عمل تنفّس جاری ہو گیا جسموں میں خفیف حرکتیں پیدا ہوئیں۔ اور وہ اپنے قد و قامت میں بڑھنے لگے۔ گویا وہ ربر کے مجسمے ہوں۔ جن میں ہوا پمپ سے بھری جا رہی ہو۔ جب وہ قدِ آدم کو پہنچے تب اس نے اپنی دعا ختم کر دی۔

اس نے آخری مرتبہ ان کا جائزہ لیا۔

بارڈر سیکورٹی فورس کا جوان، پولیس کا جوان، مجسٹریٹ، تاجران، مذہبی لیڈران،

خاکروب، بوجھ ڈھونے والے، کھیت مزدور، بہشتی، بھکاری، مرد، عورتیں، بچے، ...... غرضیکہ اس تابوت میں سے پورے کا پورا شہر برآمد ہو گیا......

سیاہ پوش تمسخرانہ انداز میں مسکرایا...... چھڑی گھمائی ...... اور ان سبوں کو اس نے اسی گلی میں ہانک دیا۔ جیب سے کالے مونگ نکالے۔ ان پر دم کیا اور انہیں ان پر اچھال دیا۔ ان کی تعداد پلک جھپکنے میں کئی گناہ ہو گئی۔ وہ ہولے ہولے چلتے گئے۔ اور اس گلی میں روپوش ہوتے گئے۔

سیاہ پوش نے ہاتھ جھٹکے۔ جیب سے سگریٹ نکالا اور لائٹر کی مدد سے اسے سلگا کر میرے قریب آیا۔

''بڑا بورنگ کام ہے۔''

''بورنگ......'' میں نے حیرت ظاہر کی۔

''ہاں'' وہ دھواں اُگلتا ہوا بولا۔ ''بڑا بورنگ...... پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر روز یہ ڈرامہ کرنا پڑتا ہے...... دوسری یہ کہ بات کرنے کی مخالفت ہے...... تیسری یہ کہ پردہ کی پابندی ہے۔''

''تو پھر...... تم مجھ سے؟''

''ہاں...... زبان ترس گئی تھی...... اور اب پکڑے جانے کا امکان بھی نہیں...... اور یہ تابوت بھی خالی ہو چکا ہے...... تمام چغل خور جا چکے ہیں۔

''لیکن تم یہ کام......؟''

''معاوضے پر کرتا ہوں۔ پہلے سڑکوں پر مجمع لگا کر لوگوں کا دل بہلاتا تھا۔ دس پانچ کما لیا کرتا تھا۔ اب بھی سڑکوں پر مجمع لگاتا ہوں...... لیکن ڈھنگ نرالا ہے۔ امپریشن خوب پڑتا ہے...... پوزیشن بھی بن گئی ہے۔ اب دیکھو نا اتنے بڑے شہر میں اکیلا ہی ہوں...... کبھی کبھار محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں اس شہر کا حاکم ہوں اور...... کبھی......''

''لیکن تم یہاں کس کے لئے کام کرتے ہو؟ تمہارا معاوضہ کون ادا کرتا ہے؟''

''جس ٹرین سے تم اُترے تھے۔ اسی ٹرین کا گارڈ مجھے ہر ماہ دو ہزار روپے کا لفافہ دے جاتا ہے...... بھائی میں بھی بال بچے والا آدمی ہوں...... اس حلیے میں تمہیں ضرور پراسرار لگ رہا ہوں گا...... کیا کروں یہ میرا یونی فارم ہے...... لیکن میں ہرگز برا آدمی نہیں ہوں...... میرے بچے اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔...... بیوی گھر گرہستی سنبھالتی ہے اور ہر سوموار کو مجھے پریم پتر لکھ بھیجتی ہے۔''

''کیا...... انہیں معلوم ہے کہ تم...... یہاں اس کام پر تعینات کئے گئے ہو......'' میں نے جھجھک کر پوچھا...... گویا میں جان گیا تھا کہ وہ کوئی غیر شریفانہ یا غیر انسانی کام انجام دے رہا ہوں۔

وہ سمجھ گیا۔

''جس کام کا معاوضہ مل جائے وہ کام ہرگز بُرا نہیں...... اور اگر برا ہے بھی تو مجھے اسے سے کیا سروکار؟ جس کے اعمال برے آخرت خراب ہو اس کی!...... مجھے کیا پروا...... وہ جانے اور اس کے کام......''

''شی ــــ شی ــــ شی ــــ''

اور اپنے لبوں پر انگلی رکھ دی۔

میں نے محسوس کیا کہ سورج کی تمازت اچانک بڑھ گئی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اوپر دیکھا۔ لیکن میں نظر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکا۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرے اطراف کی مرئی اور غیر مرئی ــــ ہر ہر شئے ہماری گفتگو پر کان دھرے بیٹھی ہے۔

ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی میرے جسم میں!

اس نے پھر گھڑی دیکھی اور کہا۔

''تم چاہو تو اس ڈرامے کا بقیہ حصہ اسٹیج پر دیکھو ــــ یا چاہو تو ٹی وی، پر ــــ'' ''ٹی وی پر؟''

''ہاں'' اس نے تابوت کو کھولا۔ تابوت کے ڈھکن کی اندرونی ساکت فلم کے اسکرین جیسی

تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''تم ہی بتاؤ''

''میرا خیال ہے کہ ٹی وی پر دیکھنا بہتر ہوگا۔ کیونکہ تم جو کچھ بھی دیکھو گے۔ وہ حقیقت ہی ہوگی۔ لیکن ٹی وی اسے ہر حال میں آرٹی فی شل (مصنوعی) بنادے گا۔ اس لئے واقعہ کا اِم پکٹ (اثر) بھی کم ہوگا۔

شہر میں رہتے رہتے اور زندگی کی حقیقتوں سے نظریں چراتے چراتے دنوں بیت گئے تھے۔ اور مجھے اپنے خول میں پڑے رہنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ سُست سی محفوظ حالت۔ ہر صبح اخبار میں قتل و غارت گری کے واقعات ـــ چوری، غنڈہ گردی جعل سازی، اغوا، اور زنا کاری کی خبریں ـــ جبر و تشدد، جنگ، ایٹمی خطرات کی اطلاعیں ـــ سمّیت، گرد و غبار، بیماریوں اور وباؤں کی وارنینگز گاؤں کے گاؤں جلا دیئے جانے اور شہر کے شہر تاخت و تاراج کر دیئے جانے کے سانحے میں بلا ناغہ پڑھتا ـــ لیکن اپنے اطراف اپنے بچوں کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر یا اپنی بیوی کو رسوئی میں کھانا پکاتے پاکر اور اپنی جیب میں شام کی دارو اور دوستوں کی تواضع پر خرچ ہونے والی رقم کا اندازہ کر کے مسرور ہوجاتا تھا۔ پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ میں ان واقعات پر۔ ان خبروں پر، ان اطلاعوں پر، ان سانحوں پر حقیقت کا گمان کروں! میرے لئے تو یہ تمام غیر متعلق، بے گانی، بے مصرف اور مصنوعی باتیں تھیں۔ جو میرے ذہن کے سانچے میں اتر ہی نہیں پاتی تھیں۔

پچھلے کئی دنوں سے میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا بارہ سالہ لڑکا اب لوگوں سے دبی آواز اور ملائم لہجے میں بات کرنے لگا ہے۔ اس نے مجھے محلے کے داداؤں، سنیما کے ٹکٹ بلیک کرنے والوں، مٹکا چلانے والوں، بھڑووں، سیٹھیوں، صاحبوں، پولیس انسپکٹروں اور حولداروں کو ادب سے سلام کرتے اور ان کے بال بچوں کی خیر خیریت پوچھتے بارہا دیکھا ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے مینٹل نوٹس (Mental Notes) لیتا رہا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس نے سوچا ہو کہ میرا باپ اس سوسائٹی میں بڑا کامیاب فرد ہے۔ ملنسار، ہنس مکھ، کلچرڈ اور سیولائز (Civilized) اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہو کہ اس دور میں محفوظ اور آرام دہ زندگی گزارنے کے یہی گر ہیں۔

سیاہ پوش نے میری اس طویل خاموشی کو اپنے فیصلے کی تائید سمجھا۔ پھر اس نے کونے میں بنے پیتل کا بٹن آن کر دیا اسکرین کا ٹیوب روشن ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد سیٹیاں بجنے لگیں۔ اب اسکرین پر نقوش اُبھرنے لگے سیٹیاں رک گئیں۔

بہت بڑے میدان کا کرین شاٹ (Craneshot) لیا جا رہا تھا۔ کیمرہ میدان میں کھڑے بے شمار لوگوں کے چہروں پر پین (Pan) ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی لوگ تھے جن کو سیاہ پوش نے گڈے گڑیوں سے انسانی پیکر عطا کیا تھا۔ بیسوائیں، کمہار، قصاب، تانگے والے، رکشے والے، باجے والے، ظروف ساز، موچی، خاکروب، بوجھ ڈھونے والے، کھیت مزدور، بہشتی، بھکاری، مرد، عورتیں اور بچے...... مرد عورتیں اور بچے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے منہ پر ٹیپ (Tape) چپکا دیے گئے تھے۔

''صفیں درست کرلو۔'' لاوڈ اسپیکر سے حکم صادر ہوا۔

وہ یوں بھی قطاروں میں کھڑے تھے۔ لیکن حکم سن کر اس قدر ہیبت زدہ ہوئے کہ میدان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھگدڑ سی مچ گئی۔ وہ اپنے پنجوں کو آگے پیچھے سرکا کر اور اپنے شانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر صفیں درست کرنے لگے۔

اب کیمرہ ڈولی شاٹ (Dolly Shot) لے رہا تھا۔ اور قطاروں کی عمودی سمت میں چل رہا تھا۔ انہوں نے اب اپنی صفیں بالکل درست کر لی تھیں۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ ان کی پشت پر چمڑے کے فیتوں سے کسے ہوئے ہیں۔

شاٹ کٹ ہوا، اب کیمرہ بہت دور سے پلیٹ فارم پر فوکس ہوا۔ پلیٹ فارم پر چند پیکر دھندلے دھندلے سے نظر آئے۔ اب ڈولی (Dolly) پلیٹ فارم کی جانب بڑھنے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ دھندلے پیکر واضح ہونے لگے۔

شاٹ فریز (Freez) کر دیا گیا۔

عین وسط میں رکھی اونچی مسند پر سوّر بیٹھا ہوا تھا۔ جو اپنے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا آئینہ تھامے

ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی ابروؤں کو سنوار رہا تھا۔ اس کی دائیں جانب بارڈر سیکورٹی فورس کا جوان، پولیس فورس کا جوان اور ان ہی دو فورسز کے دیگر جوان کھڑے تھے۔ سور کی بائیں جانب تاجران اور مذہبی لیڈران اور ان ہی طبقوں کے دیگر افراد کھڑے تھے۔ سور کی اولادیں اپنے بزرگ کی پشت پر کھڑی تھیں اور ان کے پنجے مسند کی پشت کو تھامے ہوئے تھے۔

مجسٹریٹ سور کے چرنوں میں اپنے مخصوص لباس اور اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ جس کی بائیں جانب وہ ادھیڑ عمر کا آدمی کاغذوں کا پلندہ تھامے مؤدّب کھڑا تھا۔

کیمرہ اب ایریل ویو (Aerial View) پیش کر رہا تھا۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر، رنگ برنگی پنڈال اور پنڈال پر گیان دھیان میں بیٹھے ہوئے گدھ!

میں نے اسٹول سے اٹھ کر ٹی وی آف کر دیا۔

''یہ کیا'' سیاہ پوش نے قدرے برہمی سے کہا اور ٹی وی آن کر دیا۔

میں نے اپنے رخ پھیر لیا۔ اور اپنی پیٹھ ٹی وی کی جانب کر لی۔

''لاؤ سگریٹ پلاؤ''

اس نے سگریٹ اور لائٹر مجھے تھما دیا۔

''تمہیں یہ شو پورا دیکھنا ہوگا۔''

''کیوں...... کیا یہ ضروری ہے؟''

''ہاں دستور تو یہی ہے۔''

''دستور...... کس کا دستور؟'' میں نے بے تعلقی سے پوچھا۔

''اسی کا...... کہ جس کا یہ سیٹ اپ (Set up) ہے۔

لیکن میں یہ شو دیکھنے پر مجبور نہیں ...... اور یہ شو میرے لیے کوئی نیا نہیں ...... یہ تو آئے دن کی بات ہے...... کبھی کبھار اس سے بھی دلچسپ تماشے دیکھنے کو مل جاتے ہیں مجھے اپنی زندگی میں...... اور اخبار میں اس سے بھی ہولناک خبریں پڑھنے کو......''

''تو''اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

''تو...... کچھ نہیں...... یہ گورکھ دھندہ چلتا ہے تو چلا کرے۔۔ مجھے اس میں ذرا سی بھی دلچسپی نظر نہیں آتی۔''

ا ''کیسی باتیں کرتے ہو! تم نہیں جانتے اس کا انجام کتنا تاسف انگیز اور المناک ہے۔''

''وہ تو ان گدھوں کی آنکھوں میں چھائی ہوئی ویرانی سے ظاہر ہے......اور......اس سور کے کولڈ بلڈ یڈنیس(Cold Bloodness) سے۔''

میری نظروں میں ایک ہاتھ میں آئینہ اور دوسرے ہاتھ سے اپنی ابروؤں کو سنوارتے اس سور کی تصویر گھوم گئی۔

''غالباً یہ شو تم نے کہیں دیکھا ہوگا؟''

''نہیں''

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ مجھے دور سے کسی کی سسکیاں سنائی دیں۔ جیسے کوئی بین کر رہا ہو...... جیسے نوحہ پڑھا جا رہا ہو......بس اسی لمحے اسی پل مجھے اس نوجوان کی، اس ریستوران میں عذر و احتجاج کے طور پر کی گئی خودکشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

بات کہنے کو یہی باقی رہ گئی ہے کہ ہم دونوں وقفے وقفے سے سگریٹ پھونکتے رہے اور شو کے خاتمے کا انتظار کرتے رہے۔ شام کو کھیل ختم ہوا اس کے سارے کردار یکے بعد دیگرے واپس ہونے لگے۔۔ گِدھ، سور، ادھیڑ عمر کا آدمی بارڈر سیکورٹی فورس کے جوان...... پولیس فورس کے جوان......مجسٹریٹ......تاجران...... مذہبی لیڈران...... بیسوائیں، کمہار قصاب، تانگے والے، رکشے والے، باجے والے، ظروف ساز، موچی، خاکروب، بوجھ ڈھونے والے، کھیت مزدور، بہشتی، بھکاری، پورے کا پورا شہر، سیاہ پوش نے ان کے سروں پر اپنی چھڑی کو دائروں میں حرکت دی، وہ اپنی تعداد میں گھٹنے لگے۔ آخر کار ہر قسم کا اور ہر پیشے کا بس ایک ایک نمائندہ باقی رہ گیا۔ سیاہ پوش نے انہیں ترتیب وار کھڑا کیا۔ چند کلمات کا ورد کیا۔ اور جب اس نے ان پر دم کیا، وہ تمام آدم

زاد پھر سے گڈے اور گڑیوں میں تبدیل ہو گئے۔ پرند اور جانور سمیت اور سکڑ کر اپنے جثہ میں گھٹ گئے۔ سیاہ پوش نے انہیں فرداً فرداً تابوت میں اتارا، پھر تابوت مقفل کر دیا۔ اس کے بعد اس نے بگھی جوتی، بچا ہوا چارہ سمیٹ کر بگھی سے لٹکے جھولے میں ڈالا۔ ہتھیلیاں مل کر صاف کیں پھر جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے لگام سنبھالتے ہی بگھی چل پڑی...... اور رات پھر...... سنسان ویران راستوں پر چلتی رہی میں اسٹول پر بیٹھا اونگھتا رہا۔

جب بگھی اسٹیشن کے قریب پہنچی، چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے اور وہی ٹرین دھواں اڑاتی اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ میں تیزی سے بگھی سے اُترا وہ اپنی سیٹ سے کودا، اس نے اشارے سے پھر پاس طلب کیا۔ کوٹ کی اوپری جیب سے قلم نکالا۔ پاس پر کوئی اندراج کیا۔ اور وہ پاس اس نے مجھے لوٹا دیا۔ رخصتی سے پہلے کرٹسی (Courtesy) کے طور پر میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اپنے ہاتھ کے جھٹکے سے اس نے مجھے جھڑک دیا۔ اس کی ادھ ڈھکی آنکھوں میں بے مروتی در آئی تھی اور چہرے پر شدید تناؤ کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔

گارڈ کی تیز سیٹی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اسی لمحے انجن بھی چیخا۔ میں گاڑی کی سمت تیزی سے دوڑا...... گاڑی رینگنے لگی...... میں نے اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا اور گاڑی پکڑ لی۔۔۔ میں دروازے میں کھڑا چھوٹتا منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ متحیر ہو گیا۔

ایک آدمی اسٹیشن کی وسیع عمارت سے باہر نکل رہا تھا جسے دور کھڑا سیاہ پوش چھڑی کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہا تھا۔!! ●●

امراؤ طارق

چوپال کا راجہ

چراغ جلے گاؤں کے مُکھیا کی چوپال میں لوگ جمع ہونے لگتے۔ کیا مسلم کیا غیر مسلم، کیا ادنیٰ اور کیا اعلیٰ سب ہی دن کے کاموں سے فراغت پا کر مُکھیا کی چوپال میں پہنچ جاتے جاڑوں میں ارہر کی سوکھی لکڑیاں یا سَن کے پولے روشن کر دیے جاتے اور لوگ چاروں طرف اینٹوں کی بیٹھک سنبھال کر بیٹھ جاتے۔ گرمیوں میں یہ مجلس باہر تاروں کی چھاؤں میں جمتی۔ آلہے گائے جاتے، ہندو مسلم گلے میں بانہیں ڈال کر، کاندھے سے کاندھا ملا کر شاہنامۂ اسلام اور تلسی داس کے دوہے الاپتے۔ بات غلے کی گرانی سے شروع ہوتی اور جرمن کی لڑائی پر ختم ہوتی، لال محمد بیڑیاں جلتیں، چلمیں دھونکی جاتیں، اور کچھ نہیں تو پتے والا تمبا کو ہاتھوں پر مَل کر چونا ملا کر پھانک لیتے، اور گرم راکھ پر میلی میلی رال تھوکتے رہتے۔ یہاں سب اپنی اپنی معلومات جتاتے لیکن انو میاں جو اس چوپال کے اہم جزو تھے کبھی نہ بولتے۔ بس خاموش بیٹھے لال محمد بیڑی پھونکتے رہتے۔ چوپال انو میاں کے بغیر کبھی مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی، یا انو میاں چوپال سے باہر انو میاں نہ لگتے تھے۔ کچھ لوگ تو انھیں چوپال کا راجہ کہتے تھے،

گاؤں کے مکھیا کی پہلی بیوی جب امید سے ہوئی تو اس پر بڑی پابندیاں عائد ہوگئیں کنگھی کر کے بالوں کو پھینکنے سے پہلے اُن پر تھوکنا پڑتا۔ اُتارے ہوئے کپڑے باہر والوں کی نظر سے بچائے جاتے۔ سورج غروب ہونے کے بعد صحن میں نکلنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ غرض کہ تمام ٹوٹکے اُن پر ختم تھے۔ جب پورے دن ہوگئے تو مُکھیا کی بیوی کی کمر میں کالا دھاگہ، پھونک کر باندھا گیا اور انو میاں پیدا ہوگئے۔ دو سال تک ماں کا دودھ جونک کی طرح چوستے رہے، پھر ایک سال گھر کی بھینس کا دودھ پیا اور دوسرے سال ان کی ماں اور بھینس دونوں ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں اور انو میاں منحوس قرار دے دیے گئے۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو سوتیلی ماں نے ایک نوکر

نکال کر اُس کے حصے کا کام انومیاں کو سونپ دیا۔ اور انومیاں اداس ہو کر چوپال کے ہو رہے۔

انومیاں کی تعمیر کے لئے فرشتوں نے بڑی پھُس پھُسی مٹی استعمال کی تھی۔ چار فٹ سے کچھ زیادہ بڑھنے کے بعد اور زیادہ بڑھنے سے انکار کر دیا۔ گاؤں والے انتظار کرتے رہے۔ لیکن انومیاں ایک انچ نہ بڑھے۔ پھر جوانی آئی تو سوکھنا شروع ہو گئے۔ گالوں کا گوشت گھل گیا اور آنکھوں میں حلقے اور نمایاں ہو گئے۔ لمبوترا سر سنوں سے بھر گیا۔ تنگ آ کر سر پر دو پلی ٹوپی چپکالی اور پنجگانہ نمازیں پڑھنے لگے۔ گاؤں والے سمجھ گئے کہ اب انومیاں مکمل ہو گئے ہیں۔

انومیاں اذان کے وقت بستر چھوڑ دیتے تھے، پیروں میں الہ آباد کی گھسی گھسائی کھٹ پٹی ڈالے بیلوں کو چارہ دیتے بھینس کا دودھ نکالتے اور دہلیز میں دودھ کی جھاگ ہٹا کر غٹ غٹ مناسب مقدار حلق میں انڈیل لیتے اور کنویں سے بھرا ہوا تازہ پانی ملا کر دودھ کا برتن باورچی خانے میں رکھ آتے اور وضو کر کے بڑی مسجد کے نمازیوں میں شامل ہو جاتے، اُن کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا حتیٰ کہ رمضان میں سحری کھانے کے بعد جب دودھ نکالتے تو مناسب مقدار اپنے حلق میں ڈالنا نہ بھولتے۔

جاڑوں کی دھند میں ڈوبی ہوئی سرد شام میں جب چوپال ارہر کی لکڑی کے دھنویں سے بھری ہوئی تھی، انومیاں اندر ہی کمبل اوڑھے چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے، ابھی ابھی کنویں سے چالیس گھڑے پانی بھر چکے تھے۔ سانسوں کی دھونکنی چل رہی تھی اور پیر اب تک کانپ رہے تھے۔ جیب سے بٹوا نکال کر تمباکو کی پھنگی بنا رہے تھے کہ چوپال کے سامنے چادر میں لپٹی چاندنی کے جھانج بجاتی ہوئی ہاجو آپا نکل گئیں۔ انومیاں کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، پتلیاں سمٹ گئیں اور بے خبری میں کئی مرتبہ چونا چاٹ گئے سانسوں کی دھونکنی اور تیز ہو گئی جاڑے کی اس بوجھل اور ویران سی شام میں چوپال کے سامنے سے بہار کیسے گزر گئی، انومیاں اس کے آگے کچھ سوچ ہی نہ سکے۔

مکھیا کے دوسرے لڑکوں میں سب سے بڑے کی شادی بڑے چاؤ سے رچائی گئی۔ ڈومنیوں کے ناچ ہوئے دوسرے لڑکے نے کمائی کے زعم میں شادی کر لی۔ تیسرے نے باپ کو خط لکھ دیا کہ

میری شادی کر دی جائے، اور کئی تیج میں باپ کو بروقت شادی کے افادے سمجھائے۔ مگر انو میاں ہمیشہ نظر انداز کئے جاتے رہے۔ گاؤں میں جب بھی انو میاں کی شادی کے چرچے ہوتے تو بڑے میاں تسبیح کی گردش روک دیتے۔ زیرِ لب کوئی دعا پڑھتے اور صاف کہہ دیتے کہ اِس کو کون اپنی لڑکی دے گا۔ اور اس پہلو سے جب گاؤں والے سوچتے تو انو میاں چنے کے کھیت میں اُگی ہوئی گھاس کی طرح بے مصرف معلوم ہوتے۔ بڑی مشکلوں سے گنگا پار میں ان کی شادی طے ہوئی یہاں تک کہ سسرال سے عید پر جوڑا بھی آ گیا۔ انو میاں نے تکیوں سے روئی نکال کر جوتوں میں ٹھونسی اور عید گاہ چلے گئے لیکن دوگانے سے واپس آ کر اعلان کر دیا کہ میں گنگا پار میں شادی نہیں کروں گا۔ جب ماں نے جھاڑ بتائی تو کہہ دیا کہ اگر میں شادی کروں گا تو باجو سے، اور سارے گھر نے اپنی اپنی انگلیاں دانتوں میں دبالیں۔ یہ کسی کو نہ معلوم تھا کہ وہ باجو آپا پر کب سے فدا ہیں۔ لیکن گاؤں والوں نے اکثر انھیں اس وقت پکی قبر کے پاس دیکھا ہے جب باجو آپا بڑے دروازے میں ''ڈھیک چاندنی'' کھیلا کرتی تھیں۔

باجو آپا جاگیردار کی اکلوتی بیٹی تھیں، اور پھر واقعی میدے کی طرح سفید اور پھولوں کی طرح نازک تھیں۔ اگر گاؤں والوں کو انو میاں کے اس جگر گردے کے عشق کا پتہ چل جاتا تو اتنے جوتے پڑتے کہ چاند پلپلی ہو جاتی۔ مگر وہ تو گھر میں انہوں نے اعلان کیا تھا اور بات گھر کی گھر میں رہ گئی انو میاں کا عشق بھی ایک طرفہ تھا۔ مجھ سے جب انو میاں نے ڈرتے ڈرتے ایک پیغام باجو آپا کو بھیجا تو میں اُن کے گھر جا کر واپس آ گیا اور انو میاں کو اپنی طرف سے جواب گھڑ دیا اور پھر یہ سلسلہ مٹھائیوں اور کنگھی چوٹی تک پہنچا، اور میں سب گول کرتا رہا۔ میں جب مٹھائیاں اور تحفے لے جا کر باجو آپا کی طرف سے انو میاں کا شکریہ ادا کرتا تو اُن کے چہرے پر خوشی کی شفق پھوٹ پڑتی اور قمیص کے نیچے میلے اور گندے شلوکے سے ملکہ وکٹوریہ کے پیسے نکال کر دیتے۔

چوپال میں سَن کے پولے سُلگ رہے تھے۔ لوگ بارش کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ انو میاں بہت اداس تھے، میں چوپال کے باہر بیٹھا ہوا لال محمد بیڑی کے ہلکے ہلکے کش لگا رہا تھا کہ انو میاں بھی میرے

پاس آ کر بیٹھ گئے۔ بیڑی نکال کر جلائی اور کہنے لگے میں کل شہر جا رہا ہوں۔

’’واقعی آپ شہر جا رہے ہیں۔‘‘ مجھے تعجب ہوا۔

’’ہاں اب میں کچھ کماؤں گا۔‘‘ انو میاں ستاروں سے بھرے ہوئے آسمان پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔

’’لیکن گاؤں سونا ہو جائے گا۔ چوپال اُجڑ جائے گا۔ میں نے جھوٹ موٹ رونی صورت بنا کر کہا۔

’’مجھے بھی یہ غم ہے‘‘! انو میاں بھی منمنائے۔ تھوڑی دیر بے مقصد میری شکل دیکھتے رہے پھر جیسے کچھ یاد آ گیا۔

اچھے میرا ایک کام کر دو گے۔‘‘

’’ہوں اوں۔‘‘ میں جانتا تھا کہ ہاجو آپا کے پاس کوئی پیغام یا تحفہ جائے گا۔

’’یہ لے جا کر ہاجو آپا کو دے دو۔ اُن سے کہہ دینا کہ تیرا انو اب کچھ بن کر لوٹے گا لیکن اس کا انتظار کرنا۔۔۔ وہ اب تیرے لائق ہو کر تیرے سامنے آئے گا۔ اور کچھ نیں تو......‘‘ ان کی آواز بھرا گئی اور حلق سے شوں شوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے پوٹلی اُن کے ہاتھوں سے لے لی۔۔۔ تازہ پیڑوں کی خوشبو سے میرا دماغ معطر ہو گیا، اور رال کا ایک پھندہ میرے منہ سے حلق میں پھسل گیا۔

’’لیکن آپ جا کیوں رہے ہیں؟‘‘ میں نے یوں ہی سوال کر دیا۔ گو کہ مجھے اس سے کئی دلچسپی نہ تھی کہ وہ کیوں اور کہاں جا رہے ہیں۔

’’جاگیردار مجھ جیسے آدمی سے اپنی بیٹی نہ بیاہے گا۔ کیونکہ میں نکما ہوں۔۔۔ کیوں کہ میں بے ہنگم ہوں۔۔۔ کیونکہ میں......اس لئے اب میں کچھ بن کر دکھاؤں گا۔ تم دیکھنا جب میں انگریزی لباس میں سفید گھوڑے والے......اکے پر بیٹھ کر گاؤں آؤں گا تو لوگ مجھے تعجب سے دیکھیں گے، اور پھر میں ہاجو آپا کو بیاہ لاؤں گا۔‘‘ وہ پھر تاروں سے بھرپور آسمان میں اپنی قسمت کا ستارہ تلاش کرنے لگے۔ اور میں پیڑوں کی پوٹلی لے کر کھسک آیا۔

اُفق پر رنگوں سے بھرپور رات کی مانگ میں کرنوں کا سیندور بھرتی ہوئی صبح گاؤں پر جگمگائی۔ پھر اسی طرح کئی اور صبحیں آئیں اور گاؤں پر روشنی بکھیرتی رہیں، لیکن انو میاں شہر نہ گئے۔ ایک

دن میں نے انھیں چوپال میں بیٹھا پکڑ لیا۔

''آپ شہر کیوں نہیں گئے۔''

''ہی۔ای ای۔ دراصل میں گاؤں نہیں چھوڑ سکتا۔ ہی ای ی ی۔'' وہ بے ہنگم ہنسی لنڈھاتے رہے۔ پھر ایک دم بچوں کی طرح منھ لٹکا کر سنجیدہ ہو گئے۔

''یہ گاؤں جہاں میں نے آنکھ کھولی ہے، مجھے بہت عزیز ہے۔ اسی گاؤں میں ہاجو ہیں، یہیں چوپال ہے۔ پھر تم ہی بتاؤ اچھے میں شہر کیسے جا سکتا ہوں۔''

تو پھر ہاجو آپا۔'' میں نے پھر چونکا دینے والا سوال کیا۔

ہاجو میری ہے۔ میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ سچ ہے مگر ہاجو بھی کسی اور کے پاس خوش نہ رہے گی۔ وہ قطعی سنجیدہ تھے۔

مجھے انو میاں کے اس دعوے پر گدگدی کا دورہ پڑا۔

گاؤں میں یہ خبر ہیضہ کی طرح پھیل گئی کہ انو میاں ہاجو پر فدا ہیں۔ جب یہ خبر جاگیردار کے کانوں تک پہنچی تو مکھیا کی شامت آ گئی۔ جاگیردار نے مکھیا کو بلا کر خوب ڈانٹا۔ گھر میں آگ لگوا دینے کی دھمکی دی۔ مکھیا کا سارا نزلہ انو میاں پر اترا۔ باپ کی گالیاں سن کر انو میاں کو پہلی بار غصہ آیا اور خود اعتمادی نے انگڑائی لی، غصے میں دانت پیستے تن تن کرتے اندھے کنوئیں کی جگت پر جا کے بیٹھ گئے۔ کچھ لوگ سمجھے رات کا وقت ہے کنوئیں میں کود پڑیں گے۔ کچھ کہنے لگے اب گاؤں نہ لوٹیں گے۔ مگر انو میاں کافی رات گئے چوپال پہنچ گئے۔ چھ دنوں چوپال میں پڑے بیڑیاں پھونکتے رہے۔ اور کئی دنوں بعد پہلی بار اس دن نکلے جب ہاجرہ آپا کی ڈولی رخصت ہو کر جانے لگی۔ جب ڈولی گاؤں کی حدود پار کر گئی تو میں انو میاں کے ساتھ تالاب کے کنارے کنارے نکل گیا، جہاں پانی کی سطح پر پالتو بطخیں قیں قیں کر رہی تھیں اور سنگھاڑے کے پتے تیر رہے تھے۔

''ہاجو آپا کی شادی ہو گئی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''یہ سب کیوں ہو گیا۔'' انو میاں بولے یہ سلسلہ کیوں ہو گیا۔ کیا مجھے محبت کرنے جینے اور

مرنے کا بھی حق نہیں۔ میں نے اپنی زندگی سے بھی اتنا پیار نہیں کیا۔ لیکن گاؤں والوں نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ کاش مجھے موت آ جاتی......''!

میرا دل چاہا کہ میں انو میاں کی مضحکہ خیز صورت گاؤں کے تمام لڑکوں کو دکھادوں، تاکہ وہ بھی اس تفریح میں شریک ہوسکیں لیکن مجھے اس کا افسوس تھا کہ اب ہاجو آپا کے نام پر انو میاں سے تحفے اور مٹھائیاں نہ مل سکیں گی۔ لیکن یہ انو میاں کی آخری تقریر تھی۔ اس کے بعد انو میاں ایک دم گاؤں سے غائب ہو گئے اور پھر نہ لوٹے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ کنوئیں یا تالاب میں ڈوب مرے۔ بعض کا خیال تھا کہ بمبئی چلے گئے۔ وہاں فلم ایکٹر ہو جائیں گے۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ انو میاں گاؤں سے ہمیشہ کے لئے چلے گئے تھے، اور چوپال ویران ہو گئی تھی۔

پَت جھڑ بیت گئی اور پیڑوں میں ہری ہری کونپلیں پھوٹ آئیں تو ہاجو آپا بھی سُسرال سے واپس آ گئیں میں شام کے وقت کوٹھی کی چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا کہ زرق برق جوڑے میں لدی پھندی، سہاگ کی خوشبو لنڈھاتی ہاجو آپا میرے پاس آ گئیں۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑی رہیں پھر بولیں۔

''کیوں ــــ یہ چوپال بند کیوں رہتی ہے؟'' میں نے اُن کی طرف غور سے دیکھا۔ اُن کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ غم خوشی یا تعجب سے ان کا چہرہ بالکل صاف تھا۔

''ہاجو آپا۔'' میں سنجیدہ ہو گیا۔ ''اب یہ چوپال بند رہے گی، کیونکہ چوپال کا راجہ گاؤں چھوڑ گیا۔''

میں ہاجو آپا کی طرف دیکھ رہا تھا، پتنگ کی تنی ہوئی ڈور میرے ہاتھوں میں ڈھیلی ہو گئی تھی ــــ اور کٹی ہوئی پتنگ فضا میں ہچکولے کھا رہی تھی، لیکن میں صرف ہاجو آپا کو دیکھ رہا تھا، جن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ نکلے تھے۔ اور میدے جیسے سفید چہرے پر اُداسی اور اضمحلال کے سرمئی بادل چھا گئے تھے۔ وہ نڈھال ہو گئیں تھیں جیسے طوفان کا مقابلہ کرتے کرتے ایک دم کشتی کے تختے الگ ہو گئے ــــ میں نے کٹی ہوئی پتنگ کی طرف دیکھا جو اَب بیٹھ رہی تھی ــــ ہاجو آپا مسلسل روئے جا رہی تھیں۔

☆☆

اشفاق احمد

قصاص

شام کے ٹھیک پانچ بجے موبے کلیام سے چل کر جب دونوں بھائی پتو کی پہنچے تو ساڑھے پانچ بج چکے تھے اور سردیوں کی شام گہری ہونے لگی تھی۔ انہوں نے سیون اپ کی ایک ایک بوتل میں آدھی آدھی چمچی کالے لون کی ڈالی۔ اور بوتل کے منہ پر انگوٹھا رکھ کر اسے اپنے اپنے منہ میں جکڑ بند کرلیا۔ دونوں بھائیوں نے ابلے ہوئے پانی کا ایک قطرہ بھی باہر نہ نکلنے دیا اور بڑی صفائی کے ساتھ اپنی اپنی بوتل پی گئے۔

اصل میں سابو اور دینوں دونوں سگے بھائی نہیں تھے۔ چاچے اور تائے کی اولاد تھے اور دونوں میں سگے بھائیوں سے بھی زیادہ پیار تھا۔ ایک سے رنگ کے کپڑے پہنتے۔ ایک جیسی پگڑی باندھتے۔ دونوں پٹی جوتی اور لانگڑ کھینچ کر چادر پہنتے تھے۔ دونوں ہونٹوں پر ملائی مل کے......، آنکھوں میں لال سرمہ ڈالتے تھے۔ اور دونوں موبے کلیام کی ایک ہی عورت کے عاشق تھے۔ یہ عورت ذات کی بورئن تھی اور سانڈے کا تیل بیچتی تھی۔ سردارنیوں کی مالش کرتی تھی۔ اور سرداروں سے مالش کرواتی تھی۔ سابو اور دینو اُس کو بہت اچھا جانتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کے دل میں کوئی میل نہیں تھا۔ ویسے بھی اُن کے دلوں میں دوئی نہیں تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُن کی دوستیاں اور دشمنیاں ساجھی تھیں۔ دوستی تو خیر ان کی ایک ہی تھی اور آپس کی تھی۔ لیکن دشمنیاں کافی تھیں۔ اسی لئے وہ سفر میں اور حضر میں ایک نوبر نو گولا ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ اور یہ گولا ایک کلاشنکوف ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اور تینوں ایک ہی وقت میں ایک ہی لینڈ روور میں سفر کرتے تھے۔

جس شام وہ پتو کی سے لاہور کی طرف چلے تو راستے میں میل بھر کے ٹوٹے پر بارش ہوئی۔ پھر

موسم بالکل صاف ساںبو نے دینو سے کہا۔تایا غلام غوث کبھی کبھی کرتار سنگھ بلٹو یئے کا قصہ سنایا کرتے تھے۔تو سماں باندھ دیتے تھے۔"

"ہو گیا"۔ دینو نے کہا۔"ابّے نے مجھے اور بھائی کرم داد کو صرف دو مرتبہ یہ قصہ سنایا تھا لیکن تمہارے گھر آ کر وہ اکثر اُس کا ذکر کیا کرتے تھے۔اصل میں اُن کو اپنی اولاد سے زیادہ اپنے بھائی کے بچوں سے پیار تھا۔"

ساںبو نے کہا"خیر یہ حقی سچی بات ہے۔تایا غلام غوث ہم سب سے بڑی محبت کرتے تھے اور یہ محبت ہمارے ابّے کی وجہ سے تھی۔اُن کو اپنا چھوٹا بھائی اپنے بیٹوں سے پیارا تھا۔"

دینو نے اپنے چچا زاد بھائی کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا اور اونچی آواز میں ایک واہیات قسم کا نعرہ لگا کر بولا۔"یہ ساری محبت کی کھیتیاں ہیں جن کو عشق کے پانی سیراب کر رہے ہیں بھائی! پر آگے کا علم نہیں کہ ہماری اولادوں میں بھی ایسی محبت رہتی ہے کہ نہیں۔"

"ضرور ضرور" پیچھے بیٹھا ہوا گولا بولا۔"جن کے بڑوں میں محبت ہوتی ہے ان کے چھوٹے بھی عشق کے جھونٹے لیتے ہیں۔"

ساںبو نے کہا۔"اوئے داریا! تمہارے گھرانے میں بھی کبھی ہوئی ایسی محبت، ہم بھائیوں جیسی؟ یا ہمارے وڈکوں جیسی یا ہمارے پُرانے پرکھوں جیسی جب ہم ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے۔"

دارا کچھ شرما سا گیا۔اور بھاگتی ہوئی لینڈ رور کے باہر دیکھ کر بولا۔"میرے دوناتوں میں ایسی محبت ضرورت تھی پر میں نے اُن کو دیکھا نہیں۔"

دینو نے چنک کر کہا۔"لکھ لعنت اوئے داریا! کبھی نانا بھی کسی کی جدّ پشت میں شمار ہوا ہے۔ نانکے بھی شجرے کھتونی، جمع بندی میں آئے ہیں کبھی! دادے لوگاں کی بات کر۔اونچے، لمبے سور میاں کی۔نانا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔"

دارا نے کلاشنکوف پر پھونک مارتے ہوئے ہولے ہولے سے کہا۔"ٹھیک ہے بھئی چوہدریا ٹھیک ہے۔جدّ پشت میں تو آخر تک دادے کا لہو اور دادے کی رت ای چلتی ہے۔نانا تو پہلے ہی

سٹیشن پر اُتر جاتا ہے۔''

دونوں بھائی ہنسنے لگے تو آگے پھر میل بھر کا دھواں دھار ٹوٹا آ گیا۔ بارش ہوئی نہیں تھی۔ پر تُلی کھڑی تھی۔ کالا سیاہ سمندر، بڑی ساری پکھال میں بھرا درختوں سے اُوپر چھلک رہا تھا اور کسی بھی گھڑی اُس کے پھٹ جانے کا اندیشہ تھا۔۔۔ لاہور ابھی کافی دور تھا۔

سابو نے کہا۔ ''میرا تایا سنایا کرتا تھا کہ ایسی ہی کالی رات تھی اور اسی طرح آسمان نے مینہ کا پرنالا روک رکھا تھا۔ جب بجن سنگھ پلٹو ہے کا بیٹا کرتار سنگھ گھر سے روانہ ہوا ہے۔ ماں نے کہا بھی کہ کاکا کل سویرے چاہے منہ اندھیرے نکل جانا۔ پر اس وقت نہ جا۔ بوند بارش کا موسم ہے، جھڑی لگ گئی تو راستے میں ایک ہی بیڑ ہے۔ وہاں رک بھی گیا تو تیری گھوڑی نہیں اٹکے گی۔ چار پھنیئر ناگوں کی راجدھانی میں بڑے بڑے راٹھ گھوڑے نہیں ٹھہر سکے۔ تیری گھوڑی تو پھر ابھی اکھڑ بچھڑی ہے، بدک کر تیری...... جانگھوں سے نکل جائے گی۔ کل سویرے سویرے چلے جانا اور دوپہر سے پہلے پہلے اپنے ماما کے پاس پہنچ جانا۔ کرتار سنگھ نے اپنی ماں کی بات سنی ان سنی کر دی اور کالی نُنّی پر کاٹھی ڈال کر لمبے پینڈے کے لئے تیار ہو گیا۔''

سابو نے کہا۔ ''میں نے کرتار سنگھ کی تصویر دیکھی تھی اس میں وہ موت کے گولے میں موٹے سیکل چلانے والے کی ساتھی لڑکی نظر آتا تھا۔ منہ پر ہلکی ہلکی داڑھی جو کانوں کے پاس جا کر گہری ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ پگڑی کے اوپر کھانڈے کے نشان، ہونٹ بہت ہی باریک اور ناک بالکل باریک اور چھوٹی تھی۔ تایا جی بتایا کرتے تھے کہ وہ اپنے ڈولے پر زنجیری باندھ کر اور ڈولا پھلا کر زنجیری توڑ دیتا تھا۔ گدھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر اور پورا زور ڈال کے گدھے کو دھرتی پر بٹھا دیتا تھا۔ زمین سے اُچھال کر درخت کے بڑے سے ڈالے میں لٹک کر اُسے اپنے ایک ہی جھکورے سے کڑاک سے توڑ دیتا تھا۔ اور نیزہ بازی میں سارے علاقے میں کوئی اس کا جوڑ نہیں تھا۔

کرتار سنگھ پلٹو ہے کی گر جی گراں کے ویدوں کی لڑکی سے یاری تھی جس کو سوائے اُس کے جانی یار گلزار کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ ویسے اُس کی ماں بھی اس بھید سے واقف ہو گئی تھی۔ کہ اس نے

ایک مرتبہ کرتار کے کپڑے دھوتے ہوئے جب اُس سے بنفشے، عقرقرح، شرینھ کے بیجوں اور ملٹھی کی خوشبو آئی تو اس نے پوچھا۔ ''سچ بتا کرتار یا وہ کون ہے جس کو تو چھیاں ڈالتا رہتا ہے۔ اس نے پکا سامنہ بنا کر کہا مجھے گورو کی سونہہ بے بے، کوئی بھی نہیں۔ گلزار تو اینویں ای بونگیاں مارتا رہتا ہے۔ ماں نے کہا۔ ''وے نکر میاں مجھے تو اُس نام بتادے تو کرتار نے پھر گورو کی سونہہ کھا کر کہا۔'' کوئی ہو تو اُس کا نام بتاؤں بے بے تو تو ویسے ہی وہموں میں پڑ جاتی ہے۔''

سابو نے کہا۔ ''ویدوں کی اُس لڑکی کا نام منور ما تھا۔''

دینو نے پوچھا۔ ''تجھے کس نے بتایا؟'' تو سابو دو ہاتھ منہ پر مل کر بولا۔ ''میں نے بہت سنی ہے یہ کہانی تایا جی سے۔'' ــــ ''پر تجھے یہ تو پتہ نہیں ہوگا کہ کرتار سنگھ پلٹو ہے کو مارا کس نے تھا؟''

''اس کا تو کسی کو بھی علم نہیں ویر جی۔'' سابو نے کہا۔ ''چھ بندے پکڑے گئے تھے۔ پانچ بری ہو گئے تھے اور ایک کو شش بول گئی تھی۔ وہ بھی ہائیکورٹ سے بری ہو گیا تھا۔''

دینوں نے کہا۔ ''اُس برکھا بھری کالی رات میں جب بیڑ کے اندر ویریوں نے کمند پھینک کر کرتارے کو گھوڑی سے گرایا ہے تو کالی نٹنی الف ہو گئی، اُس نے اپنی دونوں اگلی ٹانگیں آسمان تک اُٹھا کر ویریوں پر حملہ کیا۔ لیکن وہ بچ گئے اور کرتارے کے ہردے میں برچھی گاڑ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ اس کالی سیاہ اندھیری رات میں کالی سیاہ مشکی گھوڑی جب بھری بارش میں ننگ دھڑنگ واپس گھر پہنچی تو کرتار کی ماں چیخ مار کر اُٹھی کہ میرے کرتارے کی نٹنی برباد ہو گئی لوگو۔ اس کا کلغی والا مارا گیا۔ شاہ جوان کواری کی عزت لُٹ گئی۔''

اچانک موٹر کے اگلے پہیئے زور سے اُٹھے اور دھپ سے نیچے گرے۔ پیچھے بیٹھا گولا اپنی سیٹ سے اُچھلا اور چھت سے ٹکرا کر اپنی سیٹ آ گرا۔ دینوں نے کہا۔ ''کوئی بہت ہی ظالم سپیڈ بریکر تھا۔ میرے ہاتھ سٹیرنگ پر نہ ہوتے تو میں تو کھڑکی سے باہر نکل گیا تھا۔''

''لیکن لانگ روٹ کی مین سڑک پر آج تک کوئی سپیڈ بریکر بنا نہیں۔ یہ کچھ اور تھا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے چوہدری جی۔'' گولے نے تائید بھرے لہجے میں کہا۔

دینو بھی سوچ میں ڈوب گیا کہ اگر یہ سپیڈ بریکر نہیں تھا تو پھر لینڈ روور اچھلی کیوں اور لمبے روٹ پر چونکہ سپیڈ بریکر بنے نہیں ہوتے پھر گاڑی الف کیوں ہوئی اتنے زور سے اچھلی کیوں!''

سابو نے کہا۔''جب کرتارے کی موت کے ایک سال بعد اس کی ماں نے مشکی گھوڑی بیچ دی تو گاؤں والوں نے گھوڑی کو جاتے وقت روتے دیکھا۔ وہ خریدنے والے کو اچھی طرح سے جانتی اور پہچانتی تھی کہ وہ کرتارے کا بچپن کا دوست تھا لیکن کالی نٹنی نے اسے اپنے گاؤں کے اندر سوار ہونے نہ دیا۔ جب وہ بستی کی حد سے باہر ہوگئے تو گھوڑی نے اپنی تھوتھنی گورنام کے کندھے پر رگڑ کر اُسے سوار ہونے کی دعوت دی اور وہ ڈرتے ڈرتے اپنے یار کی گھوڑی پر سوار ہو کر اپنے چک کی طرف روانہ ہوگیا۔

''لاہور کتنی دور رہ گیا جی؟'' کلاشنکوف والے گولے نے پیچھے سے پوچھا۔ تو دینوں نے گردن ہلائے بغیر جواب دیا۔''پچیس میل''......

سابو نے کہا۔''بڑا لمبا مقدمہ چلا۔ بے بے نے پورا رقبہ بیچ کر بیٹے کے قاتلوں کی ساری گردنیں پھندوں میں پھنسا دیں لیکن پانچ صاف بری ہوگئے اور چھٹے کو شش بول گئی۔''

وہ بھی ہائی کورٹ میں بری ہوگیا۔'' گولے نے ہنکارا ابھرا تو سابو نے اپنے چچازاد بھائی سے کہا۔ ویر جی پورے چھ سال تک کرتارے کی مشکی گھوڑی نٹنی گورنام کے پاس رہی۔ لیکن کبھی کھلی نہیں۔ ویسی نہیں رہی جیسے اس عمر کی الہڑ بچھیریاں رہا کرتی ہیں۔ بُجھ سی گئی اور سردیاں گرمیاں گہرے سلیٹی رنگ کا جھولا پہن کر ہی سارا وقت گزار دیا۔ گورنام پٹی چھوڑتا بھی تھا اور ایڑی بھی لگاتا تھا۔ لیکن وہ دُلکی سے آگے نہ بڑھی۔ پوئیاں یا سرپٹ کے لئے اُس کا دل ہی نہیں مانا۔ دھمالی چلتی یار ہوار، منزل پر پہنچا دیتی لیکن کبھی سر اُٹھا کر گردن کو کمانچہ نہیں بنایا۔ دل گرفتہ سی جاتی اور ویسی ہی سرنہادہ واپس آجاتی۔ گورنام کو اُس کے اندر کا دکھ معلوم تھا اس لئے اس نے مشکی سے کبھی کوئی تقاضا نہیں کیا۔''

''گھوڑے کو، کتے کو، اور بھورے تیتر کو اپنے مالک کا بہت دکھ ہوتا ہے۔'' دینو نے کہا۔ لیکن

سابو نے اُس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اُس وقت تک اپنے تائے غلام غوث کے روپ میں اُترا ہوا تھا۔ اور فتح چوڑیاں پہنچ چکا تھا جسے اُس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ سابو نے کہا۔ ''پورے چھ سال بعد جب گورنام کالی نٹنی پر سوار چک میں داخل ہوا تھا۔ اور دو سانڈنی سوار اپنے بوتے کی مہار پکڑے نیائیں کے کھنگروں پر پیدل چل رہے تھے۔ کالی نٹنی اتنے زور سے ہنہنائی کہ گورنام کی گرفت زین پر ڈھیلی ہوگئی اپنا راستہ چھوڑ کر اور دونوں کنوتیاں دبا کر نٹنی چیتے کی طرح سنائیں میں جتائی تو گورنام اس کی پیٹھ سے اُچھل کر راستے کی موٹی دھول میں گر گیا اور اس کی تہمد کھل گئی۔

مشکی نٹنی دوسری جست میں پیدل چلتے سانڈنی سواروں کے سامنے پہنچ گئی۔ اُس نے دونوں پچھلے سموں پر اپنا پہاڑ جیسا بدن تول کر بائیں طرف کمر لچکائی اور دائیں طرف گردن میں خم ڈال کر آسمان بھر اونچی اگلی ٹانگوں کے ساغری سم جوڑے سامنے والے شخص پر تین ٹن کا دو موہا ہتھوڑا اچلا دیا۔ ایک دو تین اور جب اُس نے گرے ہوئے شخص کے سر پر چوتھا وار کیا تو اس کا بھیجا دور دور تک پھیلے کھنگروں سے جا کر چپک گیا۔ دوسرا آدمی اونٹ کی مہار چھوڑ کر بھاگا تو نٹنی کی مہیب آواز نے اُس کے قدم پتھرا دیئے۔ نٹنی کے پہلے ہی وار نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کے دو ٹوٹے کر دیے۔ اور وہ مفلوج ہو کر کھنگروں پر لیٹ گیا۔ پھر نٹنی ہنہناتی رہی اور سموں کے وار اُس کی ریڑھ کو ریزہ ریزہ کر کے توڑتی رہی۔ اونٹ کی مہار اُس کے ٹیڑھے نتھنے سے ملگجی دھار کی طرح سیدھی زمین پر اُتر رہی تھی۔ اور وہ اطمینان سے کھڑا جگالی کر رہا تھا۔''

لینڈ روور کے انجن سے چنگیز خان کے لشکر کی ایک خوفناک صدا بلند ہوئی اور تقریباً تیس ہارس پاور کی ٹاپ نے اندر ایک کھڑ وبتی سی مچا دی۔ دینوں نے چیخ کر کہا۔ ''ویر جی ٹائی راڈ ٹوٹ گیا۔''

ایک دم بریک لگا کر جب تینوں نے نیچے اتر کر یکھا تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا اور انجن اپنے نیوٹرل میں بڑی شائستگی کے ساتھ رہا تھا جب سب واپس آ کر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے تو ہر ایک نے شکر ادا کیا کہ ٹائی راڈ صحیح سلامت ہے اور انجن اپنی فل پاور میں چل رہا ہے لیکن سب حیران ضرور

تھے کہ وہ آواز کیسی تھی اور کہاں سے آئی تھی اور اس کا چنگھاڑ سے اور میدان حرب کے گھوڑوں کی آواز سے کیسا تعلق تھا پر یہ ایسی توجہ طلب بات نہیں تھی۔

اب لاہور قریب آ گیا تھا۔ اور ان کے سامنے دو راستے تھے کہ وہ نہر کنارے یونیورسٹی کیمپس والے راستے سے گلبرگ جائیں یا وحدت روڈ پکڑ کر فیروز پور روڈ کے پل پر پہنچ جائیں۔ سالو نے کہا۔ 'وحدت روڈ ٹھیک ہے۔'' لیکن جب وہ وحدت روڈ پر اقبال ٹاؤن کے دہانے کی سرخ بتی پر رُکے تو عین ان کے سامنے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل نے رک کر کلاشنکوف کی ایک لہراتی ہوئی افقی باڑھ ماری۔ اُسے جلدی سے دہرایا اور پھر لینڈ رروور کی تیز اور چمکدار بتیوں کے سامنے سے تیزی سے نکل گئے۔

دینو اور سابو جنھوں نے مشکل سے علامہ اقبال کے کمالِ فن کی بات کر کے اُن کے خوابِ پاکستان کا ذکر شروع کیا تھا دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گئے۔ پچھلی سیٹ پر جو گولا کلاشنکوف سنبھالے بیٹھا تھا وہ ہسپتال جا کر ختم ہو گیا اور اور اُن کی موٹر کو اُسی مقام پر سڑک کے کنارے روک کر پولیس نے تفتیش شروع کر دی۔ کچھ فٹے اور پیمانے لے کر سڑک ناپی گئی اور کچھ موٹر کا قد بُت ناپا گیا۔ اُس کے بعد موٹر کے اندر سے فنگر پرنٹ اور باہر سے اُس کے فوٹو اتارے گئے۔ ڈی آئی جی صاحب کے حکم سے ایک سپاہی کی ڈیوٹی موٹر کے پاس لگ گئی۔ اور وہ اپنی پرانی وضع کی رائفل لے کر ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔ اگلے روز صبح سویرے پولیس کے چھوٹے بڑے افسروں کے ہمراہ کوئی پندرہ بیس سپاہیوں کی نفری وہاں جمع ہو گئی۔

اخباروں میں تین کالمی سرخی سے یہ خبر شائع ہوئی تھی اور اس میں دینوں اور سابو خاندان کے اُس موروثی جھگڑے کا مذکور تھا جس میں مخالف پارٹی کے تین آدمی ابھی تک جیل میں تھے۔

لینڈ ردور دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی گئی تھی اور اس کے پہیوں کے آگے ایک ایک اینٹ رکھ دی گئی تھی۔ سہالہ سے دو ایکسپرٹ آ رہے تھے۔ اور ڈی آئی جی صاحب کے خصوصی تعلقات کی بنا پر اس واردات کی بڑی گہرائی گیرائی کے ساتھ تفتیش ہونی تھی۔ موسم کی خرابی کے

باوصف ایک فلی آرنڈ سپاہی ہر وقت گاڑی کے باہر ڈیوٹی پر موجود تھا۔ سارا دن گزر چکا تھا لیکن ابھی تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آسکی تھی۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار کر طرح طرح کے مال برآمد کر رہی تھی لیکن انھوں نے ابھی تک ایک بھی مشتبہ شخص گرفتار نہیں کیا تھا۔ اخبار والے البتہ چھبیس کے قریب مشتبہ اشخاص بے نقاب کر چکے تھے۔ لیکن چونکہ ہر ایک کے نام کے ساتھ مبینہ لگا ہوا تھا اِس لئے کسی کو بھی گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجرم دندناتے پھر رہے تھے۔ جب رات کے بارہ بجے اور فلی آرنڈ باوردی سپاہی قریبی کھوکھے پر جا کر کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گیا تو دونوں مجرم اپنی دوسری نئی موٹر سائیکل پر ننگے منہ اور ننگے سر، بغیر کسی ہتھیار کے دندناتے ہوئے نکلے اور لینڈ روور سے ذرا دور صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے دندنانے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں کوئی بھی موجود نہیں۔ وہ آن ڈیوٹی سپاہی جس کا ذکر انہوں نے اخباروں میں پڑھا تھا۔ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ آدھی رات کا ٹریفک اپنے روزانہ معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ اور وحدت روڈ پر خاصی چہل پہل تھی۔

دونوں مجرم حوصلہ کر کے گاڑی کے قریب آگئے اور اُس جگہ کا جائزہ لینے لگے تھے۔ جہاں کھڑے ہو کر انہوں ریپڈ فائے کئے تھے اور اپنے مشن میں سو فی صد کامیاب ہو کر گھر واپس گئے تھے۔

رات کا سماں تھا۔ اونچی اور مدھم سٹریٹ لائٹیں۔ قاتلوں کے چہرے پر شیطنت۔ ساتھ ہی تحقیر اور خود بینی وخود رائی کے تاثرات، آنکھوں میں شرارت اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ قاتلوں کو اتنا قریب، اس قدر پر سکون اور ایسے گھمنڈی اور مغرور دیکھ کر لینڈ روور کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور اُس کی بتیاں ایک دم روشن ہو گئیں۔ پھر اُس نے فرسٹ گیئر میں ایک سو بیس میل کی سپیڈ پر اپنے آپ کو اُبھار اور اینٹوں پر سے اُچھل کر جمپر جوڑ کے گورے قاتل کو ٹکر ماری جو کچھ دیکھے، سوچے، بولے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی، تو موٹر نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر اور بائیں طرف گھوم کر بھاگتے قاتل کو زور کی ایک سائیڈ ماری اور اُسے زمین پر گرا دیا۔

اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو لینڈ روور نے اپنا اگلا اور پچھلا پہیہ اُس پر سائن کی طرح چلا دیا۔ ریڑھ کی ہڈی کا چورا کرنے کے بعد اُس نے اندھے لیٹے ہوئے بیہوش قاتل کا پنجر توڑنا شروع کیا۔ اور جب تک اُس کی پسلیوں کی چھوٹی چھوٹی گنڈیریاں نہیں بن گئیں، لینڈ روور اپنے اگلے پہیوں کی آری اسی طرح سے چلاتی رہی۔ بہت سے لوگوں نے اس منظر کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن کوئی بھی کچھ سمجھ نہ سکا۔ بھاگنے والے خوفزدہ جوڑے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے یہی کہتے جا رہے تھے کہ حادثہ نہیں ہے کوئی پرانی دشمنی ہے ورنہ اندر بیٹھا ہوا ڈرائیور اس طرح سے کچوکے دے دے کر کیوں مارے۔ صبح جب ڈی آئی جی صاحب اپنے تفتیشی عملے کے ساتھ موقع واردات پر آئے تو لینڈ روور اُسی طرح سے اپنی جگہ پر کھڑی تھی، اور اس کے پہیوں کے آگے ایک ایک اینٹ بدستور رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے موقع پر موجود محافظ سنتری سے پوچھا تو اُس نے قرآن کی قسم کھا کر کہا کہ میں تو ایک منٹ کے لئے بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ صرف ایک پیالی چائے پینے گیا تھا۔ اور اسی عرصے میں یہ سارا کھیل ہو گیا۔

ڈی آئی جی نے پوچھا۔ ''اور یہ موٹر چلا کون رہا تھا؟''

سپاہی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میرے ہوتے ہوئے تو کوئی بھی اُس کے اندر داخل نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ تو بعد میں ہوا۔''

''اور اُس کی چابیاں کہاں تھیں۔'' انھوں نے کڑک کر کہا۔

''چابیاں میرے پاس تھیں جناب عالی میری برانڈی کی جیب کے اندر۔''

'تو پھر کس طرح سے موٹر سٹارٹ ہو گئی۔''

''پتہ نہیں جناب عالی۔ میں خود حیران ہوں۔''

''تم کو سوائے حیران ہونے کے اور کچھ آتا بھی ہے۔'' ڈی آئی جی صاحب نے غصے سے پوچھا۔ ''کس نے تمہاری ڈیوٹی لگائی تھی یہاں؟''

''منشی شیر دل نے جناب عالی!''

''سبھی گولی کے لائق ہو۔'' ڈی آئی جی صاحب نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''کیا منشی اور کیا بے منشی!''

مکینک جو بونٹ کھول کر اندر انجن کا مطالعہ کر رہا تھا۔ گردن باہر نکال کر بولا۔ سر جی ویسے تو کچھ خاص سمجھ نہیں آیا، لیکن ایسا لگتا ہے کہ بیٹری ارتھ ہو گئی اور اگنیشن آن ہو گئی۔ اگنیشن آن ہوئی تو گاڑی خود بخود اسٹارٹ ہو گئی۔ اسٹارٹ ہوئی تو گیئر میں ہونے کی وجہ سے چھرپا مار کر آگے بڑھی اور پھر سب کو لپیٹتی ہوئی چلی گئی۔'' مکینک کی یہ بات سن کر گاڑی بہت مسرور ہوئی۔ اور اُس کے کار بریٹر سے ہلکی سی آواز آئی۔ ''اوے روئیں اپنی مکینک گیریوں کو گدھے، کبھی موٹر اس طرح سے بھی اسٹارٹ ہوئی ہے!''

☆☆

ہرچرن چاولہ

سوال

آج ماتا جی کا خط ملنے کے بعد میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا، کِدھر جاؤں، کیوں اس دوراہے سے کوئی تیسرا راستہ پھوٹتا ہی نہیں۔ مگر آج میں اپنے دونوں بزرگوں، باپ بابو کیول رام چاولہ اور باپ جیسے چاچا بھگت ہیرانند سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے مجھے غلط راہ پر کیوں ڈالا۔ ہم تو سنتے آئے ہیں کہ ہمارے بزرگ بہت سیانے اور عقل مند ہوتے تھے اور وہ سینکڑوں سال آگے بھی سوچ لیا کرتے تھے۔ پھر میرے سمجھ دار اور پڑھے لکھے پتا اور دھرم گرنتھوں کو رگ رگ میں بسائے ہوئے بزرگ چاچا کو پچاس پچپن سال آگے کی تصویر کیوں دکھائی نہ دی؟ کیا ان کی ذہنی اُڑان اتنی مختصر تھی کہ وہ اتنے تھوڑے عرصہ بعد آنے والے اُس وقت کی پہچان بھی نہ کر سکے جب بھائی بھائی سے خوف کھانے لگے گا؟ وہ دونوں آج اس دُنیا میں نہیں ہیں کہ میرے اس سوال کا جواب دے سکیں، مگر دنیا بزرگوں اور داناؤں سے خالی تو نہیں ہوگئی ہے۔ میں آج کے سیانوں سے یہ پوچھتا ہوں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ آج میں پون سے اور پون مجھ سے خوف کھانے لگا ہے۔

سیانے کہتے ہیں، بچپن کی سب یادیں لاشعور کے ایک کونے میں محفوظ پڑی رہتی ہیں۔ مجھے یاد ہے جب میرے والد تبادلے کے بعد داؤد خیل جنکشن آئے تھے تو انہوں نے داؤد خیل گاؤں میں بھگت ہیرانند کے گھر کا ایک حصہ کرائے پر لیا تھا اور اسی روز سے انہوں نے بھگت جی کو اپنا چھٹا بھائی کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کے سگے بھائیوں کو ان سے یہ غلط قسم کی شکایت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ بھگت ہیرانند کو ان پانچوں بڑے بھائیوں سے زیادہ پیار کرنے لگے تھے۔ بھگت ہیرانند چھوٹی سی دوکان تو برائے نام سانس کی ڈوری قائم رکھنے کے لیے چلاتے تھے، ورنہ ان کا ایک

ایک سانس گوربانی گانے اور گرنتھ صاحب پڑھتے رہنے میں گزرتا تھا۔ بھگت کی اپنی کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھ کو ہی اپنے بیٹے کی طرح ہر وقت گود میں لیے لیے پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ گرنتھ صاحب کے پیچھے پیچھے پاٹھ کر رہے ہوتے تو بھی میں اُن کی گود میں ہوتا اور اُن کا ایک ہاتھ مورچھل مقدس کتاب پر جھلتا رہتا، اور دوسرا پیار سے میرے جسم کا طواف کرتا رہتا۔ گوربانی پڑھتے ہوئے ان کی سفید ہلکی ہلکی ترشی ہوئی ڈاڑھی ہلتی ہوئی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ آپ تو جانتے ہیں، بچہ پیار کا بھوکا ہوتا ہے اور پیار مجھے جتنا ان سے ملتا تھا شاید ہی بابو جی اور ماتا جی سے ملتا ہوگا۔ ماں باپ نے میرا نام ہرچرن داس رکھا تھا۔ اور بھگت چاچا خود سکھ نہ ہوتے ہوئے بھی نہ جانے اپنے کس جذبے کی تسکین کے لیے مجھے ہرچرن سنگھ کے نام سے بلایا کرتے تھے مگر ساتھ ہی کبھی کبھی جب میرے بال بڑھ کر میری آنکھوں میں گرنا شروع ہو جاتے تو خود ہی قینچی لے کر انہیں تراش دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔

بابو جی جتنے پڑھے لکھے، سمجھدار اور باشعور تھے۔ بھگت چاچا بھی اتنے ہی گیانی دھیانی اور انسان دوست تھے۔ اس وقت، ان کی زیادہ تر باتیں میری سمجھ میں تو آتی نہیں تھیں، مگر ایسا ضرور لگتا تھا جیسے وہ میرے ننھے کانوں میں شہد آگیں رس ٹپکا رہے ہوں، اُن کا منہ ہی منہ میں گوربانی پڑھنا تو میرا دل موہ لیتا تھا۔ مٹھاس کا مزہ صرف زبان سے نہیں، کانوں سے بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کا پہلے پہل علم مجھے اُن کی گوربانی سن کر ہوا تھا۔ اور میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ وہ جب مسلمان اور ہندوؤں کے سامنے گوربانی کے اشلوک، اور کبیر کے دوہے پڑھتے تھے تو لوگ عش عش کر اٹھتے تھے۔

بابو ہنومان اور کرشن کے بھگت تھے۔ انہوں نے گھر میں الماری کے ایک خانے میں ہنومان، کرشن اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں سجا رکھی تھیں اور بڑی باقاعدگی سے ہر روز اُن کے سامنے کھڑے ہو کر ان کی استتی کرتے تھے۔ بھگت چاچا سے میل جول بڑھنے کے بعد انہوں نے اپنے چھوٹے سے مندر میں دوسری سب مورتیوں کے ساتھ بابا نانک کی تصویر اور خواجہ دل محمد کی منظوم گیتا کے ساتھ خواجہ صاحب کی جپ جی اور سکھ منی صاحب بھی رکھ لی تھی اور وہ دونوں کتابوں

کا ایک ساتھ پاٹھ بھی کرنے لگے تھے۔

چاچا کے ایک بہت بڑے کمرے کی دھرم سالہ میں، جہاں ایک خوبصورت تخت پوش ریشمی بستے میں لپٹا بڑا سا گرنتھ صاحب رکھا رہتا تھا اور جہاں صبح سویرے بھگت جن صاف سُتھری چٹائیوں پر بیٹھ کر چاچا کا پاٹھ سنا کرتے تھے۔ اسی دھرم سالہ میں ہر شام کو ''ہرے رام ہرے رام، رام رام ہرے ہرے۔ ہرے کرشن ہرے کرشن، کرشن کرشن ہرے ہرے'' اور ''اوم جے جگدیش ہرے'' کی آرتیاں بھی گائی جاتی تھیں۔ جہاں پہلے دھرم سالہ میں اکثر چاچا کے ہاتھوں کڑا پرشاد گاؤں کے سرے پر موٹی موٹی چوٹیوں والے ہندو مگر ذہنی طور پر ہر لحاظ سے سکھ حاضرین میں بٹتا رہتا تھا۔ وہاں اب ریوڑیوں کی صورت میں ہر منگل کو ہنومان کا پرشاد بھی بٹنے لگا تھا۔ منگل کی شام کو ریوڑیوں کے پرشاد کے لالچ میں چاچا کی دھرم سالہ میں بچوں کی اتنی بھیڑ ہو جاتی کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہ ملتی اور چھوٹے بڑے اتنی اونچی آواز سے......

مہابیر بلوان، کرتا سب کا کلیان

مانگو بھگتی کا دان، دیجئے آن آن

گاتے کہ سارا گاؤں گونج اٹھتا۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، جتنا پیار اور خلوص مجھے چاچا سے ملا، اپنے ماں باپ سے بھی نہ مل سکا، میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ ماں باپ کی محبت سے محروم رہا ہوں۔ نہیں، ایسا کہہ کر میں گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔ انہوں نے اپنے تمام فرائض بہ حسن وخوبی انجام دیئے۔ مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں۔ ہاں، اپنے لیے اُن کی اور چاچا کی محبت کا موازنہ کرتا ہوں تو چاچا کا پلڑا کچھ زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے۔

وقت کے بے رحم اور ظالم ہاتھوں نے ہم سے چاچا کو چھین لیا اور اتھل پتھل کے کچھ ہی عرصہ بعد بابو جی بھی بھگوان کو پیارے ہو گئے۔ اب گھر میں ماتا جی، میں اور بابو جی کی موت کے ڈیڑھ ماہ بعد جنم لینے والا میرا چھوٹا بھائی پون رہ گئے۔ پون تو ہنومان کے پتا کا نام ہے اور لکشمی وشنو کی

استری ہیں، پھر پتہ نہیں ہماری لکشمی نام کی ماتا جی نے اس کا نام پون رکھنا کیوں پسند کیا، حالانکہ وہ خود بڑے کٹر سکھ وچاروں کی ہیں۔ پون سے بہت بڑا ہونے کی وجہ سے میں بابو جی اور چاچا کی گود میں پلا بڑھا اور پروان چڑھا ہوں، مگر پون شروع سے ہی ماتا جی کے قریب رہا ہے اور ماتا جی جیسا کہ سب جانتے ہیں، ایک ایسے خاندان کی فرد ہیں جس کے آدھے لوگ سِکھ اور آدھے ہندو وچاروں کے ہیں، یعنی ہماری نانی سکھ اور نانا ہندو تھے۔ اسی لیے جب شادی کے بعد ماتا جی چاولہ خاندان میں آئی تھیں تو جہیز میں میکے سے انہیں ایک خوبصورت سے ریشمی رومال میں بندھا ہوا گرو گرنتھ صاحب بھی ملا تھا جب کہ اسی گھر سے ان کی بڑی بہن کو جہیز میں بھگوت گیتا دی گئی تھی۔

صبح سویرے دہی بلوتے ہوئے اور گھر کا سارا کام کاج کرتے ہوئے ماتا جی منہ ہی منہ میں پاٹھ تو پہلے بھی کیا کرتی تھیں، مگر بابو جی کے مرنے کے بعد انہوں نے ان کی مورتیوں کے ساتھ بابا نانک اور گرو تیغ بہادر کی تصویریں بھی رکھ لی تھیں۔ فرصت زیادہ رہنے کی وجہ سے وہ صبح سویرے پون کو گود میں لیے گوردوارے بھی با قاعدگی سے جانے لگی تھیں اور شام کو ''رہوراس'' تو بڑی پابندی سے پڑھنے لگی تھیں۔ بابو جی کا سایہ سر پر نہ ہونے اور میری نوکری میں مصروفیت کے باعث پون ماں اور باپ دونوں کا پیار اُن ہی کی گود سے حاصل کرنے کی خاطر ہر دم ان سے لپٹا رہنے لگا تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد شروع شروع میں ہم امرتسر میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ وہاں ماتا جی ہر روز پون کو گود میں لیے پاٹھ تو کیا ہی کرتی تھیں، ہفتہ میں دو بار رکشا میں اس کے ساتھ ہر مندر صاحب بھی جایا کرتی تھیں۔ ویسے پیار تو پون کو میں اور میری بیوی پورنیا بھی کم نہیں دیتے تھے، مگر ہمارے پیار کا بھلا ماں کے پیار سے کیا مقابلہ؟

کئی سال بعد سروس کے سلسلے میں میرا تبادلہ ہوا تو ہم سب دہلی منتقل ہو گئے۔ دہلی میں بھی ماتا جی بڑی پابندی سے ارداس کرنے گوردوارہ جایا کرتی تھیں۔ بیانہ سے بڑے ماما جی جب کبھی ہم سے ملنے یا اپنے کپڑے کے بیوپار کے سلسلے میں دہلی آتے اور ہمارے ہاں ٹھہرتے تو سب سے پہلے ہم سب کو لے کر گوردوارہ سیس گنج ماتھا ٹیکنے جاتے۔ ماتا جی ہر روز قریب کے گوردوارے

جاتے وقت ہاتھ میں آٹے سے بھری ایک کٹوری لے جاتی تھیں جس پر تھوڑا سا گھی اور گڑ کی ایک ڈلی بھی رکھی رہتی تھی، جسے وہ ماتھا ٹیکتے ہوئے بابا جی کے چرن کملوں میں ارپن کر آیا کرتی تھی۔ مگر ایک دن ان کے رویہ سے مجھے عجیب سا جھٹکا محسوس ہوا۔ اس روز زندگی میں پہلی بار وہ بھری بھرائی کٹوری گوردوارے سے واپس لے آئی تھیں اور میرے پوچھنے پر میری کم پڑھی لکھی ماں نے کہا تھا میں تو وہاں من کی شانتی کے لئے جاتی ہوں، مگر آج جب میں نے وہاں ہری کیرتن کے بجائے سیاست پر لیکچر ہوتے سنا تو میرے من نے کہا یہاں تو کسی اور قسم کا پودا لگایا جا رہا ہے، جس کی جڑوں میں پانی ڈالنا میری آتما نے گوارہ نہیں کیا اور میں اپنا پانی واپس لے آئی۔ میں نہیں کہتی کہ سیاست بری چیز ہے، مگر ہر چیز کا اپنا ایک الگ پلیٹ فارم ہونا چاہئے۔''

انہوں نے اپنے آٹے اور گھی کو انکسار کی وجہ سے سادہ پانی کہا تھا مگر پھر بھی ان کا یہ رویہ مجھے عجیب سا ہی محسوس ہوتا رہا۔ تاہم انہوں نے کسی بات کی پروا کئے بغیر اپنا زیادہ وقت اب اپنے گھر کے چھوٹے سے مندر بجمع گوروارے کی نذر شروع کر دیا۔ اسی درمیان ہمارے پڑوس میں ایک سکھ فیملی بھی آ کر آباد ہوگئی۔ یہ بہت ہی نیک طینت اور خدا ترس لوگ تھے۔ انہوں نے گھر میں ایک پورا کمرہ سجا سنوار کر گورو گرنتھ صاحب کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اب ماتا جی روز صبح سویرے نہا دھو کر وہاں جانے اور واک لینے لگیں۔ وہ ہر گورپرب پر اپنے گھر سے کڑاہ پرشاد بھی بنا کر ساتھ لے جاتیں اور بڑی شردھا سے سنگتوں میں اپنے ہاتھوں سے بانٹتیں۔ اس دوران ہمارے ماما جی کا ایک لڑکا باقاعدہ پانچوں ککے دھار کے سکھ بھی ہوگیا تھا، مگر اس کے اور اس کے باقی تین بھائیوں کے پیار کی مثال بیانہ میں اب بھی پہلے ہی کی طرح دی جاتی تھی۔ وہ جب اپنی دُکان کے کام کے سلسلے میں ہمارے گھر آتا تو اپنی خوبصورت داڑھی مونچھ اور پگڑی باندھنے کے دلکش انداز کے ساتھ ہمیں اور خاص طور پر پون کو کوئی آسمانی مخلوق لگتا۔ ادھر ماں کے سنسکاروں کی وجہ سے بھی آہستہ آہستہ اس کے دل میں سکھی دھرم سے ایک خاص احترام پیدا ہو رہا تھا۔ بہت پہلے جب اُسے اسکول میں داخل کروایا گیا تھا تو ماتا جی اُسے خاص طور پر نہلا دھلا اور صاف ستھرے کپڑے

پہنا کر گوردوارے لے گئی تھیں۔ اس کے بعد تو وہ خود اسکول میں ہر امتحان کے وقت پہلے گوردوارے ضرور حاضری دینے لگا تھا اور گورومہاراج کی ایسی مہر ہوتی گئی کہ وہ ہر امتحان میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتا گیا۔

حالات مجھے ناروے لے آئے اور بہت صبر آزما جدوجہد کے بعد میں یہاں انڈیا کی نسبت کہیں زیادہ مادی خوش حالی کے ساتھ بس گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یون بی ایس سی کرنے کے بعد انجینئرنگ کرے اور انڈیا میں ہی کسی اچھے روزگار سے لگ جائے، تاکہ ہم دونوں میں سے ایک تو کم از کم ماں کا سہارا بنا رہے۔ لیکن فارن کا سراب وہ جادو ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ خود میں نے اِدھر بڑے بڑے ڈگری یافتہ لوگوں کو فرش صاف کرتے اور برتن دھوتے دیکھا ہے۔ مگر لاکھ بتاتے رہو، شور مچاتے رہو، سمجھاتے رہو، کون سنتا ہے؟ کم از کم وہاں بیٹھے بیٹھے تو کوئی بھی ہماری رائے پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہوتا جب تک خود آ کر اس دلدل میں پھنس کر نہ دیکھ لے۔ پھر دلدلوں نے کبھی کسی کو چھوڑا ہے؟

اُدھر یون کا میلان پڑھائی کی طرف کم اور مذہب کی طرف زیادہ بڑھنے لگا تھا۔ وہ رات کو بارہ بجے بھی سوتا تو سردی ہو یا گرمی، صبح کو تین بجے اٹھ کر اور نہا دھو کر شاہ جی کے گوردوارے جا کر باقاعدہ گوربانی کا کیرتن سننے لگا تھا۔ وہ اس پر بھی بس نہ کرتا، بلکہ کالج جانے سے پہلے کی تمام تیاریوں تک کیسٹ لگا کر گوربانی کا جاپ سنے جاتا۔ وقت بچانے کے لئے اس نے شیو کرنا بند کر دیا تھا۔ دراصل یہ اس کے سکھ دھرم کی طرف جھکاؤ کا پہلا زبردست اظہار تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے شیونگ سیٹ کو ایک فضول سی چیز کی طرح ایک کونے میں ڈال دیا۔

ماتا جی چاہتی تھیں کہ وہ پڑھ لکھ کر کام سے لگے تو وہ ایک سندر سی بہو گھر میں لے آئیں مگر یون کی انتہائیں تو سنیاسیوں جیسی ہوتی جا رہی تھیں۔ بھلا کون ماں پسند کرے گی کہ اس کا بیٹا اتنی چھوٹی عمر میں جوگ کی طرف مائل ہونے لگ جائے۔ مجبوراً انہوں نے اس کی دوسری زبردست خواہش کا احترام کرتے ہوئے اُسے میرے پاس بھیجنا مناسب سمجھا اور میں نے بھی ان حالات میں اپنی

نصیحتوں کے تمام ٹوکرے ایک طرف دھر دیئے اور اُسے اپنے پاس ناروے بلا لیا۔

ناروے آ کر اس نے فوکلے ہائی اسکول میں دخلہ لیا۔ نارویجین زبان سیکھی، اور پھر ڈپلوما اِن سوشل ہیلتھ حاصل کر کے نرسنگ کورس شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ اس کا دھرم سے عشق پھر جاگنے لگا اور وہ ہی بہت سویرے اٹھ اُٹھ کر گوربانی کے کیسٹ سننے لگا۔ ہم دونوں کے پردیس میں بس جانے کی وجہ سے ماتا جی شدید تنہائی محسوس کرنے لگی تھیں، وہ چاہتی تھیں کہ پون انڈیا واپس پہنچ جائے۔ خود میری بھی یہی تمنا تھی اور پون بھی اس شرط پر واپس جانے پر رضامند تھا کہ ماتا جی دہلی کا مکان بیچ کر پنجاب منتقل ہو جائیں۔

مگر اب ماتا جی نے لکھا ہے کہ میں اسے واپس نہ بھیجوں اور اسے بھی ناروے ہی میں بسانے کی کوشش کروں۔ اور میں آج کل کے تمام حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سوچوں میں ڈوبا ہوں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء کچھ ایسے حالات بھی اپنے دامن میں لائیں گے کہ پون اپنے باپ جیسے بزرگ اور شفیق بڑے بھائی سے ڈرتا پھرے گا اور میں اپنے پیارے پیارے چھوٹے بھائی کو شک کی نظروں سے دیکھوں گا۔ اُسے رات دو تین بجے اٹھ کر کچن کی ٹونٹی سے ٹھنڈا اور تازہ پانی نکال کر پینے کی عادت ہے۔ وہ جب بھی رات کو پانی لینے کے لئے اٹھتا ہے، میں اس کے پاؤں کی چاپ سے جاگ جاتا ہوں اور اپنے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل کی بتی جلا لیتا ہوں، اور جب تک وہ کچن میں رہتا ہے، میں رضائی میں کسمساتا رہتا ہوں، جیسے میں اُسے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں سویا ہوا نہیں، جاگ رہا ہوں۔ اور جب کبھی کسی کام سے میں اس کے قریب جاتا ہوں تو خود اس کی آنکھوں میں بھی کسی خوف کی پرچھائیاں مجھے صاف نظر آنے لگتی ہیں۔

☆☆

کنور سین

گلیڈی ایٹر

چتا بھڑ بھڑاتی رہی۔

کومیلا اُسے دیکھتے ہوئے پتہ نہیں کیا سوچنے لگی۔

رات کو اور بھی گھنا ہوتے دیکھ کر بولی۔

لوگ کب کے لوٹ گئے، تم بھی جاؤ۔ مجھے پتہ نہیں کب تک رکنا پڑے۔

وہ دور تک ہو آئی۔

یہ کہتا تھا چتا ٹھنڈی ہونے تک پاس بیٹھی رہنا۔

کومیلا رات کی آتما میں جھانکنے کے لئے بے چین ہو اٹھی۔

عجیب آدمی تھا۔ میرا اس کا ملاپ بھی عجیب ڈھنگ سے ہوا۔ میں جانتی تھی۔ شاید یہ بھی جانتا تھا۔ اس کی آخری خواہش اور بھی عجیب تھی۔

تم بتاؤ اس کی راکھ کو ذرّہ ذرّہ بکھیر دینے سے سمسیا حل ہو جائے گی؟

شمشان ـــ کالام بھجنگ شمشان ہُنکار اٹھا۔

کومیلا کی پرچھائیں جیسی کایا کو دیکھتے ہوئے میں سننے لگا۔ اس میں بیٹھا کوئی عجیب ڈیزائن بننے لگا:

جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا یہ شمشان سے زیادہ بھیانک لگتا تھا۔

چٹکتی چنگاریاں شعلوں کا روپ دھارنے لگیں۔

کومیلا بولتی چلی گئی۔

یہ پریشان رہتا ـــ لوگ جانے کس سمے اور کون سے ستھان کی بات کرتے ہیں؟

زندگی کی گہما گہمی میں بھی یہ اکثر چونک اٹھتا:

مجھے سب یاد ہے۔ کچھ بھی دُھندلا نہیں پڑا۔

کوروکشیتر کی بات جانے دو۔

اس مہایدھ میں میرے ساتھ عجیب بات ہوئی۔

میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو اپنی تجربہ گاہ میں قدرت کے ساتھ جوجھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہاڑ، پاتال اور سمندر کا بھید جاننے میں لگا تھا۔ آکاش میری نظروں کو بھانپ رہا تھا اور تبھی ...... میرے کانوں میں رن بھیری گونجنے لگی۔ میں اپنے کو بھول گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ پچھتانے لگتا۔

تم وِشواس کرو۔ میں کسی یدھ میں اپنی مرضی سے نہیں گیا۔ کوئی دوسرا مجھے کھینچ لے گیا۔

یہ بوکھلا جاتا۔

تم نہیں جانتیں کہ آدمی بیٹھے بیٹھے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

یہ اپنی کہانی کی طرف لوٹ آتا:

میرے پاس شکتی تھی۔ برسوں کی تپسیا سے پراپت کی ہوئی شکتی۔ کچھ بھی کر سکنے کی شکتی۔ اچھا ہوا اس یُگ کی نیتی کرشن طے کر رہا تھا ورنہ......

مجھے یدھ بھومی میں اترتے دیکھ کرشن اداس ہو گیا۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ میری شکتی کو پہچانتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ میں اُس کا ساتھ دوں گا جو ہار رہا ہوگا۔ کورووں کی ہار نشچت تھی۔ لیکن میں اُن کے ساتھ ہو جاتا تو......

کرشن پانڈووں سے زیادہ سرِشٹی کے پورن وِناش سے ڈر گیا۔

جس دِن میں کورکشیتر پہنچا اسی شام وہ سادھو کے بھیس میں میرے پاس آیا۔ اس نے بھکشا میں میرا سر مانگ لیا۔

''لیکن میں یدھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس میں حصہ لینا......'' میں تلملایا۔

''تم یدھ دیکھو گے۔ اس میں حصہ نہیں لو گے۔'' کرشن کی مسکان نردئی تھی۔ اُس نے میری منڈی کاٹ کر درخت سے لٹکا دی تھی۔

کتھا سنانے کے بعد یہ سٹ پٹانے لگتا۔

سوال یہ نہیں کہ میں نے یدھ میں حصہ نہیں لیا۔ سوال اور ہے......

کومیلا نے ایک بار پھر کالے شمشان کی لہو میں ڈوبی جیبھ کو دھیان سے دیکھا: یہ پتہ نہیں مجھے کیا کچھ بتا تا رہتا۔ اتنا کچھ یاد رکھنا آسان نہیں۔ پھر بھی مجھے یاد ہے۔۔۔ قصہ وسطی دور میں وسط ایشیا کا۔۔۔

یہ تڑپ اٹھتا:

میں نے سدا ایک ہی نظارہ دیکھا۔۔۔ تلوار سان پر، تیر کمان پر۔۔۔ گھوڑے کی ہنہناہٹ اور ہاتھی کی چنگھاڑ۔

لشکر ہمیشہ کوچ کرتا رہا۔

اُن دنوں بڑا اندھیرا تھا۔ سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ تہذیب و تمدن کی پرچھائیں تک باقی نہ رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں تھی بیل کی راس اور کندھے پر کدال۔ پانو کے نیچے پتھریلی دھرتی۔

میں دن رات بھومی کی بنجر کوکھ کو اپجاؤ بنانے میں لگا رہتا۔ امید کی ہریالی پھوٹے گی اور میرا مقدر جاگ اٹھے گا۔ اس سے پہلے پتہ نہیں میں نے کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ آدمی دانہ پانی کی تلاش میں جانور اور پرندے سے بھی زیادہ لمبا سفر طے کرتا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں بھومی کو مسکراتے دیکھوں ایک دن میرے کان کھڑے ہو گئے۔

دور نقارے پر چوٹ پڑنے لگی۔ میرے دل کی دھڑکن جیسی آواز۔

میں سچ کہتا ہوں میں نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے کدال زمین پر رکھ دی۔ بیل کی راس ہاتھ سے چھوڑ دی۔ بیل کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ رجھانے لگا۔ لیٹی ہوئی کدال اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دستہ

میرے دائیں ہاتھ کو چومنے لگا۔ بھومی آہیں بھرنے لگی۔ کدال، بیل اور بھومی سے موہ کے ہوتے ہوئے بھی نقارے کی آواز کی طرف کھنچتا چلا گیا۔

وسط ایشیا کا میدان جس پر اندھا یگ گدھ کے پروں کی طرح چھایا ہوا تھا۔ ڈھول اور شور۔ تلوار کی کڑکڑاہٹ، تیر کی سنسناہٹ۔

کوئی تھا جو مجھے نقارے پر چوٹ لگا کر کھینچ لے گیا۔ وہ کون تھا میں نہیں جانتا وہ بول رہا تھا:

لشکر کوچ کرے گا۔ تلوار اور ڈھال ہمارا نشان ہے اور نشانہ...... ریگستان کے پرے سرے پر پہاڑی کے اس پار کی ہریالی ہماری منتظر ہے۔ وہاں اناج، پانی دولت ہے اور عورت بھی۔

لوٹ کا مال بانٹنے کا ترازو ہر ایک کی اپنی ڈھال۔ ڈھال بھر اناج، سونا، عورت جو بھی...... تلوار میدان سے باہر رہے۔ سروں کو کاٹتی، لو چاٹتی......

مجھے یاد ہے ایک بار میں لشکر سے بچھڑ گیا۔ بھٹک کر جنگل میں پہنچ گیا۔ عجیب نظارہ تھا۔ جنگل میں جھاڑی کے نیچے سانپ اور نیولا چین سے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں دوسرے درندے آنے لگے۔ چھانو میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو سہلانے لگے۔ نہ بھیڑ بھیڑیے کو دیکھ کر سہمی نہ بھیڑیا بھیڑ کو دیکھ کر غرایا۔ سچ کہتا ہوں چوہا شیر کی پیٹھ پر بیٹھ کر آیا۔ میں جھاڑی کی جانب بڑھا کہ اسکا پتہ توڑوں۔ اُسے چبا کر اپنے بکھرے وجود کو جوڑوں۔ لیکن یہ میری قسمت میں نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب غائب ہو گیا۔ نہ جھاڑی رہی نہ درندے۔

اس دن سے میں جھاڑی کی تلاش میں لگ گیا۔

کوملا رکی۔ وہ چتا کی آنچ ناپنے لگی۔

یہ کم نہیں ہوئی!

میں نے کہا نا تم جاؤ۔ مجھے پتہ نہیں کب تک یہاں بیٹھنا پڑے۔

مجھے جوں کا توں بیٹھا دیکھ کر وہ پھر اس کی کہانی سنانے لگی۔

یہ سچ کہتا تھا۔

میں بھی جھوٹ نہیں بولتی۔

اس کا اور میرا ملاپ بڑا عجیب تھا۔

یُدھ چل رہا تھا۔بستی آگ میں گھری ہوئی تھی۔

یہ دھوئیں کو پار کر کے اور آگ کو چیر کر ہمارے گھر میں آ دھمکا۔اسے دیکھ کر گھر کے لوگ لرز اٹھے۔میں مسکراتی رہی۔

میری ماں، باپ اور بھائی کی ہتیا کر کے یہ میری طرف بڑھا۔میں نے مسکرانا بند نہیں کیا۔

اس نے سنگین کی نوک میری چھاتی پر رکھ دی۔میں پھر بھی مسکراتی رہی۔

دوسرے ہی پل اس کی آنکھوں کی سرخی پگھلنے لگی۔جبڑے ڈھیلے پڑنے لگے ہاتھ بھی......

بندوق ایک طرف پھینک کر یہ میری طرف لپکا____ ''جھاڑی۔میری جھاڑی''!

اس نے مجھے باہوں میں بھر لیا۔

صبح ہوئی تو اس نے دیکھا یہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا ہے۔میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی ہوں۔میری چھاتیوں پر اس کے ہونٹوں کے نشان ہیں اور میرے ہونٹوں پر ان کی مٹھاس۔رات بھر شہد جو چوستا رہا۔

اس دن اس نے مجھے پہلی بار بتایا۔

مجھے شروع سے بگل اور نقارے کی آواز کھینچتی رہی۔میں نے کبھی اُدھر جانے کی نہیں سوچی۔ پتہ نہیں کون مجھے اس طرف کا رخ کرنے کو اُکسانے لگتا۔دُھند بن کر مجھ پر چھانے لگتا۔میں نہ چاہتا تھا لیکن میں رُک نہ پاتا۔

یہ میری طرف دیکھ کر ہمک اٹھا:

میری آنکھوں میں جمی وحشت دیکھ کر ہر کسی کا کلیجہ دہل اٹھتا۔لیکن تم......!

تم کون ہو؟ تم کون ہو؟____ یہ پوچھتا رہا۔میں مسکراتی رہی۔اپنی دانست میں اس کے اندھیرے من میں جوت جلاتی رہی____ اسے قدرت کا نیا روپ دکھاتی رہی۔

اب فوج لٹیروں کا بے ہنگم ٹولا نہ تھی۔

اب اس کا قانون تھا اور قاعدہ تھا۔

ہر فوج کی اپنی رجمنٹ تھی۔ اُس کا نشانہ تھا۔ سرکار کی دی ہوئی وردی تھی اور تھی سرکار کی طرف سے مقرر تنخواہ۔ کوئی فوج میں بھرتی ہو سکتا تھا اُسے اپنی مرضی سے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ بھگوڑے پر مقدمہ چلایا جاتا اور وہ سخت سزا پاتا۔

اس نے پروا نہیں کی۔ یہ میرے ساتھ بھاگ نکلا۔ ندی نالوں کو پار کر کے اس نگری میں آ پہنچا۔

دوسرے سال ہمارے لڑکا پیدا ہوا۔ یہ خوشی سے ناچ اٹھا۔

اسے تلوار سے بچائیں گے۔ بگل کی آواز سے دور لے جائیں گے۔

لیکن دوسرے ہی پل یہ اُداس ہو گیا۔

سوال نقارے یا بگل کا نہیں۔ سوال اور ہے۔

یہ اپنے سر کو جھٹکنے لگا جیسے چاروں دِشاؤں کی چھان پھٹک کرنے لگا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے کبھی نہیں چاہا۔ پھر بھی میں...... میں کس کو دوش دوں؟

کومیلا نے ایک بار پھر چتا کی آگ کی طرف ہاتھ بڑھایا:

اس کی آنچ کم نہیں ہوئی۔

خیر!

ایک دن یہ کام سے لوٹا تو گھبرایا ہوا تھا۔

مجھے لگتا ہے جھاڑی سوکھنے لگی۔

اس کی بات سُن کر میں چکرا گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ان میں سرخی ابھرنے لگی تھی۔

یہ چیخ اٹھا۔

میرے کانوں میں پھر نقارہ گونجنے لگا۔

لشکر کے کوچ کرنے کی آواز آنے لگی۔

لگتا ہے مجھے تلوار بلانے لگی۔

میں کیا کروں؟

کچے گوشت کا ذائقہ اور گرم لہو کا سواد میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ شاید یہ میرا وہم ہے کوئی اور وجہ بھی تو......

یہ اپنے بچے کی طرف اداس نظروں سے دیکھنے لگا۔

اُس دن میں مسکرا نہ سکی۔

اس دن سے اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ رات دن کراہتا رہتا۔ چیختا چنگھاڑتا رہتا۔ کونے میں پڑی بندوق کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور آنے والے یُدھ کی خبر سناتا۔

ایک دن یہ مٹھیاں بھینچنے اور دانت کٹکٹانے لگا۔

مجھے بتاؤ آج کل گلیڈی ایٹر کا تماشا ہوتا ہے یا نہیں؟

میں حیرت سے اسے تکنے لگی تو یہ ہنس پڑا۔

میں جھوٹ نہیں کہتا۔ گلیڈی ایٹر کا کرم میں نے اپنی مرضی سے نہیں نبھایا۔ وہ تو میں پکڑا گیا اور سدھایا گیا۔ لیکن سوال میرے پکڑے جانے یا سدھائے جانے کا ہی نہیں، سوال اور بھی ہے۔

یہ اپنے کو کھوجتے کھوجتے گلیڈی ایٹر کی کہانی سنانے لگا:

پرانی بات ہے۔ یونانی غلاموں کی تجارت کرتے۔ کئی ایک گلیڈی ایٹر اکھاڑے چلاتے، جوان، تندرست اور توانا غلام خرید کر لاتے۔ انہیں خوب پالتے۔ فولاد میں ڈھالتے۔ داؤ پیچ بتاتے، چھری چلانا سکھاتے۔

پٹھے تیار ہو جاتے تو شہر میں منادی کرائی جاتی۔ بادشاہ ملکہ اور امیروں کبیروں تک خاص دوت کے ہاتھوں خبر بھجوائی جاتی۔ تماشے پر ٹکٹ لگایا جاتا۔ لوگ اکھاڑے کے گرد بیٹھ جاتے تو غلاموں کی جوڑی چھوڑی جاتی۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر۔ دونوں ایک دوسرے پر پل پڑنے کو تیار۔

یہاں پہنچ کر یہ لمبی سانس لیتا۔

میں قسم کھاتا ہوں بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ کبھی نہ چاہتے لیکن نہ ٹلتے۔

اکھاڑہ خون سے لال ہو جاتا۔ غلام ایک دوسرے کی تکا بوٹی اڑاتے۔ تماشائیوں کا دل بہلاتے۔ اکثر وہ گوشت کے ٹکڑے امیر زادیوں کے ہاتھوں میں تھماتے۔ شہزادیاں اور ملکہ گوشت کے ٹکڑوں کو دباتی رہتیں، مسکراتی رہتیں۔

آخر ایک غلام دوسرے کو گرا کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتا اور اپنا خنجر اُس کے دل پر رکھ دیتا۔ اس وقت بادشاہ اپنی جگہ سے اٹھتا۔ اکھاڑے میں آتا۔ نیچے پڑے غلام کے سینے میں خنجر کو آہستہ آہستہ اُترتے ہوئے دیکھتا اور خوشی سے تالیاں بجاتا۔ غلام کا تڑپنا اُسے بہت بھاتا۔

کہانی سناتے سناتے یہ چیخ اٹھتا۔

مجھے اکھاڑے میں لے چلو۔ مجھے اکھاڑے میں لے چلو۔

کومیلا نے چِتا کی جانب دیکھ کر آہ بھری:

اس کے پاگل پن کو بڑھتے دیکھ کر میں نے ترکیب سوچی۔ میں اسے مرغوں، مینڈھوں اور سانڈوں کی لڑائی دکھانے لے جانے لگی۔ اس کے کچے گوشت کی بھوک اور گرم لہو کی پیاس بجھانے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔

یہ بڑے شوق سے دیکھتا رہتا۔

اکھاڑے کے کنارے بیٹھا قہقہے لگاتا۔ سیٹی بجاتا۔ لہولہان جانوروں کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ لیکن گھر آتے ہی اُداس ہو جاتا۔

کل یہ بہت اُداس تھا۔

اس نے اکھاڑے میں جانے سے انکار کر دیا۔

جانوروں کے خون سے طبیعت اکتانے لگی۔ مجھے پُرانی بو پھر بلانے لگی۔

شام ہوتے ہوتے یہ کلبلانے لگا۔ ایک ہی رٹ لگانے لگا۔

سچ بتاؤ واتاورن میں بارود کی بُو ہے یا نہیں؟

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

یہ اور بھی اداس ہو گیا۔

آج فیصلہ ہو جائے۔

یا میں یا مجھ میں چھپا......

یہ چونک پڑا۔

تمہیں ملٹری بینڈ کی دھن سنائی نہیں دیتی؟

وہ مجھے بلا رہے ہیں۔

مجھے بھی پیٹ اور پیٹھ پر بم باندھنے ہیں۔

مجھے جانے دو۔ مجھے جانے دو۔ اپنا کرم نبھانے دو۔

اس کی حالت دیکھ کر بلبلائی۔

تم نے مجھے گلیڈی ایٹر کی دُکھ بھری کتھا سنائی۔ اب تم......

میری بات سن کر یہ کانپ اٹھا۔

تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے فیصلہ کر لیا۔

وعدہ کرو چتا ٹھنڈی ہونے تک اُس کے پاس بیٹھی رہوگی......

صبح ہونے سے ذرا پہلے یہ دھیرے دھیرے کونے کی جانب چلنے لگا، وہاں پڑی اپنی بندوق پر نظریں جمائے۔

مین نے اسے نہیں روکا۔

میں پلنگ پر سوتے اپنے بیٹے کو دیکھتی رہی۔ کومیلا چونک اٹھی۔

بولنا چھوڑ کر وہ تیسری بار چتا کی آنچ ناپنے لگی۔

یہ کم نہیں ہوئی۔ یہ بالکل کم نہیں ہوئی۔

☆☆

افتخار نسیم

سگریٹ

وہ اس ٹوٹ پھوٹے مکان سے باہر نکلا تو اس کی طبیعت مکدر ہو چکی تھی۔ مکان کے اندر کی گندگی، لوگوں کا وضو کے پانی کو جگہ جگہ پھینکنا پانوں کی پیک، بیت الخلاء کی بدبو مسجد کا یہ تصور اس کے ذہن میں کبھی نہیں تھا۔ اس نے جب یہ سنا کہ چند مسلمانوں نے ایک مکان کرائے پر لے کر اس میں مسجد بنالی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اسے شکاگو آئے ہوئے ابھی تین مہینے ہوئے تھے اور وہ شدید ''ہوم سک'' تھا۔ اسے وہ لوگ جنہیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا، یاد آ رہے تھے۔ شکاگو میں کوئی دیسی آبادی نہیں تھی۔ کسی نے اسے بتایا کہ ایک جگہ ایک پروفیسر رہتا ہے، وہ ہندوستانی ہے۔ اس نے اس پروفیسر کو فون کیا اور اردو میں بات شروع کی۔ لیکن وہ پروفیسر ساؤتھ انڈیا کا ہندو نکلا۔ اسے ہندی یا اردو بولنی نہیں آتی تھی۔ اکبر بہت مایوس ہوا۔ اس لئے جب اس نے سنا کہ شکاگو میں کسی مسجد کا وجود ہے تو وہ جمعے کے دن چھٹی کر کے وہاں چلا گیا۔ اس مکان میں داخل ہوتے ہی اس کا ایک ملی جلی بدبو نے استقبال کیا۔ دائیں ہاتھ ایک شخص کھڑا ادھر ادھر سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دھان پان سی انتہائی خوبصورت عورت کھڑی تھی۔ ان کے سامنے میز پر سموسے چنے اور باقی ملی جلی اشیاء پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے السلام علیکم کہا تو اس شخص نے قدرے رکھائی سے جواب دیا۔ وہاں چند لوگ نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔ نماز کے بعد سموسہ کھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے سموسے کا بھاؤ پوچھا۔ ''ایک ڈالر کا ایک سموسہ اس نے ڈالر کو روپے سے ضرب دی۔ بارہ روپے کا ایک سموسہ؟ مسجد میں یہ چور بازاری؟...... لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اکبر نے سوچا۔ رمضان کے دنوں میں برف کتنی مہنگی ہو جاتی ہے۔ کھجوریں

جنہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں، ہیروں کے مول بکنے لگتی ہیں۔ دودھ ایک دم بازار سے ناپید ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں نے کب مسلمانوں کو بخشا ہے۔ بہرحال اس نے سموسہ لے لیا اور اس شخص سے باتیں شروع کر دیں۔ اب وہ شخص قدرے خوشگواری سے گفتگو کرنے لگا۔ عبدالوحید نے اپنی بیوی کا تعارف اکبر سے کرایا۔ اس نے بہت شائستگی سے آداب کہا۔ لیکن اکبر نے جب عبدالوحید کو بتایا کہ وہ پاکستان میں پنجاب سے ہے تو وحید کے لہجے میں وہی رکھائی اور ٹھنڈا پن آ گیا۔ اکبر کے لئے لسانی اور علاقائی تعصب کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

عبدالوحید کی بیوی نے بڑے دکھ سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔

لیکن وہ اپنے خاوند کے اس تعصب کو کیسے ختم کرے؟ مسلمان مسلمان کے اتنا خلاف کیوں ہے؟ برجیس دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ ''اب مجھے اسی کے ساتھ ساری عمر رہنا ہے۔ امریکہ میں آزادی ہوگی لیکن ہمارے معاشرے میں تو کوئی نہیں ہے۔''

اکبر وحید کے اس رویے سے دل برداشتہ ہو کر دروازے سے باہر نکل آیا۔

''جلدی جلدی چیزیں سمیٹو۔ گھر بھی پہنچنا ہے۔ اور تم اس لڑکے کی طرف کیوں دیکھ رہی تھیں۔ وحید نے برگشتگی سے کہا۔

''بیچارہ نیا نیا لگتا ہے۔'' برجیس نے چیزیں اکٹھی کرتے ہوئے جواب دیا۔

''تو اس سے پیٹ میں منڈھی دے کر مل لیتیں؟''

''ہاؤ'' برجیس نے بے بسی سے کہا۔

وہ گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ابھی تک میرے بچے اور بچیاں چھوٹے ہیں۔ امریکہ میں پلیں بڑھیں گے۔ جانے کیسے نکل آئیں۔ کبھی وہ کسی امریکن کو گھر لے آئے تو قیامت آ جائے گی۔ لڑکوں کا تو برداشت ہو جائے گا لیکن یہ لڑکیوں کی آزادی کیسے برداشت کرے گا؟ ہم روپے کے لالچ میں یہاں کیوں آ گئے؟ وہاں اپنے وطن میں ہمارے پاس سب کچھ تھا۔ جائیداد، رشتے دار، دوست احباب......

کار ایک جھٹکے سے رکی۔ گھر سے باہر چار پانچ بچوں نے وحید اور برجیس کا گرم جوشی اور چیختے ہوئے استقبال کیا۔ برجیس اپنے سارے غم اور تفکرات بھول گئی۔ وحید کو دیکھ کر سب بچے ایک دم چپ ہو گئے۔ وہ اندر چلا گیا۔ بچوں نے پھر شور مچانا شروع کر دیا۔

وحید کا معاشی درجہ بلند ہوا تو ہر طرف رشتے داروں نے یلغار کر دی۔ امریکہ جو کبھی بہت دور تھا اب جیسے دوسرا محلہ بن گیا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ بچوں اور وحید کے درمیان پہلے ہی کوئی اتنی انڈرا سٹینڈ نگ نہیں تھی۔ اب تو ڈالر نے ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی تھی۔

وحید تو ڈالر کمانے میں مصروف تھا۔ برجیس نے بچوں کی پرورش کا ذمہ اکیلے ہی لے لیا۔ وہ بچوں کے ہوم ورک کے ساتھ انہیں سیپارے بھی پڑھاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے انہیں اردو بھی پڑھانا شروع کر دی۔ ایک دن وحید جلد واپس آ گیا۔ اس کے بڑے بیٹے رضوان نے وحید کو علامہ اقبال کی ایک نظم سنائی۔ اسے شاباشی دینے کی بجائے اس نے رضوان سے پوچھا کہ اس نے یہ کس سے سیکھی ہے۔ رضوان نے جواب دیا۔

''امی نے سکھائی ہے۔''

وحید برجیس پر برس پڑا۔ ''تمہیں بچوں کا دماغ خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ امریکہ میں اردو کی افادیت کیا ہے؟''

'لیکن آپ ہی پچھلے دنوں بحث کر رہے تھے کہ بچوں کو اردو پڑھانی چاہئے تا کہ ہماری تہذیب وتمدن قائم رہے۔'' برجیس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

'وہ تو بحث تھی۔ حقیقت تو اور ہے۔ بس اب بحث بند کرو۔'' وحید نے واش روم جاتے ہوئے کہا۔

وقت گزرتا رہا۔ بچے دو قسم کے معاشرے اور والدین کی دوغلی طبیعت کی وجہ سے کنفیوز ہوتے چلے گئے۔ آخر ہمارا تشخص کیا ہے؟ بچے اکثر برجیس سے پوچھتے؟ اور وہ بھی اس کا کوئی مناسب جواب نہیں دے سکتی تھی۔ آخر وہی ہوا۔ بچے جب ذرا بڑے ہوئے تو خود مختار ہوتے چلے گئے۔

''ہمارا گھر پریشر کُکر ہے'' وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہتے۔ بچے دو دنیاؤں بلکہ دو انتہاؤں

میں رہ رہے تھے۔ والد ڈالر کمانے کے چکر میں سارا دن باہر رہتا۔ بچوں کو اپنے امریکن دوستوں کو گھر لانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے اکثر وہ گھر سے باہر رہتے۔

ایک دن وحید نے برجیس سے کہا کہ ہمیں بچوں کو واپس بھیج دینا چاہئے تاکہ وہ ہندوستان سے مسلمان لڑکے اور لڑکیوں سے شادی کر آئیں۔ یہ سنتے ہی سب لڑکوں نے بغاوت کر دی۔ اور صاف انکار کر دیا۔

''یہاں بھی تو اتنی بڑی مسلم کمیونٹی ہو گئی ہے۔ یہیں سے ہی کوئی ڈھونڈ لیتے ہیں۔'' برجیس نے تجویز پیش کی۔

لیکن وحید جانتا تھا کہ اب معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اس اب احساس ہوا کہ اسے بچوں کے ساتھ رہنا چاہئے تھا۔ اسے ان کی پرورش میں برجیس کا حصے دار بننا چاہئے تھا۔ لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ وحید نے اپنی اکلوتی بیٹی کنیز کی طرف دیکھا جس نے اپنا نام کنی رکھ لیا تھا۔ اگلے برس اٹھارہ سال کی ہو جائے گی۔ پھر تو یہ قانونی طور پر کہیں بھی جا سکتی ہے۔

''کاش میں وقت کو روک سکتا۔'' وحید نے بے بسی سے سوچا۔

جس گھر میں پھل دار درخت ہوتا ہے وہاں پتھر بھی آتے ہیں۔ کمیونٹی کے بچے اب بالغ ہو گئے تھے۔ اب کسی نہ کسی بہانے لوگوں نے اپنے بالغ بچوں کو ایک دوسرے سے ملانا شروع کر دیا۔ چند ایک شادیاں بھی ہو گئیں۔ والدین کی امیدوں کے بجھتے ہوئے چراغ پھر سے روشن ہو گئے۔

لیکن جب کنی نے برجیس کو بتایا کہ وہ امریکن سے شادی کرنا چاہتی ہے تو برجیس کا تقریباً نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔

''وہ تمہارے باپ کو کیسے بتاؤں؟''

''یہ آپ کا مسئلہ ہے۔''

سونے سے پہلے برجیس نے وحید کو کنیز کا فیصلہ سنا دیا۔

لیکن برجیس حیران ہو گئی۔ جب وحید نے بڑے اطمینان سے کہا۔'' کوئی بات نہیں۔ میں کل

اس سے بات کروں گا۔''

صبح کے وقت گھر میں ایک ہنگامہ بپا تھا۔

''لیکن وہ لڑکا ہے کون؟''

'اس کے ماں باپ جاپانی ہیں۔ لیکن وہ امریکہ میں پیدا ہوا ہے۔'' کنی نے بتایا۔

''شکر ہے خدا کا وہ کوئی کالا نہیں لے آئی۔'' وحید نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن تم ہماری ایک ہی بیٹی ہو۔ ہم یہ شادی دھوم دھام سے اور تمام رسومات کے ساتھ کریں گے۔ اگر تم اسے مسلمان بنالو۔''

لڑکے کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ مسلم کمیونٹی سینٹر میں جا کر مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلامی نام عبدالحق رکھ دیا گیا۔

''مہندی کی رسم ہو رہی تھی۔ عورتیں برجیس کو طنز کے ساتھ مبارک باد دے رہی تھیں۔''

''مسلمان تو ہو گیا، اس کے ختنے بھی ہوئے ہیں؟''

برجیس کا دل دھڑک اٹھا۔

''رہنے دو بہن جاپانی ہے، باقی کیا بچے گا۔'' کسی نے ہنستے ہوئے کہا۔

برجیس کا دل ڈوب گیا۔

رات کو دونوں ماں بیٹی اکٹھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ برجیس نے محبت سے پوچھا۔

''بیٹی تمہیں کوئی مسلمان پسند نہیں آیا۔ آخر اس میں ایسی کون سی بات ہے؟''

کنیز نے بڑی قناعت سے کہا۔ ''ڈیڈی جب سگریٹ پیتے تھے......''

برجیس اس کے بعد کچھ نہ سن سکی۔

☆☆

بشریٰ رحمان

ٹوٹا ہوا آدمی

اتنا شاندار دفتر، یہ بڑی کار، اوپر سے نیچے تک ایک مستعد عملہ، اچھی شہرت — اور رہنے کے لئے ایک خوبصورت، آرام دہ گھر۔

ایک آدمی کے کریئر کی یہی انتہاء ہوتی ہے۔ ابتداء وہ کہیں سے بھی کرے۔

جبران علی نے بھی بڑی کڑی مسافت طے کی تھی۔ یوں سمجھئے کہ پاؤں پاؤں چلتا اور آبلے پھوڑتا وہ اس مقام تک آیا تھا۔

پہلے پہل جب یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی اس نے سی ایس پی کا امتحان دیا تھا تو اس کے سامنے کئی راستے تھے۔ ابا کی دواؤں کی دوکان پر بیٹھ جاتا۔ مزید تعلیم کے لیے باہر چلا جاتا۔ کالج میں لیکچرار ہی رہتا۔ کیونکہ وہ اپنی کلاس میں اول آیا تھا۔ ادر کالج کی لیکچراری تو اُسے یوں ہی بن مانگے مِل گئی تھی۔ بن مانگی شے کی کبھی قدر نہیں ہوتی۔ اس لیے اس نے سی ایس پی کا امتحان دے ڈالا۔ اسے لگ رہا تھا سی ایس۔ پی وہ ستاروں بھرا راستہ ہے جو چاند سورج تک پہنچا دیتا ہے۔ ایک بار آدمی اس راستے پر چل پڑے تو منزل تک پہنچنے کے گُر اسے خود بخود آ جاتے ہیں۔ یا شادی ڈی۔ سی اور کمشنر کی کوٹھیوں پر جوتے چٹخاتے رہنے سے کُرسی اس کی کمزوری بن گئی تھی۔ ایسی کمزوری جو خنجر کی نوک بن جاتی ہے۔ خواہشوں کی قبا پھاڑ ڈالتی ہے۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ وہ اس امتحان میں بھی اول آیا اور قسمت نے اسے اس راستے پر ڈال دیا۔ جسے وہ کریئر کی کہکشاں کہا کرتا تھا۔

ملازمت ملتے ہی اس نے اپنی ایک پرانی کلاس فیلو سے شادی کر لی۔ جس سے وہ عشق تو ہمیشہ

سے کرتا تھا۔ مگر اس کے باپ کی جھنڈے والی گاڑی سے ڈر کر کبھی بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

دونوں مرادیں ایک ساتھ بر آئیں۔

اور وہ زندگی کی کہکشاں پر قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

آگے اور آگے...... آگے بڑھنے کی لگن اگرچہ بہت اچھی ہے۔ مگر اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔

ایک سخت مقام کچھ ایسا آیا کہ اس کی سختی کا وہ مقابلہ نہ کر سکا۔ بہت دنوں تک وہ اپنے دل کی آواز کو دبا کر ضمیر کے شعلوں کو ہوا دیتا رہا۔ مگر اس کا اثر اُلٹا ہوا۔

جب وہ چھوٹے چھوٹے علاقوں کا بادشاہ مانا جانے لگا تو اس میں تمام تر شہنشاہی عادات سرایت کرنے لگیں۔ اس کا اس میں کیا قصور تھا؟ جہاں جاتا لوگ دوزانو ہو جاتے۔ اس کی پہچان اس کی موٹر تھی۔ اور وہ بڑی کوٹھی جس کے گیٹ پر چوب دار پہرہ دیتا نظر آتا تھا۔

اندر باہر ضرورت مندوں کا ہجوم نظر آتا۔

اور پھر لوگ تو ستم ظریف ہیں۔

خدا کی قسم اس نے کبھی عورت اور شراب کو چھونے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ نہ جانے کن کی مہربانیوں سے بوتلیں بیڈروم میں گھس آئیں۔ شراب تن من میں اُتری تو ساقی گری کی لذت نے سر اٹھایا۔ ساقی آیا تو ساتھ سنگت بھی آیا۔

جام، ساقی اور سرور، تینوں نے مل کر اُسے لوٹ لیا۔

یہ سب کچھ رفتہ رفتہ زندگی کی ضرورت بتایا گیا۔ یا شاید اسٹیٹس کی علامت بنتا گیا۔ بیویاں روتی ہیں، چلاتی ہیں، دھمکیاں دیتی ہیں۔ بالآخر سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔ کیونکہ شوہر کا اسٹیٹس اور بچوں کا مستقبل انہیں بھی عزیز ہوتا ہے۔

جب شوہر مدہوش ہو ہو کر سرِ محفل گانے والی کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا ہے۔ تو وہ مسکرا

مسکرا کر اپنے آنسو ضبط کرتی ہیں۔اور ہنس ہنس کر گانے کی داد دیتی ہیں۔یوں تو جبران علی کے بے شمار دوست تھے۔اور کون تھا جو اس کا دوست کہلانا پسند نہیں کرتا تھا۔مگر جبران علی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اُن میں فصلی بٹیرے کون کون سے ہیں؟ لیکن اس کے پیشے کا تقاضا یہ تھا کہ پہچان کے باوجود اُنہیں قریب رکھے۔اور اُن کے پردے رکھے۔قربت کے باوجود کچھ دوریاں بھی رکھے۔

لیکن قدرت نے کچھ پیارے دوست بھی عطا کیے تھے۔جن میں سے ایک سلمان شاہ بھی تھا۔سلمان شاہ ایک پڑھا لکھا زمیندار تھا۔اُس نے ملک سے باہر جا کر بیرسٹری کی ڈگری لی تھی۔لیکن طبیعت میں سادگی اور درویشی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔اس لیے اپنے پیشے سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا رہا تھا۔ہاں اُس کی ذات سے دوستوں کو خوب فائدہ پہنچا تھا۔جبران علی کی ٹرانسفر جب سلمان شاہ کے شہر میں ہوگئی تو پرانے دوستوں کی پرانی محفلیں پھر زندہ ہوگئیں۔

جب بھی جبران علی اپنے کام سے تھک جاتا تو سلمان شاہ کے گھر آ جاتا۔سلمان شاہ کے گھر کوئی اسے سرکار نہیں سمجھتا تھا۔وہاں وہ ایک پیارا بھائی تھا۔اچھا دوست تھا۔سب لوگ فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے،تاش کھیلتے،سلمان شاہ کے بچے چاچا،چاچا کہہ کر اس کے گلے میں جھولتے رہتے۔

کم از کم وہاں جا کر اسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک انسان ہے۔آزاد ہے۔اور اپنی مرضی سے ہنس بول سکتا ہے اور ایک ایسی جگہ بھی ہے جہاں وہ جس عالم،اور جس حلیے میں بھی چاہے جا سکتا ہے۔مرتبے اور وردی کو جعلی نوٹ کی طرح پرے پھینک کر۔ہاں ایک بات کی کمی اسے محسوس ہوتی کہ سلمان شاہ کے ہاں پینے پلانے کا بندوبست نہیں تھا۔سلمان شاہ اکثر مردوں کی طرح شادی سے پہلے پیتا ہوگا مگر اب شادی کے بعد تائب ہوگیا تھا۔اُس کی بڑی وجہ غالباً اس کی بیوی ہوگی۔

پینے والے کسی ایک جگہ رت جگا نہیں کر سکتے جہاں بوتل کا بندوبست نہ ہو۔رات اُترتی ہے تو اُن کے ذہن کے جنگل میں بھوت پریت واویلا کرنے لگتے ہیں۔اور پھر جب تک کھانے سے پہلے جبران علی چسکی نہ لگا لے اسے کھانے کا مزہ نہیں آتا۔ادھر ہر شب سلمان شاہ نے اپنی بیوی

سے کہہ سن کر، جبران علی کو اپنی بوتل ساتھ لانے کی اجازت دے دی۔

''اب کوئی زہر کی گولی اپنی جیب میں رکھے یا پھانسی کا پھندا گلے میں لٹکائے رکھے، بھلا کسی کو اعتراض کیوں ہو۔ اپنی گور اپنی گردن۔ اگر ہم مہیا نہیں کرتے تو ہم گناہ میں شامل کیوں ہوں گے؟''

سلمان شاہ کے ان دلائل کو شائستہ نہیں مانتی تھی۔ وہ ایک مضبوط ارادے کی پڑھی لکھی عورت تھی۔ پتہ نہیں شراب سے کیوں متنفر تھی......؟ مگر جب جبران علی اپنی بیوی کو بھی محفلوں میں لانے لگا تو وہ بھی آ کر بیٹھنے لگی۔

سلمان شاہ کی بیوی عجیب قسم کی عورت تھی؟

کم از کم جبران علی کو تو یہی محسوس ہوا۔ اس کی صورت پر ہی لکھا ہوا تھا کہ وہ بڑی سلجھی ہوئی تعلیم یافتہ عورت ہے۔ کتنی تکلیف دہ ہوتی ہیں وہ عورتیں جن کے چہروں پر اُن کی ذہانت کی چھاپ ہوتی ہے۔ وہ محفل میں ہمیشہ چراغ کی صورت نظر آتی ہیں۔ کبھی ایک مکتب لگتی ہیں کبھی میخانہ......

اور مرد ایک طالب علم کی صورت ہوتا ہے۔ وہ جب تک زندہ رہتا ہے، عورت کے بارے میں ہر علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عورت پر ریسرچ کرنا چاہتا ہے۔ عورت کو ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ کھوجنا چاہتا ہے۔ ہر عورت اُس کو ایک ایسا جزیرہ لگتی ہے۔ جسے ابھی دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ دریافت کا کولمبس بننا چاہتا ہے۔ گو انجام کار، اس کے ہاتھوں میں عورت کے بارے میں کوئی ڈگری نہیں ہوتی۔ خالی تھیس لیے کھڑا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے تھیس اس کے ہم جنسوں سے میل نہیں کھاتے۔

جبران علی جب بھی شائستہ کو دیکھتا۔ اُسے بڑی اُلجھن ہوتی۔ بظاہر اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ تین بچوں کی ماں تھی۔ اور ایسی ہی تھی جیسی تین بچوں کی ماں کو ہونا چاہیے۔

وہ شہر کی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ مگر اپنے خاوند کے ساتھ ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتی تھی۔ قصبے میں رہنے کے باوجود اس کا گھر شہری گھروں کا اچھوتا نمونہ تھا۔ وہ فیشن کی دنیا سے دور بڑی

سادگی سے رہتی۔ مگر اس سادگی سے ایسی شعاعیں نکلا کرتی جو سچے پتھروں میں سے نکلتی ہیں۔

وہ جب محفل میں آتی تو کسی کی طرف بطور خاص نہیں دیکھتی تھی۔ نہ کسی کو مخاطب کر کے بات کرتی تھی۔ وہ سرسری انداز سے ہر ایک طرف دیکھتی جیسے اُسے دنیا میں کسی کی پرواہ نہ ہو۔ مگر جب وہ بات کرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے محفل میں ہر ایک کو دیکھ رہی ہے۔

وہ کبھی قہقہہ لگا کر نہیں ہنستی تھی۔ صرف مسکرایا کرتی تھی۔ مگر اس کے آگے یوں محسوس ہوتا جیسے کمرے کی ہر شے ہنس رہی ہے، قہقہے لگا رہی ہے۔ اتنے شاداب چہرے کہ جنہیں دیکھ کر قطار اندر قطار ہریالے کھیتوں کا تصور ابھرنے لگے، کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔

وہ کبھی بحث میں حصہ نہیں لیا کرتی تھی۔

جب بھی ڈرائنگ روم میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ ضرور ایک لایعنی سی بحث شروع کر دیتے ہیں۔

ٹکرانا اور سر پھوڑنا انسانی خاصہ جو ٹھہرا۔ وہ بحث کے دوران نظریں جھکائے چائے بنا بنا کر ہر ایک کو پیش کرتی تھی۔ اور پھر جب اُس کو چپ کرانا مقصود ہوتا تو اپنی رائے کا اظہار صرف ایک فقرے میں کرتی تھی۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا کہ یہی ایک فقرہ ہر دلیل پر بھاری ہے۔ اور اب اس بھاری پتھر کو اپنی جگہ سے سرکانے کی ہمت کسی میں نہیں ہے۔

سب لوگ چپ ہو جاتے۔ تسلیم کر لیتے۔ احتراماً یا کسی خوف کے تحت۔ شاید اس کے اندر علم کی ایک نہر جاری تھی۔ یا شاید جبران علی کا محض خیال ہو یا واہمہ ہو!

ایک بات تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ رفتہ رفتہ جبران علی پر انکشاف ہوا کہ سلمان شاہ کے گرد شخصیت کا یہ سارا تانا بانا اس کی بیوی نے بُنا تھا۔ ورنہ وہ شادی سے پہلے ایسا نہیں تھا۔

اب تو ایسا محسوس ہوتا جیسے شائستہ ایک مشعل ہے۔ اور سلمان شاہ اس روشنی میں آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے۔ اسی لیے سلمان شاہ کے چہرے پر وقت کی ایک شکن بھی نہیں تھی۔ کیا مست

قلندر بنا بیٹھا تھا۔ جیسے زندگی اس کے آگے بین بجا رہی ہے اور وہ اُس پر سانپ کی طرح بیٹھا سر دھن رہا ہے۔

دوستی بڑی پیاری شے ہے۔ مگر حسد پر تو کسی کی اجارہ داری نہیں نا؟ کسی کے من کے اندر اتنی شانتی ہو۔ کوئی اس حد تک اپنے حال میں مست ہو۔ تو پھر دوسروں کو کیا تکلیف ہوتی ہے۔ وہ اپنے عزیز یا دوست ہی کیوں نہ ہوں۔

جبران علی کی گھر میں مسلسل آمد کے ساتھ ہی شائستہ اور سلمان شاہ میں بھی گھریلو قسم کی جھڑپیں ہونے لگی تھیں۔ جنہیں سلمان شاہ اپنے یار سے نہیں چھپاتا تھا۔ اور یہی بات شائستہ کو بری لگتی تھی۔ دوستی ایک طرف، اور ذاتی زندگی ایک طرف۔ عورت اور مرد کی نجی زندگی ایک ایسا مقدس راز ہوتی ہے جس میں شانہ نشیں فرشتوں کو بھی شامل نہیں کرنا چاہئے۔ لحاظ کی ایک مقدس چادر کے تلے، یہ کہانی آپ ہی آپ دوسری دُنیا میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اور اپنے پیچھے ایک خوشبو چھوڑ جاتی ہے۔ ماں، باپ، بہن بھائی چہ جائیکہ دوست، احباب، کسی کو کیوں درمیان میں لایا جائے۔ اور تو سارے مسئلے اُن کے حل ہو چکے تھے۔ اب یہ اتنی سی بات درمیان میں آن اَ ٹکی تھی کہ جبران علی اُن کے گھر میں بیٹھ کر پیتا تھا۔

''پینے والوں کی نگاہ بے باک ہو جاتی ہے اور اسے رشتوں کی پہچان نہیں رہتی۔'' شائستہ کا اصرار تھا۔

مگر سلمان شاہ اس کا ہمیشہ مذاق اڑاتا تھا۔ وہ کہتا۔ ''یہ تو پینے والے کے ظرف پر منحصر ہے۔ کیونکہ......

''جو اہلِ دل ہیں بڑھاتی ہے آبرو اُن کی
جو بے شعور ہیں ان کو خراب کرتی ہے!''

''اونہہ۔ شراب اور شعور کا بھلا کیا میل!'' شائستہ چڑ جاتی۔

''بعض اوقات تم بالکل نیم خواندہ خواتین کی طرح بات کرتی ہو۔'' سلمان شاہ کہتا۔ ''مجھے

حیرت ہوتی ہے۔تمہارا سارا علم کہاں چلا جاتا ہے۔ یہ باتیں مڈل پاس اور میٹرک فیل لڑکیوں کو زیب دیتی ہیں۔''

''جی ہاں! ابھی ابھی میں اتنی ماڈرن بن جاؤں کہ شراب کو سوشل زندگی کا ایک لازمہ سمجھ لوں۔اور ڈرائنگ روم کو بوتلوں سے سجادوں۔اور ہر زید بکر کو آوارہ نظروں کی اجازت دے دوں تو پھر میں بڑی اچھی اور تعلیم یافتہ کہلاؤں گی۔ ہے نا؟''

سلمان شاہ ہنس پڑتا۔

''بالکل درست کہا تم نے۔''

''تو صرف تعلیم یافتہ کہلانے کے لئے میں اپنے نظریاتی اصولوں کا خون نہیں کرسکتی۔''

''اچھا یہ نظریاتی اصول کیا ہوتے ہیں؟''

''مرد اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' وہ بے رخی سے کہتی تو سلمان شاہ فوراً صلح پر آمادہ ہو جاتا۔

''شائستہ!'' وہ اسے آگے بڑھ کر تھام لیتا اور کہتا۔ ''مجھے پتہ ہے تمہیں کیا تکلیف ہے؟''

وہ چپ رہتی۔ بالکل نہ بولتی تو پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنستا اور کہتا۔ ''تمہیں یہ ڈر ہے کہ کہیں تمہارے شوہر کے منہ کو نہ لگ جائے۔''

یہ ڈر بھی اپنی جگہ صحیح تھا۔مگر وہ کوئی جواب نہ دینا مناسب سمجھتی۔

''تمہارا شوہر کاغذ کا بنا ہوا نہیں ہے۔ سمجھیں؟ اتنے سال ہو گئے تمہارے ساتھ رہتے ہاں جب چھوڑ دی۔تو چھوڑ دی اور پھر ع

جب سے دیکھیں یہ آنکھیں ہم پینا پلانا بھول گئے

وہ انگلی سے شائستہ کی آنکھوں کی طرف اشارہ کرنے لگتا۔اور اس عمر میں اس ایکٹنگ پر شائستہ مصنوعی غصے سے کہتی۔

''پلانا تو نہیں چھوڑا۔ہاں پینا ضرور چھوڑ دیا ہوگا۔''

''ارے کیوں اس غریب کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ میرا یار ہے۔ تھک، ٹوٹ کے آتا ہے ذرا دل کا غبار نکال لیتا ہے۔ تمہارا کیا لیتا ہے؟

''بھئی مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ مجھے نکال دو اور اُسے رکھ لو......'' شائستہ پھر برہم ہونے لگتی۔

''حالانکہ تم جانتی ہو۔ دونوں کو نہیں نکالوں گا۔ دونوں کو رکھوں گا۔''

شائستہ کو اس بات کا بہت غصہ تھا کہ اس کے شوہر نے اپنے دوستِ جبران علی کی آمد کے بعد اس کے ساتھ اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کرلی ہے۔ اور وہ جبران علی کی آمد کے بارے میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔

پُرسکون زندگی میں ذراسی بے سکونی بعض اوقات وہ کام کرتی ہے جو پاؤں کے تلوے میں چبھی ہوئی پھانس کرتی ہے۔

شائستہ کو تو جبران علی کا بوتل لانا بھی بُرا لگتا تھا۔ اس نے جبران علی کی بیوی کے دل کا بھید بھی پالیا تھا۔ وہ غریب مجبور تھی۔ وہ کہتی تھی اس نوکری کی میں صحبتیں ہی ایسی ہوتی ہیں۔ اور پھر جب کوئی مرد کسی دوسرے مرد کو بہترین تحفہ پیش کرنا چاہتا ہے تو اس کے ذہن میں بوتل اور عورت کے سوا کوئی اور چیز نہیں آتی۔ مردوں نے مردوں کو کبھی دلدل سے باہر نہیں نکالا۔ بلکہ گرنے والا نکالنے والے کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ تاکہ وہ بولنے کے قابل نہ رہے۔ اس وقت شائستہ کا دل لرزنے لگتا تھا۔

گو اُسے سلمان شاہ پر مکمل اعتماد تھا۔ مگر اس اعتماد کا کیا ہے۔ اپنے عارضی دوست کی ذراسی خوشنودی کی خاطر یہ مرد اپنی بیوی سے کیا ہوا زندگی بھر کا وعدہ بھول جاتے ہیں۔ دل توڑ دیتے ہیں، راستے بدل لیتے ہیں۔

''پیالے کے ساتھ کبھی مخلص دوست نہیں ہوتے۔'' شگفتہ ہمیشہ کہتی۔

''تمہیں کیا پتہ دوستی کیا ہوتی ہے؟'' سلمان شاہ بے پروائی سے کہتا۔

''ٹھیک ہے، میں نہیں جانتی کہ مردوں کی دوستی کے معیار کیا ہیں۔ مگر اتنا جانتی ہوں کہ اندھیری راہوں کے دوست کبھی اچھے دوست نہیں ہوتے۔''

''وہ برے دوست ہوتے ہیں؟'' سلمان شاہ جھنجلا کر پوچھتا۔

''دشمن ہوتے ہیں۔'' شائستہ بڑے شان سے کہتی۔

''یعنی اب تم میری اور جبران علی کی دوستی تڑوانا چاہتی ہو۔ صرف اتنی سی بات پر کہ وہ اپنی بوتل یہاں لے آتا ہے۔''

''انشاءاللہ تعالیٰ مجھے یہ کوشش نہیں کرنی پڑے گی۔ یہ بات تو وقت ثابت کردے گا۔''

''یہ ٹھیک ہے شائستہ بیگم کہ تمہارے آگے گھٹنے ٹیک چکا ہوں۔ مگر تم میرے اور میرے دوستوں کے درمیان حائل نہ ہوسکو گی۔ مجھے اپنے دوست اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔ بیوی کا کیا ہے۔ ہر عمر میں مل جاتی ہے۔''

شائستہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اور پھر وہ چپ ہوجاتی۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔

مرد واقعی اتنا بے وقوف ہوتا ہے؟ وہ دل میں سوچتی۔ پھر اس کو گم صُم اور چپ دیکھ کر سلمان شاہ خود ہی محفل میں چھیڑ دیتا۔

''یار میری بیوی کو تمہاری بوتل سے بیر ہے۔'' وہ جبران علی کے سامنے کہتا۔ جبران علی اپنی لال آنکھوں سے شائستہ کی طرف دیکھتا اور پھر اپنا پیگ بنانے لگ جاتا۔ وہ جواب دینے کی بجائے مسکرا کر جام منہ سے لگالیتا۔

''جانتے ہو کیا کہتی ہے؟''

''ہوں۔''

''یہ کہتی ہے۔ شراب پی کر مرد کی نگاہ بدل جاتی ہے۔''

اس بات پر جبران علی سر جھکا لیتا۔

''کیا ہو جاتا ہے مرد کی نگاہ کو۔'' سلمان شاہ تمسخرانہ انداز میں شائستہ سے پوچھتا۔

''غلط اور صحیح کی تمیز اُٹھ جاتی ہے۔'' بھری بھری شائستہ ہونٹ بھینچ کر کہتی۔

''غلط اور صحیح کیا ہوتا ہے۔''

''برا اور بھلا، حلال اور حرام۔''

''ذرا مثالیں دے کر واضح کرو۔''

''اسے ماں بہن کی تمیز نہیں رہتی۔'' شائستہ ایک دم پھٹ پڑتی۔

اس پر دونوں دوست قہقہہ لگا کر ہنستے۔ شائستہ غصے میں تنی رہتی۔

''آپ کو اس طرح ہنسنے سے میں اپنا موقف تو نہیں چھوڑ دوں گی۔''

''بھئی میں جانتا ہوں۔ تم مضبوط اعصاب کی عورت ہو۔''

''شراب اسی لیے حرام کی گئی ہے کہ اُسے پی کر آدمی حلال و حرام میں تمیز نہیں کر سکتا۔ ماں اور بہن کا فرق اُٹھ جاتا ہے۔ سامنے والی عورت اس کی کیا لگتی ہے؟ اس سے وہ بے نیاز ہو جاتا ہے۔''

'پھر تو شراب بڑی اچھی شے ہے۔'' سلمان ہنس کر کہتا۔ ''یار مجھے بھی کسی دن ایک پیالہ دے ہی دو۔ اب اس عمر میں دل چاہتا ہے۔ یہ تمیز مٹا کر دیکھوں۔''

اِس پر دونوں دوست پھر قہقہہ لگا کر ہنستے اور کافی دیر تک ہنستے رہتے۔

''بھابھی صاحبہ! آپ کو کیسے پتہ چلتا ہے کہ یہ تمیز اٹھ گئی ہے۔'' نشے میں ڈوبی ہوئی بھاری آواز میں اچانک جبران علی پوچھتا۔

تب شائستہ کا دل چاہتا۔ بڑھ کر اس کی لال انگارہ آنکھیں نوچ لے۔ اور پھر اُنہیں ہتھیلی پر رکھ کر اسے دکھائے اور کہے۔

''خود اپنی آنکھوں کو دیکھو، تمہیں بھی اندازہ ہو جائے گا۔''

مگر وہ بڑے سکون سے کہتی۔ '' کچھ باتوں کے مرد دعویدار ہیں۔ تو کچھ دعوے عورتیں بھی

کر سکتی ہیں۔''

''مثلاً......''سلمان شاہ اُسے ٹوک کر پوچھتا۔

''اپنی طرف اُٹھنے والی ہر نگاہ کو عورت فوراً پہچان لیتی ہے۔ آپ جو چاہے کہہ لیں، مگر یہی پہچان ہر ذہین عورت کی میراث ہے۔''

''تم ذہین عورت ہو۔ یہی سب سے بڑی مصیبت ہے۔''جبران علی اپنے دل میں سوچتا۔

گو شائستہ نے اُن کی محفلوں میں بیٹھنا کم کر دیا تھا وہ جبران علی کی بیوی کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ مگر پھر بھی آمنا سامنا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ چھوٹی موٹی رنجشیں بھی ہوتیں۔ اور صحت مند قسم کی تکرار بھی۔

پھر ہوا یوں کہ جبران علی پر ایک کیس بن گیا۔ بوتل اور عورت کے بیچوں بیچ اس نے کچھ کام غلط بھی کر دیئے تھے...... آنے والے حالات کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے؟ کرسی کی نوکری ایسی ہوتی ہے۔ بہت کوشش سے ملتی ہے۔ ایک جھٹکے میں چھن جاتی ہے۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح جبران علی کو بھی ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ حقیقی معنوں میں اس وقت اُسے احساس ہوا کہ سچا دوست کیا ہوتا ہے۔؟

جبران علی کی آگے پیچھے کوئی جائیداد نہ تھی۔ پس انداز کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ جو جس کے نام تھا۔ وہ اُسی پر قابض ہو بیٹھا تھا۔ زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی۔ اور وہی سرمایہ جو کل تک اس کی راہ میں بچھا جاتا تھا۔ آج سوتیلی ماں بن بیٹھا تھا۔ بھئی روپے سے بڑا ہرجائی بھی کوئی ہے اس سنسار میں؟ اس وقت سلمان شاہ نے، ماں بن کر اسے کلیجے میں چھپا لیا۔ سائبان بن کر سر پر چھا گیا۔ وہ جبران علی کے بیوی بچوں کو اپنے گھر لے آیا۔ اس کے مقدمے پر پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ وہ قانون کی کتابیں جنھیں خاندانی اثاثے کی طرح، اس نے بند کر کے رکھ دیا تھا۔ اُس کے مطالعے میں آ گئیں۔ اور جبران علی کے لیے وہ اپنے ہر قانون داں دوست کے پاس گیا۔

پھر رات کو دونوں مل کر بیٹھتے تو کوئی نیا کاروبار شروع کرنے کی بات کرتے۔ سلمان شاہ نے اپنے گھر کا ایک حصہ انہیں دے دیا تھا۔ بچے مل کر کھیلا کرتے۔ عورتیں مل کر کھانا پکاتیں۔ وہ دونوں سر جوڑ کر تجویز کرتے۔ آخر کار دونوں شوگر مل لگانے پر متفق ہو گئے۔ اس کے علاوہ مستقبل کے اور بہت سے پروگرام انہوں نے کاغذ میں قید کر لیے۔

سب کچھ کتنا ٹھیک جا رہا تھا۔ جو عمارت گرنے والی تھی۔ وہ اپنے آپ کھڑی ہونا شروع ہو گئی تھی اور...... نہ جانے کیسے اور کس طرح جبران علی کو احساس ہوا کہ وہ سلمان شاہ کی بیوی کے عشق میں مبتلا ہو چکا ہے۔ ایسا نہیں کہ اس نے پہلے کبھی عشق نہیں کیا تھا۔ وہ عشق پیشہ آدمی تھا۔ شادی کے بعد بھی یہ مشغلۂ عشق اس نے جاری رکھا تھا۔

اس کا فلسفۂ عشق ہی نرالا تھا۔

وہ کہتا تھا ہر عورت اس قابل ہوتی ہے کہ اس سے عشق کیا جائے۔ اور عشق کا یہ فلسفہ اس نے شراب کی مستی میں ڈوب کر پایا تھا۔ جب وہ نشے میں ہوتا تو ہر عورت اسے پری معلوم ہوتی۔ اُس پری کو زیر کرنا ہی اس کی آخری تمنا بن جاتی۔

سلمان شاہ کی بیوی شائستہ ہرگز ایسی عورتوں میں شمار نہ ہوتی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی وہ اس کے خیال کو ذہن سے نہیں جھٹک سکا تھا، جوں جوں وہ اپنے ذہن و دل کو ملامت کرنا اتنا ہی وہ حواسوں پر چھاتی۔ اُسے چھونے کا خیال بے قرار کرنے لگتا۔ خصوصاً جب وہ شراب کے نشے میں ہوتا۔ اور وہ کام کرتے ہوئے اِدھر اُدھر مصروف ہوتی تو جبران علی اس کے دھیان میں ڈوبا رہتا۔

جب صبح ہوتی تو وہ صدق دل سے توبہ کرتا۔ اپنے آپ کو گالیاں دیتا۔ لعنت ملامت کرتا کہ پھر اس قسم کے خیال کو دل میں جگہ بھی نہ دے گا۔

لیکن جب رات آتی۔ اور اپنے جلو میں لال پری لیے ہوئے آتی۔ تب اس کی سوچ کا زاویہ بدل جاتا۔ شائستہ ایک مدھ بھرا سپنا بن کر اس کی آنکھوں میں لہرانے لگتی۔ اگر وہ شریکِ محفل ہوتی تو وہ اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پینے کی کوشش کرتا اور وہ جلد ہی محفل سے اُٹھ کر چلی جاتی۔

کیسا عجیب دوراہا تھا کہ جب اُن پر بُرا وقت آ پڑا تھا۔ وہ ان کے خلاف کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ اور یہ جبران علی بھی جانتا تھا کہ خدا کے بعد سلمان شاہ ہی اس کا آخری سہارا ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ عزیزوں اور دوستوں نے بھی نظریں بدل لی تھیں۔

پھر ایک دن وہ بری گھڑی آ پہنچی۔

اس روز سلمان شاہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ اپنے گاؤں گیا ہوا تھا اور صرف ایک ہی رات کے لیے گیا تھا۔ جبران علی تنہائی میں پی رہا تھا، آدھی رات ڈھل چکی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کو جگایا کہ ذرا کھانے کے کمرے میں جا کر ریفریجریٹر میں اسے برف کا ایک سانچا لا دے۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ اور وہ منہ موڑ کر سو گئی۔ بہت دیر انتظار کرنے کے بعد وہ اٹھ کر اس طرف کو چل پڑا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ ایک عورت فریج کھولے کھڑی ہے۔ اس کی پُشت دروازے کی طرف تھی۔

کون عورت ہے......

اس نے اپنی جلتی بجھتی لال لال آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور اسے پہچانتے دیر نہ لگی۔ وہی ترشا ہوا جسم۔ چراغ کی طرح جلتا ہوا۔ سراپا کندن، کندن گردن پر کھلی لٹوں کا خمار......

بس نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اس پر ریشمی گردن کو چومنے کی خواہش کو نہ دبا سکا۔ جلدی سے آگے جا کر اس نے اس کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ رکھے ہی نہیں دباؤ بھی ڈالا۔ وہ خوفزدہ ہو کر مڑی اور پھر گر گئی...... اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل بھی گر کر چور چور ہو گئی۔

گری ہوئی عورت شکار ہوتی ہے۔

اور گرے ہوئے شکار پر جھپٹنا ذلالت کی نشانی ہے۔

جبران علی اس وقت ذلیل مرد بن گیا۔

شائستہ کی وحشت زدہ آنکھیں جب جبران علی کی خبیث آنکھوں سے ٹکرائیں تو اس نے لرزتی ہوئی زبان میں صرف اتنا کہا۔

''بھائی جی!''

'بھائی جی.....''اس کے بعد اس میں کچھ کہنے کی سکت نہ رہی۔ وہ صدمے سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

صبح کو سب نے یہی سمجھا کہ پورا ریفریجریٹر اس پر گر گیا تھا۔ اور ساری رات وہ اس کے نیچے دبی رہی۔ اس لیے جانبر نہ ہو سکی۔

مگر جبران علی جانتا تھا۔ داغ اپنا ہو یا بیگانہ۔ کچھ عورتیں ایسی بھی ہیں جو اُجلے دامن پر کوئی داغ لے کر نہیں جی سکتیں، جب روح مر جائے تو جسم کی موت کا واقع ہونا یقینی امر ہے۔

انقلاب تو زندگی کی ریت ہے۔

آگے بڑھنا تو چلن ہے زندگی کا

زندگی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ جبران علی کے اندر جوالاؤ جلتا رہتا تھا۔ وہ اسے کبھی نہ بجھا سکا۔

شراب کی بوتلوں میں غرق ہو کر، اس نے بھولنے کی کوشش کی۔ عورتوں کو پامال کر کے تسکین حاصل کرنی چاہی۔

مگر جب بھی وہ کسی عورت کے قریب جاتا۔ اسے آواز آتی۔

''بھائی جی۔''

''بھائی جی۔'' وہ یوں چونک جاتا جیسے سانپ نے اس کے پاؤں کو ڈس لیا ہو۔ یہ آواز اس کی روح کے پاتال میں بیٹھ گئی تھی۔

اس نے پہلے بھی کئی عورتوں کے منہ سے لفظ ''بھائی جی'' سنا تھا۔ ہر قسم کی عورتوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔ شروع شروع میں وہ بھی عورتوں کی بہت سی قسموں کے بارے میں باتیں کیا کرتا تھا۔ اچھی بُری عورتوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا کرتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ ہر قسم کی عورت اس کی ضرورت بن گئی تھی۔ کالی ہو، گوری ہو، شہزادی ہو یا چمارن۔ بس جوان ہو۔ عورت ہو۔

ایسی عورتیں بھی اس کے پاس آتی تھیں کہ بھائی صاحب کہتے ان کی زبان سوکھتی تھی۔ مگر اپنا کام کروانے کے بعد جب اُٹھ کر جانے لگتیں تو اپنی کوکھ میں اس کا بچہ لے کر جاتیں۔

اُسے خوب معلوم تھا۔ بھائی بھائی کہنے والی حرافہ عورتیں، کتنی جلدی بھائی کو عاشق بنانے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔

اس کے لیے لفظ بھائی کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

مگر نہ جانے شائستہ کی زبان سے یہ لفظ کیسے ادا ہوا۔ کہ وہ زندگی میں پہلی بار صحیح معنوں میں لفظ بھائی کے معانی سے آشنا ہوا۔

بھائی جی کے بدلے وہ اسے جوتا مار لیتی۔ اس کے منہ پر تھوک دیتی...... اُسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتی۔ اتنا بڑا تاوان ادا نہ کرتی تو وہ زندگی کی بہت سی منزلوں سے آشنا نہ ہوتا۔

تنگ آ کر اس نے عورت اور شراب سے توبہ کر لی۔

کام میں مگن ہو گیا۔

بڑا بنتا گیا۔

اونچا ہوتا گیا۔

آج وہ ایک شاندار دفتر کا مالک تھا۔ موٹر کاریں تھیں۔ فیکٹریاں اور کارخانے تھے۔ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اس لیے دولت کے انبار پر کھڑا ہو کے وہ غلاظتوں سے دور ہو گیا تھا۔

بڑا عظیم تھا وہ۔

لیکن۔ ایک لفظ اب تک اس کے کلیجے میں پھانس کی طرح اٹکا ہوا تھا۔ جب تک بھائی جی کی پھانس، اس کے کلیجے کو لہولہو کر رہی تھی، وہ غلاظتوں کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔

او بے ہودہ انسان! گندگی کے لیے ہر عورت نہیں ہوتی۔ بعض عورتوں کا مقام بہت بلند ہوتا

ہے۔

کبھی کسی نے مسجد کے گنبد پر بھی اُپلے تھاپے ہیں؟

اپلوں کے لیے الگ دیواریں ہوتی ہیں۔

رات کو جب کام کر کے اپنے دفتر سے باہر نکلنا۔ زینہ زینہ نیچے اُترنا۔ تو ہر زینہ بلاناغہ اس کے کان میں سرگوشی کرتا۔

بھائی جی۔

بھائی جی۔

اس کا سارا وجود نیزے پر چڑھ جاتا ہے!

''باری تعالیٰ! وہ سوچتا۔

''گناہ تو میں نے اور بھی بہت کیے ہیں۔ اس ایک گناہ کا بوجھ اتنا زیادہ کیوں ہے کہ مجھ سے اُٹھ نہیں سکتا۔!''

☆☆

آغا گل

دوسری بابری مسجد

دونوں کے درمیان ہندو مسلم فساد برسوں جاری رہا۔ شیل کو یقین تھا کہ یہ سارے مسلمان یہی اپنے بلوچستان کے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں عرب سے ہجرت کرتے تو کوئی تاریخ داں کوئی ہمعصر نشان دہی تو کرتا۔ پھر ایک ہی شکلیں خوبیاں اور برائیاں بھی ایک سی۔ بہر حال وہ اپنے دھرم پر قائم تھی اور سرِ موانحراف کے لئے تیار نہ تھی۔ بابر چاہتا تھا کہ کسی طور شیل مشرف بہ اسلام ہو جائے، تاکہ ان کی شادی ہو سکے۔ دونوں اتنے محتاط تھے کہ ان کے گھرانے تک ہی بات محدود تھی۔

محبت کی ابتداء بھی جنگ سے ہوئی، ہوا یوں کہ بچپن میں ایک بار بابر بچوں کو اکٹھا کر کے ہندو محلہ پر چڑھ دوڑا۔ اگلے روز طلبی ہوئی۔ وہ اپنے والد میر مہر اللہ خان کے سامنے مجرم بنا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں احترام تھا، خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ مہر اللہ خان نہایت پرسکون انداز میں ہندو پنچایت کو یقین دلا رہے تھے کہ کل کا واقعہ بچوں کی ایک شرارت سے اہم نہیں ہے۔ مگر ہندوؤں کو خدشہ تھا کہ ایسے واقعات کے دوررس نتائج ہو سکتے ہیں یہ کسی بڑے فساد کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے۔

پندت روی کشن کے ساتھ ایک کانچ کی گڑیا بیٹھی مسلسل بابر کو شعلہ بار نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ مانو کچا ہی چبا ڈالے گی۔ اس کی سفید رنگت میں ڈوبتے سورج کی کندن سی چمک تھی، اس کی چوٹیاں غیر معمولی طور پر طویل تھیں۔ یکایک وہ طنطناتی ہوئی، اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کا حسین چہرہ غصے میں دمک رہا تھا، اور کانچ کی تپتی چٹانوں کی طرح اُس کے رخساروں پر سرخی پھیل رہی تھی۔

"یہ سب کہہ رہے تھے،

آدھی روٹی آدھا کباب

ہندوؤں کو مارنا بڑا ثواب

انہوں نے ہمارے کھلونے توڑ ڈالے، کچھ کھلونے اٹھا کر بھی لے گئے! چور!''

''جواب دو۔'' مہر اللہ خان نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''ہم جہاد کرنے گئے تھے۔'' ایک لمحے کے لئے سناٹا چھا گیا۔

''مگر کیوں، کیا کیا تھا انہوں نے؟'' مہر اللہ خان کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔

''کچھ نہیں مگر ماسٹر جی بتایا ہے کہ ہندوؤں کو مارنا ثواب ہے، اسے جہاد کہتے ہیں۔''

میر۔ناں ادتاخ ایک مشترکہ قہقہے سے گونج اٹھا۔

مہر اللہ خان بڑے جز بز ہوئے۔

''اسلام میں اور ہم بلوچوں میں کسی پڑوسی کو ستانا بہت بڑا گناہ ہے، میں تمہارے ٹیچر سے بات کروں گا، آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا، بلکہ دوسروں کو بھی روکنا، جاؤ چاچا سے معافی مانگو۔''

لیکن روی شنکر نے بابر کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔

''اور سنو شیل کو آئندہ شکایت کا موقع نہ دینا، اسے گھر لے جاؤ۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' بعد میں بابر نے پوچھا۔

''شیلا کماری۔''

''اس کا مطلب؟''

''پتھر کی بنی ہوئی شہزادی۔ آئندہ مجھ سے نہ لڑنا ورنہ جان نکالوں گی۔'' اُس نے اپنے ناخن دکھاتے ہوئے کہا۔

بابر اکثر کہا کرتا، ''شیل کاش اس جہاد میں تمہارے ہاتھوں شہید ہو جاتا۔''

اُس دن شیل کافی تحفے لے کر اُن کے گھر سے رخصت ہوئی، اپنے گھر آ کر اس نے سب کو تحفے دکھائے، اور بابر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر اکثر وہ ساتھ ساتھ کھیلنے لگے، اور کسی ایسے رشتے میں بندھ گئے جس کا کوئی نام نہیں ہے۔

انسان نے تو مادی اشیاء کے ہزاروں نام رکھے ہیں مگر پُر اسرار طاقت اور جذبے کو محبت کہہ کر۔ جنرلائز (Generalise) کر دیا۔

عقیدے سے محبت، وطن سے محبت، محبوبہ سے محبت کتنا تضاد کس قدر فرق ہے۔ مگر ایک نام دے کر لاتعلق ہو گئے۔ انسان جسمانی سوچوں کے آگے تو نکلا ہی نہیں، یہ مخلوق چند لاکھ سال پہلے تک تو کیچوے کھاتی تھی اور درختوں سے لٹکتی تھی، جس طرح جغرافیائی شمال اور مقناطیسی شمال میں فرق ہے بعینہٖ ایک جغرافیائی دنیا ہے' ایک محبت کی دنیا ہے، جس کا فاصلوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک گھاٹ میں بند عمر قید کے دو قیدی زندگی بھر ساتھ رہ کر بھی لاتعلق رہتے ہیں اور مختلف براعظموں میں بسنے والے دو پریمی ایک ساتھ جیتے ہیں۔ ہر علم پر ہزاروں کتابیں ہیں۔ محبت پر ایک بھی نہیں، علم کی کسی شاخ کا نام محبت نہیں ہے!

شیل تعلیم یافتہ گھرانے کی بیٹی تھی، اس کا گھرانہ روایت پسند تھا ایک خاص انداز میں ہر نسل کی تربیت دلائی انہیں دلیر اور شجاع لوگوں کے قصے سنائے جاتے، راجا پرتاپ سنگھ، جس نے زندگی بھر مغلوں سے جنگ کی، سداشو راؤ، بھاؤ جس نے پانی پت کی تیسری جنگ میں گھیرے میں آ جانے کے باوجود ہتھیار نہ ڈالے، اُسے سر کی سلامتی کی ضمانت دی گئی۔ مگر اس نے لڑتے ہوئے جان دی، اور دیوان بچل مل تو کل ہی کی بات ہے، قلات میں جنگ جاری تھی جب انگریزوں نے خان قلات کے محل کے خفیہ راستے سے دربار تک رسائل حاصل کر لی، اور اچانک دھاوا بول دیا۔ بچل مل کو خان رشید نے لڑنے سے روک دیا کہ تم ہندو ہو، ہمارے باہوٹ (زیرِ پناہ) ہو تمہیں جنگ میں جھونکنا ہمارے دین کے خلاف ہے، ہاں مسلمان ہوتے تو ٹھیک تھا، دیوان بچل مل نے تلوار سونت لی اور کہا اگر مردانگی اور جاں نثاری کی راہ میں یہی رکاوٹ ہے تو میں وفا کے نام پر بھی یہ شرط مانتا ہوں، اس نے باآوازِ بلند کلمۂ شہادت پڑھا اور اپنے بیٹوں سمیت دست بدست لڑائی میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے جان دے دی۔

ایسے مضبوط (Feed Back) کی وجہ سے شیل واقعی شیلا تھی، وہ تلسی کی طرح تھی، جس کے

بارے میں عقیدہ ہے کہ جہاں تلسی ہو وہاں سانپ یا کوئی خطرناک چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے شیل سے کسی غیر ذمہ دارانہ رویے کا امکان ہی نہ تھا۔

بابر بھی میر مہر عبداللہ خان کا بیٹا تھا، روایات کے سانچے میں ڈھل کر نکلا تھا۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ چھوٹے شہروں نے ہی بڑے انسان پیدا کئے۔ ان کا خاندان بلوچستان بھر میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور خاندانوں کو عزت و وقار دس بیس برسوں میں نہیں ملتا۔ اس کے لئے عمروں کی تپسیا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ بابر اور شیل کی وابستگی کا علم محض ان ہی دو گھرانوں تک محدود رہا۔

عشق بھی بس ظرف کی بات ہے۔ سالک اور مجذوب کا سا فرق ہے۔

سالک تو معرفت کے پیالے پی کر بھی باہوش رہتا ہے۔ اور مجذوب ادنیٰ تجلی پر ہی ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے یہ جو کہتے ہیں، عشق چھپائے نہیں چھپتا، عام لوگوں کی بات ہے، ورنہ وہ عشق بھی کیا جس کا چرچا ہو، افواہوں کے جلو میں گلی گلی بھٹکتا پھرے۔

شیلا کماری کا تعلق کشمیر کے براہمن خاندان سے تھا، ایک صدی سے ان کا گھرانہ کشمیر کی سرد وادیاں چھوڑ کر سیوی کی جلتی گلیوں میں سمٹ آیا تھا۔ سیوی کے بارے میں صدیوں پہلے مسلمان فاتحین نے احتجاجاً کہا تھا۔

سیوی وسیوستان ساختی

دوزخ چرا پرداختی

(سیوی وسیوستان جیسے گرم علاقوں کے ہوتے ہوئے اے خدا دوزخ کی کیا ضرورت تھی؟)

سیوی ہمیشہ سے ہندوؤں کا گڑھ رہا، درہ بولان کا دروازہ ہونے کے ناطے اس کی اپنی ایک حیثیت رہی، کئی بار اُجڑا، کئی بار آباد ہوا، سیوا راجاؤں کا پایۂ تخت رہا، مائی سیوی کی راجدھانی رہا۔ میر چاکر خان رند نے اسے دارالخلافہ کے طور پر پسند کیا۔ آٹھویں اور بارھویں صدی کے درمیان بلوچستان میں اسلام پھیلا تو ہندوؤں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ پھر تو یہ حالت ہوئی کہ ہنگلاج کے

مقدس غار (لاس بیلہ) کالی کا مندر (قلات) اور بدھڑا شال (کوئٹہ) جیسے مقامات یاتریوں کو ترس گئے۔ خوانین قلات کا دورِ سلطنت آیا تو انہوں نے ہندوؤں کو سرکار دربار میں خاص اہمیت دی۔ ہمیشہ ہندو ہی وزیر مالیات مقرر کیے جاتے۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات کے تصفیے کے لئے ان کا اپنا پنچایتی نظام قائم رہا۔ یوں تو انہیں مکمل آزادی تھی لیکن ان تمام مراعات کے باوجود درجہ دوئم کا شہری ہی سمجھا جاتا، صدیوں کے معاشرتی دباؤ اور نفسیاتی محرومیوں سے بچنے کے لئے خاندان مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

لیکن شیل کا خاندان بھی ان گھرانوں میں شامل تھا جو اپنے عقائد پر قائم تھے۔ اب صرف وہ لوگ بچے تھے جو ٹوٹ تو سکتے تھے، جھک نہیں سکتے تھے، روی شنکر ذات کے براہمن تھے۔ اُن کے دادا پرشوتم داس واقعتاً ہی پرشوتم (صاحبِ علم) تھے، انہوں نے پتا (باپ) کی مخالفت کے باوجود انگریزوں کی ملازمت اختیار کر لی۔ واپسی فرنچ افغانستان، جاتے ہوئے انہیں سیوی میں ملا تھا۔ واپسی فرنچ کی نگاہیں جوہر شناس تھیں۔ اس نے تعارفی خط دیا۔ جو گویا خاندان کی قسمت بدل گیا۔ جب گورنر بمبئی، جنرل ٹمپل کو زبردستی سیوی بھجوایا گیا۔ تاکہ درۂ بولان سے ریلوے لائن گزارنے کے امکانات کا جائزہ لے تو اسی گھرانے نے اس کی مدد کی۔ حالات کے رُخ خود ہی بدل رہے تھے۔

۱۸۷۸ء میں امیر افغانستان نے کسی برطانوی مشن کے استقبال کی منظوری ٹھکرا دی۔ ۱۸۷۹ء میں برطانوی اسٹاف کو کابل میں قتل کر دیا گیا۔ بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور زارِ روس کی ممکنہ پیش قدمی کے مدِ نظر درہ خیبر اور درہ بولان کی اہمیت اچانک بڑھ گئی۔ انگریزوں کو ان علاقوں میں اپنے دوستوں کی تلاش ہوئی۔ درہ بولان کا دروازہ سیوی تھا لہٰذا یہاں بھی عنایات ہوئیں۔ اسی دوران لارڈ لٹن کی فارورڈ پالیسی سامنے آئی برطانوی جنون کا یہ عالم تھا کہ سندھ سے سیوی تک ۱۳۲ میل ریلوے لائن ایک سو ایک دن میں مکمل کر لی۔ ۱۴ر جنوری ۱۸۸۰ء کو دھواں اُگلتا انجن سیوی میں داخل ہوا۔

پرشوتم داس کے بیٹے وشوا ناتھ نے درہ بولان میں ریلوے لائن بچھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں ان کے ساتھ مرزا محمد ہادی رسوا بطور اوورسیئر رہے، جنہوں نے بعد ازاں امراؤ جان ادا، ناول تخلیق کر کے شہرت دوام حاصل کی۔ مسلسل خدمت کے صلے میں وشوا ناتھ کو رائے بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔ چاہتے تو سیوی کے آس پاس پھیلے ہوئے ببول کے جنگلوں میں شاندار سا بنگلہ بنا کر راجاؤں کی طرح رہتے۔ مگر وہ روایت پسند تھے۔ طبیعت میں انکساری تھی اور یہ بھی جانتے تھے کہ اقلیت کو اجتماعیت میں ہی تحفظ ملتا ہے۔ لہٰذا ہندو محلّہ میں ہی ایک حویلی بنا کر رہنے لگے۔ لیکن شیو شکتی کے آگے تو سبھی بے بس ہیں۔ نٹ راج کے محوِ رقص پاؤں ایک ایک جنبش سے نئے انقلابات لاتے ہیں۔ شیو ایک عروج دے کر اسے زوال پہ لاتا ہے اور زوال کو نیا عروج دیتا ہے، یہی اس کے رقص کا زیر و بم ہے اور یہی ان کا مقدر۔

جب شیل نے آنکھیں کھولیں تو حویلی کے در و دیوار سے ماضی کے تابناک فسانے لپٹے ہوئے تھے، مگر اب اس کے پتا روی شنکر ایک عام سی حیثیت کے تاجر تھے۔ وہ کلکتہ کے گریجویٹ تھے، ۱۹۶۸ء تک تحصیلدار اور اسسٹنٹ کمشنر رہے۔ مگر بعض حکومتی کارروائیوں کی سخت مخالفت کی خصوصاً مہر اللہ خان کے قبیلے کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کو انہوں نے غیر آئینی قرار دیا ہے۔ کارروائیاں تو برقرار رہیں مگر انہیں ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔ دنیاوی ترقی کے گروہ جانتے تو تھے مگر ان پر عمل کرنے سے وہ مر جانا بہتر سمجھتے تھے۔ ہر کوئی بیہودہ اسکریوتی تو نہیں ہو سکتا۔ وہ خودکشی کے لئے تیار تو ہو سکتے ہیں مگر ضمیر کشی کے لئے نہیں۔ یہ بات علاقے کا ہر شخص جانتا تھا اور ان کا احترام کرتا تھا۔ خصوصاً مہر اللہ خان کا قبیلہ جس کے لئے انہوں نے اتنی بڑی قربانی دی مگر جتایا کبھی نہیں۔

بابر اور شیل کے ساتھ گزرنے والے سال تیزی سے ختم ہوتے چلے گئے، حتیٰ کہ بابر کو زبردستی فوج میں بھیج دیا گیا۔ اس نے والد سے خاصی بحث کی، مگر مہر اللہ خان کے فیصلے اٹل ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے چند لفظوں میں فیصلہ سنا دیا۔

''اب دنیا بھر کی فوجیں جنگجو فوجیں نہیں حکمراں فوجیں ہیں۔ بادشاہ گر فوجیں ہیں جو کبھی کبھار تزک اور احتشام سے شہروں میں پریڈ کرلیتی ہیں۔ یا ریڈ سکوائر پر طاقت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ یہ معاشی جنگوں کا دور ہے، تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔''

''میں خطرے سے نہیں ڈرتا! میں سیوی میں رہنا چاہتا ہوں۔ اپنے لوگوں کے ساتھ، اپنے لوگوں کے لئے۔''

''اعلیٰ افسر اپنے لوگوں کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ بات میں پہلے جانتا تو خود بھی سول سروس میں شامل ہو جاتا۔''

''مگر بابا۔ میں سیوی سے دور نہیں جانا چاہتا۔ میں تو'' وہ خاموش ہو گیا۔

''میں جانتا ہوں۔ مگر شیل سے تمہاری شادی میرے اختیار سے باہر ہے۔ میرے ایک اشارے پر قتل و غارت ہو سکتا ہے، قاتلوں کو خبر دی جا سکتی ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ شیل کبھی مذہب تبدیل نہیں کرے گی اگر اس نے کبھی ایسا سوچا بھی تو میں اس کی مخالفت کروں گا۔ روی شنکر کی ہندو برادری میں کیا عزت رہ جائے گی؟

تم جانتے ہوں اس کی قیمت پورے گھرانے کو ادا کرنی ہوگی۔''

بابر نے روح کی تمام تر طاقت کو مجتمع کر کے پوچھا۔

''اور اگر میں ــــ !'' مہر اللہ خان ساکت و جامد رہ گئے۔ پھر رفتہ رفتہ نارمل ہو گئے۔

''میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ مگر تم میرے اکلوتے بیٹے ہو۔ خاندان کا نام اب تم سے ہی چلے گا۔ صدیوں ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے دشمن کانپتے رہے، ہم نے حکومت کرنا سیکھا ہے۔ بابا احمد شاہ کے ہم حلیف رہے۔ نصیر خان نوری کے ساتھ مل کر مرہٹوں کی طاقت کو کچل دیا۔ انگریزوں سے ٹکرائے، اور ــــ ''

وہ مزید کچھ نہ بول سکے۔ انہوں نے جب سر اٹھا کر دیکھا تو بابر جا چکا تھا۔

جب بابر ملٹری اکیڈمی کاکول جا رہا تھا۔ شیلا کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ہزاروں طوفان

تھے۔ لاکھوں سمندر موجزن تھے۔ مگر صرف اس کا کاجل ہی ہلکا سا پھیلا۔

''میں شیلا نہیں، تُلسی ہوں، میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' پھر سائیں سائیں کرتی ہواؤں میں وہ اکیلی رہ گئی۔ بابر جب بھی چھٹیوں میں گھر آتا، دونوں گھنٹوں باتیں کرتے۔ فون پر! ہر پوسٹنگ پر بابر کی تنخواہ کا بڑا حصہ ٹیلی فون کی نذر ہو جاتا۔ محکمہ فون کو زیادہ ریونیو پریمیوں سے ملتا ہے۔ تبھی تو تین ارب روپے سالانہ کما کر دے رہا ہے۔

اور محکمہ ڈاک پوری دنیا میں ہی خسارے میں چل رہا ہے۔

جب بابر سینئر کیپٹن تھا اور میجر بننے کے امکانات خاصے روشن تھے۔ بمباں والا، راوی، بیدیاں، لنک کینال (بی آر بی) کے قریب ایک فوجی مشق کے دوران حادثاتی طور پر ایم نائن جیسی بھدی اور بے مصرف اسٹین گن کی زد میں آ گیا۔ اس کی ٹانگیں بری طرح زخمی ہو گئیں۔

شدید گرمی میں اتنا طویل اضافہ طے کر کے روی شنکر بھی اپنے بیٹے بسنت کمار کے ساتھ لاہور آ پہنچے۔ بابر کمبائینڈ ملٹری ہسپتال کے ایک کمرے میں مفلوج پڑا تھا۔ روی شنکر پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ کِھل اٹھا۔ خود مہر اللہ خان کو بھی روی کے آنے پر پُر مسرت حیرت ہوئی۔

بابر نے یوں مضبوطی سے روی شنکر کا ہاتھ پکڑ لیا، جیسے کبھی یہ ہاتھ نہیں چھوڑے گا۔

''انکل آپ کیسے ہیں؟''

اُسے شیل کی خوشبو آ رہی تھی۔

روی شنکر کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''تم اپنی کہو بیٹا کیسے ہو؟''

''انکل پہلے ہمیں تلواریں پڑتیں تھیں۔ اب گولیاں لگتی ہیں۔ ہم مارشل لاء ریس کے لوگ ہیں۔ ہمارے لئے عام سی بات ہے۔ چاچی کا کیا حال ہے اور___ وہ خاموش ہو گیا۔

کس قدر مشکل ہے خاموش رہنا بھی! انسان کی سب سے بڑا سزا بھی تو خاموشی ہے۔ زندگی کے ویران جزیرے جہاں بولنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لئے تو حکمراں سزائے موت کی

بجائے قیدِ تنہائی دیتے ہیں تاکہ انسان ہر ہر لمحہ مرتا رہے۔

''سب خیرت سے ہیں بیٹا،تمہارے لئے دعا کرتے ہیں،شیل تو تم جانتے ہو،ایم اے انگلش کرنے کے بعد گرلز کالج میں پڑھانے لگی ہے۔ بہت ہی پریشان تھی وہ!''

روی کے چہرے سے کرب گزر گیا۔ گرد اُڑاتے بگولوں کی طرح جو غزنی کے راستوں میں اٹھتے ہیں۔ اچانک انہیں احساس ہوا کہ یہ سب کچھ انہیں نہیں کہنا چاہئے تھا۔ رشتوں کی بھاری زنجیروں سے بندھے بے بس انسانوں کی طرح وہ چپ ہو گئے۔

اُسی شام اُس نے ڈاکٹر سے فرمائش کی۔

''ڈاکٹر مجھے کوئی تیز سا انیل جیزک دے دو، تاکہ میرے سانسوں سے بھی کسی تکلیف کا احساس نہ ہو۔''

ڈاکٹر بھی زندہ دل تھا، شاید اس نے بھی کبھی محبت کی ہو تبھی اتنا اچھا تھا، اس نے گفتگو کی اجازت بھی دے دی اور تکئے لگوا کر بستر میں اس کا سر کچھ دیر کے لئے بلند کروادیا۔

مگر فون کی دوسری جانب شیل کی سسکیاں تھیں۔

''شیل، شیل۔''

وہ کہتا چلا گیا، مگر شیل کی سسکیوں کے سوا وہ کچھ نہ سن پایا حتیٰ کہ ہلکی سی کلک کے ساتھ لائن ڈراپ ہو گئی۔

علاج کے بعد بابر کو اعزاز اور تمام سہولتوں کے ساتھ فوج سے ڈِس ایبل قرار دے کر گھر بھجوا دیا گیا۔ رفتہ رفتہ وہ بلا سہارا چلنے لگا۔ اب وہ اپنی زمین جائیداد کو سنبھالنے لگا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا کزن ببرک مخالفت پر اُتر آیا، کیونکہ پہلے وہ تمام آمدن کا مالک تھا، رہتا بھی اُن کے گھر تھا۔ کیونکہ بچپن میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ مصاحبوں کی صحبت کم تعلیم کی وجہ سے وہ بابر کو اپنا دشمن سمجھنے لگا اور نہایت خاموشی سے بابر کے خاتمے کے بارے میں منصوبے بنانے لگا۔ بلوچستان میں سب سے بڑا دشمن ہی سیال (کزن ہوا کرتا ہے، تبھی بلوچی کا محاورہ ہے۔ ''سیال چہ

سیالاں کم بود گوش ہائے بُرٗ''

(کزن سبقت لے جانا چاہے تو اس کے کان کاٹ ڈالو۔)

جن سالوں میں وہ باہر رہا۔ سیوی میں بہت سی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ بڑی شہروں والے جراثیم بھی در آئے۔ جدائی کے کتنے جگ شیل نے کتابوں میں ڈبو دیئے۔ مطالعہ ہی فراریت کا ذریعہ رہا جس نے اس کی سوچوں میں گہرائی اور جذبات میں استحکام پیدا کر دیا۔ لٹریچر کے حوالے سے اُسے معلوم ہوا کہ انٹلیکچول کلاس قرنوں سے ذہنی کرب اور معاشرتی جبر و تشدد کا شکار رہی ہے، اس حقیقت نے خاصی حد تک اس کا احساس محرومی زائل کر دیا۔ گرلز کالج میں وہ خاصی مقبول تھی اور ہندو برادری میں خصوصاً اس کا بہت احترام تھا۔ بڑی دھارمک تھی وہ!

بابر کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا دل کانپ اٹھتا تھا بچپن میں کیسے چاکر خان کے قلعے کی شکستہ فصیلوں اور برجیوں پر چڑھ جاتا، اور زور زور سے اُسے آوازیں دیتا۔ گھنی بیریوں میں شاخ در شاخ گھومتا اس کے دوپٹے میں بیر پھینکتا، برق رفتار گلہریوں کو پکڑنے کے لیئے دوڑیں لگاتا۔

مگر بابر اب بھی ویسا ہی تھا۔ کیئر فری، زندہ دل۔

''میرا خیال تھا تم مجھے وھیل چیئر پر لئے پھرو گی۔'' بابر ہنسا، وہ آنسو پی کر بولی۔

''اور جمعہ کے دن جامع مسجد کے سامنے لے جایا کروں گی۔''

سبھی ہنسنے لگے، ایک غیر قدرتی ہنسی۔ کیونکہ جمعہ کے دن سارے بھکاری جامع مسجد کے سامنے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ بابر کا انداز ہی ایسا تھا۔ پلے بوائے سا۔ کہ چند دنوں میں لوگ یہ سب نارمل سا لینے لگے۔

اچانک سیوی میں ہنگامے شروع ہو گئے، ہندوستان میں بابری مسجد کا قضیہ ایک بار پھر کوہِ سلطان کی روح کی طرح جاگ اٹھا۔ اُس پر سکون شہر پر بھی دھوئیں راکھ اور انگاروں کی بارش سی ہونے لگی۔ اجودھیا کے ہندو بابری مسجد کو مندر میں تبدیل کرنا چاہتے تھے، ان کا مؤقف یہ تھا یہ رام کی جنم بھومی ہے، یہاں مندر ہونا چاہیئے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں میں شدید بے چینی پھیل گئی، سیوی

میں بھی لوگ مشتعل ہو رہے تھے۔ تیسری دنیا کے دبے ہوئے لوگ پلک جھپکنے میں مضطرب ہو جاتے ہیں۔ بلوچستان میں بیلنس آف پاور اب مختلف تھا۔ بات اکثریت یا اقلیت کی نہیں تھی فائر پاور کی تھی۔

دونوں قوموں کے سمجھدار لوگ کسی بھی امکانی تلخی سے بچنا چاہتے تھے۔ لیکن ایک حادثے نے حالات کا رخ بدل دیا، اسی کشیدگی کے دور میں رات گئے، بابر تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا ہندو محلّہ سے گزر رہا تھا، مقصد صرف یہ تھا کہ شیل کی حویلی کے پاس سے گزر جائے، اُسے اس قدیم آبادی سے دلی محبت تھی، اینٹوں سے بنے دو منزلہ مکانوں کی طویل قطاریں گھونگھٹ کاڑھے ہندو عورتیں مندر آتی جاتی رہتیں۔ مندر کے بھاری چوبی دروازے سے کا ایک پٹ ہمیشہ کھلا رہتا۔ اینٹوں کے فرش پر دور، درخت کے نیچے خوب صورت سفید گائے بندھی رہتی۔ اسی مندر کی سیڑھیوں پر وہ بچپن میں دیر تک بیٹھا شیل کی راہ تکا کرتا تھا۔ جو سامنے اپنے گھر کی بالکونی پر کبھی کبھار آتی اور اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ سرِ شام ہندو عورتیں پر پیچ کمروں والے مکانوں سے نکل نکل کر گلیوں میں پتھر کے کوئلوں والی انگیٹھیاں سُلگنے کو رکھ جاتیں، ہندوؤں کے کان بھی پر پیچ ہوا کرتے ہیں ان کے ذہنوں کی طرح، ورنہ تو وہ صفر ایجاد نہ کر سکتے جو پہیے کے بعد انسان کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔

گلیاں کوئلے کے دھوئیں اور اُترتے سائے سے بھرنے لگتیں، اسے بچپن سے یہ دھواں اچھا لگتا۔

ایک بار فوج میں کمانڈر نے اسے دھواں سونگھتے دیکھا تو گرج کر انگریزی میں بولا۔

'یہ زہر ہے۔''

''مگر رومینٹک ہے۔'' اس نے کوئی تاثر لئے بغیر انگریزی میں جواب دیا۔ ببرک ہفتوں سے ایسے سنہری موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے جلدی سے ایک ساتھی سے چرزی لے کر سول کیا اندھیرے سے وہ اچانک ایک زندہ حقیقت کی طرح نکل کر سامنے آ گیا۔ قد، انداز اور چال ڈھال سے بابر نے اُسے پھر بھی پہچان لیا۔ اس سے پہلے کہ بابر کچھ سمجھ سکتا۔ ببرگ کے میگا روف

سے یکے بعد دیگر شعلے نکلے، پہلی گولی بابر کے سر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ دوسری دائیں بازو میں لگی اور تیسری سینے میں پیوست ہوگئی۔ بابر لڑکھڑا کر گرا۔ مکانوں کے دروازے کھلنے لگے۔ روشنیاں شور ہجوم اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

شہر میں کہرام مچ گیا کہ بابر پر ہندوؤں نے قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ اس خبر کو زیادہ تقویت ببرک نے دی، جو بدلہ، بدلہ اور انتقام، انتقام چلاتا پھر رہا تھا۔ ان کے قبیلے کے مردان ہتھیاروں کے ساتھ جو فطری طور پر مل سکے دور دراز کے پہاڑوں اور وادیوں سے اتر کر سیوی پہونچنے لگے۔

اے کے ۴۷ (کلاشنکوف) سیمانوف، روسی برک مین، دوسری جنگِ عظیم کی اسٹین گن، لمبی بیرل والی تھری ناٹ تھری جو دنیا بھر میں متروک ہو چکی ہے، اسرائیل کی اسالٹ رائفل اوزی اور گلیل چیکوسلواکیہ کی ننھی منی سگار پین۔ ان کی حویلی میں دیکھتے ہی دیکھتے کسی فوجی چھاؤنی میں تبدیل ہوگئی۔ مہر اللہ خان ان تمام چیزوں کے خلاف تھے۔ مگر قبائلی رواج کے مطابق سب کا استقبال کرنے پر مجبور تھے۔ اُنہیں شدت سے بابر کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔

سول انتظامیہ کو اپنی نوکری کی فکر پڑ گئی، فوری طور پر ہندو محلّہ کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ اور ہندو پنچایت کو باہر نکلنے سے روک دیا گیا جو بابر کی خیریت دریافت کرنے جا رہی تھی۔ حزبِ اختلاف کی سیاسی پارٹی نے فیصلہ کیا کہ برسرِ اقتدار پارٹی کو ہٹانے کا اس سے بہتر موقع شاید اگلے چند برس میں نہ مل سکے۔ انہوں نے اعتدال پسند مذہبی جماعتوں کو بھی مجبور کیا کہ جمعہ کی نماز کے بعد بطور احتجاج مندر کا گھیراؤ کر کے صدیوں سے رائج دستور کے مطابق ہندوؤں سے ملزم طلب کیا جائے۔

روی شنکر کے گھر میں گہرا سناٹا تھا۔ دن بھر وہ ہندو نوجوانوں کو پر امن رہنے کی تلقین کرتے۔ ہری شیو است سنگ جیسی انقلابی تنظیم طاقت سے جواب دینا چاہتی تھی۔ مقامی حکام سے رابطہ قائم کرتے، حتیٰ کہ کسی شر پسند نے ٹیلی فون کے سلسلے کاٹ دیئے اور بیرونی دنیا سے اُن کے رابطے ختم ہوگئے۔ شیل ہمہ وقت مندر میں رہتی۔ وہ شریمد بھگوت گیتا میں کھو جاتی جو علم کا خزینہ ہے۔ جب سری کشن نے ٹائم اور اسپیس کو کنٹرول کر کے کنتی کے بیٹے کو معرفت کا علم بخشا شاید ہفتوں یا مہینوں

میں مگر ٹائم کو کنٹرول کرنے کی وجہ سے یوں لگا ہے جیسے ایک ہی طویل گفتگو میں سب کچھ منتقل کر دیا۔

شیل کے ذہن میں سانکھیہ یوگ کے تقویت بخش الفاظ گونجنے لگے۔

''نہ میں کبھی تھا اور نہ تو، نہ یہ راجے اور نہ ہم سب کبھی آئندہ ہوں گے جس پر ماترا سپرش اثر نہیں کرتے۔ دکھ اور سکھ میں یکساں رہتا ہے۔ حیات ابدی پاتا ہے۔ آتما کو نہ ہتھیار کاٹتے ہیں نہ اس کو آگ جلاتی ہے۔''

کرم یوگ، وگیان یوگ سے پرشوتم یوگ پر آجاتی۔ اس کا سینہ آنسوؤں سے جلنے لگتا۔ اس کا گلا رُندھ جاتا۔ مگر وہ ان جذباتی نوجوانوں کی دیدی تھی (اور بابر کی۔ کیا ہوں وہ سوچتی) بڑے پُروقار انداز میں وہ انہیں سمجھاتی اور ماحول کو قابو میں رکھتی۔ بابر کی جان بھی شاید اسی کی دعاؤں سے بچی، دعا ساؤنڈ ہے، ساؤنڈ انرجی ہے اور انرجی کو فنا نہیں۔ آپریشن کامیاب رہا، مگر بابر اب تک خطرے سے باہر نہیں آیا تھا، نہ ہی اُسے ہوش آیا تھا۔

جمعہ کے دن شہر میں بے چینی بڑھ گئی۔ مہر اللہ خان نہ چاہتے ہوئے بھی جلوس کی قیادت کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ تاکہ کوئی ناخوشگوار بات نہ ہو سکے۔ اس جلوس میں مذہبی یا قبائلی جذبات سے زیادہ اثر حزبِ اختلاف کا تھا۔ جو حالات کو زیادہ سے زیادہ خراب کرنا چاہتی تھی۔

جمعہ کی نماز میں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر جمع ہو گیا۔ اِدھر ہری شیو است سنگ کے مسلح نوجوان مندر میں پوزیشن سنبھالنے لگے۔

اب زندگی میں چند سانسوں کی دیر تھی۔ شیلا کماری نے گھونگھٹ اُٹھا پھینکا اور میرا کی طرح گھنگھرو باندھ لیئے۔

''میں بابر کو مندر میں لاؤں گی، وہ لوگوں کو بتائے گا کہ اسے ہندوؤں نے نہیں مارا۔''

''بابر بے ہوش ہے۔''

''میں اسے لاؤں گی، میں اسے لاؤں گی۔''

روی کشن کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے، اُن کے چہرے پر رنگ آتے جاتے رہے، وہ کچھ دیر موت وزیست کی کش مکش میں رہے، پھر انہوں نے سر اٹھایا۔

''میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔''

مندر کے پچھلے دروازے سے وہ اپنے بھائی بسنت اور چند ساتھیوں کے ساتھ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ محافظ دستوں نے بھی نہ روکا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید جان بچا کر بھاگ رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سب نکل بھاگیں اور جلوس کو مندر خالی ملتا۔ مگر ہندو بھی مندر کی حفاظت میں جان دینے کا ارادہ کئے بیٹھے تھے۔

''یہ انٹینس سیو کیئر یونٹ (I.C.U) ہے۔ آپ اندر نہیں آ سکتیں۔''

''یہ ہزاروں لوگوں کی موت اور زندگی کا سوال ہے۔''

وہ ڈاکٹر کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

''بابر، بابر،'' وہ ہذیانی انداز میں کہے چلی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر مضحکہ خیز انداز میں انہیں گھورنے لگا۔

شیل نے آگے بڑھ کر بابر کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بابر، بابر''

''یسوع نے جواب میں ان سے کہا۔ خدا پر ایمان رکھو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کوئی اس پہاڑ سے کہے اُکھڑ جا اور سمندر میں جا پڑ اور اپنے دل میں شک نہ کرے۔ بلکہ یقین کرے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ ہو جائے گا تو اس کے لئے وہی ہوگا۔ اسی لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کچھ تم دعاؤں میں مانگتے ہو یقین کرو کہ تم کو مل گیا۔ بکھرے بکھرے پھیکے رنگ واضح صورت اختیار کرنے لگے۔ قلاتی دوڑو میں ملبوس شیلا، اس کے سامنے کھڑی تھی، شیل کو یوں اس قدر قریب دیکھ کر اس کے زرد چہرے پر شفق رنگ بکھر گئے، اس نے جذبات پر قابو پانے کے لئے دانت بھینچ لئے، مگر اس کی بائیں آنکھ کے کونے میں ستارے کی ایک طرح ایک قطرہ جھلملانے لگا۔

شیل نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

بابر نے اپنی روح کی طاقت کو مجتمع کر کے کہا۔

''گلوکوز نکال دو، میں ساتھ چلوں گا۔''

ڈاکٹر اسٹاف کو آوازیں دیتا باہر بھاگا۔ ''روکو، ان کو روکو۔'' وہ چیخ رہا تھا۔

مندر گھیرے میں آ چکا تھا، قانون نافذ کرنے والے مسلح دستے مندر کی دیواروں سے کمر لگائے چاق و چوبند کھڑے تھے۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں ماتا سمندر MOB میں تبدیل ہونے کو تھا۔ MOB جس کا کوئی دھرم کوئی عقیدہ نہیں ہوتا۔ ہندو مسلم فسادات دراصل MOB فسادات ہیں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے نہیں، وہ تو صدیوں سے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔

کچھ شر پسند جلوس کے پُر امن لیڈروں کو دھکیل کر آگے بڑھ آئے۔ اُن میں سب سے زیادہ نمایاں ببرگ تھا، مندر کی دہلیز پر پاؤں رکھ کر وہ چیخا۔ ''بابر پر قاتلانہ حملہ کرنے والے کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم پانچ منٹ کی مہلت دیتے ہیں۔''

روی شنکر نے دلیری سے کہا۔

''کسی ایک کو باہر جانا ہوگا۔ سب کی جان بچانے کے لئے ایک انسانی جان چاہیے۔''

کئی ایک نوجوان ایک ساتھ آگے بڑھے۔

روی شنکر نے ان کو روک کر غیر متزلزل اور جذبات سے عاری آواز میں اپنے بیٹے بسنت کو پکارا۔

''باہر جا کر اپنے آپ کو پیش کر دو۔''

روی شنکر تو مہادیو کا دوسرا نام ہے۔

بسنت نے پتا کے پاؤں چھوئے اور نہایت اعتماد سے دروازے کی جانب بڑھا۔

عین اسی لمحے مندر کے عقبی راستے سے شیل ظاہر ہوئی۔

بابر کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئے۔ مندر کا قوی ہیکل سا گوانی گیٹ کھول دیا گیا۔ انسانوں کے موجیں مارتے سمندر پر حیرت اور خوشی سے سناٹا چھا گیا۔ کسی نے مجسٹریٹ سے

مائیک چھین کر بابر کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

بابر نے مجمع پر نظر ڈالی، اس کی نگاہ ببرک سے الجھ گئی۔ اس نے پوری طاقت مجتمع کر کے کہا۔

''مجھے ہندوؤں نے نہیں مارا، ببرگ نے مارا ہے، دولت کے لئے، میرے بھائی نے مارا ہے۔''

مجمع ببرک پر جھپٹ پڑا، لوگ گتھم گتھا ہو گئے۔ اسی لمحے بابر تیورا کر سیڑھیوں پر گرا اور وقت کے طوفان میں کہیں کھو گیا۔

بابر کے سوئم پر ایک بڑا وفد آیا، وہ سب بابر کے نام پر سیوی میں بابری مسجد بنانا چاہتے تھے۔

مہر اللہ خان کا چہرہ سپاٹ تھا مگر ان کی آنکھوں میں غم کے اندھیرے تھے۔

''میرا بیٹا بابر کوئی بڑا آدمی نہیں تھا۔ نہ مغل شہنشاہ بابر، مغل یا منگول کا لفظ ہنگ سے بنا ہے، جس کا مطلب ہے خون آشام، سلاطین دہلی یا مغلیہ حکمران تو اپنے بیٹوں کی آنکھیں نکلوا دیا کرتے تھے۔ بھائیوں کی کھال اُتروا دیتے تھے۔ کسی شہنشاہ کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ وہ تو بس شہنشاہ ہوتا ہے۔ شہنشاہ بابر کا مذہب سے کیا تعلق ہے؟ آپ تزک بابری پڑھ لیں وہ خود اپنے بارے میں کیا کچھ لکھتا ہے؟'' مسجدیں تو ضرور بنائیں، مگر اس روئے زمین پر اب دوسری بابری مسجد نہ بنائیں۔''

اگلے روز اخباروں نے شہ سرخیوں سے یہ خبر شائع کر دی۔ ان ہی اخباروں کے اندر والے صفحات پر جہاں اخباروں کو پالنے والے بڑے بڑے بے مقصد سرکاری اشتہارات ہوا کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی اہم خبر تھی۔

سابقہ پی سی ایس پنڈت روی شنکر کی جواں سالہ بیٹی آگ کے شعلوں کی نذر ہو گئی۔

شیلا کماری غالباً کسی شادی میں جانے کے لئے تیار ہوئی، اس نے دلہنوں سا سنگار کیا، اچانک اس کے کمرے میں آگ بھڑک اٹھی، جس نے اس کی جان لے لی۔ اُس کے سوگ میں کل گرلز کالج بند رہے گا۔

شوکت حیات

ہیولا

اس علاقے کے سناٹے کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کل کی رات وہ اسی طرح آنکلا ہوگا اور کسی نہ کسی کے گھر کی دیواریں تہس نہس کر کے دوسری جانب نکل گیا ہوگا۔ دیواروں کا انہدام تو عام بات تھی، جس علاقے سے اس کا گذر ہوگا، اس علاقے کے وہ تمام لوگ جو شب ڈھلنے تک اپنے ڈیرے کے باہر رہ جاتے، اس کا شکار بن کر اپنی جان یا کسی نہ کسی عضو کی سالمیت کو کھو بیٹھتے۔

خاص بات یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اندھیری راتوں میں وارد ہوتا تھا۔ مہیب سناٹوں اور گھپ تاریکی میں جب کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا اور اسی لئے کئی اسے آج تک دیکھ نہیں سکا تھا۔ یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ آخر کیا ہے۔ آدمی، جانور یا کوئی بلا۔ بس اسی قدر قیاس کیا جاسکتا تھا کہ وہ ایک قبیح وجود ہے۔ غالبًا کوئی درندہ صفت جاندار ورنہ آدمیوں اور گھر کی دیواروں کو زد میں لینا کسی چھوٹے موٹے جانور کے بس کی بات تھوڑے ہی ہے۔

گاہے گاہے وہ خاموشی سے آتا اور اپنے پیچھے ہلاکتوں کی نشانیاں چھوڑتا ہوا خاموشی سے چلا جاتا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکالتا تھا۔ جس کو سُن کر اندھیرے میں اس کی شناخت کی جاسکتی۔

شروع شروع میں تو لوگوں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اندھیری رات میں دیر سے آنے والے کچھ لوگوں کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں تو لوگ یہی سمجھتے کہ گلی کے آوارہ کتے ٹانگوں سے لپٹ گئے ہوں گے۔ ان سے پیچھا چھڑانے میں لوگ گرے ہوں گے اور ان کے پیر ٹوٹ گئے ہوں گے۔

لوگ سراسیمگی کے عالم میں بڑبڑاتے رہتے کہ نہیں وہ کتا نہیں ہوسکتا، وہ بلی بھی نہیں ہوسکتی۔ وہ کیا ہوسکتا ہے کہ کہنا مشکل ہے لیکن وہ جو بھی ہو، ہم اس کے سامنے بے دست و پا تھے۔ بغیر

گرے ہوئے ہمارے پاؤں اس کے پنجوں کی شکتی کی تاب نہ لاتے ہوئے ٹوٹے ہیں۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ یوں بھی جس پر گزرتی ہے، اسی کو گزرے ہوئے لمحوں کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا کوئی سن اور سمجھ کران لمحوں کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اگلے ہی مہینے کی اندھیری راتوں میں کچھ لوگ دیر سے آتے ہوئے مارے گئے۔ صبح سڑکوں پر انہیں مردہ پایا گیا۔ ان کے جسموں پر کہیں کوئی قابل ذکر نشان نہیں تھا سوا اس کے کہ ان کے سینے پر کسی وزنی چیز کے نیچے دبے رہنے کا گمان ہوتا تھا پھر کچھ مکانوں کی دیواریں خاموشی کے ساتھ زمین پر آرہیں۔ اب لوگوں نے سمجھا کہ ہونہ ہو کوئی انہونی پراسرار معاملہ ہے۔

بڑے بوڑھوں نے اپنی یادداشت کی پرتوں کو کھرچ کھرچ کر تار تار کردیا۔ ماہر عمرانیات، حیوانیات اور دیگر علوم وفنون کے دماغوں نے اپنی الماریاں چھان ماریں، ایسا کوئی چرندہ، پرندہ یا درندہ کہیں نہیں تھا، جو اس طرح تاریکیوں میں اپنے پیچھے سراغ کی کوئی نشانی چھوڑے بغیر اتنی خاموشی کے ساتھ تباہیاں مچاتا ہو کہ کسی کو اس کی آہٹوں تک کا احساس نہ ہوتا ہو۔ ایک سے ایک جانور کا ذکر ملتا تھا۔ اور داستانوں میں جن اور پریوں کے قصے بھرے پڑے تھے لیکن سب کے سب ایسے تھے جن کے واضح ثبوت اور واضح خدوخال تھے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا جاندار تھا۔ جس کو دیکھنا، سننا اور سمجھنا ناممکن تھا۔ کوئی ثبوت چھوڑے بغیر بڑے پیانے پر آفات نازل کرتا جارہا تھا۔

گشت کرنے والے عملوں نے اعلیٰ حکام کی ہدایت کے مطابق شہر کے چپے چپے پر سرچ لائٹ کا انتظام کیا ور رات بھر پہرے دیتے رہے۔ انتظامات اتنے سخت ہوئے تو ان راتوں میں کہیں کوئی واردات نہیں ہوئی دھیرے دھیرے علاقے کے لوگ ان حادثوں کو بھول گئے۔ پہرے داروں نے بھی اپنی ڈیوٹی میں ڈھیل شروع کردی۔ اور اگلے مہینے کی سناٹی اندھیری رات کے دم توڑنے کے بعد لوگوں نے متعدد افراد کو پژمردہ دیکھا۔ کچھ کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے۔ مردہ، نیم مردہ اور بے ہوشی کی حالت میں لوگ پڑے تھے۔

بیانات لینے پر معلوم ہوا کہ گذشتہ رات کو ایک ہیولا ان پر اچانک سوار ہوگیا اور ان کی سانسیں

گھٹنے لگی تھیں۔ جو بچ گئے تھے انہوں نے بتایا کہ اچانک کسی جانب سے گشت کرنے والے کی ٹارچ کی روشنی اس پر پڑی تھی اور وہ غائب ہو گیا تھا۔ حالانکہ اسے غائب ہوتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے اس کی موجودگی سبھوں کے لئے ــــ بس اچانک محسوس ہوا کہ روشنی کی تاب نہ لا کر وہ کہیں دور جا پڑا۔ کئی مکانوں کی دیواریں بھی گری ہوئی تھیں۔

بزرگوں نے بتایا کہ بڑے بڑے آدم خور شیر گزرے ہیں۔ جو آخر کار مارے گئے انہوں نے بھی ایسی سفاکی نہیں کی۔ وہ آدمیوں کا شکار ان کا خون پینے کیلئے کرتے تھے۔ لیکن یہ عجیب بربریت پسند اور سفاک درندہ ہے جو بغیر کسی خاص مقصد کے لوگوں کا شکار کر رہا ہے۔ نہ کسی کے جسم سے گوشت نچا ہوا ہوتا ہے، نہ کسی کی شریان سے خون ٹپکتا ہے، بس دونوں جہان کی سب سے پیاری شے چلی جاتی ہے۔

اس علاقے کا نیم پاگل قلندر سبھوں کا چہرہ گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ سب کے سب ہراساں نظروں سے اس قلندر کو دیکھنے لگے تھے۔

کیو.......... تیری ہی حرکت تو نہیں ہے.......... تو رات رات بھر سڑکوں پر مارا پھرتا ہے.......... آخر لوگوں کے اس طرح مرنے کا راز کیا ہے۔''

قلندر باری باری سبھوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔

قلندر کو مت گھسیٹو، یہ سب تم لوگوں کے معاملے ہیں میں تو انہیں واردات ہی نہیں سمجھتا۔

''سالا پاگل نہیں ہے، بہت ہوشیار ہے...... ہمیں اس کی خبر لینی چاہیئے۔''

''ہے'' تم لوگ اپنی خبر لو...... میں...... میں قلندر ٹھہرا...... سردی گرمی، برسات ہر موسم میں کھلے آسمان کا عادی ہوں۔ گھر، مکان، مندر، سرائے، دھرم شالہ ــــ میرا کہیں کوئی مسکن نہیں کہ دیواروں کے ٹوٹنے کا ڈر ہو...... میری جان کی کوئی قیمت ہی نہیں جو اس کے جانے کا اندیشہ ہو...... بتاؤ...... تم نے اسے درندے کو دیکھا ہے......؟''

''ہاں دیکھا ہے...... میں پہچان گیا ہوں...... لیکن میں بتاؤں گا نہیں...... تم سب کے سب

میری جان کے دشمن بن جاؤ گے......!''

قلندر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ اور کچھ دیر بعد زار و قطار رونے لگا۔

دوسری صبح وہ قلندر جو بڑی بڑی طوفانی بارش اور برف باری میں بھی زندہ رہا تھا، مردہ پڑا تھا۔ لوگ اس واردات پر متفکر نہیں ہوئے، بلکہ ایسا لگا جیسے ان کی پریشانیاں دور ہو گئیں ___ بازار میں ان کی پگڑی اترتے اترتے رہ گئی۔

☆☆

مشرف عالم ذوقی

احمد آباد ۔ ۳۰۲ میل

(۱)

صبح اٹھے تو سب کچھ بدلا بدلا سا لگا، ابراہیم بھائی کو۔ در، دروازے، کھڑکیاں اور گھر...... وہ آنکھیں پھاڑے اپنے گھر کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کسی انجانے گھر میں آ گئے ہیں...... کمرہ...... ادھر اُدھر بکھرے ہوئے سامان...... بے رونق دیواریں۔ اندر دل نہیں لگا تو باہر نکل آئے۔ ایک لمبی سڑک مکان سے ہوتی ہوئی آر پار گزر گئی تھی۔ سڑک پار دو چار کپڑے کی دوکانیں تھیں۔ ملکانی صاحب، نرمل ورما وغیرہ کے مکان...... یعنی سب جان پہچان والے...... نہیں جان پہچان والے نہیں؟ غیروں کے۔

گھر سے باہر نکلے تو بدن میں جیسے خوف ہی خوف پسر گیا۔ ٹھیک اسی وقت پولیس کی ایک جیپ دھواں چھوڑتی ہوئی گزری۔ ابرہیم بھائی ڈر کے چھپ گئے...... جیسے پولیس کے سپاہی نے اگر دیکھ لیا تو فوراً جیپ روک دے گا۔ پھر ان سے ان کا نام پوچھے گا۔ وہ نام بتائیں گے تو وہ زور زور سے ہنسے گا۔ پھر...... انہیں چپ چاپ، شوٹ کردے گا، جیسے عام طور پر لوگ پاگل کتوں کو شوٹ کر دیتے ہیں۔

جیپ آگے بڑھ گئی تو تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے سڑک کا جائزہ لیا۔ دل اچانک پھر زور زور سے دھک دھک کرنے لگا، ابھی اچانک دنادن زور زور سے سڑک پر گولیاں چلنی شروع ہو جائیں گی...... دنا...... دن۔ پھر سڑکوں پر لاشیں ہی لاشیں بچھ جائیں گی۔ چیختے چلاتے لوگوں کی بھیڑ ان کے گھر پر دھاوا بول دے گی۔ دروازہ نہیں ٹوٹے گا تو مشتعل لوگ

دروازے میں آگ لگادیں گے۔ پھر چیختے چنگھاڑتے، دھکم پیل کرتے اندر گھس جائیں گے اور......

''چھپاؤ...... چھپاؤ......''

کمرے میں دوبارہ واپس آتے ہی ابراہیم بھائی نے چیخنا شروع کردیا۔ سب کچھ چھپالو...... کچھ بھی سامنے نہیں رہنا چاہئے۔ جس سے پتہ چلے کہ تم کون ہو...... سمجھے...... ایسا کچھ بھی یہاں نہیں رہنا چاہئے۔

دیوار پر اسلامی کلینڈر ٹنگا تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ قرآن شریف کی تلاوت کررہا تھا۔ انہوں نے جھٹ آگے بڑھ کر کلینڈر اتار لیا۔ اسے موڑنے لگے۔ ریک پر اردو کی کتابیں ایک قطار سے سجی تھیں۔ انہوں نے ذرا بھی دیر نہیں کی۔ مسہری سے چادر کھینچ لی۔ اردو کی کتابیں جلدی جلدی ریک سے نکال کر چادر پر پھینکنے لگا۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ ''کچھ بھی نہیں رہنا چاہئے۔ کچھ بھی نہیں۔''

....

چادر کی گٹھری اتنی ہی وزنی تھی۔ جتنا ان کے دماغ پر رکھا ہوا وزنی پتھر___ اٹھانا چاہا تو ٹھہر گئے۔ ''کمبخت...... اب اٹھاؤ تو اٹھتا نہیں...... یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ کوئی آ گیا تو؟ کسی نے دیکھ لیا تو؟ گٹھری کے چاروں طرف جھانکتے کونوں سے اردو کے حروف تو نظر آ ہی رہے ہیں۔ انہیں لگ رہا تھا، قصاب کا چھرا ہر وقت ان کی گردن پر تیار ہے...... کسی وقت بھی یہ چھرا ان کی گردن اتار سکتا ہے......

گٹھری کو جھٹک کر آنکھیں سیدھی کیں تو طاق پر جزدان میں رکھے کلام پاک پر نظر چلی گئی۔ بدن میں سمائی کپکپی جیسے ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اب کلام پاک کا کیا کریں؟ وحشی گھر میں گھس جائیں تو۔ جان تو جائے گی ہی۔ ایمان بھی سلامت نہیں رہے گا...... آگے بڑھے ابراہیم بھائی نے کلام پاک کو ہاتھوں اٹھایا۔ آنکھوں سے چوما، سینے سے لگایا۔ وحشت اور گھبراہٹ کے عالم میں آگے بڑھنا چاہا تو ٹھٹھک گئے۔ لگا دروازے کھڑکیوں میں سو سو آنکھیں پیدا ہوگئی ہیں۔

اور یہ آنکھیں بری طرح سے انہیں گھور رہی ہیں......

''کہاں جاؤ گے؟''

''کہیں بھی۔''

''کہیں بھی؟''

''ہاں۔ جہاں سکون ہو۔''

''تمہارے لیے؟''

''کیوں؟''

وہ سہم گئے......

جواب ملا۔''تمہارے لیے کہیں سکون نہیں ہے۔ یہ طے ہے کہ تم مارے جاؤ گے۔''

''کیوں؟''

تم ایسے ہی ہو بے غیرت۔ مار کھانے کے لئے بنے ہو۔ ہر جگہ مار ہی تو کھا رہے ہو۔''

محسوس ہوا، دیوار کی آنکھوں نے اپنا کھرا فیصلہ سنا دیا۔''کہیں بھی جاؤ گے، نکالے جاؤ گے، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا، دو چار برس کہیں بھی مہاجر بن کے جی لو گے۔ آخر میں موت یقینی ہے۔ مارے جاؤ گے۔ یہی سچ ہے۔''

وہ ایک دم سے ڈر گئے۔ گھگی بندھ گئی۔

''......کہاں جاؤں؟''

......''ڈر گئے...... یہاں سب، آس پاس والے تمہارے مسلمان بھائی مکان خالی کر گئے۔ کیلے تم رہ گئے ہو۔ اور یہ سب......''

دیوار میں لگی آنکھوں نے جیسے ان کے ساز و سامان کی طرف اشارہ کیا......انہیں جلا دو...... ن کے نشان مٹا دو۔ یعنی اپنی شناخت کی ساری نشانیاں......

''نہیں''......ابراہیم بھائی کے بدن میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی......ان میں تو کلام پاک بھی

ہے......اردو کی کتابیں بھی ...... بچپن میں اردو کا کوئی ورق آنگن یا ڈیوڑھی میں پڑا ملتا تو اماں کان مروڑتی تھیں...... پگلے ......ان میں اللہ کا نام ہوتا ہے......اسے ایسے پھینکتے ہیں کیا...... پہلے انہیں چومو......''

''ایمان کب تک چاٹو گے۔ مگر مارے جاؤ گے تب؟ وہ آ کر ان کی بے حرمتی کریں گے، تب؟ انہیں پیروں کے نیچے کچلیں گے۔ آگ دکھائیں گے، اس وقت؟''

اس نے گھٹی گھٹی سانس چھوڑی...... میں نہیں کر سکتا۔ میں مجبور ہوں۔''

''......تو پھر مارے جاؤ۔ مرنے کیلئے تیار ہو جاؤ......''

دیوار پر لگی آنکھوں نے اس کی طرف نفرت سے دیکھا...... ان میں لکھا ہے کہ تم مسلمان ہو......اور ڈرا سی بات کا ہے کہ تم مسلمان ہو۔ اور مسلمان ہو اس لئے یقیناً مارے جاؤ گے۔ دیکھو، آس پاس کے سب مسلمان بھاگ گئے.. ..''

....

انہیں یاد آیا، رات انہوں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ خواب میں دیکھا کہ چاروں طرف ہتھیار سے لیس ڈاکو گھوم رہے ہیں۔ مسجدیں توڑی جا رہی ہیں...... بسوں میں، گاڑیوں پر، دیواروں پر، ہر جگہ بھڑ کیلے نعرے لکھے ہیں...... مسلمان اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر راتوں رات بھاگ رہے ہیں۔ دور تک لمبا قافلہ...... ڈاکوؤں کو پتہ چل گیا ہے۔ ڈاکو قافلے والوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اور ایک ایک کے سر تن سے جدا کئے جا رہے ہیں۔ جن کے سر کٹتے ہیں ڈاکو غصے اور حقارت سے ان کے منہ پر تھوکتے ہیں یا پینٹ کی زپ کھول کر...... پیشاب کی دھار بہا دیتے ہیں۔ ملیچھ...... سنپولیا...... انہوں نے دیکھا۔ راتوں رات لوگ گھر کے باہر لگے نیم پلیٹ کو اکھاڑ رہے ہیں، توڑ رہے ہیں۔ اور گھر کے باہر گیروا کپڑوں کے جھنڈے لگا رہے ہیں۔ انہوں نے دیکھا۔ ایک مسلمان گیروا کپڑوں میں ہے۔ پاؤں میں دھوتی۔ ماتھے پر چندن۔ پیچھے سے ایک ڈاکو آتا ہے۔ اس کی تلوار چمکتی ہے۔ مسلمان چیختا ہے۔ بچاؤ۔

ڈاکو تلوار اڑا کر ہنستا ہے۔ ''سانپ کا بچہ سانپ ہی رہے گا، جو بھی بھیس بدل لے...... مار ڈالو......''

انہوں نے یہ بھی دیکھا۔ جو لوگ بچ گئے ہیں وہ اپنے اپنے ماتھے پر چندن اور بھبوت مل رہے ہیں۔ کلام پاک پر رامائن یا مہابھارت کا کور چڑھا کر، تہ خانہ میں بند بند تلاوت کر رہے ہیں۔ اور گھر کے باہر آ کر دھوتی پہن کر، ٹیکا لگا کر بھارتیہ، بن جاتے ہیں۔

وہ دیکھ رہے تھے۔ بادشاہت اور غلامی کا زمانہ ایک بار پھر لوٹ آیا ہے۔ انہوں نے کہیں سنا تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں، انگریز ڈنڈے کے ایک چھور پر ہیٹ رکھ کر ہندوستانیوں کو سلام کرنے کو بولتے تھے۔ اور جو ہیٹ کو سلام نہیں کرتا تھا، انگریز اس پر ہنٹر برساتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے دیکھا۔ سب کچھ ویسا ہے۔ صرف منظر بدل گیا ہے۔ ہیٹ کی جگہ ڈنڈے پر گیروا کپڑا پڑا ہے۔ اور ایک آرمی کا آدمی سہمے سہمے سے مسلمان کو بلا کر کہہ رہا ہے۔ پرنام کرو۔ جو ہاتھ نہیں اٹھتے، ان پر ویسے ہی ہنٹر برس رہے ہیں۔ چیخ۔ تیز چیخ۔ وہ صرف چیخیں سن رہے ہیں۔

وہ دور تک دھواں دیکھ رہے تھے۔ جلتے ہوئے مکان...... آسمان چھوتے ہوئے شعلے___

وہ دیکھ رہے تھے جو بچ گئے ہیں، آرمی کے لوگ انہیں غلاموں کی طرح کھینچتے ہوئے لیے جا رہے ہیں اور سہمے بھیڑوں کی طرح سر نیچا کیے، ہاتھ جوڑے مسلمان چلے جا رہے ہیں......

انہوں نے دہشت سے آنکھیں موند لیں۔ انہوں نے دیکھا۔ انہوں نے ایسا بہت کچھ دیکھا۔ بہت کچھ دیکھا جسے بتایا نہیں جا سکتا۔ کسی کو سنایا نہیں جا سکتا، لکھا نہیں جا سکتا، انہوں نے دیکھا، ایک بار پھر پرانے زمانے کی طرح پھانسی دیئے جانے کے قصے عام ہیں۔ شاہراہوں پر جا بجا لکڑی کی صلیبیں جھول رہی ہیں۔

''......سرکار...... یہ نماز پڑھتا ہوا پکڑا گیا۔''

''......ہینگ'' ......

''......سرکار اس کے گھر میں اردو میں لکھا ہوا......''

''ہینگ''......

انہوں نے دیکھا...... ایک تیز الاؤ ہے۔ الاؤ میں ڈھیر ساری ٹوپیاں، تسبیحیں پڑی ہیں۔ الاؤ کے شعلے دہک رہے ہیں۔ انہوں نے دیکھا صبح ہوگئی ہے۔ غلام پنجروں میں قیدیوں جیسے کپڑے پہنے قید ہیں۔ ہاتھ پیروں میں زنجیریں پڑی ہیں۔ انہوں نے دیکھا...... ہلکی ہلکی صبح نمودار ہوگئی ہے...... پولیس کا آدمی آتا ہے۔ غلاموں کے پنجرے ہے...... چابک ہوا میں لہراتا ہے، اور......

رونگٹے کھڑے کردینے والے اس خواب کے بعد اب باقی ہی کیا تھا۔ وہ اٹھے تو جیسے سب کچھ بدل چکا تھا۔ وقت...... زمانہ...... کمرہ وہی تھا۔ دیوار پر اسلامی کلینڈر، جھول رہے تھے۔ پائنتیانے ان کی ٹوپی پڑی تھی۔ وہ جیسی لنگی پہنے تھے۔ ایسی چٹائی دار لنگیاں زیادہ تر مسلمان ہی استعمال کرتے ہیں۔ سہمے سہمے سے وہ آئینہ کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ پیشانی پر سجدے سے گٹھا پڑ گیا تھا۔ سیاہ گٹھا۔ بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے تھے۔ قیامت کے دن اس گٹھے سے روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں...... مگر اس وقت...... یہ سب کچھ انہیں کاٹ رہا تھا...... جیسے یہ پورا گھر جل رہا ہو۔

وہ تیزی سے ہتھوڑا لے کر باہر نکلے۔ سڑک بھی سناٹے میں ڈوبی تھی۔ دور دور تک کوئی نہیں۔ سامنے والی دکانیں ۱۰۔۹ بجے سے پہلے کھلنے کا سوال ہی نہیں۔ انہوں نے دروازے پر جھولتے نیم پلیٹ کو دیکھا...... محمد ابراہیم...... آنکھوں کے آگے اندھرا سا چھایا۔ ہتھوڑا نیم پلیٹ پر مارنا چاہا تو پیچھے سے کسی نے دبوچ لیا۔ وہ سہم گئے۔ خوفزدہ ہوکر گھومے تو شبن سے ٹکرائے۔

''دولہا بھائی۔ یہ کیا کررہے ہیں آپ؟''

''شی''...... انہوں نے انگلی سے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

شبن کنارے ہوگیا۔ ''اپنا نیم پلیٹ توڑ رہے ہیں؟''

''ہاں''......

''خالی نیم پلیٹ دیکھ کر بھی تو۔ کچھ لوگ......'' شبن کہتے کہتے رک گیا۔ انہیں یاد آیا۔ خواب والے لوگ اپنے نیم پلیٹ کی جگہ دوسرے فرقے کی نیم پلیٹ ڈال رہے تھے۔ وہ بس خوف میں

گھرے تھے۔انہوں نے جیسے کوئی دھیان نہیں دیا......

''ٹھک......ٹھک......ٹھک......''

نیم پلیٹ کے ٹکڑے ٹکڑے بکھرے تھے۔

ایسا کرتے ہوئے انہوں نے دیکھا، سڑک کے اس طرف والے مکان کے چھجے سے ملکانی صاحب ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حیرت سے۔ اور دن ہوتا تو شاید وہ مسکراتے۔ باتیں کرتے__ مگر نہیں۔ انہوں نے ہاتھ جھٹک دیا۔ شبن کا ہاتھ پکڑا۔ جھٹ دروازہ بند کیا۔ کمرے میں آ گئے......

''یہ سب؟''

شبن کی آنکھوں میں خوف ہی خوف تھا۔انہوں نے شبن کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں ایک سہما سہما، بھگیڑو، جو اپنے محلہ کی فضا خراب ہوتے ہی بیوی بچوں کے ساتھ ان کے یہاں آدھمکا تھا۔

''تم کیوں بھاگے تھے شبن میاں؟''

شبن نے گہری سانس لی۔ ''کچھ کہہ نہیں سکتا دولہا بھائی۔ کچھ نہیں۔ فضا خراب ہوئی تو انہوں نے کہا۔ ''بہتر ہے تم ابھی چلے جاؤ۔ اس لیے کہ جب جنون حد سے گزرتا ہے تو ہماری نظریں بھی بدل سکتی ہیں۔ ہاں یہ کہا انہوں نے، جن کے ساتھ دن بھر کا اٹھانا بیٹھنا تھا۔ یہ کہا انہوں نے......''

ابراہیم بھائی نے شبن کی پیٹھ تھپتھپائی......دیکھا__ شبن کی آنکھوں میں ایک قطرہ طوفان کانپا اور تھم گیا...... ظلم کی کوئی کہانی اس سے زیادہ خوفناک نہیں ہوسکتی۔ ایک کربلا وہ تھا اور ایک کربلا۔ شبن مندر مارگ پر ہندوؤں کے گھر میں کرائے دار تھا۔ بڑے اچھے لوگ...... ہر وقت اٹھنا بیٹھنا۔ دکھ سکھ میں ہر لمحے کا ساتھ جہاں بیٹھے وہیں ایک دوسرا کا کھانا پینا تک ہوگیا۔ کوئی چھوا چھوت نہیں۔ مگر ادھر جنون کی بارود بھڑکی، ادھر مالک مکان نے شبن کو بلا کر عملی بات سمجھا دی کہ میاں ایسے میں جذباتی بن کر کچھ کہنا اچھا نہیں ہوتا۔ یہاں اکیلے صرف تم مسلمان ہو تم سے دستخط

کرا کر لے جانے والے بھی جان گئے ہیں کہ تم...... تمہارے یہاں اردو میں خط آتے ہیں۔ پرچے آتے ہیں۔ تمہارے بیٹے تم سے ملنے آنے والوں کو باہر نکل کر زور زور سے خدا حافظ اور سلام عرض کرتے ہیں۔ پوسٹ مین سے لے کر آس پاس والے سب جانتے ہیں کہ تم...... کچھ ہو گیا تو...... کیا خبر جنون میں ہماری آنکھیں بھی بدل جائیں......"

شبن میاں نے پھر دیری نہیں کی۔ بستر اٹھایا اور ان کے یہاں چلے آئے۔

شبن نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ "لیکن...... یہاں بھی تو سب جانتے ہیں آپ کو......"

"ہاں"......

"پاس پڑوس کے مسلمان بھی چلے گئے؟"

"ہاں"......

"کچھ ہوا تو سب سے پہلے ہم ہی......"

اچانک وہ ٹھٹھک گئے۔ کان کھڑا کیا تو معلوم ہوا کلام پاک کی تلاوت کی صدا دھیرے دھیرے دالان خانے سے نکل کر ان کوٹھریوں سے ہوتی ہوئی باہر کی ہوا میں گونجنے لگی ہے۔ کون ہے......؟ نصیبن ہوگی...... وہی...... اتنی صبح صبح اٹھتی ہے__ پھر فجر کی نماز پڑھنے کے بعد کلام پاک لے کر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن اتنے زور زور سے......

وہ تلملائے ہوئے دالان خانے میں آئے۔ نصیبن جانماز پر جھکی ہوئی۔ دھیمی آواز میں تلاوت میں مصروف تھی۔

"بند کرو۔ بند کرو" وہ تیز آواز میں چیخے۔ "لپیٹو۔ جزدان میں لپیٹو۔"

نصیبن چونک گئی۔ "یہ کیا ہے؟"

"ایک دن تلاوت نہیں کروگی تو قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی۔"

"چھپاؤ میں کہتا ہوں چھپاؤ۔"

انہوں نے جھپٹا مارنا چاہا تو نصیبن نے ہاتھ تھام لیا۔ "آپ نے وضو نہیں بنایا۔"

''میں کہتا ہوں۔'' وہ تلملا گئے۔

''یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔'' نصیبن نے کاغذ کی نشانی بنا کر صفحہ موڑ دیا۔ ان کی طرف پیار سے دیکھنا چاہا۔ مگر ٹھہر گئی۔ اتنی ساری جھریاں...... ایک ہی دن میں میاں کے چہرے پر کیسے اُگ آئیں؟

''یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

وہ غصے میں چیخے۔ ''کیا ہو گیا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے ٹی وی سے ڈر لگتا ہے...... اخباروں سے ہول آتا ہے...... لاؤڈ اسپیکر پر ہونے والی اذان سے وحشت ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے ٹوپی پہنے ہوئے لوگ نکلیں گے اور مارے جائیں گے۔ اذان ہو گی اور موذن منبر سے اتار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ لوگ نماز پڑھ رہے ہوں گے اور کاٹ ڈالے جائیں گے۔

وہ چیختے ہوئے کمرے میں آئے تو سانس پھول چکی تھی۔ سر میں چکر آ رہا تھا۔ غش کھا کر ایک دو جگہ لڑکھڑائے۔ ساعت دھندلی سی ہوتی معلوم ہوئی۔ نیم غنودگی میں ڈوب گئے۔ پھر آنکھیں کھلیں تو جیسے سب کچھ جھل مل جھل مل کر رہا تھا۔ در، دروازے، کھڑکیاں سب جیسے انجانے لگ رہے تھے۔

وہ خود سے بڑبڑائے...... ''میرا وطن گم ہو گیا ہے......''

انہیں لگا، وہ لوگوں سے پوچھیں گے تو لوگ ہنسی اڑائیں گے۔ وہ ایک دم سے خود کو اکیلا اور اجنبی رہے تھے...... یہ...... کہاں ہیں وہ؟...... یہ کمرہ...... یہ کس کا کمرہ ہے......؟ وطن؟ ان کا وطن کون سا ہے...... سب جیسے مذاق اڑا رہے ہوں...... تم بے وطن ہو۔ تمہارا وطن ہی کب تھا۔ لڑاکو جنگجو۔ تم لٹیروں کی طرح باہر سے آئے۔ جی بھر کر لوٹا پھر لاچار مظلوموں پر حاکم بن کر راج کرنے لگے۔ یہاں...... یہاں تھا وطن...... انہوں نے جیسے کہنا چاہا...... اس مٹی میں...... لیکن...... اچانک جیسے سب کچھ اجڑ گیا۔ علاء الدین کا جن وطن اٹھا کر ہوا میں کہیں دور پھینک آیا اور وہ...... بھک منگوں جیسے انداز میں آتے جاتے لوگوں سے دریافت کر رہے ہوں......

صاحبو، میرا وطن کہاں ہے...... میرا ملک کہاں ہے...... میرا ملک گم ہو گیا ہے......

انہوں نے دیکھا، وہ بستر پر پڑے ہیں۔ بستر سے ذرا فاصلے پر نصیبن، شبن میاں، ان کی بیوی بچے، اقبال میاں ان کے بڑے لڑکے کھڑے ہیں۔ آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو اپنی طرف آنے کو کہا۔ ذہن کی نسیں اب بھی چیخ رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا، بچے، بیوی، شبن پاس آنے میں تامل کر رہے ہیں۔

انہوں نے اشارہ کیا......

شبن آگے بڑھا۔ پیچھے اقبال میاں، ان کے پیچھے نصیبن، مہرو...... ان کی کالج میں پڑھنے والی لڑکی۔

''طبیعت کیسی ہے آپ کی؟''

انہوں نے اقبال کو دیکھا۔ افسوس آیا۔ ''بے چارہ...... بے وطن......''

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔''

اقبال سرہانے بیٹھ گیا۔ اور ہولے ہولے ان کا سر سہلانے لگا۔ ہاتھوں کی تمازت پا کر آنکھیں جیسے ساون بن گئیں۔

''میرا وطن گم ہو گیا ہے...... میرا وطن......''

اقبال پلنگ سے ایسے اچھلا، جیسے بجلی کا شاک لگ گیا ہو...... ابا جان...... اس نے کانپتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ شبن غصے میں بولے۔ ''یہی باتیں...... یہی باتیں ہمیں ذلیل کرتی ہیں۔''

ذلیل؟ ان کا جی چاہا، اٹھ کر شبن کو طمانچہ لگائیں۔ ''اس میں ذلیل ہونے کی کون سی بات ہے۔ جس کے ماں باپ مر جائیں وہ یتیم کہلاتا ہے۔ جو ہجرت کر جائے وہ مہاجر۔ جس کا گھر بار، وطن چھن جائے وہ بے وطن ہی تو کہلائے گا۔''

''آپ سو جایئے۔'' نصیبن آگے بڑھی۔

اندرونی جذبات کی چبھن سے وہ پھر چیخے۔ ''میرا وطن ہو گیا ہے۔''

نصیبن کی آنکھوں میں پھر ایک قطرہ طوفان مچلا۔ اس نے آہستگی سے سورہ یٰسین کی تلاوت کرنی چاہی۔ ابراہیم بھائی گلہ پھاڑ کر چیخے۔ ''بند کرو، ہونٹ سی لو...... چپ رہو خاموش......'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

اقبال کمرے میں ٹہلنے لگا...... پھر اماں کا ہاتھ تھاما۔ ''چلو ابا کو اکیلے چھوڑ دو۔'' شبن کی بیوی، مہرو سب باہر نکل گئے۔ اکیلا شبن رہ گیا اور وہ۔ انہوں نے دیکھا شبن پتھر کی مورت کی طرح دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پلنگ کے قریب آ کر جیسے وہ کسی بم کی طرح پھٹ گیا'' دولہا بھائی...... مجھے بھی......'' اس کے لفظ تھرتھرائے...... ''مجھے بھی ہی لگ رہا ہے...... میرا وطن کہیں گم ہو گیا ہے......''

پھر وہ ٹھہرا نہیں۔ اپنے کمرے میں تیزی سے لوٹ گیا۔

(۲)

ڈاکٹر پرکاش ان کے یہاں سے چار قدم کے فاصلے پر تھے۔ کہا جائے تو خاندانی ڈاکٹر۔ جب کبھی گھر بلانے کی نوبت آئے تو گھر بلا لو۔ دکھا لو...... فیس دو، نہ دو کوئی بات نہیں۔ دماغ جس طرح پھٹ رہا تھا، اس سے لگتا تھا، ٹیومر ہو گیا ہے...... یوں بھی بڑھاپے میں مرض چھپانا اچھا نہیں ہوتا۔ ڈسپنسری میں پہنچ کر اس نے ڈاکٹر کو نمستے کیا تو ڈاکٹر نے انہیں اشارہ سے قطار میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ سب سے پیچھے ان کا نمبر تھا۔ چار و ناچار بیٹھ گئے...... کیا کرتے...... مگر ایسا پہلے کبھی...... انہوں نے یوں ہی آس پاس گھورنا شروع کیا۔ اچانک وہ ٹھہرے۔ ڈاکٹر پرکاش کے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ تھا۔ کمرے میں پہلے دھارمک کلنڈر نہیں ہوتے تھے، اب جا بجا لٹکے تھے۔ طاق پر دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں براجمان تھیں۔ اگر بتی جل رہی تھی۔

وقت بدل گیا ہے۔ بدل گیا ہے۔ وہ خود سے بڑبڑائے۔

آدھے گھنٹے بعد ان کا نمبر آیا۔

ڈاکٹر پرکاش مسکرائے۔ انہیں لگا، اس مسکراہٹ میں بھی مذاق کے پہلو چھپے ہیں__

''ساری، صبح کا وقت تھا۔اس لیے انتظار کرنا پڑا۔نبض دکھایئے......''

انہوں نے نبض دکھائی۔

''ہوا کیا ہے؟''

''دماغ میں چکر رہتا ہے۔''

''اور؟''

''بلڈ پریشر......''

ڈاکٹر نے بلڈ پریشر چیک کیا۔پھر مسکرایا۔''نارمل!''

''نارمل۔'' وہ چونک پڑے۔انہیں لگا، ڈاکٹر انہیں اصلیت بتانا نہیں چاہتا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''

''نارمل ہے بس۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔''ویسے تکلیف کیا ہے؟''

''جی۔دماغ میں بم کے گولے سے پھوٹتے ہیں۔آنکھوں کے آگے گول گول دائرے بنتے ہیں۔کبھی کبھی چکر اور اندھیرا سا آجاتا ہے۔''

''گول گول Rings...... جیسے بجلی چمکتی ہے؟''

''ہاں...... بالکل اور......'' وہ بے دھیانی میں بولتے چلے گئے...... ''اور بس سر پھٹنے لگتا ہے...... پھر لگتا ہے...... کسی کو پہچان نہیں رہا ہوں...... میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ملک نہیں ہے۔میرا ملک گم ہوگیا ہے......''

''وہاٹ......'' پرکاش اتنے زور سے چونکے کہ کئی مریض ان کی طرف دیکھنے لگے۔

''جی۔یہی لگتا ہے......''

انہوں نے دیکھا۔ڈاکٹر کی پیشانی پر لکیریں پڑگئی ہیں۔وہ کچھ دیر تک انہیں گھورتے رہے۔ پھر سنبھل کر بیٹھ گئے...... ''کچھ الگ سا سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔بتائیں گے؟''

''ضرور ممکن ہواتو۔'' وہ دل ہی دل میں ڈر گئے۔

''سڑک پر مرے ہوئے دو آدمی پڑے ہوں...... ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ آپ پہلے کسے بچائیں گے؟''

''جی......'' وہ اٹک گئے۔ ڈاکٹر مسکرا رہا تھا۔

''اظہر اور تندولکر میں آپ کو زیادہ کون پسند ہے؟''

''جی......''

''ہندو پاک ٹیسٹ میچ چل رہا ہو، آپ کس کی جیت پر خوش ہوں گے؟''

''جی......''

ڈاکٹر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو کوئی بیماری نہیں۔ اپ صرف ڈر گئے ہیں۔ آپ بہت ڈر گئے ہیں۔ آپ گھر جائیے۔ اگلا نمبر۔''

انہوں نے آواز لگائی آگے بڑھتے بڑھتے ان کو ڈاکٹر کی آواز سنائی پڑی۔ ''سن آف بچ۔ یہ آج بھی سمجھتے ہیں کہ یہ یہاں رول کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کب ان مسلمانوں کی ذہنیت بدلے گی۔ رہتے یہاں ہیں کھاتے یہاں ہیں اور......''

وہ سر سے لے کر پیر تک جیسے لرز گئے۔ بدن میں کاٹو تو خون نہیں۔ لرزتے قدموں سے باہر سڑک تک آ گئے۔ مگر جیسے خوف سے شرابور تھے۔ بس یہی لگتا تھا، چاروں طرف سے اسٹین گن، کلاشنکوف اور طرح طرح کے ہتھیاروں سے لیس لوگ آئیں گے۔ گھیر لیں گے۔ دنا دن گولیاں چلیں گی۔ کوئی ان کے منہ پر حقارت سے تھوکے گا۔ جیب سے دو پلی ٹوپی کھینچے گا اور اسے ہوا میں لہرا دے گا...... لاکھوں کی وحشیانہ ریلی نکلے گی...... رتھ یاتراؤں کا خونی سیلاب سڑکوں پر بہے گا۔ خونخوار چہروں والے، ہاتھوں میں مشعل لیے انہیں گھیر لیں گے...... بیہودہ باتیں بکیں گے۔ ''دیکھیں کون بچاتا ہے تمہیں۔ تمہارے اللہ میاں آسمان سے آتے ہیں یا نہیں۔''

نظر اٹھاتے ہیں تو دور دور تک کوئی بھی انکے قبیل کا نظر نہیں آتا۔ مندروں کی گھنٹیاں ٹن ٹنا رہی ہیں۔ ہوا میں شنکھ پھونکے جارہے ہیں۔ لاوڈ اسپیکر سے بھجن کی آواز ۲۴ گھنٹے کانوں میں گونج رہی ہے۔ وہ ذرا آگے بڑھتے ہیں۔ مولانا محمد علی روڈ، مولانا ابوالکلام آزاد روڈ، سرسید روڈ، محمد علی گلی، قریش محلہ......اب ان سارے گلی محلوں کے نام بدل چکے ہیں۔ ان کی نشانیاں، ان کے قصے ایک ایک کرکے مٹائے جارہے ہیں۔ بدن میں پھر لرزہ سا طاری ہوا...... ہونٹوں سے کپکپی چھوٹی......میرا وطن گم ہوگیا ہے......اب جیسے خود پر اختیار نہ تھا۔

آگے بڑھے......

سڑک بارود اڑا رہی تھی۔

رکشہ والے کو روکا......"میرے بھائی، میرے وطن کو دیکھا ہے۔ میرا وطن......؟"

پیدل چلنے والے ایک مسافر کا ہاتھ تھام لیا۔ "سنو بھائی! ایک منٹ کے لئے رک جاؤ......میرا گھر میرا وطن......کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔ سب گم ہوگیا۔ راستہ بتا سکتے ہو؟"

آنکھوں کے آگے جیسے نیلے پیلے اندھیرے جمع ہو رہے تھے۔ یہاں کہاں ڈھونڈیں گے وہ باپ داداؤں کے قصے__ ولی، صوفی، پیغمبروں کی کہانیاں__ ان کی شناخت، ان کی نشانیاں__ یہاں، کم از کم اب یہاں کی مٹی میں تو محفوظ نہیں۔ نہ ہی یہاں کے میوزیم میں......نہ تواریخ کی کتابوں میں......سب گم کردیئے جائیں گے تو وہ......کہاں ڈھونڈیں گے......اپنے آپ کو؟ اپنے آج کو؟ اپنے کل کو ......اپنے باپ داداؤں کو......اپنی تہذیب کو......؟

وہ اپنے دو چار رشتہ داروں، عزیز، شناساؤں سے ملے۔ سب سے وہ یہی پوچھتے تھے......

"صاحبو، میرا ملک، میرا وطن کہیں گم ہوگیا ہے۔ آپ کو......آپ کو بھی کیا ایسا ہی لگتا ہے؟"

ہر جگہ انہیں یہی ٹکا سا جواب ملتا......"آپ ڈر گئے ہیں۔ آپ خوف زدہ ہیں۔ جائیے۔ ہمیں تنگ مت کیجئے۔"

لیکن وہ کہاں جائیں۔ گھر آتے ہیں تو بیوی بچے سہمے سہمے سے ان کی طرف ایسے دیکھتے ہیں

جیسے ابھی رو پڑیں گے۔ ابا کو کیا ہو گیا ہے...... اور یہاں ان کی دماغی کیفیت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ لوگوں کو روک روک کر اپنے گم شدہ وطن کے بارے میں پوچھیں۔

اس دن اتفاقیہ طور پر ان کے ایک کلیگ مل گئے۔ وہ ان کے سوال پر چونکے۔ پھر زور سے ہنسے۔

''آپ لوگوں نے کبھی اس ملک کو اپنا وطن سمجھا ہی نہیں؟''

ان کے دماغ میں دھماکہ ہوا...... انہوں نے غور سے دیکھا۔ یہ آدمی...... اس آدمی کو وہ برسوں سے جانتے ہیں۔ برسوں انہوں نے ساتھ ساتھ مل کر کام کیے ہیں۔ اور تو اور...... سیکولر منچ سے بھی اس آدمی کی کتنی بار للکارتی، آواز کو سنا ہے انہوں نے۔ یہ آدمی۔ انہوں نے گھور کر دیکھا__ وہ آدمی مسکرایا۔ سب بکواس ہے۔ سچ یہ ہے__ یہاں__ اس نے اشارہ کیا۔ وہ تھم گئے۔ آدمی جہاں اشارہ کر رہا تھا، وہاں اس کی پیشانی تھی اور پیشانی پر ترشول بنا تھا۔

''تم بدل گئے؟''

سب کو بدل جانا ہے ایک دن۔''

''لیکن تم تو......؟''

''غلطی کی جاسکتی ہے تو سدھاری بھی جاسکتی ہے۔'' وہ ہنسا۔

''میرا وطن''...... وہ لرز گئے۔

''پاگل پن چھوڑو۔ تمہارا وطن کہیں کوئی تھا ہی نہیں شروع سے لٹیرے تھے۔ لٹیرے۔

اس نے زور دیا۔ ہمیں بھی پہلے تواریخ کا صحیح گیان نہیں تھا۔ مگر اب سچ یہی ہے تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔''

اس کی آواز بہت مناسب تھی۔ سنبھل سنبھل کر۔ ''تمہیں خود ہی یہاں سے جانا چاہیے۔ یا یہاں کے طور طریقے، چال چلن اختیار کر لینا چاہیے۔ اس میں غلط ہی کیا ہے۔''

ابراہیم بھائی نے آنکھیں سیدھی کیں تو لگا، سڑکوں پر اس طرح کے آدمیوں کا ایک ریلا امڈ آیا ہے۔ سب یہی چیخ رہے ہیں...... ''اس میں غلط کیا ہے۔'' وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر کہہ نہیں پاتے...... وہ دیکھتے ہیں...... وہ اوپر سے لے کر نیچے تک بدل گئے ہیں۔ دھوتی کرتا، ماتھے پر چندن، گھر کے باہر بدلا ہوا نیم پلیٹ، اپنے آپ کو چھپانے والی ساری تدبیروں کے باوجود وہ ہار گئے تھے۔ ابراہیم بھائی نے سوچا ممکن ہے، نفسیاتی معالج کے پاس ان Psychiatrist __ کے زخموں کے علاج ہو۔

(3)

Psychiatrist نے ان آنکھوں میں جھانکا۔ ''گھبرائیے نہیں سچ سچ بتائیے۔ اپ کو ایسا کب سے لگ رہا ہے؟''

''ادھر چند ماہ سے''

''پہلے نہیں لگتا تھا۔''

''اتنا بھیانک نہیں۔ لیکن یہ ضرور لگتا تھا کہ ایسا کچھ ہو سکتا ہے۔''

''اب؟''

''اب صرف اسٹین گن اور اسلحہ دھاری پولیس کے بھیس میں ڈاکو نظر آتے ہیں...... ڈر لگتا ہے...... وہ آئیں گے۔ ہماری شناخت مٹائیں گے۔ گھر میں آگ لگا دیں گے۔ ہماری لڑکیوں کی عزت لوٹیں گے۔ لڑکوں کو بندوق سے شوٹ کریں گے اور ہماری الہامی کتابوں کو......'' وہ ہانپ رہے تھے۔ ''آنکھوں کے آگے گول گول دائرے بنتے ہیں۔ یہ دائرے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے رنگس...... بلیک اسپاٹ...... پھر آنکھوں میں نیلی پیلی روشنیاں۔ کہیں اندھیرا سا لپکتا ہے۔ اور لگتا ہے......'' وہ تیز تیز سانس لیتے ہیں...... میں بے گھر ہوں، بے وطن ہوں...... سب کچھ الٹ پلٹ گیا یا غائب ہو گیا...... میں سڑک پر آتا ہوں...... لٹا لٹا...... لوگوں سے پوچھتا ہوں...... میرے وطن کو دیکھا ہے۔ صاحبو! میرا وطن گم ہو گیا

ہے۔''

وہ دیکھتا ہےPsychiatrist کے چہرے پر بل پڑ گئے ہیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے۔ کافی دیر تک وہ ان کے چہرے کو پڑھتا رہا۔ پھر دنیا بھر کی ادھر اُدھر کی باتیں پوچھتا رہا۔ باپ کو کیا بیماری تھی۔ دادا کو کیا تھی۔ بچپن میں ان کے ساتھ کیا کیا ہوا۔ وہ کیا کیا شوق سے کھاتے ہیں۔ کون سا رنگ اچھا لگتا ہے۔ چور ڈاکو، ہتھیار کیسے لگتے ہیں۔ عجب اٹ پٹے سوال، سرخ مرچ اچھا لگتا ہے کہ ہری مرچ ــــ گلاب اور کانٹے میں کیا پسند ہے......

''صاحب۔'' انہوں نے غصے میں اس کی طرف دیکھا۔ ''سوال اس کا ہے کہ میرا وطن......''

Psychiatrist اٹھ کر کھڑا ہوا It is a matter of Shame وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا...... ''ٹھہریئے...... کیا آپ نے کسی مسلم آتنگ وادی کو کبھی اپنے یہاں پناہ تو نہیں دی؟''

''جی؟''

''سوچیے۔ خوب سوچیے۔ کبھی انجانے میں۔ ممکن ہے آپ کا رشتہ دار ہو۔'

''جی؟''

''سوچیے۔ کبھی کسی برے موقع پر۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا...... آپ نے اپنے گھر پر ہتھیار، بارود وغیرہ تو نہیں بنائے؟''

''جی؟''

''دنگوں اور فسادات میں آپ نے کسی ہندو کو......؟''

وہ گھبرا کر چیخے...... '' پاگل ہیں آپ۔ آپ علاج نہیں کر رہے ہیں...... آپ پریشان کر رہے ہیں مجھے......''

Psychiatrist ان سے بھی زیادہ غصے میں چیخا۔ ''گیٹ آوٹ۔ نکل جایئے یہاں سے۔ آپ کو کوئی بیماری نہیں ہے۔ آپ کسی موذی مرض میں مبتلا ہے۔ آپ......'' وہ کہتے کہتے ٹھہرا...... '' آپ ایک خطرناک اپرادھی ہیں۔ مجرم۔ آپ...... آپ مسلمان ہیں ــــ مسلمان

ہونا کیا ہوتا ہے۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ ٹھہرا۔ پھر آنکھ کا اشارہ کیا۔ ''آپ چلے جایئے یہاں سے؟''

وہ نڈھال قدموں سے باہر آئے۔ قدم شل۔ کہاں جائیں۔ کیا کریں۔ ذہن کو سمجھانے کی کون سی تدبیریں کریں۔

وہ خود چاہتے تھے کہ اب یہ مکان چھوڑ دیں۔ کہیں دور چلے جائیں اور سچ تو یہ ہے کہ وہ تہیہ بھی کر چکے تھے۔ مگر عین وقت پر پاس پڑوس والوں کو خبر مل گئی۔ وہ ہاتھ جوڑے ہوئے چلے آئے انہوں نے یقین دلایا۔

''ڈریے نہیں۔'' کچھ نہیں ہوگا آپ کو۔ آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ یہیں رہیں گے۔''

ان کی آواز کمزور سی پڑ گئی۔ ''لیکن ہم تو یہاں اکیلے پڑ گئے ہیں۔''

''ہمیں آپ اپنا نہیں سمجھتے۔ آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

ابراہیم بھائی کو تب پہلی بار لگا تھا، وہ کسی غیر ملک میں ہیں شاید، جہاں انہیں اپنی پناہ گاہ کو، اپنے گھر کو اپنا گھر کہتے ہوئے بھی پڑوسیوں کی صلاح لینی پڑ رہی ہے...... وہ اپنی ہمت، اپنی مضبوطی سب کچھ ان کے سپرد کر چکے ہیں ــــ د

ایک دم سے کمزور، اکیلے اور دبو آدمی۔ بس ان کے بھروسے۔ Psychiatrist کے یہاں سے لوٹے تو طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہوگئی۔ گھر آئے تو کمرے میں بوجھل بوجھل، افسردہ تنہائی کے نوحے گھلے تھے۔ نصیبن، شبن، شبن کی بیوی، اقبال میاں، سب انہیں دیکھ کر کسی حادثہ کی طرح چونک پڑے۔

''آپ یوں کہاں چلے گئے تھے؟''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اقبال دھیرے سے آگے بڑھے۔ کان میں پھسپھسایا۔ ''شبن پر بھی دورہ پڑا تھا۔ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگے ــــ اچانک زور زور سے چیخنے لگے ــــ

''کیا......؟''

''ہاں وہی الٹی پلٹی باتیں۔ میرا گھر کہاں ہے میرا وطن کہاں ہے۔ میرا مکان کہاں ہے۔ میرا ملک گم ہوگیا ہے ابا، وہ دھیرے سے وحشت کے انداز میں پھسپھسایا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ اب یہ دورے مجھے بھی پڑنے لگے ہیں۔''

انہوں نے سر جھکالیا۔

ابراہیم بھائی پھر ٹھہرے نہیں۔ انہیں لگا، وہ غش کھا جائیں گے۔ لڑکھڑاتے ہوئے کمرے میں آگئے، پتہ نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ اور آنکھیں لگتے ہی وہ ایک بار پھر...... خوابوں کے اس خوفناک ہجوم میں گھرے ہوئے تھے۔

کیا دیکھتے ہیں۔ کہیں جائے اماں نہیں ہے۔ مسلمان یا تو مارے گئے یا بھاگ گئے، یا نام اور بھیس بدل زندگی۔ نہیں، دوزخ بھری زندگی کی کڑواہٹ جھیل رہے ہیں۔ انہیں چاروں طرف چن چن کر مارا جارہا ہے۔ اخبار، الکٹرانک میڈیا، عام بحث و مباحثہ، مشاعرے، ادبی گوشٹھیاں...... سب تصویریں بدل گئیں۔ بس وہ بھاگتے پھر رہے ہیں۔ بھگوڑوں کی طرح___ ایک جگہ مشاعرہ ہورہا ہے۔ وہ پہنچتے ہیں، تالیاں بج رہی ہیں۔ چہرے پر چندن، پیروں میں دھوتی، ان کا پورا حلیہ بدلا ہوا ہے۔ ایک ۳۲ سال کا نوجوان کچھ پڑھ رہا ہے۔ لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔ ہنس رہے ہیں۔ یہ لڑکا۔ انہیں یاد آیا، ایک بار فرقہ واریت کے خلاف ہونے والی کانفرنس میں دریاں بچھاتے ہوئے انہوں نے اس لڑکے کو دیکھا تھا۔ لڑکا کچھ پڑھ رہا ہے...... وہ سنتے ہیں۔

''ایک دن پرانی تہذیب، پرانی سبھیتا کی طرح
دفن کردیئے جاؤ گے تم
اتنے گہرے میں، اتنی گہرائی میں
کہ کبھی کسی کھدائی سے برآمد نہیں ہوگے تم۔''

انہیں لگا ان کی سانس، ان کی گرفت سے پھسل رہی ہے۔ دھونکنی کی طرح چل رہی ہے۔ نہیں، وہ تیز چیخ مارتے ہیں۔ وحشی ہو رہی آنکھیں ان کی طرف اٹھتی ہیں۔ وہ سرپٹ بھاگتے ہیں۔

آواز چیختی ہے۔ ''پکڑلو۔ مسلمان ہے۔ بھاگنے نہ پائے۔ فائر۔ شوٹ۔''

....

کئی دنوں کی مسلسل تھکن، مسلسل بھاگ دوڑ۔ چور ڈاکوؤں کی طرح چھپنے چھپانے کے نتیجے میں ان کی داڑھی بڑھ چکی ہے۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک جگہ ٹھہرتے ہیں ایک۔ پیڑ ہے۔ پیڑ کے نیچے حجام بیٹھا ہے وہ حجام کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ استرا 'بجاتے' ہوئے حجام ان کے حلیے کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر، چندن کے ٹیکے کے پاس ابھرے ہوئے سیاہ گٹھے کو......

''تم......''

انہیں لگا، یہ دو کوڑی کا حجام بھی جانتا ہے کہ جو مسلمان بچ گئے ہیں وہ حلیہ بدلے گھوم رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں حجام کے استرے کی دھار نوکیلی ہو چکی ہے اور چمک رہی ہے۔ رہ رہ کر تیز چیخ فضا میں گونج جاتی ہے۔ زمین پر لاشیں بچھی ہیں۔ چاروں طرف آرمی کے لوگ کھڑے ہیں۔ وہ ایسے خوش ہیں جیسے عام طور پر فتح یابی کے بعد ہوتے ہیں۔ کمانڈر جیسا آدمی گنتی کر رہا ہے...... ''نور محمد، غلام بخش، سہیل انصاری...... سب مر گئے۔ لاشوں پر پیر دھرتا وہ قہقہہ لگاتا ہے...... سب مر گئے __ ۱۲۰۰، سال بعد اب ہمارا رول ہے یہاں......''

جیسے کبھی پولیس نکسلیوں کا صفایا کرتی تھی۔ جیسے پولیس چمبل جیسی جگہوں میں چھپے ڈاکوؤں پر حملے بولتی تھی...... ویسے ہی اب...... کونے کدرے میں چھپے ہیں ابراہیم بھائی۔ ڈرے ڈرے، خوف زدہ __ کمانڈر فتح سے چیختا ہے...... سب مر گئے...... ہا ہا...... ہہ......''

ابراہیم بھائی کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ یہ سب...... یہ خواب...... وہ ایسے خواب کیوں دیکھتے ہیں۔ یہ خواب ان کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے۔ وہ جتنا ان مناظر سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے، یہ مناظر اسی شدت سے انہیں دبوچ لیتے۔ کہاں جائیں۔ کہاں امان ڈھونڈیں۔

زیادہ پریشان ہوئے تو پڑوسی نرمل ورما کے یہاں چلے گئے۔ کہانیاں لکھتے ہیں۔

مکان نہ چھوڑنے کی فرمائش کرنے والوں میں نرمل ورما بھی تھے۔ کہا تھا۔ ''آپ بھی چلے گئے تو ہمارے عقیدے اور بھی کمزور ہو جائیں گے۔ لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ اندر جمی بھڑاس کو نکالنا ان کے لئے ضروری تھا۔

نمستے آداب کے بعد وہ سامنے بیٹھ گئے...... ذرا دیر میں مطلب کی بات پر آ گئے۔ وہی بھیانک خواب کی تفصیلات۔ چھوٹے چھوٹے رنگ اور اندر سے حرکت کرتی آواز...... ''میرا ملک گم ہو گیا ہے۔''

''گم ہو گیا ہے؟''

نرمل ورما نے چونک کر، سگار کا کش کھینچا۔ پھر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ دھیرے سے بدبدائے۔ ''یہ آثار اچھے نہیں ہیں...... ''اچھے نہیں ہیں'' ...... وہ پھر سوچ میں پڑ گئے...... پھر کافی دیر بعد ان کا سکوت ٹوٹا۔

''سچ ہے۔ آپ مانیں گے آپ لوگ کبھی Loyal نہیں رہے۔ اس کنٹری کے لئے۔ لائیل؟ سمجھ رہے ہیں نا؟''

''ایں،......'' وہ ایک دم چونک گئے۔

''تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اسلام کی پوری تاریخ۔ آپ بھگوڑے تھے۔ یہاں آ گئے۔ لوٹا تو لوٹا۔ یہاں جم گئے بس گئے۔ کبھی ہندوؤں کو جزیہ کے نام پر نام نہاد تحفظ دیا۔ کبھی تلوار کے زور پر مسلمان بنایا۔'' وہ مسکرائے...... ہو سکتا ہے، آپ بھی پہلے ہمارے جیسے ہوں۔ آپ کے پوروج کو بھی زبردستی ایمان لانا پڑا ہو۔'' وہ رکے۔ ''سمجھ رہے ہیں نا، آپ لائل کبھی نہیں رہے۔ تواریخ میں گھٹنائیں بھری پڑی ہیں۔ آپ نے مندروں کو توڑا۔ مندر کی جگہ مسجد بنائی اور۔ نادر شاہ، چنگیز، ہلاکو، بابر، غوری، اورنگ زیب...... سمجھ رہے ہیں نا...... آپ......'' وہ پھر مسکرائے ''یہاں رہنا ہے تو اسلام کا بھارتیہ کرن، کرنا ہوگا اور اس سے بھی زیادہ مسلمانوں کو اپنی لائیلٹی ثابت کرنی

پڑے گی۔اپنی لائیلٹی۔"

ابراہیم بھائی نے غور سے نرمل ورما کا چہرہ دیکھا......وہاں ایک بدلا بدلا سا آدمی تھا...... آنکھوں میں ویسی چمک تھی۔جیسی زہریلے سانپوں میں ہوتی ہے۔انہیں لگا،اس کی چھوٹی چھوٹی بلی جیسی آنکھوں میں کوئی خطرناک منصوبہ پل رہا ہے......اُن کے جی میں آیا کہیں مجھ سے لائیلٹی چاہتے ہو۔مجھ سے۔ارے خاندان در خاندان......یہیں جمے ہیں......یہیں رہے،ہم......مدتوں سے برسوں سے......اسی مکان میں...... پلے بڑے......اور اب اس جگہ رہنے یا مستقبل میں رہنے کے لئے وفاداری کے ثبوت اور دستاویز چاہتے ہو تم......مگر کس سے کہتے......آواز لڑکھڑائی......آنکھوں میں اندھیرا اترا......ہونٹ سکڑ گئے......سب کچھ بھول گئے......وہی کمزور دبی آواز منہ سے پھسل پڑی......کہاں جاؤں......میرا ملک گم ہو گیا ہے۔"

نرمل ہنسے"آپ غلط سمجھے۔آپ کا یہ ملک تھا ہی نہیں جو کھوتا یا گم ہوتا۔"

کالا چشمہ اتار کر انہوں نے میز پر رکھ دیا۔کوئی فائل اٹھالی......کچھ پڑھنے لگے......پھر ابراہیم بھائی وہاں بیٹھ نہیں سکے۔اٹھ کھڑے ہوئے۔

گھر آئے تو دیکھا تکیہ پر سر رکھے مہرن سسک رہی ہے۔وہ کانپ گئے۔مہرن میری بچی...... مہرن کو گھیرے ہوئے شبن،نصیبن اور قبال میاں کھڑے تھے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟"ان کے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

نصیبن لاغر اور کمزور جان کو اٹھائے،بمشکل اٹھی۔ان کا ہاتھ پکڑا۔باہر لائی۔اس کی آنکھیں برس پڑیں تھیں،یہ سب کیا ہو رہا ہے...... پہلے آپ،پھر شبن میاں،پھر اقبال اور اب مہرن۔مہرن کو بھی دورہ پڑا ہے۔بار بار غش آتا ہے۔روتی ہے اور پوچھتی ہے۔میرا ملک کہاں ہے۔میرا ملک گم ہو گیا ہے۔پھر بے ہوش ہو جاتی ہے۔"

ایک بار پھر وہ سن سے تھے۔غور سے پیلی پڑی مہرن کا چہرہ دیکھا۔یا اللہ کہنا چاہا۔آواز نہیں نکل سکی......ادھ مرا سا محسوس کیا خود کو......کلیجہ کانپا......مگر آنکھوں سے آنسو کے سوتے بھی سوکھ

چکے تھے۔ پھر ٹھہرے نہیں۔ لرزتے قدموں سے کمرے میں لوٹ آئے۔ کچھ ہونے والا ہے......
کا احساس رہ رہ کر دل میں ڈر اور خوف کی بارش کر رہا تھا۔

شام ہوگئی۔ شام کو ملکانی صاحب، نرمل ورما، اور پاس پڑوس کے کئی لوگ ان سے ملنے آئے۔
جیسے کوئی انہونی ہو چکی ہو...... اندر تک ٹھنڈی لہر اترتی چلی گئی۔

''آپ...... آپ لوگ......؟''

انہیں محسوس ہوا...... آواز طاقت کھو چکی ہے۔

نرمل ورما آگے بڑھے۔ ''ابراہیم بھائی، ہم آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتے۔''

ان کی آواز ڈوب گئی...... ''کیا کہہ رہے ہیں آپ لوگ...... میں کچھ سمجھا نہیں۔''

ملکانی آگے بڑھے۔ ''فضا ٹھیک نہیں ہے ابراہیم بھائی۔ اگر کچھ ہو گیا تو ہم الزام اپنے سر نہیں لے سکتے۔ ہماری جانیں بھی جوکھم میں پھنسی ہیں۔''

نرمل بولے۔ ''بہتر ہے آپ آج رات ہی...... یا بہت بہت کل صبح کہیں بھی چلے جائیں۔''
ان کے آخری الفاظ پھس پھسے تھے۔

''کسی محفوظ جگہ......''

''ڈم...... ڈم...... ڈم......''

جیسے ڈرم پیٹا جاتا ہے۔ جیسے قبائلیوں کا رقص ہوتا ہے۔ فلموں میں، قصوں میں، کہانیوں میں ___ جیسے کسی انسان کی بلی چڑھاتے ہیں...... ڈم...... ڈم...... ڈم۔

ڈم...... ڈم...... ڈم......

آواز تیز ہوتی جاتی ہے......

....

احمد آباد۔ ۳۰۲ میل ___

سنگِ میل پر 302 کے حروف جگمگا رہے ہیں ___ بیوی بچوں کے ساتھ اچانک بھاگتے

بھاگتے وہ ٹھہر گئے ہیں۔302 دفعہ نمبر 302 پھانسی۔سزائے موت۔آنکھوں میں پھر چکر آرہے ہیں...... گول گول دائرے...... سب کچھ سرخ سرخ...... وہ جیسے انصاف کی، کسی بڑی عمارت میں ہیں۔انصاف سنایا جاچکا ہے۔ملزم کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ملزم مسلمان ہے۔ ملزم نے اس ہندو بھارت میں جنم لیا ہے۔تعزیرات ہند۔دفعہ 302 کے تحت ملزم کو......

اب اُنہیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔

انصاف کی بڑی عمارت، بھی اندھیرے میں کھوگئی ہے۔

☆☆

....

زاہدہ حنا

پانیوں میں سراب

لوحِ مزار پر ''عصمت پناہ'' پڑھ کر میں بے ساختہ ہنسی اور میں نے اظفر سے کہا۔ ''میری قبر پر بھی ''عصمت پناہ'' کندہ کروا دینا۔''

اظفر بے معنی سے انداز میں مسکرایا اور ہم قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے باہر آ گئے۔

گاڑی روانہ ہوئی تو احسن نے اچانک ''عصمت پناہ'' کی ترکیب کا ذکر چھیڑ دیا اور بات نظریۂ عصمت اور تاریخ کے مختلف ادوار میں عصمت کے معیار تک پہنچی۔ الف لیلہ کا شہریار، بے پردہ شہزادیاں اور ان کی خلوتوں میں بار پانے والے حبشی غلام۔ بغداد کے گلی کوچے، نیپلز اور فلورنس کی حویلیاں اور باغات، ''ڈی کیمرون'' کی پامپینا، نی نیتی اور میڈیلینی، __ دل ہتھیلی پر رکھ کر پھرنے والے عشاق اور شوہروں کی پیٹھ پھیرتے ہی خوابگاہوں کے در کھول دینے والی نازنینیں۔

میں نے موضوع بدلنا چاہا لیکن بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ اور پھر اس نکتہ پر بحث ہونے لگی۔ کہ عصمت و عفت کا تصور مطلق ہے یا اضافی؟ درمیان میں لطیفے اور چٹکلے بھی بیان ہو رہے تھے۔ اور پھر Chastity Belt کا ذکر نکل آیا۔

احسن نے فوراً ہی صلیبی جنگ پر جانے والے ایک مسیحی سورما کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس نے جنگ پر روانگی سے پہلے ہی اپنی بیوی کو Chastity Belt پہنوائی اور چابی اپنے عزیز ترین دوست کے حوالے کر گیا۔ اصولی طور پر چابی اسے اپنے ساتھ لے جانی چاہیے تھے۔ لیکن وہ ایک مصنف مزاج آدمی تھا اور اسی لئے چابی اس نے دوست کے حوالے کر دی تھی کہ اگر وہ جنگ میں مارا جائے تو چابی اس کی بیوی کے سپرد کر دی جائے تا کہ وہ جس سے چاہے شادی کر سکے۔ ابھی وہ سورما کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس کا دوست گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور کہنے لگا تم

مجھے غلطی سے کوئی دوسری چابی دے آئے ہو یا Chastity Belt کی چابی تو نہیں ہے۔''

ایک قصہ کسی شہزادی کا تھا جس نے اپنے محبوب شوہر کی جنگ پر روانگی سے پہلے Chastity Belt پہن کر چابی اپنے شوہر کے سامنے ہی ایک تالاب میں پھینک دی تھی۔ کچھ دنوں بعد جب وہ کسی دوسرے مرد کے عشق میں گرفتار ہوئی تو اس نے اپنی ساری دولت ان غوطہ خوروں کو دے ڈالی جو تلاش بسیار کے باوجود چابی کی تلاش میں ناکام رہے تھے یہ اور اسی قسم کے دوسرے قصے اس وقت تک بیان ہوتے رہے جب تک ہم کنجھ جھیل نہ پہنچ گئے۔

اور اب ہم پانیوں پر تھے۔ سونا لٹاتی دھوپ جھیل کے پگھلے کانچ جیسے سبز پانی پر بچھی تھی۔ تہہ میں آبی پودے لہروں کے ساتھ ہلکورے لے رہے تھے اور سبز کائی ان سے چمٹی ہوئی تھی۔ جل کوؤں کی ایک ڈار پھڑ پھڑاتی ہوئی اتری اور پانیوں پر سفر کرنے لگی۔۔۔ کشتی آگے بڑھ رہی تھی۔ زمینی منظر دور ہوتے جا رہے تھے۔ پیڑ، اُن پیڑوں کے سائے میں بیٹھے انسان، بڑے بڑے ٹرک جو جھیل کے کنارے نہایت مستعدی سے دھوئے جا رہے تھے، اب دوری کے سبب ہیولے لگ رہے تھے۔

میرے عقب میں آواز ہوئی تو میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ کنارے کے قریب اظفر نے ایک مچھلی پکڑی تھی اور اب وہی کشتی کے فرش پر تڑپ رہی تھی یہ اسی کے تڑپنے کی آواز تھی۔۔۔

''اظفر پلیز'' اسے پانی میں پھینک دو۔' میں نے بے تابی سے کہا۔

''بمشکل تمام ایک تو ہاتھ آئی ہے۔ اور تم کہہ رہی ہو کہ سے واپس پھینک دوں، جواب نہیں ہے تمہارا بھی۔'' اظفر کی آنکھوں میں مچھلی کو تڑپتے دیکھ کر لذت کی ایک لکیر کھنچ گئی میں نے اپنے سامنے بیٹھے یوسف کی طرف دیکھا اور اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

صفیہ احسن نے تھرماس کھول کر مگوں میں کافی انڈیلنی شروع کی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ سموسے ٹھنڈے ہو گئے تھے لیکن گرما گرم کافی کے ساتھ وہ بھی لطف دے رہے تھے۔

کافی گھونٹ گھونٹ کر کے پیے جانے کے لئے ہے، سموسے لقمہ لقمہ کر کے کھائے جانے کے لئے ہیں اور میں اس لیے ہوں کہ دن میں ہجر کا عذاب مجھے پانی کرے اور میں اس لیے ہوں کہ رات آئے تو میرے مجازی خدا کے بدن کی سرشاری کا گدھ میرے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھائے ـــ مجھ سے اچھی تو یہ کافی ٹھہری جو ایک لمحے میں پی لی جاتی ہے اور معدوم ہو جاتی ہے، مجھ سے بہتر تو سموسے کا یہ لقمہ بہتر ہے جسے صرف ایک مرتبہ چبایا جاتا ہے اور پھر وہ نجات پالیتا ہے۔ ہر رات مجھے چباتی ہے اور میں ختم نہیں ہوتی۔ ہر دن مجھے پیتا ہے لیکن میں موجود رہتی ہوں۔

کافی پیتے ہوئے احسن نے گنگنانا شروع کر دیا ''اکیلے مت جائیو رادھے جمنا کے تیر ـــ میں نے لرز کر اسے دیکھا۔ تم دلوں کے بھید کس طرح جانتے ہوں۔ سنا ہے دلوں کا بھید تو بس خدا جانتا ہے۔ اور کون جانے کہ جاننے یا نہ جاننے کے مرتبے پر فائز موجود ہے یا معدوم۔

احسن کی آواز پانیوں پر بگولے کی طرح چکراتی ہوئی اٹھی۔ ''اکیلے مت جائیو رادھے'' اکیلے مت جائیو رادھے'' کنجھ جھیل کا پانی اترنے لگا زمین کی گہرائیوں میں سمانے لگا اور آنکھ کی پتلی پر جمنا کا گہرا سبز پانی پھیل گیا، گہرائیوں میں اترتا ہوا، وسعتوں میں پھیلا ہوا۔

میں اکیلی تو نہ گئی تھی، میں تنہا تو نہ گئی تھی۔ مجھے تو خود اظفر تنہا چھوڑ کر گیا تھا ـــ بمبئی میں کئی لوگوں سے ملاقاتیں ضروری تھیں۔ ورنہ جس بزنس ٹور پر وہ گیا تھا، وہ ناکام ہو جاتا وہ دو دن کے لئے گیا تھا، اس کا فون آیا کہ اسے ابھی دو دن اور لگیں گے۔

میں اور یوسف دتی میں گھومتے رہے، میں اس سے اظفر کی بے اعتنائیوں کا ذکر کرتی رہی اور وہ سنتا رہا ـــ میں نے اس سے کہا کہ

صرف روپیہ ہی تو کوئی چیز نہیں ہوتا، سب سے بڑی چیز محبت ہے، جس کے لئے اظفر کے پاس وقت نہیں ـــ بیوی، بچے اور رشتہ دار یہ سب ثانوی چیزیں ہیں ـــ اصل مسئلہ روپیہ ہے اور مزید روپیہ۔

میرا ذہنی سفر خوابوں سے شروع ہو کر کتابوں پر ختم ہوتا تھا۔ روپے سے کتابیں تو خریدی جا سکتی تھیں۔ لیکن خواب کسی بازار میں نہیں بکتے تھے اور سکہ رائج الوقت سے خریدے نہیں جا سکتے تھے۔ پھر میں اتنا بہت سارو پیہ لے کر کیا کرتی؟ ہمارا مستقبل محفوظ سے محفوظ تر ہو رہا تھا لیکن میں کہاں تھی۔ میری گذرتی ہوئی زندگی کے لمحاتِ رائیگاں کا حساب کہاں تھا؟

یوسف اور اصغر بچپن کے دوست تھے، یار غار__ مزاجوں کے تفاوت کے باوجود جب بھی انہیں موقع ملتا وہ مل بیٹھتے__ اظفر نے باپ کی طرح تجارت اختیار کر لی اور لاکھوں کمائے یوسف شروع سے ہی خواب دیکھتا تھا محلوں کے، قلعوں کے، حویلیوں کے اور بھول بھلیوں کے، وہ آرکیٹیکٹ بن بیٹھا سیمنٹ، بجری، پتھر، چونے، لوہے اور المونیم کے ڈھیر کو خواب نما عمارتوں میں بدل دینے والا انسان۔

یوسف کی بنائی ہوئی خواب خواب عمارتیں امریکہ، کانٹی نینٹ اور مشرق بعید کے ملکوں میں پھیلی ہوئی تھیں، وہ انٹرنیشنل سلیبریٹی تھا۔

لندن میں جب میرا وقت یوسف کے ساتھ گزرا تو اس کی ذات کی ایک نئی جہت مجھ پر کھلی۔ ریت، پتھر اور چونے جیسے کھردری چیزوں سے مختلف عمارتوں کی تجسیم کرنے والا اندر سے پور پور شاعر تھا۔ وہ جب عالم سرشاری میں ہوتا تو فن تعمیر پر عجیب زاویوں سے گفتگو کرتا۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا کہ کسی عمارت کی تعمیر دراصل مادے کا قلبِ ماہیت ہے۔

وہ گوتھک طرزِ تعمیر کا اور گرجا گھروں کا عاشق تھا__ ان کی قربان گاہیں ان کی راہ داریاں، ان کے حجرۂ اعترافات__ یہ تمام مقامات اس کے خیال میں کنائے تھے__ وہ کہتا کہ کوئی عظیم عمارت اپنے عہد کا استعارہ ہوتی ہے اور جب تک اس استعارے کو اپنے اندر سمو نہ لیا جائے، عمارت کا حسن اور اس کی سریت دیکھنے والے پر کھل نہیں سکتی۔

ایک رات وہ میرے فلیٹ پر پی رہا تھا اور باتیں کر رہا تھا۔ چار انگل شراب اس کے معدے میں پہنچ جاتی تو اس کے اندر کا شاعر جاگ اٹھتا اور اس کے منہ سے پھول جھڑنے لگتے__ اس

رات وہ باتیں کر رہا تھا، بورومینی کی، برنینی کی، البرٹی اور مائیکل انجیلو کی __ وہ ان قدیم معماروں کو اپنا روحانی استاد سمجھتا تھا۔ اور ان کی بنائی ہوئی عماتوں کے ایک ایک طاقچے اور ستون پر اس کی جان جاتی تھی __ اسی گفتگو کے دوران جانے کس طرح قدیم عمارتوں اور کھنڈروں کو چاندنی رات میں دیکھنے کی بات نکل آئی تو وہ بکھر گیا۔

''کیسی باتیں کرتی ہو، یہ محض رومانویت زدہ عورتوں اور نالائق مردوں کے کرنے کی باتیں ہیں کہ روم کے فلاں کھنڈر کو چاندنی رات میں دیکھنا چاہئے اور پیرس کا فلاں کلیسا چاندنی میں کس قدر خوبصورت لگتا ہے __ میں تمہیں بتاؤں شالیمار باغ اور تاج محل کے سوا معدودے چند عمارتیں ہی ایسی ہیں جو چاندنی میں دیکھنے کے لئے بنائی گئی ہیں __ دنیا کی تمام عظیم عمارتیں دن کے اجالے میں دیکھنے کے لئے تعمیر ہوئی ہیں۔ چڑھتے ہوئے اور سہ پہر کے سورج کی ترچھی کرنیں ان عمارتوں کے شکوہ کو نمایاں کرتی ہیں، ایک ایک دیوار کے حسن کو اجاگر کرتی ہیں اور ایک ایک گنبد کی گولائی کا احاطہ کرتی ہیں۔ قلعے، محل حویلیاں دن میں دیکھنے کی اور برتنے کی چیزیں ہیں۔ رات بیشتر عمارتوں کا حسن چرا لیتی ہے۔ ان کے خدوخال کا تیکھا پن چھپا لیتی ہے اگر کوئی عمارت محض چانی رات میں ہی دل کش نظر آتی ہے تو سمجھ لو کہ اسے بڑی عمارتوں کی صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

وہ تعمیرات کی اقتصادیات اور سماجیات پر بحث کرتا __ فلاں عمارت پر کتنا صرف ہوا؟ یہ رقم کہاں سے آئی تھی؟ لگان کس علاقے کے لوگوں سے وصول کیا گیا تھا اور ان پر کتنی سختی روا رکھی گئی تھی؟ __ ان عمارات کو تعمیر کرنے والے آزاد مزدور تھے۔ یا مجبور و بے بس غلام؟ ان کے معمار اختراع پسند لوگ تھے یا لکیر کے فقیر؟ اس کے مزدور کام کرتے ہوئے گیت گایا کرتے تھے۔ یا فضا ان کی پشت پر پڑنے والے چابکوں کی آواز سے گونجتی تھی؟ تعمیرات کے حوالے سے سیاست کے بارے میں اس کے خیالات بہت الجھے ہوئے اور ناپسندیدہ تھے۔ اور یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر میری اس کی خوب خوب بحث ہوتی اس کا کہنا تھا کہ دنیا کی بیشتر عظیم تعمیرات مطلق العنان

فرمانرواؤں کے فیصلوں اور خواہشوں کی مرہونِ منت ہیں اور یہ کہ جمہوریت فن تعمیر کو راس نہیں آ سکتی۔

یوسف نے لندن کی ایک ایک تاریخی عمارت مجھے دکھائی۔ وہ جب کسی عمارت کے ستونوں، محرابوں، دروں، دروازوں اور طاقوں کے بارے میں بات کرتا، جب وہ روشنی اور سائے کا حساب بتاتا، جب موسموں کے اعتبار سے ہوا کے چلنے اور دھوپ میں اُترنے کا فرق بیان کرتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ سونی عمارتیں آباد ہوگئی ہیں۔ پھر سے سانس لے رہی ہیں، جیسے ابھی دھوپ فصیلوں سے ہوتی ہوئی قلعے کے قلب میں اُتری ہے اور ہنری ہشتم نے اپنی مسہری پر کروٹ بدل کر صبح کا پہلا جرعہ حلق سے نیچے اتارا ہے۔

یوسف کو دوستداری کا عجب ہنر آتا تھا۔ وہ اظفر کا دوست تھا لیکن میں جب اس سے ملتی، باتیں کرتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ محض میرا دوست ہے کھرا، سچا، میرے تمام دکھ سمجھنے والا __ اس سے ملے ہوئے کچھ دن گزر جاتے تو دل میں خلش ہوتی، اس کا خط نہ آتا تو میں پریشان ہوکر اسے خط لکھتی __ کیسے ہو؟ کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ اتنے دنوں سے خط کیوں نہیں لکھا؟ اور پھر اس کا جواب آتا، طول طویل، دنیا جہان کی باتوں سے بھرا ہوا، میں اور اظفر دونوں اس کا خط پڑھ کر خوش ہوجاتے۔

اظفر اور میں ہندوستان کے لئے روانہ ہونے والے تھے کہ اچانک ایک شام یوسف لندن سے آ پہنچا __ وہ کچھ دنوں ہمارے ساتھ رہنے آیا تھا آرام کرنے، اپنی تھکن اتارنے __ یوسف کو معلوم ہوا کہ ہم ہندوستان جا رہے ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ہم تینوں دلی پہنچے، اور اظفر حسب معمول مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر بمبئی چلا گیا __ وہ مایا موہ میں پھنسا تھا اور اس جال سے نکلنا اس کے بس کی بات نہ تھی __

یوسف اور میں، ہم دونوں دلی کے گلی کوچوں میں گھومتے رہے۔

قلعے، مسجدیں، مزار، دروازے، باؤلیاں، کون سی جگہ تھی جو ہم سے چھوٹی اور کون سا ویرانہ تھا

جو ہم نے آباد نہ کیا۔ ہم جمنا گئے، ہم گھاٹ کی سیڑھیاں اترے اور ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے ــــ دوپہر کا گرم سورج ہمارے سروں پر تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی، سناٹا تھا، اور شاید یہ ویسا ہی کوئی لمحہ تھا جب خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔

میں نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پانی جو حیات کی اصل تھا اور یوسف سے مڑ کر کچھ کہا، وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا اور ان آنکھوں میں کیا نہیں تھا ــــ؟

ہم اپنے تمام باطنی عذابوں اور ثوابوں، نادانیوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے عریاں تھے ــــ آدم وحوا کی طرح جب انھوں نے شجرِ ممنوع کا پھل کھایا تھا اور برہنہ تن ہو گئے تھے۔ ہم دو نہ تھے، ہم جدا نہ تھے، ہم بہت دنوں سے ایک دوسرے کو دوستی کے نام پر اور خلوص کے نام پر دھوکہ دیتے رہے تھے ــــ وہ ایک لمحہ ہر بات بدل گیا ــــ ہر شے منقلب ہوگئی اور نہ تو تُو رہا نہ تو میں میں رہا ــــ وہ عجیب گھڑی تھی، میں نے جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا ــــ

اچانک کشتی ڈگمگائی، آنکھ کی پتلی پر جو راس لیلا رچی تھی وہ معدوم ہوگئی۔ جمنا کا پانی چشمِ زدن میں غائب ہوگیا۔ ہم کنجھ جھیل کے آبِ رواں پر تھے۔ یوسف اپنا زرد سوئمنگ کاسٹیوم پہنے کشتی کے اگلے حصے میں کھڑا تھا۔ بدن کو تولتا ہوا، پھر چھپاکا ہوا اور اس کا سنہرا بدن سبز پانیوں میں اتر گیا۔ وہ ہماری کشتی کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ ہم پر پانی کی چھینٹے اُڑاتا ہوا۔ پانی میں ڈبکی لگا کر پھر اُبھرتا ہوا ــــ اس کے ننگے بدن کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اِسی کی پسلی سے جنم لیا ہو، جیسے ہم ایک تن ہوں زمین کا پہلا جوڑا۔ میں نے نظریں نیچی کر لیں، میں ان لمحوں سے ڈرتی تھی جب اظفر میرے دل کی تحریر میرے چہرے پر پڑھ لے۔

دور زمین و آسمان ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے، محض فریب نظر ــــ میری آنکھیں بھیگ گئیں ــــ ہم دونوں بھی افق کا وہ کنارہ تھے جسے دور سے دیکھو تو محسوس ہوتا ہے کہ زمین و آسمان شیر و شکر ہو رہے ہیں اور جب نظر کا فریب درمیان سے ہٹ جاتا تو ہم زمین و آسمان تھے جو کبھی نہیں مل سکتے ــــ میں زمین تھی، ٹھوس، پتھریلی، اپنی جگہ اٹل اور وہ آسمان تھا، محض خلاء محض

آنکھ کا دھوکہ__

میں عورت تھی، کمزور، بے بضاعت، میں اس کے لیے کسی بھی انتہا تک جاسکتی تھی لیکن یوسف مرد تھا، بہادر، جی دار اس لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔لوگ کیا کہیں گے۔بچوں کا کیا ہوگا__ اظفر پر کیا گزرے گی، وہ دنیا کے تمام برّ اعظم گھوم آیا، دنیا بھر کی دولت اس نے اکٹھی کرلی۔انٹرنیشنل سیلے بریٹی بن بیٹھا تھا__ وہ دوست کی لاعلمی میں اس کی بیوی کو Share تو کرسکتا ہے لیکن اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ اظفر کا سامنا کرسکے اور سے ایمانداری کے ساتھ اپنے اور میرے نفس کی حالت سے آگاہ کرے اور پھر فیصلہ اس پر چھوڑ دے مجھے معلوم تھا کہ اظفر کا فیصلہ کیا ہوگا اور یوسف بھی جانتا تھا__ لیکن یوسف کی اخلاقی اقدار بھی خوب تھیں۔محض منافقت محض ریا کاری۔

اور اب میں دو مردوں کے درمیان زندگی گزارتی ہوں__ اظفر جس کی اپنی زمین اس کی اپنی نہیں۔جس کے گھر میں سیندھ لگ چکی ہے اور یوسف جو اپنی زمین کو دوسرے کے تسلط سے آزاد کراتے ہوئے ڈرتا ہے جس کی زمین کا خراج کسی دوسرے کے خزانے میں جمع ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان میں ہوں۔تلپھے ہے، مرغِ قبلہ نما آشیانے میں۔

''بیگم اصغر کیا آپ جانتی ہیں کہ اس وقت آپ کہاں ہیں؟'' احسن نے اچانک ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟'' میں نے قدرے حیران ہوکر احسن کو دیکھا وہ اظفر کے لندن آفس کا مینجر تھا اور ان دنوں اپنی بیوی کے ساتھ کراچی آیا ہوا تھا۔

''آپ اس وقت نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہی رہیں۔'' اس نے مجھے مطلع کیا۔

''پہیلیاں بجھوا رہے ہو احسن؟'' اظفر بھی اب اس کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

''اظفر صاحب، ہم واقعی نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہے ہیں۔

یہ دراصل مون سون کا موسم ہے۔پانی چھلکا پڑ رہا ہے اس لیے دونوں کے مزار زیرِ آب ہیں

ورنہ عام دنوں میں ایک چھوٹے سے ٹاپو پران دونوں کے شکستہ مزار نظر آتے ہیں۔ آس پاس کے لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ چاندنی راتوں میں نوری انہیں جھیل کی سیر کرتی نظر آتی ہے__'' احسن نے کہا۔

'بھئی تم لوگ آخر کس چکر میں پڑ گئے ہوں__ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہماری بیگم صاحبہ مکلی کے مزارات سے لو لگا رہی تھیں__ بڑی مشکل سے انہیں وہاں سے گھسیٹ کر لائے ہیں، اب تم پھر مزاروں کا ذکر لے کر بیٹھ گئے__'' اظفر نے برا منہ بنا کر کہا: ''اُدھر یوسف ہے تو وہ اتنی سنجیدگی سے پانی میں ڈبکیاں لگا رہا یہ جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔'' پھر اس نے بہ آواز بلند یوسف کو مخاطب کیا: ''یار پلٹ آؤ۔ کسی شہزادی نے اپنی Chastity Belt کی چابی یہاں نہیں پھینکی ہے جو تم ڈبکیاں لگا رہے ہو۔''

یوسف نے اس کا جملہ سنا تو مسکرایا اور کشتی کی طرف پلٹا احسن بھی ہنسنے لگا: ''یوسف صاحب نے تو بہت سی چابیاں اکٹھی کی ہوں گی۔'' ''یہ میرا یار جو ہے بہت گھنا ہے، ایسی باتوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا'' اظفر نے کہا__ اب یوسف کشتی میں پہنچ چکا تھا اور اس کے بدن سے ٹپکتے ہوئے پانی کے قطرے کشتی کے فرش پر جمع ہو رہے تھے وہاں پڑی مچھلی اب ختم ہو چکی تھی۔ صوفیہ احسن نے نگاہیں اٹھا کر بے اعتنائی سے ہم سب کو دیکھا اور پھر اپنی اسکیچ بک پر جھک گئی۔ اس میں سب سے بڑی خرابی کم گوئی اور سب بڑی خوبی مصوری کی تھی، چند ہفتوں بعد سڈنی میں اس کی تصویروں کی نمائش ہونے والی تھی۔

میں نے جھک کر پانی کو دیکھا، پانی بہتی ہوئی سریت ہے۔ پھیلی ہوئی ہیئت ہے، حیات کی اصل کیا ہے۔ رگ وید میں کہا گیا ہے:۔

''اس وقت نہ عدم تھا نہ وجود۔

نہ عالم باد اور نہ آسمان، جو اس سے پرے ہے۔

کیا چیز سب کو محیط تھی اور وہ سب کچھ کہاں قائم تھا؟

کیا وہ پانی اور عمق بے پایاں تھا؟''

یہ پانی جس کے سینے پر ہم اس وقت رواں تھے، عمقِ بے پایاں نہ تھا۔ لیکن پانی تھا۔ پانی جس میں سب سے پہلے ''کام'' (خواہش) نمودار ہوئی اور یہ خواہش عقل یا روح کا ابتدائی تخم تھی ___ خواہش، عقل، روح، عشق ___ میں ان چاروں کے دام میں تھی ___ بادل کا ایک ٹکڑا ہماری کشتی کے اوپر سایہ کیے ہوئے تھا اور ساتھ ساتھ چل رہا تھا ___ شاید ہم واقعی نوری جام تماچی کے مزار پر سے گزر رہے ہوں ___ صدیوں پہلے کا وہ زمانہ کیسا گزر رہا ہوگا۔ جب کنجھ کے کنارے مچھیروں کی ایک بستی تھی اور سمہ خاندان کا سردار جام تماچی اس بستی کی ایک مچھیرن نوری کو اپنا دل ہار گیا تھا۔

یہ جو ساتھ جاگتے تھے، اب صدیوں سے ساتھ سو رہے تھے اور ان کے ساتھ نہ جانے کتنے مکمل اور نامکمل بوسے سو رہے تھے، کتنی آسودہ اور ناآسودہ ہم آغوشیاں سو رہی تھیں۔ مجھے شاہ کا ''سُر کاموڈ'' یاد آیا ___ یہ راگنی جس کا تعلق دیپک راگ سے بتایا جاتا ہے، شروع سے آخر تک نوری جام تماچی کے عشقِ بلاخیز کا قصہ سناتی ہے۔

شاہ کی آواز آئی:۔

دھن دولت جنتا میں بانٹے۔

مایا جال کو توڑا

کنجھ کی گندری کے کارن

راج پاٹ کو چھوڑا

راج پاٹ کو چھوڑنے والا اور کنجھ کی گندری تہہِ آب سوتے تھے۔ لیکن غرقِ دریا ہونے کی تمنا تو غالبؔ نے کی تھی، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا، نہ کہیں مزار ہوتا۔

مکلی کے مزار میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔

چودھویں صدی کی قبروں پر سایہ کیے چھتریاں، فیروزی اور گہرے نیلے رنگ کی شیشے کی طرح چمکتی اینٹیں کائی نے دیواروں کو سیاہ کر دیا تھا۔ یہ مرزا خان بابا بن مرزا خان عیسیٰ خان ترخان

(اوّل) کا مزار ہے۔ یہاں ملک راجپال اور اہنسا بائی سوتے ہیں۔ مرزا باقی بیگ اُزبک، مرزا طغرل بیگ ___ یہ سونے والے جانے کہاں کہاں سے آئے تھے؟ کس کس علاقے کی مٹی کا خمیر یہاں قطار اندر قطار سوتا تھا۔ ترک، راجپوت، مغل، اُزبک، ارغون ___ دوست دشمن، باپ بیٹے، محرم نامحرم سب خاک میں مل کر خاک ہو گئے تھے۔ مٹی نے تمام راز اپنے اندر چھپا لیے تھے جیسے ماں اپنے سینے میں بچوں کے عیب چھپا لیتی ہے۔ اور جب چلتے چلتے رک کر میں نے ایک قبر کا کتبہ پڑھا تو ٹھٹک گئی تھی، لوحِ مزار پر لکھا ہے۔

''بہ تاریخ بست ششم ذی الحجہ ۱۰۸۲ھ
عصمت پناہ جہاں بیگم فوت شد ___ ''

اس لمحے میں مجھے خیال آیا کہ میری لوحِ مزار پر ''عصمت پناہ'' کا لفظ کس قدر سجے گا؟ اور اسی لیے میں نے ہنس کر اظفر سے کہا تھا۔

''میری لوحِ مزار پر بھی ''عصمت پناہ'' کندہ کروا دینا ___ ''

ہم کنجھ کے وسط میں تھے جب اظفر نے کشتی والے سے واپسی کے لیے کہا۔ جس پانی میں ہم نے آگے کا سفر کیا تھا، اسی پانی میں اب واپس جا رہے تھے۔

اکثر میرا جی چاہتا ہے کہ وقت میں پیچھے چلی جاؤں لیکن واپسی کا سفر ممکن نہیں ___ میرا جی چاہتا ہے یوسف سے پوچھوں کہ تم یہ کب تک چھپاؤ گے کہ Chstity Belt کی چابی تمہارے پاس ہے؟ میں کسی ایک مرد کی عورت ہو کر رہنا چاہتی ہوں ___

کشتی کنارے کی طرف جا رہی ہے۔ لیکن میں کنارے کی طرف نہیں جا سکتی۔

مجھے پانی کے بیچوں بیچ کھڑے رہنا ہے اور اس دن کا انتظار کرنا ہے جب چابی یوسف سے بھی گم ہو جائے ___ اظغر تو اسے گم کر ہی چکا ہے۔

☆☆

ڈاکٹر سلیم اختر

آخری سبق

ماں نے صحن میں دو قدم چل کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے دہلیز پر رُکے پایا۔

''ارے آ جاؤ رک کیوں گئے۔''

حامد نے صحن میں بیٹھے لڑکے، اور لڑکیوں کو نظر بھر کر دیکھا جواب تک کتابوں پر سے گردنیں اٹھا کر اسے گھور رہے تھے، اس کے دل کی دھڑکن میں تیزی پیدا ہوگئی۔ پاؤں جیسے دہلیز نے جکڑ لیے۔

حامد نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا پھر ان بچوں کو جواب اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے اور پھر استانی جی کو۔ چوڑے کندھوں اور بھرے بھرے ہاتھ پاؤں والی لمبی تڑنگی استانی کو دیکھ کر ویسے ہی اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ سب اُسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

''بڑا شرمیلا ہے میرا حامد۔''

ماں نے اب لاڈ میں آکر اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے لا کر استانی جی کے سامنے پیش کر دیا، وہ مجرم بنا سر جھکائے کھڑا تھا۔ تپتے گال اور سرخ چہرہ لیے۔ اسے بچوں کی ہنسی اپنی پشت پر کانٹوں کی طرح چبھتی محسوس ہو رہی تھی اپنے لمبے قد کے باوجود خود کو ایک بونا محسوس کر رہا تھا۔ ایسا بونا جسے ابھی قلابازی لگانے کو کہا جائے گا اور وہ اس معمولی سے کام میں بھی ناکام رہے گا۔ دھڑام سے گر پڑے گا اور پھر سب اس پر دل کھول کے ہنسیں گے۔

شاید وہ ہنس ہی رہے تھے مگر نہیں اب کوئی بھی نہیں ہنس رہا تھا۔ استانی جی کی ایک ہی نگاہ نے ان سب کی پھس پھس بند کرا دی تھی۔ مگر وہ ابھی تک مجرم بنا کھڑا تھا۔ جس کا سر اور آنکھیں استانی جی کے سانولے پاؤں پر ٹکی تھیں، کھلی چپل میں سانولے پاؤں اس وقت کشش ثقل کا کام کر رہے

تھے۔

''ارے واقعی'' استانی جی بولیں ''یہ تو بہت ہی شرمیلا ہے'' یہ سن کر وہ شرم سے اور بھی سکڑ گیا اور ماں فخر سے بولی ''یہ میرا حامد سات بیٹیوں جیسا ہے۔'' اس پر سب کی پھس پھس پھر اس کی پُشت پر سوئیوں کی طرح چبھی مگر استانی جی کی ایک ہی نگاہ نے سب کو سُن کر دیا۔

باقی بچے سن ہوئے یا نہ ہوئے مگر حامد خود یقیناً سُن ہو کر رہ گیا۔ دراصل کہنا حامد کی خصلت تھی۔ غالباً اس کے خون میں سرخ خلیوں کے علاوہ کچھ ایسے خلیے بھی تھے جو اُسے خواہ مخواہ سن رکھتے تھے۔ ڈرنے کی بات ہو یا نہ ہو وہ خود بخود ہی ڈرا رہتا تھا خاص طور پر لڑکیوں سے اس کی جان جاتی تھی، اسے یہ لڑکیاں عجیب وغریب اور پراسرار قسم کی مخلوق نظر آتیں، ایسی مخلوق جس سے بچنے ہی میں عافیت ہو اور اب جو استانی جی کی صورت میں وہ ایک بہت بڑی لڑکی کے حضور پیش ہوا تو خود کو مجرم سمجھنا لازم تھا سو نظریں ابھی تک سانولے پاؤں پر ہی تھیں۔

اس کی ماں جھنجلا کر بولی ''او کھوتیا۔''

اس پر پھر اس کی پشت پر زور سے سوئیاں چبھیں۔

استانی جی بولیں۔ ''رہنے دیں، مت ڈانٹیں اسے، ابھی نیا نیا ہے اس لیے گھبرا رہا ہے۔'' اس نے مشکور ہو کر استانی جی کو دیکھا تو انہیں اپنی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے پایا۔ اس مسکراہٹ سے اس کی جان میں جان تو آئی مگر مکمل طور پر نہیں! ماں کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے چنانچہ وہ جھنجلا کر بولی ''بڑا شرمیلا ہے میرا حامد۔''

قصور حامد میاں کا نہ تھا۔ ماں دنیا سے خوفزدہ تھی اس لیے مرغی کی طرح حامد کو اپنے پروں میں لیے رہتی وہ وقت جو بچوں کے ساتھ باہر گلی میں کھیلنے میں گزارنا چاہیے تھا۔ وہ صرف گھر میں ماں اور خالاؤں اور چچیوں کے ساتھ گزارتا، وہ گھر میں ماں کے ساتھ کام کراتا۔ بلکہ بعض کام تو اسے بے حد پسند تھے مثلاً سل بٹے سے مصالحہ پیسنا، ماں کی سہیلیاں آتیں تو یہ ان کے دائرہ کے قریب ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے ان کی باتیں سنتا رہتا، ساسوں کی باتیں، خاوندوں کی باتیں، پڑوسیوں کی

باتیں، کچھ سمجھ پاتا، بہت کچھ سمجھ میں نہ آتا مگر باتوں میں مزا ضرور آتا۔ ان باتوں کے سننے میں اس کے لیے سب سے بڑا مزا تھا اور یہی اس کی سب سے بڑی تفریح تھی پھر یہ ہونے لگا کہ کوئی ایک کہتی ''دیکھو تو کیسے چسکا لے رہا ہے۔''

''چلو حامد بیٹے۔' اس کی ماں چمکار کر کہتی۔

اور وہ عورتوں کی جنت سے جلاوطن کر دیا جاتا۔

پھر اس نے چھپ کر باتیں سننی شروع کر دیں گو اب بھی بہت سی باتیں پلے نہ پڑتیں۔ مگر یوں چھپ کر سننے میں مزا اور بھی زیادہ تھا۔ چنانچہ وہ اور بھی زیادہ رگڑ کر مصالحہ پیسنے لگ گیا۔

پھر اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا قد بے طویل ہو چکا ہے اور اپنی ماں کے منہ سے نکلی باتیں اُسے مکمل طور پر سمجھ میں آ گئیں۔ اس رات وہ خواب میں بلاوجہ ہی روتا رہا اگلی صبح اس نے مصالحہ پیسنے سے انکار کر دیا اور تب ماں کو احساس ہوا کہ بیٹا خاصا بڑا ہو چکا ہے۔

اب اسے پڑھانا چاہیے۔ اور تعلیم کے لیے استانی کے گھر سے بہتر بھلا اور کونسا اسکول ہونا تھا۔

استانی جی جو محلّہ بھر میں آپا جی اشرف کے نام سے مشہور تھی۔ غریب کی جورو تھی آٹھویں پاس تھی اور پرائمری تک کے بچے پڑھاتی تھی کیونکہ باقی عورتیں آٹھویں پاس تو کجا آٹھویں فیل بھی نہ تھیں اس لیے استانی جی محلّہ بھر کی مشیر تھیں، عمر زیادہ نہ تھی مگر محلّہ بھر کی کنواریوں، دلہنوں، سوکنوں، ساسوں اور متفرق عورتوں کے دکھ سکھ کی کہانیاں سن سن کر بڑی بوڑھیوں سے زیادہ تجربہ کار اور سمجھ دار بن چکی تھیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ خفیہ باتوں کی پٹاری کھلی رہتی تھی جب کوئی ہونٹوں پر آنچل رکھے سر جوڑے بیٹھی سرگوشیاں کرتی نظر آتی تو یقیناً وہ خفیہ مذاکرات ہوتے اور اللہ کے فضل سے ایسا بابرکت محلّہ اور ایسی نیک بیبیاں تھیں کہ خفیہ مذاکرات کی کبھی کمی محسوس نہ ہوتی، بلاشبہ وہ محلّہ کی مقبول ترین عورت تھی اس لیے کہ وہ ان نایاب عورتوں میں سے تھی جن کے کان کوؤں جیسے ہوتے ہیں کہ بات گہری تہہ میں گم۔ بڑی سے بڑی بات سنتی مگر کیا مجال جو چہرہ پر لہر تک آ جائے

وہ سب کی رازدار تھی مگر اس کی رازدار کوئی نہ تھی، اس نے اتنی باتیں اور ایسی ایسی باتیں سن رکھی تھیں کہ ایک مرتبہ اگر زبان کھول دے تو سالوں تک محلّہ والے تھانے کچہریاں بھگتتے پھریں، عورتیں اس احسان کا بدلہ یوں چکاتیں کہ اپنے بچے پڑھنے کو بھیجتیں۔

عید، شبرات کو تحفے ملتے تو شادی بیاہ کے موقع پر جوڑے اور گھر میں اچھی چیز پکتی تو اسے بھیجنا نہ بھولتیں اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اس کی بدخوئی نہ کرتیں۔ بلاشبہ وہ محلّہ کی مقبول ترین عورت تھی اس طرح وہ بچوں کی مقبول ترین استانی بھی تھی اور حامد کے لیے سب سے پسندیدہ ہستی! اتنی کہ اس کے مقابلہ میں سے اپنی ماں کچھ بھی نہ لگتی، چنانچہ اس نے گھر میں ماں کے ساتھ زنانہ کام کرانے بند کر دیئے وہ جب بھی کچھ کرنے کو کہتی وہ جھلا کر بولتا۔ ”اماں! دیکھ نہیں رہی ہیں میں آپا جی کا کام کر رہا ہوں۔“

اگرچہ اب ماں کو مصالحہ خود پیسنا پڑتا۔ کوٹھے پر جا کر دیواروں پر دھلے ہوئے کپڑے خود پھیلانے پڑتے اور اسی طرح کے اور چھوٹے موٹے کام جن میں حامد کو پہلے عجیب طرح کی لذت اور پھر اُن سے مسرت ملتی تھی اب سب اس کے لیے غیر ضروری اور بے کار ہو کر رہ گئے تھے، ہاں استانی جی کے کاموں میں اس کی دلچسپی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ سب بچے چلے جاتے مگر وہ وہیں رہ جاتا۔ اس کے لیے بازار سے بھاگ بھاگ کر سودا لاتا، باورچی خانہ میں مصالحے کے ڈبے قرینے سے سجاتا، تکیوں کے غلاف تبدیل کرتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر سے بھی زیادہ باریک مصالحہ پیتا۔ پیتا جاتا۔ پیتا جاتا، حتیٰ کہ ہاتھ میں پکڑا بٹہ سل اور ان دونوں کے درمیان مصالحہ یک جان ہو جاتے مگر وہ دیوانہ وار پیسے جاتا۔ جب شام کو کام کاج سے تھک کر استانی جی لیٹ جاتیں تو پولے پولے ہاتھوں سے سر دباتا اور سخت ہاتھوں سے ٹانگیں۔

استانی جی کے میاں عمر بڑے تھے اور سدا کے روگی! گھر میں ہوتے تو ان کی کھانسی کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہتی۔

حامد کو آپا جی جتنی اچھی لگتی تھیں ان کے میاں صاحب اتنے ہی برے لگتے تھے۔ وہ گھٹنوں پر

کتاب دھرے دونوں کا موازنہ کرتا رہتا۔ استانی جی کا چہرہ کیسا گول کٹورے سا تھا جبکہ میاں جی کا لمبوترا چہرہ، چہرہ نہ تھا بتہ تھا، استانی جی کے چہرہ پر کیسے نمک گھلا تھا جبکہ میاں جی کے چہرہ پر چیچک کے داغ دیکھ کر گندی سل کا خیال آتا، استانی جی ہنستیں تو پھولے پھولے گالوں میں گڑھا پڑ جاتا تھا جبکہ بڑھی ہوئی شیو سے میاں جی کے پچکے گالوں کے گڑھوں میں چیونٹیاں چلتی محسوس ہوتیں، استانی جی مسکراتیں تو سفید چمکیلے دانت لشکارا مارتے جبکہ پورا منہ کھول کر کھانسنے پر میاں جی کے گندے سے دانت اور پیلے مسوڑھوں کے عقب میں سیاہ بلغمی حلق کا غار نظر آتا۔ استانی جی کے لمبے بال دیکھ کر ایک دن اس نے کہا ''آپا جی! میں تیل لگا دوں۔''

''تم؟'' وہ ہنس کے بولی۔

''ہاں! آپا جی'' وہ جوش سے بولا ''اپنی ماں کے سر میں، میں ہی تیل لگایا کرتا ہوں؟''

''اچھا، تو آؤ۔''

اس نے ہتھیلی پر تیل ڈالا اور مانگ کے بیچ میں سے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے تیل کی باریک دھار سر پر ڈالی اور پیشتر اس کے تیل اِدھر اُدھر ہوتا اس نے اسے بالوں میں سمونا شروع کر دیا اس کے بعد آہستہ آہستہ وہ ہاتھ ہلاتا گیا۔ اس کے نرم نرم ہاتھوں کا لمس مساوات کر ذریعہ سے تمام اعصاب میں سکون کی لہریں دوڑا رہا تھا یوں کہ آنکھیں نیند سے بوجھل محسوس ہونے لگیں اُسے بھی احساس ہو چکا تھا کہ یوں تیل لگانا استانی جی کو بھایا ہے استانی جی کو یوں مزا دے کر اُسے جو خوشی حاصل ہو رہی تھی اس کی وجہ سے اس کے ہاتھوں میں اس کا دل سمٹ آیا یوں کہ تیل کے قطرہ قطرہ میں اس کا وجود بھی شامل ہو گیا۔

وہ صبح سویرے سب سے پہلے آتا، پھٹی دری پر چپلی میں جھولتے سانولے پاؤں کے قریب تر بیٹھنا اور سب سے آخر میں جاتا۔ ماں خوش تھی کہ بیٹے کی تعریف کرتے استانی جی کی زبان نہ تھکتی، استانی جی خوش تھیں کہ اتنا تابعدار شاگرد آج تک نہ ملا تھا اور شاگرد رشید کا یہ حال تھا کہ اس کا بس نہ چلتا ورنہ اپنا بستہ بغل میں دبا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے استانی جی کے سامنے بیٹھا رہتا۔

وہ اب بھی ویسا ہی شرمیلا تھا، اس کے اب بھی زیادہ باتیں کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو بالکل ہی بولنے کو جی نہ چاہتا۔ بس پلکیں جھپکائے بغیر استانی جی کے کھلتے لبوں، سفید دانتوں اور ان میں بل کھاتی ننھی سی گلابی زبان کو تکتا رہتا۔ وہ اب بھی محلوں کے لڑکوں سے کھیلنے میں شرم محسوس کرتا۔ اس کا گھر میں بھی کھیلنے کو جی نہ چاہتا تھا بس گھٹنوں پر کتاب رکھے پہروں بیٹھا سبق یاد کرتا رہتا، ہونٹ رٹنے میں محو ہوتے آنکھیں کہیں اور ذہن میں کچھ اور!

اور پھر ایک رات اس نے عجیب خواب دیکھا وہ سر میں تیل لگا رہا ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ سر کس عورت کا ہے مگر بالوں میں تیل کی دھار گرانے سے پہلے ہی بال سانپوں میں تبدیلی ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے بڑے ہلتے کلبلاتے جھومتے۔ وہ ان سے ڈرتا بھی ہے لیکن اسے یہ بھی احساس ہے کہ اگر وہ اسی طرح تیل انڈیلتا رہا تو یہ سانپ مر جائیں گے چنانچہ وہ نئے عزم کے ساتھ بوتل اٹھاتا ہے مگر بوتل کو ہاتھ میں لیتے ہی جیسے ہوا ابھرا ابھرا لفافہ پھٹ گیا۔ آنکھ کھلتے ہی اسے خود سے گھن آ رہی تھی۔

اور پھر اچانک ہی جیسے جھنجھوڑ کر اسے سہانے خواب سے بیدار کر دیا گیا اس کی ماں کو اچانک یاد آ گیا کہ وہ اب بہت ہی بڑا ہو گیا ہے استانی جی نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ اسے جو سکھا سکتی تھیں سکھا چکی ہے اور یوں وہ اسکول پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس نے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو ڈرنا ضرور سیکھ لیا، ماسٹروں سے ان طاقتور لڑکوں سے جو چھوٹے بچوں پر حکومت کرتے تھے، کتابوں سے اور سب سے بڑھ کر خود اپنے جسم سے۔

آپا جی کے ہاں جانا موقوف نہ ہوا تھا۔ مصالحہ پیسنے یا بالوں میں تیل لگانے کے لیے نہیں بلکہ ویسے ہی انہیں سلام کرنے کو اسے یہاں آ کر عجیب سا سکون کا احساس ہوتا تھا۔ سکول اور کلاس روم میں وہ سکڑا سمٹا رہتا مگر یہاں آ کر اسے محسوس ہوتا گویا اب دنیا بھر کی پریشانیوں سے محفوظ ہو گیا ہو وہاں بیٹھ کر اسکول کا کام کرتا اور سب سے بڑھ کر سکول کے لڑکوں کی اور ماسٹروں کی باتیں کرتا اور یوں دونوں کی شعوری کاوش کے بغیر استانی اور شاگرد میں دوستی کے ایک نئے رشتہ نے جنم

لے لیا۔ وہ دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی، اسے مشورہ دیتی، اونچ نیچ سمجھاتی اور وہ سن کر سر ہلاتا رہتا۔ محلہ کی عورتوں کی بک بک سننے کے بعد اور بچوں سے مغز ماری کے بعد حامد سے گفتگو اسے بھی بہت اچھی لگتی چنانچہ وہ بھی اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتیں۔ میاں کی بیماری کی باتیں۔ کپڑوں کی باتیں، زندگی کے دُکھ سکھ کی باتیں۔

حامد کے لیے دن میں دوست بنانا ممکن ہو چکا تھا اور رات کے خوابوں سے پیچھا چھڑانا بھی ناممکن ہو چکا تھا۔

اور پھر اچانک ہی جیسے جھنجھوڑ کر اسے سہانے خواب سے بیدار کر دیا گیا اس کی ماں کو اچانک یاد آ گیا کہ وہ اب بہت ہی بڑا ہو گیا ہے کیونکہ تعلیم ختم کر کے ملازمت کر رہا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کی شادی سے نہیں روک سکتی، روکنا کس نے تھا؟ بلکہ استانی جی نے تو ایک رشتہ بھی بتا دیا، حامد نے بہت شور مچا دیا کہ اس نے صرف میٹرک پاس کیا ہے اور وہ معمولی سا کلرک ہے اور ابھی محض انیس سال ہی کا ہے مگر اس کی کسی نے بھی نہ سنی، یہ سب خواب محسوس ہو رہا تھا۔ مہندی کی رسمیں، تیل کی رسمیں سہرا، بارات، مولوی صاحب کے منہ سے ادا ہوتے ہوئے مقدس کلمات، کھانا واپسی اور پھر کمرہ میں ایک اجنبی عورت، سرخ جوڑا، مہندی والے ہاتھ، ٹیکے والا ماتھا اور۔ اور۔ اور وہ رو رہی تھی۔ وہ تو رونے کے قابل نہ رہا تھا۔

شادی کے سہانے سپنے کی تعبیر یہ نکلی کہ دلہن نے واپس آنے سے انکار کر دیا۔ عورتوں کی زبانیں سرگرم عمل ہو گئیں۔

استانی جی اس کی ماں سے ملیں، دلہن کی ماں سے ملیں پھر دلہن سے ملیں وہ سب سے زیادہ پریشان تھیں کہ لڑکی انہوں نے پسند کی تھی اور حامد نے ان کے کہنے پر ہاں کی تھی سب ان کی عزت کرتے تھے مگر الجھی ڈور کا سرا کہاں سے ملے؟

شادی کے بعد سے حامد صبح سویرے کام پر چلا جاتا اور رات گئے تک گھر آتا اور اس دوران اس پر کیا بیتی؟ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا کوئی دوست بھی نہ تھا، استانی جی کے گھر کا اس نے رخ

نہ کیا تھا۔

دفتر میں اس کی طبیعت بہت پریشان ہوئی تو چھٹی لے کر نکل آیا مگر جائے کہاں؟ بس سٹاپ پر بیٹھا سواریوں کی بھیڑ دیکھتا رہا، دیواروں پر لگے پوسٹر اور اشتہارات پڑھتا پھرا، سینما میں تصویریں دیکھتا رہا اور آخر تھک تھکا کر سر جھکائے سوچ میں ڈوبا جو چلا تو یہ احساس ہی نہ ہوا کہ کب اور کیسے وہ استانی جی کے گھر آ پہنچا وہ دہلیز میں مجرم سا بنا کھڑا تھا۔ وہ صحن کے کونے میں چولھے پر بیٹھی تھی، بچے جا چکے تھے مگر وہ پھٹی دری ابھی تک لپیٹی نہ گئی تھی وہ کچھ دیر تک خاموشی سے نظریں دوڑاتا رہا۔ تب اچانک وہ آگے بڑھا اور اس نے دری لپیٹنی شروع کر دی۔ استانی جی خاموشی سے دیکھتی رہیں مگر اسے منع نہ کیا اس نے دری لپیٹ کر وہیں کونے میں رکھی جہاں وہ ہمیشہ رکھا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا وہ اُس سے کچھ کہنا چاہتی تھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر اس کے چہرے پر ایسی کیفیت تھی کہ خاموش رہی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ حامد نے بولنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر کھلے ہونٹوں سے الفاظ نہ نکلے صرف ٹھوڑی کپکپا کر رہ گئی اور اگلے لمحے وہ استانی جی کے گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا۔ سسکیوں سے سارا جسم کانپ رہا تھا وہ خاموشی سے اس کی پیٹھ سہلاتی رہی۔ دھیرے دھیرے وہ سکون پذیر ہو گیا مگر آنسو رک گئے مگر وہ اب بھی سوکھی سسکیاں لے رہا تھا اور پھر وہ خاموش ہو گیا۔ مگر ابھی تک اس طرح اس کے گھٹنے سے لگا بیٹھا تھا آنسوؤں نے اس کی شلوار گیلی کر دی تھی۔

وہ خاموش تھی اور خاصی دیر تک خاموش رہی۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس لی۔ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اندر کمرے میں لے گئی۔

☆☆

طارق چھتاری

نیم پلیٹ

''کیا نام تھا اس کا؟ اُف بالکل یاد نہیں آ رہا ہے__'' کیدارناتھ نے اپنے اوپر سے لحاف ہٹا کر پھینک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''یہ کیا ہو گیا ہے مجھے، ساری رات ہو گئی نیند ہی نہیں آ رہی ہے۔ ہوگا کچھ نام وام، نہیں یاد آتا تو کیا کروں__ لیکن نام تو یاد آنا ہی چاہئے۔ آخر وہ میری بیوی تھی، میری دھرم پتنی__'' انہوں نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پچھتر سالہ کیدارناتھ کے ماتھے کی بے شمار جھرّیاں بوڑھی ہتھیلی کے نیچے دب کر پھڑ پھڑانے لگیں۔

''سرلا کی ماں......'' ان کے منھ سے بے ساختہ نکل پڑا۔

''اف وہ تو ٹھیک ہے مگر کچھ نام بھی تو تھا اس کا__ کیا نام تھا؟ اس کے نام کا پہلا اچھر...... ہاں کچھ کچھ یاد آ رہا ہے......'' انہوں نے پیر پلنگ کے نیچے لٹکا دیئے اور لائٹ آن کرنے کے لیے دیوار میں لگے سوئچ کی طرف بڑھے۔

''اس کے نام کا پہلا اچھر ......''کے''نہیں نہیں__ ہاں ہاں یاد آ گیا۔''

ان کا جھریوں سے بھرا پوپلا منہ مسکرانے کے لئے تیار ہی ہو رہا تھا کہ کھانسی کا ایک ٹھسکا لگا اور پھر وہ بھول گئے کہ وہ اچھر کیا تھا۔

کمرے میں چاروں طرف روشنی پھیل چکی تھی__

''ڈھائی بجنے کو ہیں__ '' ان کی نظر ٹائم پیس پر پڑ گئی۔

''ٹائم پیس......؟ ہاں......ٹا......نہیں، پیس......''سا''

ارے ہاں__

''سا'' ہی تو تھا اس کے نام کا پہلا اکچھر __ ''

''سا''؟ نہیں یہ تو سَرلا کی ماں......

''پھر سَرلا کی ماں __ آخر نام بھی تو کچھ تھا اس کا __ '' کیدارناتھ نے جھنجھلا کر سرہانے رکھی چھڑی کو اٹھایا، گلے میں گس کے مفلر لپیٹا اور بار بار چھڑی کو فرش پر پٹخنے لگے۔ پھر دونوں ہاتھوں میں چھڑی کو جکڑ کر اس طرح سر کے قریب لائے جیسے اس کے ہتھے سے اپنا سر پھوڑ ڈالنا چاہتے ہوں۔

''تعجب ہے اپنی بیوی کا نام بھی بھول گیا۔ اسے مَرے ہوئے بھی تو چالیس برس گزر گئے ہیں۔ تین سال کا عرصہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ صرف تین سال ہی تو اس کے ساتھ رہ پایا تھا میں __ ''

وہ خالی خالی نظروں سے کمرے کو گھور رہے ہیں۔ پلنگ، میز، کرسی اور الماری __ کتابیں...... '' الماری کتابوں سے بھری پڑی ہوگی، الماری کے پٹ بند ہیں۔ وہ پلنگ کی جانب بڑھے اور پھر الماری کی طرف مڑ گئے۔ دروازہ کھولا __ الماری خالی تھی __ نہ اس میں کتابیں تھیں اور نہ خانے __ ''ارے اس میں تو پچھلی دیوار بھی نہیں ہے __ ''

وہ لرز گئے اور گھبرا کر ایک پاؤں اس کے اندر رکھ دیا پھر دوسرا پاؤں __

اب وہ دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ سب کچھ خالی تھا، ان کے ذہن کی طرح وہ سمت بھول گئے تھے اور الماری کے بجائے باہر جانے والا دروازہ کھول بیٹھے تھے۔ باہر سڑک پر کہرا جما ہوا تھا۔ کھمبوں کے بلب مدھم دیوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ سنسان سڑک پر انہیں لگا کہ یکا یک بھیڑ اُمڈ آئی ہے۔ چاروں طرف شور ہو رہا ہے۔ باجے کے شور سے کان پھٹے جا رہے ہیں۔ دو کہرے میں چھپی ہوئی ڈولی __ سُرخ جوڑا پہنے دلہن، دلہن مسکرا رہی ہے۔

سڑک پر ایک پتھر کا ٹکڑا پڑا تھا، انہیں ٹھوکر لگی اور لڑکھڑا کر کھمبے سے جا ٹکرائے، بہت زور سے دھکا دیا تھا محلے بھر کی لڑکیوں نے __ اور پھر دروازہ بند __

''کیا نام ہے تمہارا __ '' نام معلوم ہوتے ہوئے بھی اس کا نام پوچھا تھا انہوں نے __ وہ شرما گئی تھی اور گھٹنوں میں منہ چھپا لیا تھا۔ انہوں نے پھر پوچھا تو اس نے آہستہ سے اپنا نام

بتایا__

''کیا بتایا تھا اس نے__؟ اف بالکل یاد نہیں__''اور وہ چھڑی کو زمین پر ٹیکتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چل پڑے۔انھیں کہاں جانا ہے؟ پتہ نہیں__ پھر بھی وہ چلتے رہے اور اب وہ اپنے گھر سے بہت دور نکل آئے تھے۔

یہ علاقہ کون سا ہے؟ کیلاش نگر؟ ہاں شاید وہی ہے۔آگے دائیں طرف ان کے دوست شرما جی کی کوٹھی ہے۔باہر گیٹ پر نیم پلیٹ لگی ہے۔''ست پرکاش شرما'' وہ ان کے دفتر کے ساتھی تھے۔ گزرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔

اچانک کیدار ناتھ ٹھٹکے اور رک گئے__''ارے یہی تو ہے شرما جی کی کوٹھی، ہاں بالکل یہی ہے۔وہاں لگی ہے ان کے نام کی پلیٹ__'' کیدار ناتھ کو کہرے کی دھند میں ایک تختی نظر آئی۔

''شرما......'' انھوں نے پڑھا__''رام پرکاش شرما''

رام پرکاش......؟ نہیں ان کا نام تو ست پرکاش تھا۔انہوں نے غور سے دیکھا۔

''رام پرکاش شرما (ایڈووکیٹ)__'' صاف صاف لکھا تھا۔

انہیں یاد آیا کہ ایک روز شرما جی نے کہا تھا__''میرا بیٹا رام پرکاش ایڈووکیٹ ہو گیا ہے__''

''اچھا تو اپنے باپ کے نام کی پلیٹ اکھاڑ کر......'' کھٹ سے کوئی چیز گری۔انھیں لگا کہ ان کے ذہن سے کوئی چیز ٹوٹ کر قدموں میں آ گری ہے۔وہ سہم گئے اور مجرم کی طرح گردن جھکالی۔یہ کسی کے نام کی پلیٹ تھی۔مگر ایک حرف بھی صاف نہیں۔سب کچھ مٹ چکا ہے۔ان کے جسم میں زن زناہٹ سی ہونے لگی۔لاغر ٹانگیں جو ابھی کانپ رہی تھیں، پیاسے ہرن کی طرح کلانچیں مارنے کو بیتاب ہو اٹھیں۔

وہ بھاگ رہے ہیں۔نہیں آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔یا رینگ رہے ہیں یا کھڑے ہی......یہ تو پتہ نہیں مگر اب وہ اپنے گھر سے کئی میل دور سرلا کے گھر کے بہت قریب آن پہنچے ہیں۔

سرلا سے اس کی ماں کا نام پوچھ ہی لیں گے ___

سرلا کو اپنی ماں کا نام یاد ہوگا ___ ؟ کیوں نہیں ___ کوئی ماں کا نام بھی بھولتا ہے کیا۔

''پاروتی دیوی ___ '' ان کی ماں کا نام پاروتی دیوی تھا۔ انہیں پچھتر سال کی عمر میں بھی اپنی ماں کا نام یاد ہے۔

''پاروتی دیوی کی جے ......'' بچپن میں وہ اپنے بابا کے ساتھ بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔

''بابا.......... اماں کا نام بھی تو پاروتی دیوی ہے ___ '''' ہاں بیٹے یہی پاروتی دیوی ہیں جن کے نام پر تمہاری اماں کا نام رکھا گیا ہے۔''

اور اس روز سے وہ آج تک روزانہ پاروتی دیوی کی پوجا کرتے ہیں اور جے بولتے ہیں۔ ماں تو بھگوان کا روپ ہوتی ہے، پھر بھلا سرلا کیسے اپنی ماں کا نام بھولی ہوگی ___ ! کیدارناتھ کا دل اندر سے اتنا خوش ہو رہا تھا کہ ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ رفتار میں دھیما پن آ گیا مگر وہ اپنے بوڑھے جسم کو ڈھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے ___ !!

''بابو جی آج اتنی سویرے آپ ادھر ___ ؟'' سرلا نے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے کیدارناتھ کو چائے کی پیالی دیتے ہوئے پوچھا ___ ! بوڑھے آسمان کی گود سے نئے سورج کا گولا جھانک رہا ہے۔ کیدارناتھ کے پنجوں کی انگلیاں سرد ہو کر سُن پڑ چکی ہیں، جیسے ان میں گوشت ہے ہی نہیں اور وہ اندر سے بالکل خالی، بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں اور وہ سرلا کے مکان کے باہر پتہ نہیں کھڑے کھڑے تھک چکے ہیں۔ ''میں یہاں کھڑا ہوں۔ آتے جاتے لوگ دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ اب تو دن چڑھے کافی دیر ہوگئی ہے۔ سرلا سو کر اٹھ گئی ہوگی۔ اندر چلنا چاہئے۔ لیکن کیا واقعی سرلا نے اب تک اپنی ماں کا نام یاد رکھا ہوگا؟ شرما جی کے بیٹے نے اپنے باپ کے نام کی پلیٹ اکھاڑ کر...... کھٹ سے کوئی چیز گری، انہیں لگا کہ ان کے ذہن سے کوئی چیز ٹوٹ کر قدموں میں آن گری ہے۔ دھندلے دھندلے حروف ابھرنے لگے اور ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ___ اندھیری رات...... کُہرے سے بھری ہوئی سرد رات...... بے شمار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں، کئی آوارہ

کتے، ان کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ وہ کتوں سے بچنے کے لئے...... ملٹن پارک میں گھس جاتے ہیں۔ ملٹن پارک؟ اب تو اس کا نام گاندھی پارک ہو گیا ہے۔ گاندھی پارک ہو یا ملٹن پارک، ہے تو یہ وہی پارک جہاں وہ شادی کے دو دن بعد اسے لے کر آئے تھے۔ پارک کی بارہ دری ٹوٹ کر کھنڈر بن گئی ہے۔ ٹوٹی ہوئی بارہ دری کے پتھروں کے نیچے سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں چالیس برس پُرانی بارہ دری میں گھس جاتی ہیں ـــــ ''آؤ یہاں بیٹھو...... کتنی خوبصورت ہیں یہ محرابیں ـــــ'' وہ دونوں سنگ مرمر کے ستون سے کمر ٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر وہ دنیا سے بے خبر بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔ مہینوں...... برسوں...... کہ اچانک اس کی بیٹی سرلا نے اسے چونکا دیا۔

''بابو آپ چپ کیوں ہیں؟ کیا سوچ رہے ہیں ـــــ؟''

''کچھ نہیں بیٹی۔ میں سوچ رہا تھا آج اتنی سویرے...... اصل میں، میں نے سوچا جوگیندر کے دفتر جانے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں تو اچھا ہے ـــــ''

''بابو جی آج تو اتوار ہے ـــــ''

''اوہ، ہاں آج تو اتوار ہے۔ کیا کروں بیٹی ریٹائر ہونے کے بعد دن تاریخ یاد ہی نہیں رہتے۔''

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے ـــــ ''دن تاریخ کیا اب تو بہت کچھ یاد نہیں رہا۔''

اتنے میں جوگیندر بھی آنکھیں مسلتے ہوئے آئے اور کیدار ناتھ کو پرنام کر کے صوفے پر بیٹھ گئے۔

''بابو اتنی سویرے؟ سب ٹھیک ہے نا ـــــ''

''میرے جلد آنے پر یہ لوگ اتنا زور کیوں دے رہے ہیں۔ ضرور میرے اچانک آنے سے ان کا ڈسٹرب ہوا ہوگا۔ مجھے چلے جانا چاہئے، ابھی......''

کیدار ناتھ کو خاموش بیٹھا دیکھ کر سرلا بول پڑی ـــــ ''ارے بابو جی تو بھول ہی گئے تھے کہ آج اتوار ہے اسی لیے تو اتنی جلدی......''

''آج اتوار ہے اور میں اس طرح بغیر بتائے یہاں چلا آیا ہوں۔ ہوسکتا ہے ان دونوں کا کوئی پروگرام ہو۔ اب میری وجہ سے..........''

''ہفتے میں چھٹی کا ایک ہی دن تو ملتا ہے ان لوگوں کو___ مگر میں بھی تو روز روز نہیں آتا۔ گھر سے چل پڑا تھا، بس چلتا رہا اور چلتے چلتے جب سرلا کے گھر کے قریب آ گیا تو سوچا، ملتا چلوں، کیا یہ لوگ آج میرے لیے اپنے پروگرام نہیں چھوڑ سکتے؟''

کیدار ناتھ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ہیں___

''کمبخت بڑھاپے میں آنسو بھی کتنی جلدی نکل آتے ہیں___'' وہ آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کررہے تھے کہ سرلا نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ یہ اس طرح کیا دیکھ رہی ہے؟ کہیں سب کچھ سمجھ تو نہیں گئی۔

کیا سمجھے گی؟ یہ کہ میں اپنی بیوی کا نام بھول گیا ہوں اور رات بھر جاگتا رہا ہوں یا یہ کہ میں رو رہا ہوں___

''بیٹی آج مجھے جوگیندر سے کچھ کام تھا......''

''بابو جی مجھ سے؟'' جوگیندر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''ہاں یوں ہی، کوئی خاص بات نہیں تھی۔''_____ پھر وہ لان کی طرف جھانکنے لگے۔

''آج بہت سردی ہے۔ تمہارے لان میں تو سویرے ہی دھوپ آجاتی ہے۔''

سرلا نے لان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''ہاں بابو جی، ابھی تو دھوپ میں تیزی بھی نہیں آئی اور اوس بھی بہت ہے، پورا لان گیلا ہے۔''

وہ کہہ رہی تھی کہ جوگیندر بیچ میں بول پڑے۔

''بابو! بھی کچھ کام کے سلسلے میں آپ کہہ رہے تھے؟''

''کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں جلدی سے کام بتا کر چلتا بنوں تاکہ ان کے پروگرام ڈسٹرب

نہ ہوں۔'' کیدارناتھ کھانسنے لگے اور کافی دیر تک کھانستے رہے۔ وہ کھانس رہے تھے اور سوچتے جاتے تھے کہ اب کیا کہوں کہ بغیر سوچے سمجھے ہی بول پڑے ــــــ

''بیٹے تمہیں نام یاد رہتے ہیں؟''

''کیسے نام بابو جی؟ ویسے میں ہمیشہ نام یاد رکھنے میں کمزور رہا ہوں، اسی لیے ہسٹری کے پرچے میں میرے نمبر بہت کم آتے تھے۔''

''اب کیا پوچھوں؟ کیا سرلا سے یہی سوال کروں؟ مگر یہ تو بڑی بے تکی بات ہوگی۔ اگر سرلا خود ہی بول پڑے کہ بابو جی مجھے نام یاد رہتے ہیں، تو جلدی سے پوچھ لوں کہ بتاؤ تمہاری ماں نام کیا تھا ــــ''

کیدارناتھ نے حسرت بھری نظروں سے سرلا کی طرف دیکھا لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی اور اٹھ کر کچن کی طرف چل دی ــــ

سورج چڑھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ دھوپ میں بھی تیزی آتی جا رہی تھی۔ لان کی ہری گھاس پر جمے ہوئے شبنم کے قطرے اپنا وجود کھو چکے تھے۔ کیدارناتھ نے اپنے جسم پر چڑھے ہوئے گرم کپڑوں کو اس طرح سے ٹٹولا جیسے وہ ڈھونڈ رہے ہوں کہ ان کپڑوں کے اندر جسم ہے بھی یا نہیں۔

دوپہر کا کھانا تیار تھا۔ لیکن ابھی تک سرلا سے اس کی ماں کا نام پوچھنے کا موقع نہیں مل پایا تھا۔ سرلا صبح سے کھانا تیار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ کیدارناتھ باہر دھوپ میں جا کر بیٹھتے تو کبھی اندر آ کر برآمدے میں ٹہلنے لگے کبھی جوگیندر سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں اور کبھی سرلا آتی تو اس موقع کی تلاش میں رہتے کہ ذرا جوگیندر اٹھ کر جائیں اور وہ اکیلے میں سرلا سے اس کی ماں کا نام پوچھ لیں۔

''اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ کھانے میں بات میں نکلے گی، تب تو پوچھ ہی لوں گا۔'' انھوں نے سوچا اور مطمئن ہو گئے۔

کھانے کی میز سج چکی ہے۔ سرلا نے کئی طرح کی سبزیاں بنائی ہیں ــــ کھانا بہت لذیذ ہے۔ آج بہت دنوں کے بعد اپنی بیٹی کے ہاتھ کا کھانا ملا ہے۔ نوکر کے ہاتھ کا کھاتے کھاتے ان کا

دل بھر گیا تھا۔ سرلا کی ماں کے ہاتھ کا ذائقہ تو انھیں یاد بھی نہیں ___ اس کا نام بھی تو یاد نہیں ___ ان کا جی چاہا کہ جلدی سے پوچھ لیں۔

''بیٹی تمہاری ماں کا کیا نام تھا۔''

''ارے یہ کیا۔ اگر اس طرح وہ کوئی سوال کریں گے تو یہ دونوں کیا سوچیں گے۔ دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں گے ___ '' کیدار ناتھ خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگے کہ کہیں بھول کر یہ سوال ان کے منہ سے نکل پڑے ___ '' اف کس سے پوچھوں.......... کمبخت خود ہی میرے ذہن میں آجائے تو پوچھنا ہی کیوں پڑے؟'' انھوں نے بھنویں سکوڑیں، پیشانی پر بے شمار بل پڑ گئے پھر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ذہن سے جوجھنے لگے۔ آج سرلا کا بیٹا نظر نہیں آرہا ہے، شاید اسے اپنی نانی کا نام یاد ہو ___ باتوں باتوں میں اس سے تو پوچھ ہی لوں گا ___ ''سرلا آج تمہارا بیٹا......؟''

''ہاں پتاجی میں تو بتانا بھول ہی گئی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد اس نے کمپیٹیشن کی تیار شروع کر دی تھی۔ کل سے اس کے امتحان ہیں۔ دو دن پہلے ہی دلی چلا گیا ہے ___ '' او...... اچھا...... تو گھر پر نہیں ہے۔ کیدار ناتھ کو اپنی بیوی کا نام یاد نہیں آیا۔ کھانے کے بعد چائے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شام ہو گئی۔ کیدار ناتھ بغیر نام پوچھے ہی وہاں سے اٹھ پڑے۔ گھر لوٹنے کے لیے بس پکڑی۔ اب ان کے جسم کی ساری رگیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں۔ ہر ایک شخص کو دیکھ کر انہیں لگتا کہ اسے ضروری میری بیوی کا نام معلوم ہوگا۔ وہ ہر ایک سے پوچھنے کے لیے ان کے ہونٹ کھلتے سفر جاری رہا اور پھر اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ بس رکی۔ انھوں نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور اترنے کے لئے سیٹ سے اٹھ کھڑے ہو گئے۔

کمرے میں چاروں طرف اندھیرا ہے۔ وہ بغیر روشنی کیے بستر پر ڈھیر ہو گئے۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا، کیدار ناتھ کو محسوس ہوا کہ دیواریں انکی طرف کھسکتی چلی آ رہی ہیں۔ انہوں نے آنکھوں پر زور دے کر دیواروں کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ پورے

کمرے میں دھواں بھر گیا تھا۔ ''اٹھ کر لائٹ جلادی جائے۔'' انہوں نے سوچا۔ مگر روشنی میں تو انہیں نیند ہی نہیں آتی۔ اندھرے میں بھی کب آتی ہے۔ اب ان کی آنکھیں شعلوں کی طرح دہکنے لگی تھیں۔ جسم سے بھی آگ نکلنے لگی۔ آگ کی لپٹیں بہت تیز ہوگئی ہیں۔ سرلا کی ماں کی چتا جل رہی ہے۔ روشنی بہت تیز ہے اور انہیں نیند نہیں آرہی ہے۔ تو پھر آنکھیں نیند سے بوجھل کیوں ہوتی جارہی ہیں؟ جگہ جگہ سے جسم گل گیا ہے۔ وہ جدھر کروٹ لیتے ہیں ادھر ہی سے شدید درد کی لہر اٹھتی ہے۔ ان کے ہاتھ پیر بالکل ٹھنڈے ہوتے جارہے تھے کہ اچانک ذہن سے کوئی چیز نکل کر پلنگ کے نیچے فرش پر جاپڑی۔ کیدار ناتھ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ لائٹ جلائی اور الماری کھول کر تمام کتابیں فرش پر جاپڑی۔ کیدار ناتھ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ لائٹ جلائی اور الماری کھول کر تمام کتابیں فرش پر بکھیر دیں۔ ایک ایک کر کے میز کی دراز کے تمام کاغذات نکال ڈالے اور پرانے بکس سے کچھ فائلیں نکالیں پھر دیوانوں کی طرح انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے ___ کسی کاغذ کو پڑھتے، کسی کو پھاڑ کر پھینک دیتے اور کسی کو تہہ کر کے رکھ لیتے۔ ''کمبخت اس کی کوئی چھٹی بھی تو نہیں مل رہی ہے۔'' اب کیدار ناتھ نے جھنجھلا کر کتابوں، کاغذوں اور فائلوں کو نوچ کر پھینکنا شروع کر دیا ہے۔ دونوں ہاتھ بالکل شل ہو چکے ہیں۔ سانس رکنے لگی ہے انہوں نے گھبرا کر گلے میں بندھے مفلر کا بل کھولنا چاہا کہ پتا نہیں کیسے گرفت اور تنگ ہوگئی پھر ایک جھٹکے کے ساتھ مفلر کھینچ لیا اور بری طرح ہانپنے لگے۔ ''ڈھونڈنے سے کوئی فائدہ نہیں ___ یاد کرنا بھی بیکار ہے، اب کچھ یاد نہیں آئے گا'' اور وہ یاد کرنے لگے کہ ان کی بیوی کا کیا نام تھا ___

شانتی.........؟

نہیں ______

سروجنی ______

نہیں......نہیں......

سرسوتھا........؟

اُف یہ بھی نہیں ___

ہزاروں نام ان کے ذہن میں تیزی سے آنے لگے۔ پھر وہ بھول گئے کہ کیا یاد کر رہے تھے۔

آج کونسا دن ہے؟

اتوار ___

نہیں اتوار تو کل تھا۔

کل؟

اتوار تو اس دن تھا جب وہ سرلا کے گھر گئے تھے اور سرلا کے گھر گئے ہوئے اب صدیاں گزر چکی ہیں۔

ان کی آنکھوں سے زرد روشنائی ٹپک کر پورے کمرے میں پھیل گئی ہے۔

کتابیں، کاغذات اور فائلیں ___ انہیں کچھ دھندلے دھندلے حروف نظر آئے۔

''شرما ___ ہاں میرے دفتر کے شرما ___''

''پورا نام کیا تھا ان کا؟''

اف یہ بھی بھول گیا۔

''اور ان کے بیٹے کا؟''

نہیں، اب مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔

پارک ___

''کون سا پارک''؟

ہاں وہی پارک جہاں وہ کھڑی مسکرا رہی ہے۔

لیکن اب تو اس پارک کا نام بھی بدل گیا ہے۔

''کیا ہے اس کا نیا نام؟''

نیا ہی کیا اب تو پرانا بھی یاد نہیں۔ میں سب کچھ بھولتا جا رہا ہوں۔

میری بیٹی ــــ

اف اس کا نام بھی یاد نہیں آ رہا ہے۔

اس کے شوہر کا نام؟

ہے بھگوان مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے ــ اب تو کچھ بھی یاد نہیں۔

کیا صرف بیوی کے نام کے لیے وہ اتنے پریشان ہیں۔

''نہیں، کوئی اور چیز بھی ہے جسے وہ بھول گئے ہیں۔

''کیا چیز ہے وہ؟''

وہ نیم پلیٹ جو بار بار ان کے ذہن سے نکل کر گر پڑتی ہے! کیا لکھا ہے اس میں؟ کچھ دکھائی نہیں دیتا ــــ سب کچھ مٹ چکا ہے ــ

دیواریں، چھت، دروازے اور فرش...... کچھ بھی نہیں ہے۔ دور تک پھیلا ہوا ایک بہت بڑا میدان ہے جس کی زمین میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ سورج کا گولا پھیل کر اتنا بڑا ہو گیا کہ پورا آسمان اس کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ روشنی اتنی تیز ہے کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا کہ اچانک دور کوئی بہت چھوٹی سی چیز نظر آئی۔

کیا ہے وہ؟

کوئی انسان ہے جو اپنے چاروں طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے قریب کوئی بھی نہیں ہے، وہ تنہا ہے، بالکل تنہا ــ

ارے وہ تو میری طرف بڑھ رہا ہے اور اب میری آنکھوں کے اتنا قریب آ گیا کہ اس کے پیچھے سارا میدان، آسمان اور سورج کا پھیلا ہوا گولا بھی چھپ گیا ہے۔

کون ہے یہ شخص؟

''میں؟'' اور ان کی آنکھوں کے سامنے خود ان کی اپنی ذات اندھیرا بن کر چھانے لگے۔

''مگر میں کون ہوں؟ کیا نام ہے میرا؟''

''ایں...... اب تو میں اپنا نام بھی بھول گیا__ '' وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے چیخنے اور بغیر ریڑھ کی ہڈی والے آدمی کی طرح ڈھیرے ہوتے ہوتے اپنے آپ میں سمٹنے لگے۔ انہیں لگا کہ وہ کئی گز زمین کے اندر دھنس گئے ہیں۔ ان کا دم گھٹ رہا ہے۔ سر بری طرح چکرانے لگا اور آنکھوں سے نیلے پیلے بادل اُمڈ آئے۔ ہاتھ پاؤں سُن پڑ چکے ہیں اور گلا رندھ گیا ہے، جیسے کوئی بہت موٹی سی چیز اس میں اٹک گئی ہو۔ کانپتا ہوا ہاتھ انھوں نے گردن پر رکھ لیا۔ اور کھنکھارنا چاہا مگر انہیں لگا کہ کھنکارتے ہی ہچکی آ جائے گی اور وہ مر جائیں گے۔

''نہیں ____ '' وہ بہت زور سے چیخے ان کے ہاتھ کی گرفت گلے پر خود بخود مضبوط ہو گئی تھی۔ دھندلے دھندلے حروف ابھرنے لگے۔

''کے...... کے......'' اف لگتا ہے ذہن کے پرخچے اڑ جائیں گے اور زبان کٹ کر دور جا گرے گی۔ انہوں نے غور سے دیکھا، حرف کچھ کچھ صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ ''کے دار.........''

اور پھر انہوں نے پڑھ لیا__ ''کیدار ناتھ__ '' خوشی سے چیخ پڑے اور گلے پر سے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ دل بہت زور سے دھڑکا، پورے بدن میں گدگدی سی ہونے لگی اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے پلنگ پر جا پڑے__

''کیدار ناتھ، کیدار ناتھ__ '' وہ زور زور سے کہنے لگے جیسے اب انہیں سب کچھ یاد آ گیا ہو۔

اپنی بیٹی کا، دوست کا، اس پارک کا اور اپنی بیوی کا نام__ کیدار ناتھ__! انھیں محسوس ہوا کہ ساری دنیا کا نام کیدار ناتھ ہے۔

پھر آہستہ سے اٹھے، لائٹ بجھائی اور کیدار ناتھ، کیدار ناتھ کہتے ہوئے لحاف میں گھُس گئے۔

صبح ہوئی تو انھوں نے خود کو بہت مطمئن محسوس کیا۔ رات انھیں بہت گہری اور سکون کی نیند آئی__!!

☆☆

2309

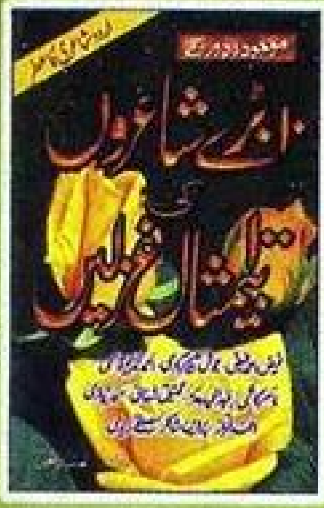

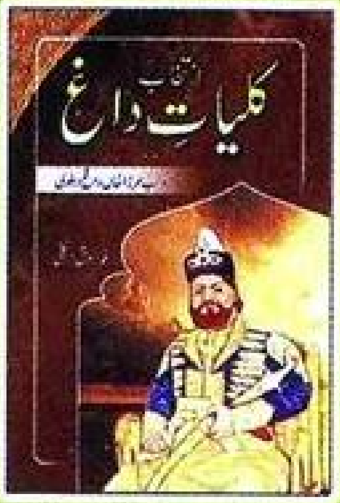

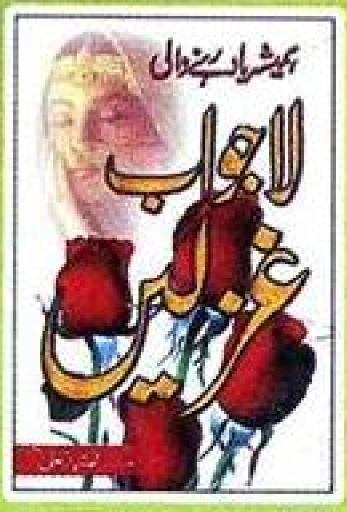

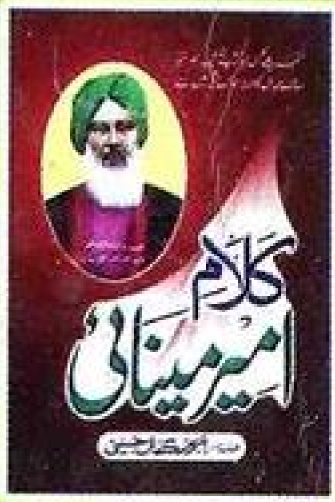

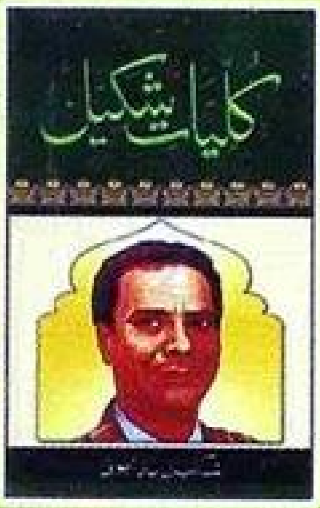

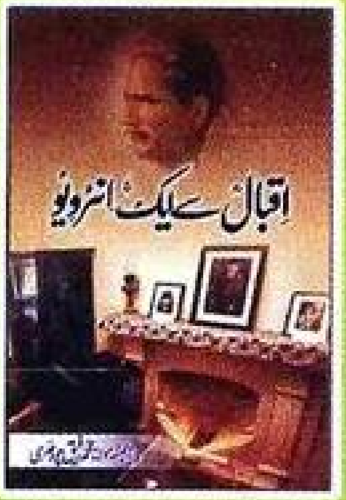

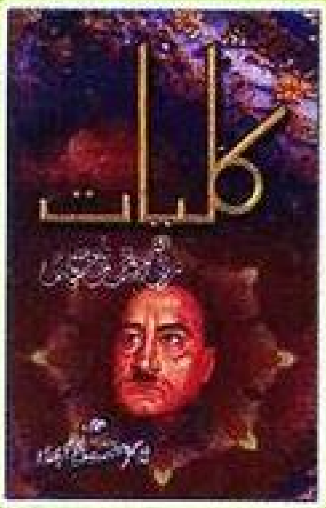

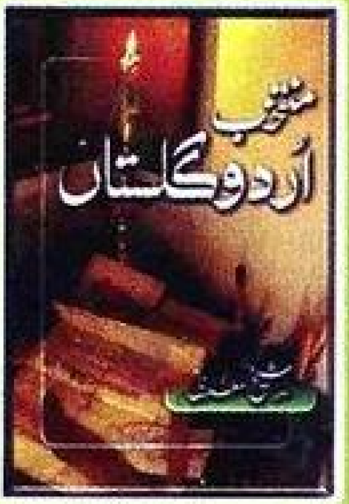

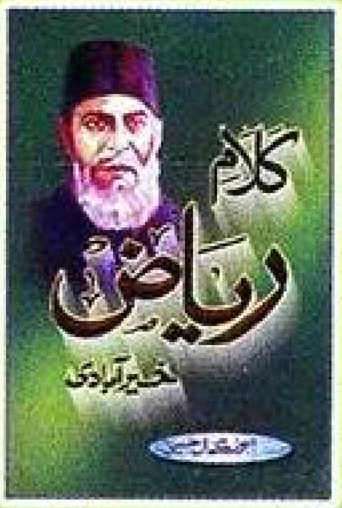

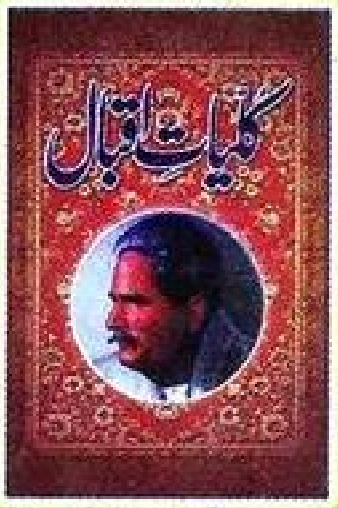

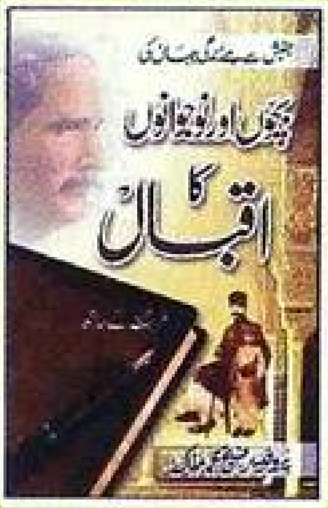

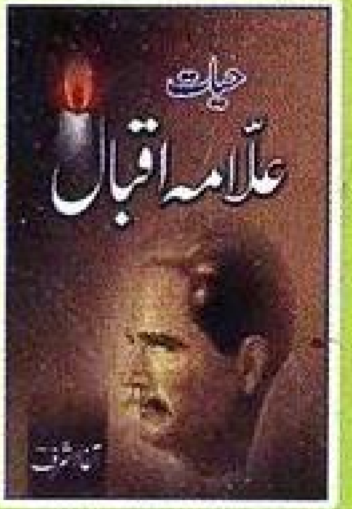

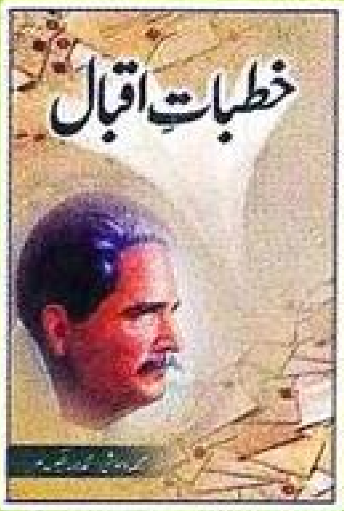

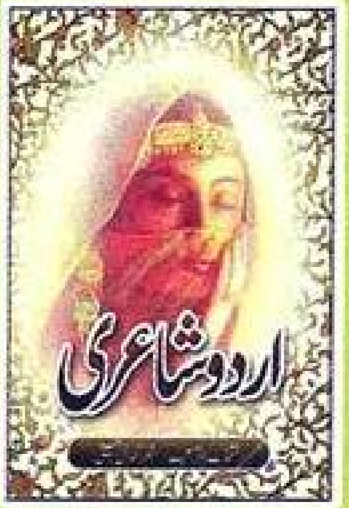

Rs. 175/-

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ
FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.
PUBLISHER & DISTRIBUTOR OF HOLY QUR' AN & ISLAMIC BOOKS

Sales Off.: 422, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-6. Ph.: 23256590, 23265406, Fax: 011-23279998
Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2. Ph.: 23289786, 23289159
E-mail: farid@ndf.vsnl.net.in · farid_export@hotmail.com · website: www.faridexport.com